الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

صبر بے عملی نہیں
صبر منصوبہ بند عمل کا دوسرا نام ہے

جنوری ۱۹۸۶
شمارہ ۱۱۰

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	[illegible]
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	[illegible]
تعمیرِ ملت	[illegible]
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	[illegible]
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارفِ اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	[illegible]
سبق آموز واقعات	[illegible]
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	[illegible]
پیغمبر اسلام	[illegible]
حقیقتِ حج	4
آخری سفر	3
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
رازِ حیات	

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۰ جنوری ۱۹۸۶

فہرست

ایک کردار

وَاتلُ عَلَیھِم نَبَاَ الَّذِی اٰتَینٰہُ اٰیٰتِنَا فَانسَلَخَ مِنھَا فَاَتبَعَہُ الشَّیطٰنُ فَکَانَ مِنَ الغٰوِینَ۔ وَلَو شِئنَا لَرَفَعنٰہُ بِھَا وَلٰکِنَّہٗ اَخلَدَ اِلَی الاَرضِ وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ الکَلبِ اِن تَحمِل عَلَیہِ یَلھَث اَو تَترُکہُ یَلھَث۔ ذٰلِکَ مَثَلُ القَومِ الَّذِینَ کَذَّبُوا بِاٰیٰتِنَا فَاقصُصِ القَصَصَ لَعَلَّھُم یَتَفَکَّرُونَ

(الاعراف ۱۷۶-۱۷۵)

اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دیں تو وہ ان کو چھوڑ کر نکل بھاگا۔ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان نشانیوں کی بدولت اس کا رتبہ بلند کر دیتے۔ مگر وہ زمین کا ہو رہا اور اس نے اپنی خواہش کی پیروی کی۔ تو اس کا حال ایسا ہے جیسے کتا، تم اس پر بوجھ لادو تب بھی ہانپے اور چھوڑ دو تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیوں جھٹلایا۔ پس تم ان احوال کو بیان کرو شاید کہ وہ غور کریں۔

اللہ تعالیٰ ایک شخص کے لیے ایسے حالات برپا کرتا ہے کہ وہ حق کا اعتراف کرے اور پھر اعترافِ حق کا انعام پائے مگر اس کی خودی اس کے لیے اعتراف کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے سامنے ایسے مواقع کھولتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس میں استعمال کرے اور خدا کے دین کا خادم بنے مگر وہ اپنی سطحی خواہشات سے ایسا مغلوب ہوتا ہے کہ ان مواقع کو استعمال نہیں کر پاتا۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کے سامنے ایسے دروازے کھولتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو کر اپنی اصلاح کرے اور نیک اعمال کر کے خدا کی رحمت و مغفرت کا مستحق بنے، مگر اپنے جھوٹے تقاضوں کی اہمیت اس کے ذہن پر اس طرح چھائی ہے کہ وہ اس دروازہ میں داخل نہیں ہوتا یا داخل ہوتا ہے تو اپنی نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے جلد ہی اس سے نکل بھاگتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی عقل پر ان کی خواہشات نے غلبہ پالیا۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔ وہ دروازہ کھولے جانے سے پہلے بھی محروم تھے اور دروازہ کھولے جانے کے بعد بھی وہ محروم رہے۔

زندگی کا امتحان

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ وہ آدم کے آگے جھک جائے۔ مگر شیطان آدم کے آگے نہیں جھکا کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں (انا خیر منہ) پھر میں کمتر کے آگے کیوں جھکوں۔ اس کے مقابلہ میں دار فرشتوں کا تھا جو حکم ہوتے ہی فوراً آدم کے سامنے جھک گیے۔

آدم کی پیدائش کے وقت مذکورہ واقعہ کا پیش آنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ یہی معرکہ تمام انسانوں پیش آئے گا۔ اس طرح تخلیق انسانی کے آغاز ہی میں یہ بتا دیا گیا کہ تمہارا اصل امتحان کہاں والا ہے۔ انسان کو موجودہ دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس کی بڑائی کا بت ٹوٹے پھر بھی وہ ارا کرے۔ دوسرے کے مقابلے میں اس کو چھوٹا مقام ملے پھر بھی وہ اس پر راضی ہو جائے۔ احساس برتری کو کچلا جائے پھر بھی وہ حق و انصاف کے راستے سے نہ ہٹے۔ اس کی عظمت کا قلعہ آنکھوں کے سامنے ڈھایا جائے پھر بھی وہ اس کا استقبال کرے۔

زندگی ایک ایسا امتحان ہے جس میں بار بار آدم کی مذکورہ کہانی دہرائی جاتی ہے یہاں بار بار تا ہے کہ آدمی کی بڑائی ٹوٹتی ہے۔ ایک شخص کو دوسرے شخص کے مقابلہ میں کم تر مقام پر راضی نا ہے۔ اب جو لوگ ایسے مواقع پر اپنے کو چھوٹا بنانے پر راضی ہو جائیں وہ فرشتوں کے ہم نشیں تے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی بڑائی کا بت ٹوٹنا برداشت نہ کریں اور اس "آدم" کے نے پر راضی نہ ہوں جس کو اللہ نے ان کے مقابلے میں بڑائی دی تھی وہ شیطان کے بھائی ہیں۔ لیے آخرت میں وہی انجام مقدر ہے جو ان کے پیش رو ابلیس کا ہونے والا ہے۔

زندگی ایک ایسا معرکہ ہے جس میں جیتے جی اپنے کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ جس میں خود اپنے ہاتھ اپنی قبر بنا کر اس میں لیٹ جانا پڑتا ہے۔ زندگی ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے کا امتحان جو لوگ اس ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے پر راضی ہوں وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت ن باغوں میں جگہ پائیں گے جو ہر قسم کی ناخوشگواریوں سے پاک ہو، جہاں دوبارہ کچھ برداشت نہ کرنا پڑے۔ جہاں انسان کو ہمیشہ کے لیے آزادی اور خوشی کی لامحدود دنیا سل ہو جائے۔

امکان ختم نہیں ہوتا

عبد الرحمٰن بن معاویہ ابن ہشام (۱۷۲-۱۱۳ھ) بنو امیہ کا ایک شہزادہ تھا۔ وہ نہایت ذہین اور باصلاحیت تھا۔ چنانچہ اس کی تربیت ابتدا ہی سے نہایت شاہانہ انداز میں کی گئی۔ اس کو اس طرح تیار کیا گیا کہ جب وہ بڑا ہو تو کامیابی کے ساتھ تخت خلافت پر بیٹھ سکے۔

مگر ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی خلافت ختم ہو کر بنو عباس کی خلافت شروع ہو گئی۔ اس وقت عبد الرحمٰن کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ جب عباسی لشکر شام میں داخل ہو کر دمشق پر قابض ہو گیا اور بنو امیہ کا قتل عام ہونے لگا اس وقت اتفاق سے عبد الرحمٰن دمشق میں موجود نہ تھا۔ بلکہ باہر دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے اس کی جاگیر تھی اور اس کے باغات وغیرہ تھے۔ اس وقت وہ یہیں پر مقیم تھا۔

عبد الرحمٰن کو جب معلوم ہوا کہ بنو امیہ کے افراد کا قتل عام ہو رہا ہے تو وہ یہاں درختوں کے جھنڈ میں خیمہ لگا کر چھپ گیا۔ ایک روز وہ اپنے خیمہ میں تھا کہ اس کا چار سال کا لڑکا خوف زدہ حالت میں خیمہ میں آیا۔ معلوم ہوا کہ بنو عباس کے سپاہی اس کو تلاش کرتے ہوئے اس باغ تک پہونچ گئے ہیں۔ عبد الرحمٰن نے اپنے بچہ کو گود میں اٹھایا اور دریا کی طرف بھاگا۔ وہ دریا میں کود پڑا اور تیرتا ہوا اس کے دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔

عبد الرحمٰن بن معاویہ دمشق سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم کئی سال تک اس کی زندگی نہایت مصیبت کی زندگی رہی۔ دشمن سے بچنے کے لیے دریا میں کودنا، جنگلوں میں پناہ لینا، بھوکے پیاسے ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگنا، یہ اس کی زندگی تھی۔ اسی حال میں وہ سبطہ پہونچا جو افریقہ کے ساحل پر واقع تھا۔

بظاہر عبد الرحمٰن کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی بنتے بنتے بگڑ گئی تھی۔ بچپن کی عمر میں جس کا یہ حال تھا کہ تخت خلافت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جوانی کی عمر کو پہونچ کر اس کے لیے زمین میں ایک گوشہ بھی نہیں رہا جہاں وہ سکون کی زندگی گزار سکے۔

مگر مایوسی کی آخری حد پر پہونچ کر اس کے لیے امید کی روشنی پیدا ہو گئی۔ عین اسی زمانہ میں اندلس کے مسلمان بے سردار ہو کر آپس میں لڑ رہے تھے۔ دمشق کے مرکز خلافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دمشق اور قرطبہ کے درمیان ایک پیغام کے آنے جانے میں اکثر مہینوں لگ جاتے تھے۔ اسی بنا پر اندلس کے اوپر دمشق کی مضبوط گرفت باقی نہیں رہی تھی۔

اندلس کے یہ حالات عبد الرحمٰن بن معاویہ کے لیے ایڈوانٹج بن گئے۔ وہ آبنائے جبرالٹر کو پار کرکے اندلس پہونچا۔ وہاں کے مسلمانوں کو ایک سردار کی ضرورت تھی۔ عبد الرحمٰن اپنی شخصی قابلیت نیز بنو امیہ کا ولی عہد ہونے کی وجہ سے بہت جلد وہاں کے لوگوں کا مرجع بن گیا اور بالآخر اس نے اندلس میں مضبوط مسلم سلطنت قائم کی۔ یہی امیر عبد الرحمٰن اندلس کی علمی اور تہذیبی ترقیوں کا بانی ہے۔ وہ شخص جس کی تاریخ دمشق میں ختم ہو چکی تھی اس نے اپنی حوصلہ مندی کی بنا پر قرطبہ میں اپنی ایک نئی شاندار تاریخ بنالی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی کسی کے لیے امکان ختم نہیں ہوتا۔ جہاں ایک موقع ختم ہو وہیں دوسرا زیادہ بہتر موقع اس کے لیے موجود رہتا ہے۔ جب ایک تاریخ اختتام پر پہونچتی ہے تو وہیں دوسری تاریخ کے آغاز کے امکانات شروع ہو جاتے ہیں۔

مگر نئے امکانات کبھی اپنے آپ واقعہ نہیں بنتے۔ ان کو استعمال کرکے انھیں واقعہ بنانے کے لیے ایک حوصلہ مند انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی ہمت نہ کھوئے، اگر وہ نئی جدوجہد کی ضروری شرطیں پوری کرنے کے لیے تیار ہو تو اس کے لیے ناکامی کا سوال نہیں۔ یہ دنیا خدا نے اسی لیے بنائی ہے کہ آدمی یہاں جدوجہد کرکے کامیاب ہو۔ اب جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اپنی نادانیوں سے ناکام ہوتا ہے، وہ خود اپنی کوتاہیوں کی سزا بھگتتا ہے۔

"انسان کے لیے کبھی امکان ختم نہیں ہوتا" یہ جملہ اتنا ہی بامعنیٰ ہے جتنا یہ کہنا کہ "اس دنیا میں کبھی صبح کا آنا بند نہیں ہوتا"۔ جس طرح ہر رات کے بعد صبح کا آنا یقینی ہے اسی طرح ہر ناکامی کے بعد دوبارہ کامیابی کا دور آنا یقینی ہے۔ تاہم رات کے بعد نئی صبح لانے کے لیے زمین و آسمان کو عظیم گردش کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح کسی آدمی کی زندگی میں ناکامی کے بعد کامیابی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اس کی خاطر عظیم جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اصل رکاوٹ

کہا جاتا ہے کہ اسلامی دعوت کے حق میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے پاس اسلامی اعمال والے لوگ نہیں۔ عام انسان صرف مثال کے ذریعہ انقلابی تاثر قبول کرتا ہے نہ کہ علمی بحثوں اور عقلی دلیلوں کے ذریعہ۔ مگر ہماری بے بسی یہ ہے کہ ہم مدعو سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ —— دیکھو یہ ہے اسلامی انسان' دیکھو یہ ہے اسلامی گھرانا، دیکھو یہ ہے اسلامی جماعت۔

یہ بات بظاہر نہایت درست معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ آدھی صداقت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس قول کی کوئی قیمت نہیں جس کے ساتھ عمل کی مطابقت شامل نہ ہو۔ اس اعتبار سے داعی کو بلاشبہ باعمل ہونا چاہیے۔ مگر یہ نہایت سادگی کی بات ہوگی کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ داعی اگر باعمل ہو تو تمام لوگ فوج در فوج اس کے ساتھی بن جائیں گے۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام انبیاء اپنے عمل کے اعتبار سے معیاری انسان تھے۔ وہ بلاشبہ مثالی کردار کے حامل تھے۔ پھر کیا ان نبیوں کو دیکھ کر سارے لوگ جوق در جوق ان کے مومن بن گئے۔ قرآن بتاتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ تمام نبیوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کر دیا۔ کردار و عمل کی تمام خوبیوں کے باوجود وہ ان کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے (یٰس ۳۰)

حقیقت یہ ہے کہ سچائی کو اختیار کرنے میں اصل رکاوٹ داعی کا عمل نہیں بلکہ مدعو کی مفاد پرستی ہے۔ داعی کی بات کو ماننے کے لیے لوگ اس لیے تیار نہیں ہوتے کہ اس کی بات ماننے سے لوگوں کی بڑائی ختم ہوتی ہے۔ ان کی انا کا بت ٹوٹتا ہے۔ ان کے مفادات اور مصلحتوں کا تانا بانا منتشر ہوتا ہے۔ اپنی بنی بنائی زندگی کو توڑ کر از سر نو ایک نئے نقشہ پر زندگی کی تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ خاندانی روابط، سماجی تعلقات اور قومی بندھنوں کا سارا ڈھانچہ بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ خود پرست ہیں، اس لیے وہ خدا پرست بننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور یہی حق کو ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر ایسا ہوا کہ نسلِ انسانی کے سب سے بہتر اور مثالی افراد (انبیاء علیہم السلام) کا بھی لوگوں نے اعتراف نہیں کیا، بلکہ حقارت کے ساتھ ان کو نظر انداز کر دیا۔

پیدائشی مسلم

گاری ملر (Garry Miller) ایک امریکی عیسائی تھے۔ وہ ایک کالج میں بائبل کے ٹیچر تھے۔ ۱۹۷۸ میں ان کو یہ خیال ہوا کہ قرآن کو پڑھ کر دیکھیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے قرآن اور بائبل کا تقابلی مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اوپر اسلام کی حقانیت منکشف ہو گئی اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا اسلامی نام عبد الاحد عمر ہے۔ وہ اب اپنی نو مسلم بیوی کے ساتھ کناڈا میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو مذہب بدلنے والا (Convert) کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ اپنے آپ کو واپس آنے والا (Revert) کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے بلکہ میں اپنے پیدائشی مذہب کی طرف واپس آیا ہوں:

> **I haven't converted to Islam but merely reverted to my birthright religion**
> ***Muslim Journal*** Chicago, June 21, 1985

مذکورہ نو مسلم نے جو بات کہی وہ بے حد اہم ہے۔ اور عین قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت صحیح پر پیدا کیا ہے (الروم ۳۰) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا خدا کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے (کُلُّ مولودٍ یُولَدُ علی الفطرۃ) اس اعتبار سے ہر آدمی پیدائشی مسلم ہے۔ خدا کے کارخانے سے وہ مسلم و مومن بن کر آتا ہے۔ اس کے بعد اس کی قومی روایات اور اس کے ماحول کے اثرات اس کو کسی اور مذہب پر ڈال دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلامی دعوت کا کام حقیقۃً لوگوں کے مذہب کو بدلنا نہیں ہے بلکہ ان کے اوپر پڑے ہوئے مصنوعی غلاف کو ہٹا دینا ہے۔ اگر ہم ایسا کر سکیں کہ انسان کے اوپر پڑے ہوئے خارجی غلاف کو ہٹا دیں تو اس کے بعد جو انسان بچے گا وہ وہی ہوگا جس کو مومن کہا جاتا ہے۔

ہر آدمی حقیقت کے اعتبار سے مومن ہے، اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے وہ کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کی یہ فطرت اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم امدادی قوت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کے سینہ میں دین حق کا ایک مثنیٰ موجود ہے۔ آدمی کا اندرونی شعور خود اس بات کی تصدیق کر رہا ہے کہ یہی حق ہے اور اس کو اپنی چیز سمجھ کر اسے اختیار کر لینا چاہیے۔

تبلیغی طاقت

قرآن میں ایک مضمون دو مقامات پر بیان ہوا ہے۔ یہاں ہم دونوں آیتیں نقل کرتے ہیں :

اولم یروا انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب (الرعد ۴۱)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ اور اللہ فیصلہ کرتا ہے۔ کوئی اس کے فیصلے کو پیچھے ڈالنے والا نہیں۔ اور وہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

افلا یرون انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها افھم الغالبون (الانبیاء ۴۴)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ کیا پھر بھی وہی غالب آنے والے ہیں۔

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کے اکابر اور سرداروں نے آپ کو رد کر دیا۔ انھوں نے آپ کے ساتھیوں کو بہکایا۔ آپ کے بارہ میں بے بنیاد پروپیگنڈے کیے۔ آپ کی معاشیات کو تباہ کیا۔ آپ کو اپنے قبیلہ کی حمایت سے محروم کیا۔ آپ پر جارحانہ حملے کیے۔ آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ چلے جائیں۔

قریش خوش تھے کہ انھوں نے یہ سب کر کے پیغمبر اسلام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انھوں نے آپ کے "مسئلہ" کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔ عین اس وقت یہ کہا گیا کہ تمہارا یہ بے بنیاد خیال صرف اس لیے ہے کہ تمہاری آنکھیں صرف قریب کے حالات کو دیکھ رہی ہیں، دور کے احوال کی تمہیں خبر نہیں۔

عین اس وقت جب کہ قریش اسلام کا جغرافی دائرہ تنگ کر رہے تھے، اس کا نظریاتی دائرہ بڑھتا جارہا تھا۔ ہر روز شرک کے حلقہ سے کچھ افراد نکل کر اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے تھے۔ قریش اسلام کے مادی جغرافیہ کو تنگ کر کے خوش ہو رہے تھے مگر اسلام کی تبلیغی طاقت خود قریش کے نظریاتی جغرافیہ کو تنگ کر رہی تھی۔ اور تجربہ نے ثابت کیا کہ پہلی طاقت کے مقابلہ میں دوسری طاقت زیادہ موثر ہے۔

دعوت و تبلیغ سب سے بڑی طاقت ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔

تعارف اسلام

دہلی کی جامع مسجد کے پاس تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ایک لائبریری ہے۔ مجھے مسز اینی بسنٹ کی ایک کتاب کی تلاش تھی۔ اس کتاب کو لینے کے لیے میں مذکورہ لائبریری میں ۲۲ جون ۱۹۷۹ کو گیا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول اس دن ان کا ہفتہ وار اجتماع تھا۔ کتاب حاصل کرنے کے بعد دن کو ۱۰ بجے تک ان کے اجتماع میں شریک ہو گیا۔ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا اجتماع تھا۔ نیا چہرہ دیکھ کر انھوں نے مجھ سے فرمائش کی "آپ بھی اپنے وچار رکھیں"۔ میں نے کہا کہ میں قرآن کا طالب علم ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں یہ کر سکتا ہوں کہ یہ بتاؤں کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ضرور۔ آپ یہی بتائیے۔ ہم آپ سے اسی موضوع پر سننا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس تقریر میں سادہ انداز میں توحید، آخرت اور جنت وجہنم کی وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ قرآن کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ موجودہ دنیا کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ موت کے بعد آنے والی دنیا کا مسئلہ ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم کس طرح زندگی گزاریں کہ ہماری اگلی زندگی کامیاب رہے۔ تمام لوگ بہت غور سے میری تقریر سنتے رہے۔ تقریر کے بعد سوالات بھی ہوئے جن کا میں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب دیا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد مجمع سے ایک صاحب اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرا پتہ معلوم کیا۔ میں نے اپنا پورا پتہ بتا دیا۔ انھوں نے کہا کہ پٹیل نگر (نئی دہلی) میں تھیاسوفیکل سوسائٹی کا لاج ہے۔ وہاں زیادہ بڑے پیمانہ پر ہمارا پروگرام ہوتا ہے۔ ہم وہاں پر آپ کی تقریر رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہم ایک ساتھ ایک مہینہ (چار ہفتہ وار اجتماعات) کا پروگرام بنا کر چھپوا لیتے ہیں اور اس کو تمام ممبروں تک بھیج دیتے ہیں۔ اب ۱۵ جولائی تک ہمارا پروگرام سٹ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد کسی تاریخ کو ہم آپ کو زحمت دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد میری دوسری تقریر ۱۵ جولائی ۱۹۷۹ کو ہوئی۔ اس کا عنوان تھا، قرآن کا پیغام۔ ملک کے اکثر حصوں میں غیر مسلم حضرات کے اس طرح کے اجتماعات برابر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی وہاں آئیں اور سنجیدہ انداز میں اپنی بات پیش کریں۔ اسلام کے تعارف کے سلسلہ میں ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس کے سلسلہ میں ایک کام یہ بھی ہے کہ اس طرح کے اجتماعات میں پہونچیں اور ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں۔

تعمیر خویش

اللہ تعالیٰ نے لکڑی پیدا کی مگر اس نے کشتی نہیں بنائی۔ اس نے لوہا زمین میں رکھ دیا مگر اس نے لوہے کو مشین کی شکل میں نہیں ڈھالا۔ اس نے المونیم اور پلاسٹک پیدا کیا مگر ان کو جہاز کی صورت میں تشکیل دینے کا کام چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا کام اللہ تعالیٰ انسان سے لینا چاہتا ہے۔ اللہ نے ایک طرف ہر قسم کے خام مواد پیدا کیے۔ اور دوسری طرف انسان کو عقل کی صلاحیت عطا فرمائی۔ اب اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ انسان زمین سے خام مواد لے کر اس کو مشین کی صورت دے۔ وہ بغیر گھڑے ہوئے مادہ کو گھڑے ہوئے مادہ میں تبدیل کرے۔

یہ فطرت کی قوتوں کو تمدن میں ڈھالنے کی مثال ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ انسان سے بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو ایک بہترین شخصیت عطا فرمائی۔ فطرت کی سطح پر اس کو اعلیٰ ترین وجود عطا فرمایا۔ تاہم یہ انسانی شخصیت اپنی ابتدائی صورت میں ایک قسم کا خام مواد ہے۔ اب یہ کام خود انسان کو کرنا ہے کہ وہ خدا کے دیے ہوئے اس ابتدائی وجود کی تشکیل نو کرے۔ وہ فطرت کے سادہ ورق پر اپنا کلام تحریر کرے۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ اسی معاملہ میں کامیابی یا ناکامی پر اس کے مستقبل کا انحصار ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے شعور کو معرفت میں ڈھالے۔ اپنے احساسات کو ذکر الٰہی میں تبدیل کرے۔ وہ اپنے عمل کو ربانی کردار کی صورت میں ظاہر کرے۔ وہ اپنی شخصیت کو آخری حد تک خدا کا بندہ بنا دے۔

ایک انسان وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کو ہر شخص اپنے آپ بناتا ہے۔ آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے گویائی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اب کوئی انسان اپنی گویائی کو حق کے اعتراف کی طرف لے جاتا ہے اور کوئی حق کے انکار کی طرف۔ آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے اعلیٰ صلاحیت لے کر موجودہ دنیا میں آتا ہے۔ اب کوئی شخص اس صلاحیت کو فوری فائدے کے حصول میں لگاتا ہے اور کوئی اس کو اعلیٰ مقصد کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ ہر آدمی فطرت کی ایک زمین ہے۔ کوئی اپنی زمین پر کانٹے اگاتا ہے اور کوئی ہے جو اپنی زمین کو پھولوں کا باغ بنا دیتا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو جنت کا باشندہ بناتا ہے اور کوئی جہنم کا باشندہ۔

قربانی

درخت کیا ہے۔ ایک بیج کی قربانی۔ ایک بیج جب اپنے کو فنا کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے تو اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک سرسبز و شاداب درخت زمین پر کھڑا ہو۔

اینٹوں سے اگر آپ پوچھیں کہ مکان کس طرح بنتا ہے تو وہ زبان حال سے یہ کہیں گی کہ کچھ اینٹیں جب اس کے لیے تیار ہوتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن کر دیں، اس کے بعد وہ چیز ابھرتی ہے جس کو مکان کہتے ہیں۔

یہی حال انسانی زندگی کی تعمیر کا ہے۔ انسانیت کے مستقبل کی تعمیر اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اپنے کو بے مستقبل دیکھنے پر راضی ہو جائیں۔ ملت کی ترقی اس وقت ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ جانتے بوجھتے اپنے کو بے ترقی کرلیں ——— قربانی کے ذریعہ تعمیر، یہ قدرت کا ایک عالمگیر قانون ہے اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قدرت کا یہی اصول مادی دنیا کے لیے بھی ہے اور قدرت کا یہی اصول انسانی دنیا کے لیے بھی۔

عمارت میں ایک اس کا گنبد ہوتا ہے، اور ایک اس کی بنیاد۔ گنبد ہر ایک کو دکھائی دیتا ہے مگر بنیاد کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ کیوں کہ وہ زمین کے اندر دفن رہتی ہے۔ مگر یہی نہ دکھائی دینے والی بنیاد ہے جس پر پوری عمارت اور اس کا گنبد کھڑا ہوتا ہے۔ قومی تعمیر کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قربانی یہ ہے کہ آدمی قومی تعمیر میں اس کی بنیاد بننے پر راضی ہو جائے۔

قربانی یہ نہیں ہے کہ آدمی جوش میں آکر لڑ جائے اور اپنی جان دے دے۔ قربانی یہ ہے کہ آدمی ایک نتیجہ خیز عمل کے غیر مشہور حصہ میں اپنے کو دفن کر دے۔ وہ ایسے کام میں اپنی کوشش صرف کرے جس میں دولت یا شہرت کی شکل میں کوئی قیمت ملنے والی نہ ہو۔ جو مستقبل کے لیے عمل کرے نہ کہ حال کے لیے۔

کسی قوم کی ترقی اور کامیابی کا انحصار ہمیشہ اسی قسم کے افراد پر ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کسی قوم کے مستقبل کی بنیاد بنتے ہیں۔ وہ اپنے کو دفن کر کے قوم کے لیے زندگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

لچک بھی ضروری ہے

دکان دار کے یہاں ایک آدمی آیا۔ اس کو کپڑا خریدنا تھا۔ کپڑا اس نے پسند کر لیا مگر دام کے لیے تقریباً آدھ گھنٹہ تک تکرار ہوتی رہی۔ نہ دکاندار کم کرنے پر راضی ہوتا تھا نہ خریدار بڑھانے پر۔ آخر دکاندار نے اسی قیمت میں کپڑا دے دیا جس پر گاہک اصرار کر رہا تھا۔

ایک بزرگ اس وقت دکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب گاہک چلا گیا تو انھوں نے کہا: جب تمہیں گاہک کی لگائی ہوئی قیمت پر کپڑا دینا تھا تو پہلے ہی دے دیا ہوتا۔ آخر اتنی دیر تک اس کا اور اپنا وقت کیوں ضائع کیا۔ "حضرت آپ سمجھے نہیں" دکاندار نے کہا "میں اس کو پکا کر رہا تھا۔ اگر میں اس کی لگائی ہوئی قیمت پر فوراً سودا دیدیتا تو وہ شبہ میں پڑ جاتا اور خریدے بغیر واپس چلا جاتا۔ اس کے علاوہ میں یہ اندازہ کر رہا تھا کہ وہ کہاں تک جا سکتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ اس سے آگے بڑھنے والا نہیں ہے تو میں نے اس کو کپڑا دے دیا۔

جب دو فریقوں کے درمیان مقابلہ ہو تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی مرضی کے مطابق معاملے کرانا چاہتا ہے۔ ایسے موقع پر بلاشبہ عقل مندی کا تقاضا ہے کہ اپنی مانگ پر اصرار کیا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ عقل مندی ہی کا دوسرا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ آدمی اپنی حدود کو جانے اور اس کے لیے تیار رہے کہ بالآخر کہاں پہونچ کر اس کو راضی ہو جانا ہے۔

اس اصول کو ایک لفظ میں توافق (Adjustment) کہہ سکتے ہیں۔ یہ توافق زندگی کا ایک راز ہے۔ یہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا اہم ترین اصول ہے۔ اس اصول کی اہمیت ذاتی معاملات کے لیے بھی ہے اور قومی معاملات کے لیے بھی۔

اس اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جاننے کے ساتھ دوسروں کو بھی جانے۔ موجودہ دنیا میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو دو طرفہ تقاضوں کی رعایت کر سکے۔ جو شخص یک طرفہ طور پر صرف اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑے اس کے لیے موجودہ دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

ایک عام برائی

یزید کی فوجوں سے حضرت حسین کی جو لڑائی کربلا کے میدان میں ہوئی ، اس میں حضرت حسین کے ساتھ ان کے چار فرزند بھی مارے گیے تھے ۔ مگر شیعہ مصنفین کی کتابوں میں حضرت حسین کی شہادت کے ذیل میں صرف ان کے ایک صاحبزادے کا ذکر آتاہے جن کا نام عباس بن علی تھا ۔ بقیہ تین صاحبزادوں کے نام سرے سے ذکر نہیں کیے جاتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نام حضرت علی نے خلفاء ثلاثہ کے نام پر رکھے تھے جن کو شیعہ حضرات جائز خلیفہ نہیں مانتے ۔ یعنی ان کے نام تھے ——— ابوبکر بن علی ، عمر بن علی ، اور عثمان بن علی ۔

اپنی پسند کے ناموں کو تاریخ میں شامل کرنا اور جو نام پسند نہ ہوں ان کو تاریخ سے حذف کر دینا صرف شیعہ حضرات کا جرم نہیں ہے ، اس میں سُنّی حضرات بھی یکساں طور پر شریک ہیں ۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ کے سنّی حضرات تو اس میں اتنا زیادہ مبتلا ہیں کہ شاید ہی کوئی مثال اس کے خلاف مل سکے ۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی صحافت و قیادت کو دیکھیے ۔ وہ واضح طور پر اسی صورت حال کی مثال ہے ۔ وہ اپنے پسندیدہ لوگوں کے نام ہر جگہ شامل کرتے ہیں ۔ وہ ہر موقع پر ان کی تشہیر کرتے ہیں مگر جو ان کے مبغوض نام ہیں ان کو اس طرح نظر انداز کرتے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ۔

ایسا کرنا حقیقت کو قتل کرنا ہے ۔ اور حقیقت کا قتل بلاشبہ خدا کی دنیا میں سب سے بڑا جرم ہے ۔ اس سے بڑا جرم اور کوئی نہیں ۔

خدا کے نزدیک سب سے بڑی نیکی حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے ۔ جس چیز کو ایمان کہتے ہیں وہ حقیقت واقعہ کے اعتراف ہی کا دوسرا نام ہے ۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی کسی مجبوری کے بغیر خود اپنے اختیار سے خدا کی عظمت کو مان لے ۔ انسان کی یہی وہ اعلیٰ ترین صفت ہے جس کو نفسیات کی زبان میں حقیقت واقعہ کا اعتراف کہا جاتا ہے ۔ جنّت کی لطیف دنیا میں وہی لوگ بسائے جائیں گے جو اس اعلیٰ خصوصیت کا ثبوت دیں ۔ اس کے برعکس جو لوگ حقیقت واقعہ کو چھپائیں یا اس کا اقرار نہ کریں وہ جنّت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے نااہل ٹھہریں گے ۔

تضاد

یہ ایکسپریس ٹرین کا فرسٹ کلاس تھا۔ ایک مرد عورت اپنے بچے کے ساتھ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے وہاں پہلے سے ایک آدمی تھا جو سگریٹ پی رہا تھا۔ مرد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا:

I think smoking is not allowed inside the compartment

(میرا خیال ہے کہ کمپارٹمنٹ کے اندر سگریٹ پینے کی اجازت نہیں) اس کے بعد میاں بیوی دونوں ایک طرف بیٹھ گئے اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ بچے سے مل کر زور زور سے باتیں کرنے اور قہقہہ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ ان کے نزدیک کمپارٹمنٹ کے اندر "دھواں" کرنا ناجائز تھا مگر اسی کمپارٹمنٹ کے اندر شور کرنا ان کے نزدیک عین درست تھا۔

یہی آج کل تمام انسانوں کا حال ہے۔ ایک آدمی اتفاق سے جس چیز کا عادی نہیں ہے یا جو چیز اتفاق سے اس کی عادت میں شامل نہیں ہوئی ہے اس کا برا ہونا اس کو معلوم ہے۔ وہ کسی شخص کو اس میں مشغول دیکھتا ہے تو بہت زور و شور کے ساتھ اس کے غلط ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ مگر اسی درجہ کی دوسری برائی جس میں وہ آدمی خود مبتلا ہے وہ اس کو نظر نہیں آتی، حتیٰ کہ اس کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ غلط ہے۔ وہ دوسرے کی برائی کا خوب ذکر کرتا ہے مگر وہ اپنی برائی کے بارہ میں خاموش رہتا ہے۔

برائی کی ایک قسم اور ہے جو اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اور وہ ہے ——— خودرا فضیحت دیگراں را نصیحت۔ یعنی دوسروں کو برا کہنا اور خود اُسی بُرائی میں مبتلا ہونا۔ ایک آدمی دوسرے کو دورُخا (Double standard) ہونے کا الزام دے گا حالاں کہ وہ خود دورُخا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کی اقربا نوازی کے خلاف جھنڈا اٹھائے گا حالاں کہ اپنے دائرہ میں وہ خود اقربا نوازی کر رہا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کو اتحاد دشمن بتائے گا حالاں کہ وہ خود اتحاد دشمنی کے عمل میں مبتلا ہوگا۔ ایک آدمی دوسرے کی مصلحت پرستی کا انکشاف کرے گا حالاں کہ وہ اپنے مفاد کے معاملہ میں خود بھی مصلحت پرست بنا ہوا ہوگا۔

لوگ تضاد میں جی رہے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ خدا کی دنیا ہے۔ اور خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کا رویہ اتنا بڑا جرم ہے جس کی کوئی معافی نہیں۔

دریا کے بغیر پل

سابق روسی وزیر اعظم نکیتا خروشچیف نے کہا تھا : سیاست داں ہر جگہ ایک ہی قسم کے ہیں ۔ وہ ایک پل بنانے کا وعدہ کرتے ہیں ، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ وہاں سرے سے کوئی دریا موجود نہ ہو ۔

Politicians are the same all over. They promise to build a bridge even where there is no river.

دنیا دار لیڈروں کی یہ سیاست خود مسلم لیڈروں میں بھی پوری طرح آگئی ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا دار لیڈر اپنے عوام کی پسندیدہ زبان بولتے ہیں اور مسلم لیڈر مسلمانوں کی نفسیات کے اعتبار سے اپنے لیے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں ۔ ایک دنیا دار لیڈر اگر کہے گا کہ " جنتا راج لاؤ " تو مسلم لیڈر کا نعرہ ہوگا " قرآنی حکومت قائم کرو " مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیوں کہ دونوں جگہ صرف نعرے ہیں ۔ جنتا راج ہو یا قرآنی راج ، دونوں ہی کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ سماج میں اس کے موافق زمین تیار کی جائے ۔ مگر دونوں ہی زمین تیار کیے بغیر لاؤڈ اسپیکر پر الفاظ کا طوفان برپا کر رہے ہیں ۔ " پل " کی باتیں ہو رہی ہیں جب کہ " دریا " کا ابھی کوئی وجود ہی نہیں ۔

مسلم ملکوں میں عوام کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ پاکستان اور ایران میں شہوانی فلموں پر پابندی لگائی گئی تو لوگوں نے کیسٹ کے ذریعہ وی سی آر پر فلموں کو دیکھنا شروع کر دیا ۔ اور رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ اپنے ملک کے " ظالموں " کو مٹانے کے لیے تمام مسلم لیڈر ایک محاذ پر متحد ہو جاتے ہیں ۔ مگر ظالم کے ہٹنے کے بعد ہی ان کا " بے نظیر اتحاد " ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اقتدار کے لیے خود آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں ۔ جس معاشرہ میں عوام و خواص کا یہ حال ہو وہاں جلسے اور جلوس کی سیاست سے اسلامی نظام کس طرح قائم ہو جائے گا ۔

کام کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے بنیاد تعمیر کی جائے ۔ قوم کو باشعور بنایا جائے ۔ اس کے اندر کردار پیدا کیا جائے ۔ اس کے مختلف طبقوں کو متحد کیا جائے ۔ وہ ذرائع فراہم کیے جائیں جو موجودہ زمانہ میں کوئی موثر کام کرنے کے لیے درکار ہوتے ہیں ۔ مگر ہمارے لیڈر اس قسم کا بنیادی کام نہیں کرتے ۔ وہ اول دن سے بڑے بڑے اقدام کی باتیں کرنے لگتے ہیں ۔ یہ صرف لیڈری کی تعمیر ہے نہ کہ ملت کی تعمیر ۔

Magnetic wire that trips up thieves

Shoplifting is big business: petty thieves around the world filch billions of dollars of goods each year. But a new disposable antitheft "tag" that is virtually impossible to detect may cause some pilferers to think about switching pastimes. The tag, made by Knogo Corp. of Hicksville, N.Y., consists of a hairthin magnetic wire that can be attached to anything from a jar of caviar to a pack of cigarettes.

Unlike the bulky plastic antitheft tags frequently used to protect clothing, Knogo's minuscule Electro Thred tags are nearly invisible. The metal thread can be attached to a price tag, incorporated into a mock bar-code label or glued to the seam of a can or the side of a carton during manufacture. When a customer makes a purchase a clerk deactivates the tag by passing the item over a desensitizing device. (Unlike plastic antitheft tags, the Electro Thred tag does not have to be removed; it is simply deactivated.) Shoplifters making off with an item containing a "live" Electro Thred wire will be tripped up at the door, where a detector sounds an alarm.

Supermarkets and pharmacies may find Knogo's invisible threads attractive because they offer broad antitheft protection at a relatively low price. Electro Thred tags cost less than one cent apiece if purchased in volume. Because the tags are hard to see, they don't have to be attached to every item in a store to deter thieves. Retailers can tag only expensive or easily stolen items and leave shoplifters guessing whether the rest are bugged. Knogo encourages clerks to run every purchase through the deactivator to "give the impression to shoppers that all items are protected," says company engineer Michael Cooper.

The system is not flawless. Clerks must bring each tag into physical contact with the deactivator to ensure that the Electro Thred is desensitized; this means shop employees must be trained to recognize which items are tagged and where tags are located. Since about one-third of the thefts in many stores are attributed to what retailers call "internal shrinkage" — pilferings by employees — training the shop clerks to recognize selectively tagged items may only cause added problems. Still, Knogo's system may convince some light-fingered individuals to keep their hands off the goods. The electro Thred system is being marketed in the United States, Europe, Japan and Australia. Knogo plans to bring out a similar antitheft system for libraries next year.

JULITH JEDAMUS WITH CYNTHIA CATTERSON
NEWSWEEK/November 4, 1985

پل صراط کا منظر

دنیا بھر میں چور کروروں ڈالر کا سامان دکانوں سے اٹھا لیتے ہیں۔ اس کو روکنے کے لیے نیویارک کی ایک فرم نے ایک کامیاب طریقہ دریافت کیا ہے، یہ چوری روک تکہ ہے۔ یہ ایک قسم کا مقناطیسی تار ہے جو بال کی طرح باریک ہوتا ہے۔ وہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا اور کسی بھی سامان کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ جب ایک خریدار سامان کو باقاعدہ خریدتا ہے تو دکان کا ایک کلرک اس کو ایک خاص طرح کی مشین سے گزار کر اس کو غیر موثر بنا دیتا ہے۔

نیویارک کے میگزین نیوز ویک (۴ نومبر ۱۹۸۵) میں یہ خبر دیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ چوری سے دکان کا سامان اٹھانے والا آدمی جب ایک ایسا سامان اٹھاتا ہے جس میں مذکورہ قسم کا زندہ برقی تار لگا ہوا ہو تو وہ دروازہ پر پہونچتے ہی پکڑ لیا جاتا ہے جہاں ایک مشین اس کو محسوس کر لیتی ہے اور فوراً الارم کی شکل میں اس سے آگاہ کر دیتی ہے:

Shoplifters making off with an item containing a live Electro Thread wire will be tripped up at the door, where a detector sounds an alarm.

مذکورہ خبر پڑھتے ہوئے مجھے وہ خبر یاد آگئی جو قیامت کے بارہ میں دی گئی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگ جہنم کے اوپر سے گزریں گے۔ پھر نیک لوگ بچ جائیں گے اور برے لوگ جہنم میں گرا دیئے جائیں گے (مریم ۷۱) حدیث کے مطابق اس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کے اوپر ایک پل (پل صراط) ہوگا۔ اس سے تمام لوگ گزارے جائیں گے۔ اس پل کے دونوں طرف فرشتے ہوں گے۔ ان کے پاس آگ کے آنکس ہوں گے۔ وہ اس سے انسانوں کو پکڑ کر کھینچ لیں گے اور ان کو دوزخ میں ڈال دیں گے (معھم کلالیب من نار یختطفون بھا الناس، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۲)

آخرت کی دنیا ابھی انسان کے لیے نہ دکھائی دینے والی دنیا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو آج کی دنیا کے واقعات آئندہ آنے والی دنیا کے واقعات کو قابل فہم بنا رہے ہیں۔ وہ آج کے تجربہ کی صورت میں کل کے تجربہ کی جھلک دکھا رہے ہیں۔

جہیز کے بارہ میں

شادی میں جہیز دینے کی رسم ہندستانی مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ رسم ہندستان اور پاکستان کے سوا دوسرے مسلم ملکوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں میں یہ رسم یقینی طور پر ہندوؤں سے آئی ہے۔ ہندو لوگ، اپنے قدیم قانون کے مطابق، بیٹی کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے تھے، اس کی تلافی کے لیے ان کے یہاں یہ رواج پڑ گیا کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو زیادہ سے زیادہ دیا جائے۔ چنانچہ وہ جہیز کے نام پر بیٹی کو اپنی دولت کا ایک حصہ دینے کی کوشش کرنے لگے۔

اسی ہندو طریقہ کی تقلید ہندستان کے مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ اسلام میں اگرچہ لڑکی کو وراثت میں باقاعدہ حصہ دار بنایا گیا ہے۔ مگر مسلمانوں نے عملی طور پر لڑکیوں کو اس شرعی حق سے محروم کر رکھا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے انھوں نے اس ہندو طریقہ کو اختیار کر لیا ہے کہ شادی کے موقع پر لڑکی کو کافی سامان دے کر اسے خوش کر دیا جائے۔ جہیز حقیقۃً اسلام کے قانون وراثت سے فرار کی تلافی ہے جس کو پڑوسی قوم سے لے کر اختیار کر لیا گیا ہے۔

کچھ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ جہیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح حضرت علی سے کیا تو ان کو اپنے پاس سے جہیز بھی عطا کیا۔ اس قسم کی بات دراصل غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیا اس کو کسی طرح بھی "جہیز" نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر اس کو جہیز کہا جائے تو ساری دنیا میں غالباً کوئی ایک مسلمان بھی نہیں جو اپنی لڑکی کو یہ پیغمبرانہ جہیز دینے کے لیے تیار ہو۔

وہ جہیز کیا تھا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو دیا۔ یہاں ہم اس کی روایت نقل کرتے ہیں:

اخرج البیہقی فی الدلائل عن علی انہ قال جہز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمۃ فی خمیل وقربۃ و وسادۃ ادم حشوھا اذخر (کنز العمال جلد ۷، صفحہ ۱۱۳)

حضرت علی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ کو جہیز میں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ دیا جس میں اذخر گھاس کا بھراؤ تھا

واضح ہو کہ حدیث میں جھز کا لفظ معروف قسم کا جہیز دینے کے معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ ضروری چیزوں کا انتظام کرنے کے معنی میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام خود حضرت علیؓ کی رقم پر کیا تھا۔ یہ رقم حضرت علی نے اپنی ایک پرانی زرہ فروخت کرکے آپ کے حوالے کی تھی۔

مزید یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہاں حضرت فاطمہ کے علاوہ تین اور صاجزادیاں تھیں جو بڑی ہوئیں اور پھر بیاہی گئیں۔ مگر مذکورہ "جہیز" آپ نے صرف حضرت فاطمہ کو دیا۔ بقیہ صاجزادیوں کو اس قسم کا کوئی جہیز نہیں دیا۔ اگر جہیز فی الواقع آپ کی مستقل سنت ہوتی تو آپ نے بقیہ صاجزادیوں کو بھی ضرور جہیز دیا ہوتا۔ مگر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتا کہ آپ نے بقیہ صاجزادیوں کو بھی "جہیز" دیا ہو۔

یہ فرق خود ثابت کرتا ہے کہ مذکورہ جہیز، اگر اس کو جہیز کہا جاسکے، بر بنائے ضرورت تھا نہ کہ بربنائے رسم۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی جب چھوٹے تھے اسی وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد (ابو طالب) سے کہہ کر ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا حضرت علی بچپن سے آپ کی زیر کفالت تھے۔ گویا حضرت علی ایک اعتبار سے آپ کے چچا زاد بھائی تھے اور دوسرے اعتبار سے آپ کے بیٹے کے برابر تھے۔ بچپن سے آپ کے تمام اخراجات کی فراہمی آپ کے ذمہ تھی۔ اس لیے بالکل قدرتی بات تھی کہ نکاح کے بعد نیا گھر بسانے کے لیے آپ انھیں بطور سرپرست کچھ ضروری سامان دے دیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام ایک ناقص دین ہے، اس میں زندگی کے تمام معاملات کے بارہ میں احکام موجود نہیں۔ تو مسلمان ایسے شخص سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ مگر عملاً مسلمان اسی بات کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ اسلام ایک ناقص دین ہے، یا کم از کم یہ کہ اس کی ہدایات کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کے طریقے زیادہ بہتر اور زیادہ قابل عمل ہیں۔

جہیز کے بارہ میں مسلمانوں نے واضح طور پر ہندو طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کی دوسری رسوم جو مسلمانوں میں رائج ہیں وہ اسلام سے زیادہ دوسری قوموں کے طور طریقوں سے ماخوذ ہیں۔ اگر مسلمانوں کا یہ خیال ہو کہ اسلام کے کامل دین ہونے پر فخر کرنا ہی خدا کے یہاں ان کی مقبولیت کے لیے کافی ہے تو اس سے بڑی غلط فہمی اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر فخر کرتے تھے اس کے باوجود وہ خدا کے یہاں ملعون قرار دیئے گئے۔

کالی آگ

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اُوقِدَ علی النار الف سنۃ حتی احمرّت ثم اُوقِدَ علیھا الف سنۃ حتی ابیضّت ثم اوقِد علیھا الف سنۃ حتی اسودّت فھی سوداءُ مظلمۃ (الترمذی)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم کی آگ کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ لال ہو گئی۔ اس کے بعد پھر اس کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ سفید ہو گئی۔ پھر اس کو ہزار سال تک دہکایا گیا تو وہ کالی ہو گئی۔ اب وہ گہری کالی ہے۔

جہنم کی آگ حقیقۃً کیا ہے اور کس طرح بھڑکتے بھڑکتے کالی ہو گئی ہے اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ مگر آگ کا کالا ہو جانا آج کے انسان کے لیے نا قابل فہم نہیں رہا۔ آج کے علم الافلاک نے بتایا ہے کہ کائنات میں آگ کی ایسی دنیائیں ہیں جو اپنی شدت کے آخری مرحلے میں پہونچ کر کالی ہو گئی ہیں "کالی آگ" آج کے انسان کے لیے ایک معلوم چیز ہے اور اس کو جدید اصطلاح میں کالا غار (Black hole) کہا جاتا ہے۔

فلکیاتی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بہت بعید فاصلوں پر کائنات میں انتہائی بڑے بڑے ستارے (آگ کے گولے) ہیں۔ وہ اتنے بڑے ہیں کہ کہکشاں کے مقابلہ میں سو گنا زیادہ انرجی خارج کرتے ہیں جب کہ ایک کہکشاں میں کھرب ہا کھرب ستارے ہوتے ہیں۔ ابتداءً یہ ستارے اسی طرح "روشن" دکھائی دیتے تھے جیسے دوسرے ستارے۔ نظریہ یہ ہے کہ اپنی بڑھی ہوئی قوتِ کشش کی وجہ سے ان ستاروں نے اپنے مادہ کو اندر کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اس کے نتیجہ میں ستارہ سکڑتا گیا اور جتنا سکڑتا گیا اتنا ہی اس کی قوت اور زیادہ بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی قوت اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ روشنی بھی اس سے خارج نہیں ہو سکتی تھی۔ اس طرح انتہائی روشن ہونے کے باوجود اب وہ ہماری نظر کے لیے بالکل تاریک ہو گیا ہے۔ کیوں کہ آدمی اپنی موجودہ آنکھوں سے کسی ایسی ہی چیز کو دیکھ سکتا ہے جس کی روشنی اس کی آنکھوں تک پہونچ رہی ہو۔

غیبی چیزوں کا حقیقی علم انسان کو صرف اگلی دنیا میں ہو سکے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں بھی ایسی چیزیں رکھ دی ہیں جو غیبی حقیقتوں کو ہمارے لیے قابل فہم بنا سکیں۔

صحابی کی مثال

اخرج ابو نُعَیم فی الحلیۃ عن ثابت البُنانی قال: خطب یزید بن معاویۃ الی ابی الدرداء رضی اللہ عنہ ابنتہ الدرداء - فردّہ - فقال رجل من جلساء یزید اصلحک اللہ تأذن لی أن اتزوجھا۔ قال اغرب ویلک - قال فاذن لی اصلحک اللہ - قال نعم - قال فخطبھا فانکحھا ابو الدرداء الرجل - قال فسار ذالک فی الناس ان یزید خطب الیٰ ابی الدرداء فردّہ - وخطب الیہ رجل من ضعفاء المسلمین فانکحہ - قال فقال ابو الدرداء، انی نظرت للدرداء، ماظنکم بالدرداء اذا قامت علی رأسھا الخصیان ونظرت فی بیوت یلتمع فیھا بصرھا، این دینھا منھا یومئذٍ

ابونُعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ثابت بُنانی سے نقل کیا ہے کہ یزید بن معاویہ نے ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے یہاں ان کی لڑکی درداء کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت ابو الدرداء نے اس کو رد کردیا اس وقت یزید کے یہاں بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ تمہارا بھلا کرے، تم مجھے اجازت دو کہ میں اس سے نکاح کر لوں۔ یزید نے کہا، دور ہو، تمہارا ناس ہو جائے۔ اس آدمی نے دوبارہ کہا کہ مجھے اجازت دو، اللہ تمہارا بھلا کرے۔ یزید نے کہا بہت اچھا۔ راوی کہتے ہیں کہ اس آدمی نے پیغام دیا تو حضرت ابو الدرداء نے اس سے اپنی لڑکی کا نکاح کر دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا کہ یزید نے ابو الدرداء کو پیغام دیا تو انھوں نے رد کر دیا اور کمزور مسلمانوں میں سے ایک شخص نے پیغام دیا تو انھوں نے اس سے نکاح کر دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابو الدرداء نے یہ سن کر کہا: میں نے اس معاملہ میں درداء کا لحاظ کیا۔ درداء کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے، جب اس کے سرہانے خصی غلام کھڑے ہوتے اور وہ ایسے گھروں کو دیکھتی جس میں اس کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں۔ اس میں اس وقت اس کا دین کہاں رہ جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مومن کو اپنی اولاد کے معاملہ میں کیسا ہونا چاہیے۔ مومن کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ اپنی اولاد کے دین وایمان کی حفاظت کرے۔ وہ ان کے دنیا کے مستقبل سے زیادہ ان کے آخرت کے مستقبل کے لیے فکرمند ہو۔

ایمان

علماء اسلام نے ایمان کی پانچ قسمیں کی ہیں :

الایمان المطبوع وھو ایمان الملائکۃ — نقش کیا ہوا ایمان اور وہ فرشتوں کا ایمان ہے۔

والایمان المعصوم وھو ایمان الانبیاء — معصوم ایمان اور وہ پیغمبروں کا ایمان ہے۔

والایمان المقبول وھو ایمان المومنین — مقبول ایمان اور وہ مومنین کا ایمان ہے۔

والایمان الموقوف وھو ایمان المبتدعین — موقوف کیا ہوا ایمان اور وہ بدعتی لوگوں کا ایمان ہے۔

والایمان المردود وھو ایمان المنافقین — رد کیا ہوا ایمان اور وہ منافقین کا ایمان ہے۔

اس قسم کی فنی تقسیم بہت زیادہ غلط فہمی پیدا کرنے والی ہے۔ بظاہر اس تقسیم میں ہر بات بیان ہوگئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو اصل بات ہے وہی اس میں غیر مذکور یا کم از کم غیر واضح ہے اور وہ ہے عارف کا ایمان۔

ایمان کی اصل قسم وہ ہے جس کو معرفت یا دریافت کہا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ وہ کائنات میں غور کرتا ہے۔ وہ قرآن و سنت کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ اس پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہاں ایک خالق و مالک ہے۔ وہ ذاتی دریافت کے طور پر معلوم کرتا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور محمد بن عبد اللہ خدا کے سچے رسول ہیں۔

یہ ایمان جو کسی آدمی کو بطور دریافت حاصل ہوتا ہے یہ اتنی بڑی حقیقت ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کو کسی خانہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ لامحدود خدا کا مشاہدہ ہے پھر کوئی محدود زبان کیونکر اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ یہ ابدی حقیقت کا انکشاف ہے پھر اس کو وقتی اصطلاحوں میں کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ محسوسات سے ماورا ہستی کا ادراک ہے پھر اس کو محسوسات کے دائرہ میں کیسے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسی چیز جس کا تعلق گہرے معنوی حقائق سے ہو اس کو فنی الفاظ میں بیان کرنا ہمیشہ ایک نقصان کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اس میں وہی بات بیان ہونے سے رہ جاتی ہے جو کہ اصل بات ہے۔ اس میں وہی بات مذکور نہیں ہوتی جس کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہیے۔

الحاد

قرآن میں گمراہی کی جو صورتیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک الحاد ہے۔ الحاد کے معنی
راف یا نشانہ سے ہٹنے کے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں الحد السہم الھدف (تیر نشانہ کے ایک
نب لگا) اسی مناسبت سے بغلی قبر کے لیے لحد یا ملحود کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن میں یہ مادہ چار مقام پر استعمال ہوا ہے۔

۱۔ سورہ اعراف میں ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کو چھوڑو جو اللہ کے نام میں الحاد کرتے ہیں۔
ذروا الذین یلحدون فی اسمائہ۔ ۱۸۰) خدا کے نام میں الحاد کی ایک صورت یہ ہے کہ اس
جسمانی نام دیئے جائیں۔ خدا نے خود اپنے کچھ نام بتائے ہیں۔ مثلاً رحمان، رحیم وغیرہ۔ مگر جن لوگوں پر
نیت کا غلبہ ہو وہ خدا کو محسوس پیکر میں ڈھالنے کے لیے اس کا کوئی جسمانی نام رکھ لیتے ہیں۔

قدیم عرب کے بڑے بڑے بُت اسی اصول پر خدا کے جسمانی نام تھے۔ انھوں نے خدا کے سچے ناموں
ں "انحراف" کرکے کچھ نئے نام بنالیے اور خود ساختہ بتوں کو یہ نام دے کر کہا کہ یہ بُت خدا سے الگ
یں ہیں بلکہ اس کا محسوس اظہار ہیں:

ی اترکوا الذین یمیلون فی اسمائہ عن الحق کما فعل المشرکون حیث شتقوا لآلھتھم اسماء منھا کاللات من للہ والعزیٰ من العزیز ومناۃ من لمنان (صفوۃ التفاسیر)

یعنی ان لوگوں کو چھوڑو جو اللہ کے ناموں میں حق سے انحراف کرتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کے مشرکوں نے کیا۔ انھوں نے خدا کے ناموں سے اپنے بتوں کے نام نکالے۔ مثلاً لات اللہ سے اور عزیٰ عزیز سے اور منات منّان سے۔

۲۔ سورہ نحل میں الحاد کا لفظ ان لوگوں کے ذیل میں آیا ہے جو یہ کہتے تھے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں
ہے بلکہ محمدؐ نے بعض عجمی غلاموں سے سیکھ کر اس کو تصنیف کر لیا ہے (انھم یقولون انما یعلمہ
بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین۔ ۱۰۳) یعنی وہ بات کو
صحیح اور سچے رُخ سے موڑ کر غلط رُخ پر لے جا رہے ہیں۔ جس کلام کو خدا کی طرف منسوب کرنا چاہیے اس کو
انسان کی طرف منسوب کرتے ہیں (والمعنی یمیلون قولھم عن الصدق والاستقامۃ

الیہ ، التفسیر المظہری)
۳۔ سورہ حم السجدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں (ان الذین یلحدون فی آیاتنا لایخفون علینا۔ ۴۰) اس سے مراد قرآنی آیتوں کی تاویل میں انحراف ہے۔ یعنی وہ آیات کو حق سے موڑ دیتے ہیں۔ اور دلیلوں کو غلط رُخ دے کر طعن و تشنیع کرتے ہیں (یمیلون عن الحق فی ادلتنا بالطعن ، تفسیر النسفی)

۴۔ سورہ حج میں کہا گیا ہے کہ جو شخص شرارت کی وجہ سے مسجد حرام میں ٹیڑھی راہ نکالے گا اس کو ہم سخت سزا دیں گے (ومن یرد فیہ بالحاد بظلم نذقہ من عذاب الیم۔ ۲۵) یعنی جو شخص مسجد حرام میں کوئی برائی چاہے گا یا سیدھے طریقہ سے انحراف کرے گا یا کسی معصیت کا قصد کرے گا تو اس کو ہم شدید قسم کا عذاب دیں گے (ای ومن یرد فیہ سوءاً او میلاً عن القصد او یہم بمعصیۃ نذقہ اشد انواع العذاب ، صفوۃ التفاسیر)

الحاد ، قرآن کے مطابق ، یہ ہے کہ آدمی بظاہر دین کا لفظ بولے مگر غلط تاویل سے اس کے رُخ کو بے رخ کر دے۔ اس کو خدا اور رسول کے مطلوب مفہوم میں لینے کے بجائے کسی خود ساختہ مفہوم میں لینے لگے۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ ذاتی حکم کو اجتماعی حکم بنا دے۔ ایک حکم جس کا رُخ آدمی کی اپنی طرف ہو ، اس کو پھیر کر وہ دوسروں کی طرف کر دے۔ مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے : وربک فکبّر وثیابک فطہّر (اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے اخلاق کو پاک کر) اب آدمی اگر یہ کرے کر وثیابک فطہّر کو وثیاب غیرک فطہّر کے معنی میں لے لے اور دوسروں کے اوپر اخلاقی داروغہ بن کر کھڑا ہو جائے تو یہ مذکورہ آیت میں الحاد کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

اسی طرح " اللہ بڑا ہے " بلاشبہ اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ مگر وہ اس وقت گمراہی بن جاتی ہے جب کہ آدمی اس میں الحاد کر کے اس کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ وہ اس کا حوالہ دے کر اپنے سیاسی حریفوں کو گرانے اور اکھاڑنے میں لگ جائے۔ " اللہ بڑا ہے اس لیے میں بڑا نہیں ہوں " کہنا قرآن کی تعلیم کو صحیح رُخ سے لینا ہے۔ " اللہ بڑا ہے اس لیے تم بڑے نہیں ہو " کا نعرہ لگانا قرآن کی تعلیم کو غلط رُخ سے لینا ہے۔

حدیثِ دعا

الدعاء ھو العبادۃ (احمد) — دعا ہی عبادت ہے۔

الدعاء مخ العبادۃ (ترمذی) — دعا عبادت کا مغز ہے۔

من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (ترمذی) — جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے

لا یرد القضاء الا الدعاء (ترمذی) — قضا کو صرف دعا ہی ٹال سکتی ہے۔

ما من احد یدعوا بدعاء الا آتاہ اللہ ما سأل اوکف عنہ من السوء مثلہ ما لم یدع باثم او قطیعۃ رحم (ترمذی) — کوئی شخص جب اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ یا تو اس کو وہ چیز دے دیتا ہے جو اس نے مانگی تھی یا اس کے برابر کوئی بلا اس سے روک دیتا ہے، جب تک کہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔

لیس شئ اکرم علی اللہ من الدعاء (ابن ماجہ) — اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں

سلوا اللہ من فضلہ فان اللہ یحب ان یسأل (ترمذی) — اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ کیوں کہ اللہ پسند کرتا ہے کہ اس سے مانگا جائے۔

ان الدعاء ینفع مما نزل ومما لم ینزل فعلیکم عباد اللہ بالدعاء (احمد) — دعا ان چیزوں کے لیے بھی مفید ہے جو اُتر چکی ہیں اور ان چیزوں میں بھی جو ابھی نہیں اُتریں۔ تو اے اللہ کے بندو، تم ضرور دعا مانگو۔

لیسأل احدکم ربہ حاجتہ کلہ حتی یسأل شسع نعلہ اذا انقطع (ترمذی) — تم میں سے ہر ایک کو اپنے رب سے اپنی تمام حاجت مانگنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی وہ خدا سے مانگے۔

دعا کرنے والا اپنے آپ کو عاجزِ مطلق کے مقام پر رکھتا ہے اور خدا کو قادرِ مطلق کے مقام پر۔ یہ ایک طرف اپنی حیثیتِ واقعی کا اقرار ہے اور دوسری طرف خدا کی حیثیتِ واقعی کا اعتراف۔ یہ حقیقت پسندی کی آخری شکل ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔ حقیقتِ واقعہ کے اعتراف سے بڑا کوئی عمل اس امتحان کی دنیا میں نہیں۔

علم

العلماء ورثة الانبیاء (حدیث)

علماء پیغمبروں کے وارث ہیں۔

اللّٰھم ارحم خلفائی۔ قلنا من خلفاؤک یارسول اللّٰہ۔ قال الذین یحفظون سنتی ویعلمونھا للناس (حدیث)

اے اللہ، میرے خلفاء پر رحم کر۔ صحابہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کون لوگ آپ کے خلفاء ہیں۔ آپ نے کہا کہ وہ لوگ جو میری سنت کی حفاظت کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

لیس شئی اعز من العلم۔ الملوک حکام علی الناس والعلماء حکام علی الملوک (ابوالاسود)

علم سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں۔ بادشاہ عوام پر حکومت کرتے ہیں اور علم والے لوگ بادشاہوں پر حکومت کرتے ہیں۔

عن عون بن عبداللّٰہ قال قلت لعمر بن عبدالعزیز یقال، ان استطعت ان تکون عالماً فکن۔ فان لم تستطع فکن متعلماً۔ فان لم تکن متعلماً۔ فاحبھم۔ فان لم تحبھم فلا تبغضھم۔ فقال عمر سبحان اللّٰہ لقد جعل اللّٰہ لہ مخرجاً

عون بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم عالم بن سکتے ہو تو بنو۔ اگر عالم نہیں بن سکتے تو طالب علم بنو۔ اگر تم طالب علم نہیں بن سکتے تو ان سے محبت کرو۔ اگر تم ان سے محبت نہیں کر سکتے تو ان سے بغض نہ رکھو۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ سن کر کہا سبحان اللہ۔ اس کو خدا نے راستہ دیدیا۔

علامہ شاطبی نے لکھا ہے ——— مستحب، مندوب، فرض، اور مکروہ اور حرام کی جو تقسیمیں ہیں، تقرب الی اللہ اور تزکیۂ نفس کے سلسلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیوں کہ اصل مقصود تزکیۂ نفس ہے۔ جو چیز تزکیۂ نفس میں مدد دے وہی اہم ہے، چاہے وہ مستحب ہو یا فرض۔ اور جو برائی کی طرف لے جائے وہ ممنوع ہے، خواہ وہ مکروہ ہو یا حرام۔

شاطبی، الموافقات، التجاریۃ الکبریٰ، القاہرہ، جلد ۳ صفحہ ۲۴۱

افضل العلم الورع والتفکر (حسن بصری) افضل علم پرہیزگاری اور غور و فکر ہے۔

کمپیوٹر

۳ جون ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے ۔ امریکہ کے خلائی دفاعی کمانڈ NORAD کے اعلیٰ ترین کمپیوٹر نے تیزی سے یہ خبر دی کہ روس نے امریکہ پر حملہ کر دیا ہے ۔ پہلے اس نے بتایا کہ روس کے دو تحت بحری زائل (Submarine missiles) امریکہ کی طرف آرہے ہیں ۔ پھر اس نے بتایا کہ مزید کئی تحت ری میزائل روس سے امریکہ کے نشانہ پر چل پڑے ہیں ۔ حتیٰ کہ اس نے بتایا کہ روس کی طرف سے ایک مل آئی سی بی ایم حملہ کا آغاز ہو گیا ہے ۔

A full scale Soviet ICBM launch had begun

اس خبر کے ملتے ہی امریکہ کے بہترین جنگی ہوابازوں نے (B-52 jets) کو سنبھال لیا ۔ قریب تھا امریکہ کی طرف سے اس کے خلاف مکمل جوابی حملہ شروع ہو جائے ۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کمپیوٹر میں پروگرامنگ کی غلطی تھی ۔

(گارجین (مانچسٹر) ۷ جولائی ۱۹۸۵)

ں قصہ کی تفصیل درج کرتے ہوئے گارجین کے مضمون نگار نے لکھا ہے :

Just one small programming error could
start world war three.

پیوٹر کے پروگرامنگ میں چھوٹی سی غلطی تیسری عالمی جنگ چھیڑ سکتی تھی ۔

کمپیوٹر کے بارہ میں اس طرح کے لطیفے اکثر اخبارات میں آتے رہتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص نصیحت نا چاہے تو اس کو ان واقعات میں بہت بڑا سبق ملے گا ۔

موجودہ زمانہ کے ملحدین نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کائنات ایک عظیم مشین ہے ۔ یہ الفاظ گرامر کے تبار سے صحیح ہیں مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے سراسر بے معنی ہیں ۔ کائنات اگر صرف ایک مشین ، تو اس میں ہر روز اسی قسم کے حادثات پیش آنے چاہئیں جو کمپیوٹر کے نظام میں پیش آتے ہیں ئنات کا اس قسم کے حادثات سے خالی ہونا بتاتا ہے کہ وہ عظیم ذہن کی کارفرمائی ہے نہ کہ محض بے روح مشین کی کارفرمائی ۔

دو تصویریں

کہا جاتا ہے کہ شیخ بایزید بسطامی کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جب شیخ بایزید بسطامی کا انتقال ہو گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم اسلام کیوں نہیں قبول کر لیتے۔ یہودی نے کہا۔ میں اسلام کیسے قبول کروں۔ اگر اسلام وہ مذہب ہے جو شیخ بایزید بسطامی کا مذہب تھا تو وہ میرے بس میں نہیں اور اگر اسلام وہ مذہب ہے جو میں عام مسلمانوں میں دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے اسلام سے شرم آتی ہے۔

ایک غیر مسلم شیخ بسطامی جیسے بزرگوں میں جو مذہب دیکھتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی دنیا سے کٹ کر گوشہ میں معتکف ہو جائے۔ وہ مغرب کے وضو سے فجر کی نماز پڑھے۔ وہ روزانہ کئی کئی بار قرآن ختم کرے۔ وہ سال بھر روزے رکھے۔ وہ حج کرنے جائے تو ہر قدم پر دو رکعت نفل پڑھے۔ وہ ذکر کے کچھ الفاظ یاد کر کے روزانہ کئی کئی لاکھ بار اس کا ورد کرے، وغیرہ

دوسری طرف عوام کے اندر جو اسلام ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اسلام کا نام لے اور عملاً اپنی مرضی پر چلے۔ وہ خدا کے سامنے سجدہ کرے اور انسان کے سامنے اکڑ دکھائے۔ وہ قرآن کو بطور تلاوت پڑھے اور اپنی زندگی کو اس کے احکام سے آزاد رکھے۔ وہ اسلام کے دینِ کامل ہونے پر فخر کرے مگر اپنی حقیقی زندگی میں جزئی اسلام پر بھی قائم نہ ہو۔ وہ کریڈٹ ملنے والے مقامات پر اسلام کا جھنڈا اٹھائے اور جہاں بظاہر کریڈٹ نہ مل رہا ہو وہاں اسلام سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ قومی دین کو اپنا دین بنائے اور اس کے اوپر خدا کے دین کا لیبل لگا دے۔

اسلام ایک سادہ اور فطری دین ہے۔ وہ انسانی فطرت کے لیے اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ اپنی اسی فطری کشش کی وجہ سے دورِ اول میں اسلام زمین کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں اسلام کی خود ساختہ شکلیں بن گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے لوگوں کی نظر میں اپنی کشش کھو دی۔ اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ باعتبارِ حقیقت وہ آج بھی اپنے اندر مکمل کشش رکھتا ہے۔ اگر اسلام کی حقیقی تصویر سے تمام مصنوعی پردے ہٹا دیئے جائیں تو اسلام اپنے آپ ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔

مانع جرم

ایک مفکر کا قول ہے :

It is not the severity of punishment that acts as a deterrent. It is its inevitability.

ی سزا کی سختی آدمی کو جرم سے نہیں روکتی۔ یہ سزا کی ناگزیریت ہے جو مانع جرم کا کام کرتی ہے۔

یہ قول بہت بامعنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس قدر سرکش ہے کہ صرف سزا کا امکان ں کے لیے اتنا طاقتور محرک نہیں کہ وہ اس کو جرم سے روک دے۔ آدمی جرم سے صرف اس وقت لتا ہے جب کہ اس کو یقین ہو کہ اگر اس نے جرم کیا تو وہ کسی حال میں اس کے انجام سے بچ نہیں سکے گا۔

مثال کے طور پر ایک شخص جنگل میں بے ہتھیار چلا جا رہا ہے۔ اتنے میں وہ دیکھتا ہے کہ قریب ں جھاڑی میں ایک زندہ شیر موجود ہے۔ ایسے موقع پر وہ سانس روک لے گا اور نہایت آہستگی کے اتھ آگے بڑھ جائے گا۔ کوئی بھی بے ہتھیار آدمی جنگل کے کھلے ہوئے شیر کو نہیں چھیڑتا۔ مگر یہی انسان ب انسانی بستی میں آتا ہے تو وہ دوسرے انسانوں کو چھیڑتا ہے۔

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو یقین ہے کہ اگر اس نے جنگل کے شیر کو ھیڑا تو اس کے برے انجام سے وہ بچ نہیں سکتا۔ اس کے برعکس اپنے جیسے انسان کو چھیڑنے میں ، اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہاں اس کو بھروسہ ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی تدبیر سے وہ اپنے آپ کو اس کے نجام سے بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

انسان کی یہ نفسیات بتاتی ہے کہ انسان کو جرم سے باز رکھنے کی صرف ایک ہی ممکن تدبیر ہے۔ ‌ہ یہ کہ اس کے اندر اس حقیقت واقعہ کا یقین پیدا کیا جائے کہ اس کے اوپر ایک خدا ہے جو ہر ن اس کو دیکھ رہا ہے۔ آدمی کسی حال میں اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ انسانی قانون میں یہ اگزیریت نہیں، اس لیے انسانی قانون پوری طرح مانع جرم نہیں بنتا۔ مگر خدائی قانون میں اگزیریت ہے۔ اس لیے صرف اسی کے اندر یہ طاقت ہے کہ وہ آدمی کو جرم سے باز رکھے۔

ناگزیر برائی

مسٹر ڈی کے داس دہلی کے اعلیٰ ترین سرکاری افسران (Seniormost IAS officers) میں سے ایک تھے۔ دہلی کی ایک پوش کالونی "مدھوبن" میں ان کا بہت بڑا مکان تھا۔ مگر ۳ اگست ۱۹۸۵ کو انھوں نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ ان کی اہلیہ مسز ہینا داس ایک بجے دن میں ان کے کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کا مردہ جسم چھت کے پنکھے سے بندھا ہوا لٹکا تھا۔ موت کے وقت مسٹر داس کی عمر ۵۶ سال تھی۔ وہ حال میں دہلی ٹورزم ڈولپمنٹ کارپوریشن کے چیرمین مقرر ہوئے تھے اور آئی اے ایس کے اسکیل کا آخری مشاہرہ پا رہے تھے۔ اس کے باوجود مسٹر داس نے کیوں خودکشی کر لی۔ اس سلسلہ میں ہم دو اخباروں کی رپورٹ سے چند جملے یہاں نقل کرتے ہیں۔ پہلا اقتباس ہندستان ٹائمس ۴ اگست کا ہے اور دوسرا ٹائمس آف انڈیا ۴ اگست کا ہے:

> A businessman friend of Mr Das said the deceased bureaucrat was dissatisfied with many of the postings he got. He said that Mr Das often used to say that he was always given insignificant and ordinary positions.
>
> He was also depressed because he felt that he was not being given his due in the Delhi administration.

مسٹر داس کے ایک تاجر دوست نے کہا کہ آنجہانی افسر اپنی کئی تقرری پر مطمئن نہ تھے۔ مسٹر داس اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کو ہمیشہ غیر اہم اور معمولی پوزیشن دی جاتی ہے۔ وہ غیر مطمئن بھی تھے کیوں کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن میں ان کو ان کی واجبی جگہ نہیں دی گئی ہے۔

اس دنیا میں کوئی شخص اقلیتی فرقہ کا ہو یا اکثریتی فرقہ کا، معمولی ملازم ہو یا اعلیٰ عہدیدار، ہر حال میں اس کو کہیں نہ کہیں امتیازی برتاؤ کا تجربہ ہوتا ہے۔ امتیاز اس دنیا کی ناگزیر برائی ہے۔ اس دنیا میں کوئی شخص اس احساس سے بچ نہیں سکتا کہ اس کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ ایسی حالت میں عقلمندی یہ ہے کہ اس صورت حال کو گوارا کیا جائے۔ کیوں کہ اس کو گوارا نہ کرنا آدمی کو یا تو مایوسی کی طرف لے جاتا ہے یا خودکشی کی طرف۔

حکمتِ اسلام

حافظ ابوخیثمہ زہیر بن حرب النسائی (۲۳۴ - ۱۶۰ھ) نے اپنی "کتاب العلم" میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن ابی عبد الرحمٰن ان علیاً علیہ السلام مر بقاصٍ فقال: اتعرف الناسخ من المنسوخ۔ قال لا۔ قال هلكتَ و اهلكتَ (صفحہ ۳۱)

حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب السلمی تابعی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو لوگوں کو جمع کرکے تقریر کررہا تھا۔ انھوں نے اس سے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ منسوخ کیا ہے اور ناسخ کیا۔ مقرر نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا تم خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ناسخ اور منسوخ کا لفظ یہاں اس محدود مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے جو موجودہ زمانہ میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس سے وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے جو کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم ہے۔ اس وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے داعی اور مصلح کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ ناسخ اور منسوخ کے معاملہ کو جانے۔ جو شخص ناسخ اور منسوخ کے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ نہ جانے وہ مصلح نہیں مفسد ہے۔ وہ اگر دعوت و اصلاح کے لیے اٹھتا ہے تو یقینی طور پر وہ خود بھی ہلاک ہوگا اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے کا ذریعہ بنے گا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ناسخ اور منسوخ کا تعلق چند مخصوص احکام سے ہے اور وہ ابدی ہے۔ مثلاً ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد سورہ بقرہ (رکوع ۱۷) کی آیات اتریں اور پچھلا حکم منسوخ ہوگیا اور کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ نسخ کے جو احکام ہیں وہ ابدی ہیں جو چیز منسوخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہے۔ اور جو چیز ناسخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے ناسخ ہے۔

مگر یہ خیال درست نہیں۔ ناسخ اور منسوخ کا معاملہ نہ تو چند خاص احکام سے متعلق ہے اور نہ وہ

غیر مبدل ہے ۔ ناسخ اور منسوخ ایک مستقل شرعی اصول ہے ۔ اس کا تعلق اس اہم چیز سے ہے جس کو عملی حکمت (Practical wisdom) کہا جاتا ہے ۔ اور وہ پورے دین سے متعلق ہے نہ کہ محض چند احکام سے متعلق ۔ اس اصول کے تحت کبھی ایک حکم میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ۔ جیسا کہ شراب کے معاملہ میں کیا گیا ۔ چنانچہ شراب کو تین مرحلہ میں حرام قرار دیا گیا ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حالات کی رعایت سے ایک طرح کا حکم مطلوب ہوتا ہے اور کبھی بدلے ہوئے حالات کے اعتبار سے دوسرا حکم مطلوب ہو جاتا ہے ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ داعی کو یہ فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے تقاضوں کو وقت کے عملی حالات پر منطبق کرے ۔ وہ لوگوں کو عین تقاضائے وقت کے مطابق صحیح دینی مشورہ دے ، اب جو شخص ناسخ اور منسوخ ، بالفاظ دیگر دین کی عملی حکمتوں اور مصلحتوں کو جانے گا وہی شخص لوگوں کو صحیح رہنمائی دے سکتا ہے ۔ جو شخص دین کے حکیمانہ پہلو کو نہ جانے وہ دین کے نام پر بے دینی کی بات کرے گا ۔ وہ لوگوں کو غلط راہوں میں دوڑانا شروع کر دے گا ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی حکمتِ اسلام کا نہایت عظیم اور کامل نمونہ ہے ۔ آپ نے مکہ میں صبر کے اصول پر عمل کیا اور مدینہ میں دفاع اور قتال کے اصول پر ۔ یہ بھی نسخ ہی کا ایک معاملہ تھا ۔ یعنی مکہ کے حالات کے تحت وہاں آپ کے لیے صبر کا حکم تھا ۔ ہجرت کے بعد مدینہ کے حالات کے تحت صبر کا حکم منسوخ ہو گیا اور دفاع اور قتال کا حکم دے دیا گیا ۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ صبر کا اصول ہمیشہ کے لیے متروک اور منسوخ ہو گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک اصولی حکم کے طور پر بدستور باقی ہے اور جب بھی اور جہاں بھی مکہ جیسے حالات پائے جائیں گے صبر کا حکم وہاں دوبارہ اسی طرح مطلوب ہو جائے گا جس طرح وہ ابتدائی مکی دور میں مطلوب تھا ۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوہ اُحد میں مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا اور غزوۂ خندق میں مدینہ میں رہ کر مقابلہ فرمایا ۔ بدر کے موقع پر آپ نے اپنے دشمنوں سے جنگ کی اور حدیبیہ کے موقع پر انھیں دشمنوں سے یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی ۔ غزوۂ حمراء الاسد میں آپ نے اعلان و اظہار کے ساتھ سفر کیا اور فتح مکہ کے موقع پر کامل خاموشی کے ساتھ سفر کیا گیا ۔ حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ایک انسانی گروہ کو دوسرے انسانی گروہ پر کوئی فضیلت نہیں ۔ مگر اپنے بعد خلافت

کے لیے آپ نے ہدایت فرمائی کہ امیر المومنین صرف قبیلۂ قریش میں سے بنایا جائے۔ ایک قسم کے باغیوں کے لیے قرآن میں آپ کو حکم دیا گیا کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اطاعت قبول کرلیں (تقاتلونہم او یسلمون) دوسری طرف آپ کی ہدایت کے مطابق خلیفہ سوم حضرت عثمان نے اپنے باغیوں کے خلاف ہاتھ نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ بلا مقابلہ شہید ہوگئے۔ ایک طرف آپ نے فرمایا کہ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔ دوسری طرف آپ نے اپنے صحابہ کو شدت سے یہ تلقین کی کہ میرے بعد تمہارے اوپر ظالم حکمراں ہوں گے مگر تم ان کے خلاف جنگ نہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ

جو شخص دعوت و اصلاح کے کام کے لیے اٹھے اس کو ناسخ اور منسوخ کے اس شرعی حکم سے باخبر ہونا چاہیے۔ اس کو اس حکمت بالغہ کو اچھی طرح جاننا چاہیے جس کے تحت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک طرح کے حالات میں ایک طریقہ اختیار فرمایا، اور دوسری طرح کے حالات میں اس کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ پر عمل کیا۔

جو شخص اس راز سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود وہ خطیب اور قائد بن کر کھڑا ہو جائے وہ اصلاح کے نام پر صرف بگاڑ پیدا کرے گا۔ مثلاً وہ لوگوں کو ایک مسلم حکمراں سے ٹکراؤ پر ابھارے گا۔ جب کہ اسلام کا حقیقی تقاضا اس وقت یہ ہوگا کہ سیاسی ٹکراؤ سے الگ رہ کر کام کیا جائے۔ وہ ایک مسلم گروہ کو یہ مشورہ دے گا کہ وہ اپنی حریف قوم کو نقصان پہونچا کر اس سے اپنے لیے زندگی کا حق وصول کریں جب کہ اسلامی حکمت اس وقت یہ چاہتی ہوگی کہ حریف قوم کے لیے نفع بخش بن کر اس کے درمیان اپنے لیے عزت کی جگہ حاصل کی جائے۔

ایسا شخص مسلم نوجوانوں کو پرجوش طور پر تلقین کرے گا کہ تم خالد سیف اللہ بنو جب کہ حالات پکار رہے ہوں گے کہ مسلم نوجوانوں کو داعی الی اللہ بننے پر ابھارا جائے۔ وہ مسلمانوں کو اسلام پر فخر کرنا سکھائے گا جب کہ باعتبار واقعہ اصل ضرورت یہ ہوگی کہ مسلمانوں کے اندر تواضع والا اسلام پیدا کیا جائے۔ وہ اقدام و اظہار کی بات کرے گا جب کہ حالات کا تقاضا ہوگا کہ مسلمانوں سے وہ بات کہی جائے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں مطالبۂ اظہار پر حضرت عمر فاروق سے فرمائی تھی: یا عمر انا قلیل (اے عمر، ہم تھوڑے ہیں)

ایسے لوگ صبر کے حالات میں ٹکراؤ کی سیاست چلائیں گے۔ جہاں چپ رہنا چاہیے وہاں

وہ بولنے کاکمال دکھائیں گے۔ جس موقع کے لیے خدا کا حکم ہوگا کہ خود اپنا احتساب کرو وہاں وہ احتساب اقوام اور احتساب کائنات کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں ———— خود بھی ہلاک ہوئے اور انھوں نے دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین تقریباً سب کے سب حضرت علیؓ کے اس قول کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ وہ "ناسخ اور منسوخ" کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ چنانچہ جہاں ناسخ پر عمل کرنا تھا وہاں انھوں نے منسوخ پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ایسے ایسے اقدامات کیے جو غیر حکیمانہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے صرف بربادی کا سبب بنے۔

۱۸۵۷ میں علماء ہند کا انگریزوں سے جنگ کرنا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ علماء کے اس فیصلہ کے مطابق ہزاروں مجاہدین تھانہ بھون (سہارن پور) میں جمع ہو گئے، اور انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد کی باتیں ہونے لگیں۔ اس وقت صرف ایک عالم (مولانا شیخ محمد صاحب) اس مہم کے مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے:

"قصبہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ اس بنا پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے۔ بدقسمتی سے مولانا کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوایا۔ جب ہر دو حضرات پہونچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔"

(نقش حیات، جلد دوم ۱۹۵۴، صفحہ ۱۴)

مولانا شیخ محمد صاحب کی رائے نہایت درست تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ کے مقابلہ کو بدر کے مقابلہ پر قیاس کرنا بالکل صحیح نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں اور ان کے مخالفین کے درمیان جو فرق تھا وہ باعتبار کمیت (Quantity) تھا۔ جب کہ ۱۸۵۷ کی جنگ کے موقع پر مسلمانوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان فرق باعتبار کیفیت (Quality) پایا جارہا تھا۔ یعنی بدر کے موقع پر تلوار کا مقابلہ تلوار سے تھا۔ جب کہ ۱۸۵۷ کے موقع پر تلوار کا مقابلہ بندوق (بالفاظ دیگر دستی ہتھیار کا مقابلہ دور مار ہتھیار) سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کے مقابلہ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور ۱۸۵۷ میں مخلص اور متقی مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھیں شکست ہوئی۔

اس معاملہ کو مزید سمجھنے کے لیے غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کا مطالعہ کیجئے۔ فتح مکہ کے فوراً بعد یہ دونوں غزوات پیش آئے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ دونوں غزوات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو الگ الگ طریقہ اختیار فرمائے۔ حنین کے موقع پر آپ نے مخالفین سے باقاعدہ جنگ کی۔ اس کے برعکس طائف کے موقع پر صورت حال کا اندازہ کرنے کے بعد آپ لڑائی کیے بغیر واپس چلے آئے۔

قریش کے بعد عرب میں دو بڑے قبیلے، ہوازن اور ثقیف تھے۔ وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ فتح مکہ کے بعد ان قبائل نے اطاعت قبول نہیں کی بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا منصوبہ بنایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ مکہ سے چل کر حنین پہونچے۔ یہاں قبیلہ ہوازن کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ کھلے میدان میں تھا۔ اس مقابلہ میں آخر کار مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

اس کے فوراً بعد آپ نے قبیلہ ثقیف پر چڑھائی کی مگر یہاں صورت یہ تھی کہ قبیلہ ثقیف طائف میں رہتا تھا۔ جو مکمل طور پر حصار میں تھا۔ شہر طائف کے چاروں طرف پتھر کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے براہ راست مقابلہ میں یہ دیواریں حائل ہوگئیں۔ قبیلہ ثقیف کے لوگ دیواروں کے اوپر مورچہ سنبھالے ہوئے تھے اور مسلمان دیوار کے نیچے میدان میں تھے۔ ثقیف والوں نے مسلمانوں پر تیر برسائے مسلمان اس کے باوجود دیوار تک پہونچ گئے۔ تو انھوں نے اوپر سے گرم کیا ہوا لوہا گرانا شروع کیا اس کی وجہ سے بہت سے مسلمان شہید ہوگئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلم فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

قبیلہ ہوازن سے مسلمانوں کا مقابلہ برابری کا مقابلہ تھا۔ اس لیے وہاں پورا مقابلہ کیا گیا۔ اس

کے برعکس قبیلہ ثقیف سے مقابلہ کے وقت دونوں فریق برابر کی حیثیت میں نہیں تھے۔ ایک فریق زمین پر تھا اور دوسرا فریق قلعہ کی دیواروں پر۔ ایک فریق کے لیے کارروائی کرنے کے راستے بند تھے اور دوسرا فریق اپنی کارروائی کرنے کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر قبیلہ ہوازن سے مقابلہ کیا گیا اور قبیلہ ثقیف سے مقابلہ نہیں کیا گیا۔ ایک قبیلہ کے مقابلہ میں جو چیز "ناسخ" کی حیثیت رکھتی تھی وہ دوسرے قبیلہ کے معاملہ میں "منسوخ" قرار پائی۔

قرآن میں فکر وعمل کا جو معیار بتایا گیا ہے وہ بلاشبہ مستقل ہے۔ مگر عملی تقاضے ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے شخصی مزاج اور اجتماعی احوال میں فرق کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اسی کے لحاظ سے شریعت کے انطباق میں بھی فرق کیا جائے۔ یہ فرق ابدی نہیں ہوتا بلکہ حالات کی بنا پر صرف وقتی ہوتا ہے۔ دین میں اگر یہ حکمت موجود نہ ہو تو وہ ابدی دین نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی دعوتی مہم کو نتیجہ خیز طور پر موجودہ اسباب کی دنیا میں چلایا جا سکتا ہے۔

مثلاً قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف دونوں کے معاملہ میں یکساں طور پر یہ مطلوب تھا کہ انھیں اسلام کے ماتحت لایا جائے۔ مگر انھیں اسلام کے تحت لانے کے لیے آپ نے دو الگ الگ طریقے اختیار فرمائے۔ ہوازن کے معاملہ میں اگر جنگ مطلوب تھی تو ثقیف کے معاملہ میں جنگ منسوخ قرار پائی۔ اسی طرح ثقیف کے معاملہ میں اگر غیر جنگی طریقہ کار مطلوب تھا تو ہوازن کے معاملہ میں وہ متروک قرار دیدیا گیا۔

ڈاکٹر رین ہولڈ (Dr. Reinhold Niebuhr). نے اپنی ایک پسندیدہ دعا لکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: خدا مجھے وہ متانت دے کہ میں ان چیزوں کو قبول کر سکوں جن کو میں بدل نہیں سکتا۔ وہ مجھے حوصلہ دے کہ میں ان چیزوں کو بدلوں جن کو میں بدل سکتا ہوں۔ اور خدا مجھے وہ عقل دے کہ میں فرق کو جان سکوں:

God grant me the serenity
To accept the things I cannot change;
The courage to change the things I can;
And the wisdom to know the difference.

ڈاکٹر رین ہولڈ نے اسی بات کو فطرت کی زبان میں کہا ہے جس کو حضرت علیؓ نے شریعت کی زبان میں فرمایا۔ اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی دانش مندی یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ اسی "فرق" کو جاننے میں تمام اجتماعی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

نسخ کی حقیقت

ہندستان ٹائمس (۱۴ اکتوبر ۱۹۸۵) میں صفحہ ۹ پر مسٹر اندرسین شرما کا ایک خط چھپا ہے۔ وہ مسلم نقطۂ نظر کے بارہ میں ایک مطبوعہ خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

> Syed Shahabuddin's letter is misleading. He says that an injunction in the Quran is unchangeable and could not be changed by the Holy Prophet. This is far from truth as many revelations (Ayat) were cancelled and replaced in the changed circumstances.

سید شہاب الدین کا خط غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا ایک حکم ناقابل تغیر ہے اور خود پیغمبر اسلام بھی اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ کیوں کہ قرآن کی بہت سی آیتیں بعد کو منسوخ کر دی گئیں اور بدلے ہوئے حالات میں دوسری آیتیں ان کی جگہ پر لائی گئیں۔

قرآن کی آیتوں میں نسخ کی یہ تشریح صحیح نہیں۔ نسخ کا مطلب کینسل کرنا نہیں ہے۔ یہ تدریج (Gradation) کی ایک صورت ہے۔ یہ دراصل حکمتِ اصلاح ہے نہ کہ کسی حکم کو مستقل طور پر کینسل کر دینا۔

قرآن کا طریقہ تدریجی اصلاح کا طریقہ ہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن جب کسی برائی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اس کے بارہ میں ایک ابتدائی حکم دیتا ہے۔ اس ابتدائی حکم کا مقصد ذہن تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد جزئی عمل کا حکم آتا ہے جو گویا قرآن کا درمیانی حکم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس معاملہ کی آخری آیت اترتی ہے اور پورے عمل کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

اس تدریجی قانون سازی کی ایک مثال شراب ہے۔ قرآن میں ابتداءً جب شراب کے بارہ میں حکم آیا تو صرف اتنا کہا گیا کہ شراب کا گناہ اس کے فائدہ سے زیادہ ہے (البقرہ ۲۱۹) اس کے عرصہ بعد دوسرا حکم ان الفاظ میں آیا کہ جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے لیے مسجد میں نہ آؤ (النساء ۴۳) اس کے ایک عرصہ بعد قرآن کا آخری حکم آیا اور یہ کہا گیا کہ شراب ایک شیطانی فعل ہے، اس لیے تم اس سے مکمل پرہیز کرو (المائدہ ۹۰)

قرآن میں نسخ کی یہ ایک بہت واضح مثال ہے۔ مگر یہ پورا معاملہ حکمتِ تدریج سے تعلق رکھتا

ہے، نہ یہ کہ آخری حکم کے سوا بقیہ تمام آیتیں ہمیشہ کے لیے منسوخ ہوگئیں۔ شراب کے بارہ میں قرآن کا معیاری حکم یہی ہے کہ وہ مکمل طور پر حرام ہے۔ مگر جب کسی سماج میں اس حکم کو نافذ کرنا ہو تو دوبارہ سماج کی حالت دیکھی جائے گی اور حکم کے نفاذ میں دوبارہ اس تدریج کو ملحوظ رکھا جائے گا جو ابتداءً شارع نے اختیار فرمایا تھا۔

نفاذ شریعت

قرآن کتاب ہدایت بھی ہے اور کتاب دعوت بھی۔ ہدایت ہونے کے اعتبار سے قرآن میں وہ سب باتیں اپنی کامل صورت میں درج ہیں جو انسان کی حقیقی صلاح و فلاح کے لیے ضروری ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن نے کسی چیز کو ادھورا نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ ہر چیز کو کامل طور پر بیان کر دیا ہے۔

مگر دعوت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیوں کہ دعوت میں مدعو کے حالات کی رعایت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ یہی دوسرا پہلو ہے جس نے قرآن میں "نسخ" کا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ بیانِ ہدایت کے پہلو سے قرآن معیار اعلیٰ کو سامنے رکھتا ہے۔ مگر دعوت و اصلاح کے پہلو سے اس میں یہ ابدی رہنمائی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ لوگوں کے مزاج کی رعایت سے کس طرح تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا جائے اور حالات کے فرق سے کس طرح احکام کے نفاذ میں فرق کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں یہ مہم چل رہی ہے کہ شریعت کے قوانین کو حکومت کی طاقت سے جاری و نافذ کیا جائے۔ مگر اس قسم کی تمام کوششیں اب تک سراسر بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یہ تمام تحریکیں "نسخ" کی حکمت کو ملحوظ رکھے بغیر چلائی جا رہی ہیں۔

اسلامی قانون کو نافذ کرنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے حق میں ذہنی فضا تیار کی جائے۔ جب معاشرہ کی قابل لحاظ تعداد ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو جائے تو قانون کو جزئی طور پر نافذ کیا جائے۔ پھر جیسے جیسے استعداد میں اضافہ ہو قانون کے مزید اجزاء نافذ کیے جائیں۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے پورا قانون اپنی آخری شکل میں نافذ کر دیا جائے۔

شریعت کی یہی خاص حکمت ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان لفظوں میں بیان فرمایا:

انما نزل اول ما نزل سورۃ من المفصل — قرآن میں پہلے وہ مفصل سورتیں اتاری گئیں جن میں

فیہا ذکر الجنۃ والنار۔ حتیٰ اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً۔ (بخاری باب تالیف القرآن)

جنت اور جہنم کا بیان ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے لیے ہموار ہوگیے تو حلال وحرام کے احکام اترے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر یہ اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

شریعت کی یہ حکمت قرآن سے اور سیرت رسول سے انتہائی واضح ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے پرجوش اسلامی قائدین اس شرعی حکمت کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور اسی لیے وہ ناکام رہے۔

ستمبر ۱۹۸۳ میں سوڈان میں سابق صدر نمیری اور الاخوان المسلمون نے ملک میں کامل شراب بندی کا اعلان کیا۔ انھوں نے بعض دکانوں پر چھاپہ مار کر شراب کی کچھ بوتلیں حاصل کیں۔ اور ان کو توڑ کر ان کی شراب دریائے نیل میں بہادی۔ مگر اس کے بعد یہ منظر دیکھنے میں نہیں آیا کہ دور نبوت کے مدینہ کی طرح سوڈان کی سڑکوں اور گلیوں میں بھی شراب بہائی جانے لگے۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام نے تدریج کے اصول پر شراب کو بند کیا تھا۔ جب کہ سوڈان کے اسلامی لیڈروں نے اچانک شراب کو بند کرنا چاہا۔ چنانچہ وقتی تالیوں کی گونج اور چند دن کی اخباری سرخیوں کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہو سکا۔ صرف ایک سال بعد سوڈان کی "اسلامی حکومت" ختم ہوگئی۔ اور اسی کے ساتھ اس کے اسلامی احکام بھی۔

یہی حال موجودہ زمانہ میں ان تمام مسلم ملکوں کا ہوا ہے جہاں انقلابی مسلم لیڈروں نے اسلامی قوانین کو نافذ کرنا چاہا۔ اسلام کی حکمتِ نسخ کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ان کی تمام کوششیں صد فی صد ناکام ہو کر رہ گئیں۔ لفظی ہنگاموں کے سوا ان کے حصہ میں اور کچھ نہ آیا۔

سید احمد شہید کی مثال

مسلمان پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے اسی ناکام کہانی کو دہرا رہے ہیں۔ وہ "نسخ" کے قرآنی اصول پر عمل کیے بغیر اقدام کرتے ہیں اور پھر سراسر ناکام رہتے ہیں۔

اس سلسلہ کا پہلا نمایاں واقعہ سید احمد شہید بریلوی (۱۸۳۱ - ۱۷۸۵) کی وہ تحریک تھی جس کو

عام طور پر تحریک مجاہدین کہا جاتا ہے۔ وہ یوپی، بہار اور بنگال سے اپنے معتقدین کو لے کر پنجاب پہونچے وہاں انھوں نے پشاور کو "فتح" کیا اور اس میں اسلامی قانون کی حکومت قائم کر دی۔

مگر یہ اسلامی حکومت بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کے اوپر اسلامی قانون کی حکومت قائم کی گئی وہ اگرچہ نسلی طور پر مسلمان تھے مگر اسلامی قانون کو قبول کرنے کا مزاج ان کے اندر بالکل پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ مقامی مسلم آبادی سید صاحب کے عمال کی باغی ہو گئی۔ وہاں کے قبائلی سرداروں نے سید صاحب کے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اور خود سید صاحب کا یہ حال ہوا کہ انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے انتہائی غیر حکیمانہ جنگ چھیڑ دی اور اس میں لڑتے ہوئے ۶ مئی ۱۸۳۱ کو قتل کر دیے گیے۔ اسلامی حکومت بننے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

ایک مورخ نے سید احمد شہید بریلوی کے حالات لکھتے ہوئے آخر میں حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

"مجاہدین کی اکثریت صرف نعرۂ جہاد پر جمع ہو گئی تھی۔ ان کی تربیت نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے اسلامی حکومت کو چلانے کی ذمہ داری سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ انھوں نے جس علاقہ میں اسلامی حکومت قائم کی وہاں کے عوام کے ذہن کو پہلے اس کے لیے تیار نہ کیا۔ سید صاحب کی حکومت نے اسلامی قانون کو نافذ کرتے ہوئے تدریج کا خیال نہ رکھا اور سارا اسلامی قانون فوراً نافذ کر دیا۔ اس سے عوام کے اندر اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔"

تاریخ پاکستان و ہند از شیخ محمد رفیق ایم اے، لاہور ۱۹۷۲، صفحہ ۲۳۵

مسلمانوں کے پرجوش لیڈروں کو نہ قرآن و سنت سے ہدایت ملی اور نہ ماضی اور حال کے واقعات ان کی آنکھ کھولنے والے ثابت ہوئے۔ وہ ایک ہی ناکام کہانی کو ڈیڑھ سو سال سے مسلسل دہرائے چلے جا رہے ہیں۔

اسلوب کلام

شاعری کی بنیاد تخیل پر ہے۔ تخیل میں کوئی خارجی چیز آدمی کی سوچ کی حد بندی کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ اسی لیے شاعر خیالی پرواز میں جو چاہتا ہے کہتا چلا جاتا ہے (والم تر انہم فی کل واد یہیمون)

اس کے برعکس سائنس کی بنیاد فطرت پر ہے۔ فطرت (Nature) ایک متعین حقیقت کا نام ہے۔ فطرت کی دنیا میں تمام واقعات انتہائی معلوم اور متعین اصولوں کی بنیاد پر ظہور میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس داں کی زبان شاعر کی زبان سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ شاعر کو لفظوں کے انتخاب میں احتیاط کی ضرورت نہیں۔ اس کی فکری اڑان اس سے کچھ بھی کہلوا سکتی ہے۔ مگر سائنس داں انتہائی محتاط زبان استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ وہ سختی کے ساتھ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کی زبان میں فنی صحت اور ریاضیاتی قطعیت موجود ہو۔

جدید سائنس کا ظہور یورپ میں ہوا اور وہیں اس کی ترقی ہوئی۔ پچھلے کئی سو سال کا زمانہ ایسا ہے جب کہ مغربی دنیا میں سائنس کو سب سے زیادہ غلبہ حاصل رہا ہے۔ مغرب کی جدید تہذیب مکمل طور پر سائنس کے زیر اثر بنی ہے۔ اسی کے اثر سے مغرب کی زبانوں میں محتاط اسلوب اور حقیقت نگاری کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔

سائنس داں جس شعبۂ علم میں کام کرتا ہے اس کے عین تقاضے کے طور پر وہ ایسا کرتا ہے کہ اپنے خیالات کو محتاط زبان (Gaurded language) میں ظاہر کرتا ہے۔ جب مغربی انسان کے نزدیک سائنس کی اہمیت بڑھی تو اسی کے ساتھ قدرتی طور پر یہ ہوا کہ زبان میں وہی طرز پسند کیا جانے لگا جو سائنس دانوں کا طرز تھا۔ اس طرح وہ زبان وجود میں آئی جس کو ہم نے محتاط زبان کا نام دیا ہے۔

محتاط زبان سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت کے لیے چند مثال لیجئے:

۱۔ ریمزے میکڈونلڈ (۱۸۶۶-۱۹۳۷) ایک برطانی لیڈر تھے جو بعد کو وہاں کے وزیر اعظم بنے ان کو عوامی تقریروں کا خاص ملکہ تھا جس میں معنی کم اور الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق انگلینڈ کی لیبر پارٹی سے تھا جو سر ونسٹن چرچل کی حریف تھی۔ چنانچہ لارڈ ونسٹن چرچل نے ایک بار ریمزے میکڈونلڈ پر طنز کرتے ہوئے کہا:

He is a man with the gift of compressing the largest amount of words into the smallest amount of thoughts.

وہ ایک ایسے آدمی ہیں جو اس بات کا خصوصی ملکہ رکھتے ہیں کہ الفاظ کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو خیالات کی کم سے کم مقدار میں کھپا سکیں۔

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب آزادیٔ ہند (India Wins Freedom) کا ایک باب منقسم انڈیا (Divided India) ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں کہ ہندستان کے لوگ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی صبح کو سوکر اٹھے تو ہندستان آزاد ہوچکا تھا۔ مگر ہماری آزادی اسی کے ساتھ ہمارے لیے ایک المیہ بھی لائی۔ دہلی میں آگ اور خون کا بازار گرم ہوگیا۔ مسلمان ہر طرف مارے جارہے تھے اور ان کی جائدادیں تباہ کی جارہی تھیں۔

اس وقت سردار ولبھ بھائی پٹیل مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ تھے۔ دہلی کے مسلمانوں کے اوپر ہر روز جو حملے ہورہے تھے اس کی توجیہ سردار پٹیل نے یہ پیش کی کہ یہ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے بچاؤ کا اقدام ہے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی سے خطرناک ہتھیار برآمد ہوئے ہیں۔ دہلی کے مسلمانوں نے یہ ہتھیار اس لیے جمع کیے تھے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کریں۔ اگر ہندو اور سکھ پہل نہ کرتے تو مسلمان ان کو تباہ کردیتے۔

پولیس نے قرول باغ اور سبزی منڈی کے علاقوں میں مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی تھی اور کچھ "ہتھیار" برآمد کیے تھے۔ سردار پٹیل کے حکم سے یہ ہتھیار گورنمنٹ ہاؤس لائے گیے اور ہمارے معائنہ کے لیے کیبنٹ روم کے پاس ایک چیمبر میں رکھے گیے۔ جب ہم لوگ جمع ہوئے تو سردار پٹیل نے کہا کہ ہم کو سب سے پہلے چیمبر میں چلنا چاہیے اور وہاں مسلم گھروں سے برآمد کیے ہوئے ہتھیاروں کو دیکھنا چاہیے۔ ہم وہاں پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ میز کے اوپر کئی درجن چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سبزی کاٹنے کی یا قلم بنانے کی یا جیبی چھریاں تھیں۔ ان میں بہت سی زنگ آلود تھیں۔ کتنوں کا دستہ ٹوٹا ہوا تھا۔ کچھ معمولی قسم کے لوہے کے چھڑ یا لوہے کے ٹکڑے تھے۔ کچھ ٹوٹے ہوئے پانی کے پائپ تھے۔

سردار پٹیل کے مطابق یہ وہ ہتھیار تھے جن کو دہلی کے مسلمانوں نے اس لیے جمع کیا تھا تاکہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کا خاتمہ کرسکیں۔ لارڈ ماؤنٹ بٹین (آزاد ہندستان کے پہلے گورنر جنرل) نے

ان میں سے ایک یا دو چاقو اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور مسکراتے ہوئے بولے :

Those who had collected this material seemed to have a wonderful idea of military tactics if they thought that the city of Delhi could be captured with them.

Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, Orient Longmans, Bombay, 1959, p. 215

وہ لوگ جنھوں نے یہ سامان جمع کیا تھا ان کا فوجی نظریہ بڑا عجیب ہوگا اگر انھوں نے سمجھا کہ اس کے ذریعہ سے دہلی کے شہر پر قبضہ کیا جا سکتا ہے ۔

جھوٹی لیڈری

صبح اٹھ کر ہر روز جو آوازیں راقم الحروف کے کان میں آتی ہیں ان میں سے ایک آواز اس پھیری والے کی ہے جو روزانہ سڑک سے یہ آواز لگاتا ہوا گزرتا ہے:

کباڑی ... ردی والا ، کباڑی ... ردی والا

جب میں یہ آواز سنتا ہوں تو اکثر میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ شخص بھی کس قدر حقیقت پسند ہے۔ وہ کباڑی والا ہے تو اپنے کو کباڑی والا ہی بتاتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنی زبان سے "جوہری" اور "سونے چاندی والا" کی آواز بھی نکال سکتا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ وہ کباڑی ہے، جوہری نہیں ہے۔ اس لئے حقیقت کے بازار میں اس کو صرف کباڑی کی قیمت ملے گی، اس کو جوہری کی قیمت نہیں مل سکتی۔ اگر وہ سڑکوں پر جوہری، جوہری پکارے تو سارا دن گزر جائے گا اور وہ ایک پیسہ کا کاروبار بھی نہ کر سکے گا۔

یہی تمام کاموں کا معاملہ ہے۔ ہر کام میں آدمی اپنی اصل حیثیت کے مطابق قیمت پاتا ہے۔ مگر لیڈری کا کام اس سے مستثنیٰ ہے۔ لیڈری کی دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آپ حقیقۃً کباڑی ہوں اور جوہری کی آواز لگائیں۔ پھر بھی آپ کو ایسے معتقدین مل جائیں جو آپ کو مفکر اسلام تصور کریں، جو آپ کو نجات دہندۂ قوم کا لقب دیدیں۔

لیڈری کی دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آدمی کے اندر ایک معمولی اخبار چلانے کی طاقت نہ ہو اور وہ انسانیت بچاؤ کا جھنڈا بلند کرے۔ وہ ایک مدرسہ کا انتظام درست نہ کر سکتا ہو اور "سنو اے اہل عالم" کے عنوان پر تقریر کرے۔ ووٹ دینے والے عوام کے اندر اس کا کوئی مقام نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا نعرہ لے کر الکشن کے میدان میں کود پڑے۔

بائبل میں "جھوٹے نبی" کا لفظ آتا ہے۔ اس سے مراد اسی قسم کے جھوٹے لیڈر ہیں۔ ایسے لوگ ممکن ہے کسی قسم کی وقتی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیں۔ مگر حقیقت کی نظر میں وہ صرف مجرم ہیں۔ کیونکہ اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے وہ کباڑی تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو جوہری کے روپ میں پیش کیا۔ انھوں نے قوم کو صرف بے راہ کیا اور نعرہ یہ لگایا کہ وہ قوم کو راستہ دکھانے کے لیے اٹھے ہیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز۔ ۱۵

۱۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلامی عبادت کے موضوع پر قرآن کی روشنی میں ۴۵ منٹ کی گفتگو کی۔ حاضرین میں بہت سے نئے نئے لوگ شامل تھے۔

۲۔ ہالینڈ میں ایک اسلامی مرکز ہے جس کا نام اور پتہ یہ ہے :

Moslim Informatie Centrum
Beeklaan 207, Postbus 61217, 2506 AE Den Haag, Holland

اس کے ایک ذمہ دار (Abdoel Qayyoum Boedhoe) ۲۷ اکتوبر کو مرکز میں آئے۔ انھوں نے مرکز کے پروگرام سے بہت دل چسپی کا اظہار کیا۔ ان کی دل چسپی کے پیش نظر الرسالہ انگریزی ان کے نام جاری کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہالینڈ میں کثرت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس وقت اسلام ہالینڈ کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے۔

۳۔ عربی پریس میں اسلامی مرکز کے افکار مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (۲۸ اکتوبر ۱۹۸۵) میں صدر اسلامی مرکز کا ایک مضمون خصوصی طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے : الدعوۃ الاسلامیہ فی العصر الحدیث۔ اسی طرح ماہنامہ البلاغ (کویت) کی اشاعت ۲۴ رجب ۱۴۰۰ھ میں صدر اسلامی مرکز کی عربی کتاب حکمۃ الدین کا لمبا اقتباس نمایاں طور پر شائع کیا گیا ہے اور آخر میں یہ الفاظ درج ہیں : نقلاً عن کتاب "حکمۃ الدین" للکاتب الہندی الکبیر وحید الدین خان۔

۴۔ ہندستان کے ایک بڑے شہر میں ایک مسجد غیر مسلم محلہ میں واقع ہے۔ یہاں کے غیر مسلم صاحبان نے مطالبہ کیا کہ صبح کی نماز کی اذان لاؤڈ اسپیکر پر نہ دی جائے۔ اس مسئلہ پر کافی تناؤ پیدا ہو گیا۔ حسب معمول مسلمانوں میں ایسے نوجوان اٹھے جنھوں نے کہا کہ ہم جیل جائیں گے مگر لاؤڈ اسپیکر کو بند نہیں کریں گے۔ یہ قصہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے کچھ سنجیدہ لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ صدر اسلامی مرکز کو خط لکھا جائے اور ان کی رائے لی جائے۔ وہ جو رائے دیں اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس کے مطابق صدر اسلامی مرکز نے وہاں کے مسلمانوں کو ایک خط لکھا جس میں انھیں یہ مشورہ دیا کہ فی الحال وہ برادران وطن کے مطالبہ کو مانتے ہوئے صبح کی اذان بغیر

لاؤڈ اسپیکر دینا منظور کرلیں۔ شہر کے سنجیدہ افراد نے اس خط کو پسند کیا۔ اس کی فوٹو کاپی نکلوا کر مسلمانوں میں تقسیم کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ خدا کے فضل سے مسلمانوں کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ راضی ہو گئے کہ فجر کی نماز کی اذان لاوڈ اسپیکر پر نہ دیں گے۔ اس طرح ایک فساد ہوتے ہوتے رہ گیا جس کے نتائج کا اندازہ کرنا قارئین کے لیے مشکل نہیں۔

۵۔ الرسالہ ماہ نومبر ۱۹۸۵ میں ایک مضمون بعنوان "نکاح اور طلاق" چھپا ہے۔ یہ مضمون ہر جگہ بہت پسند کیا گیا ہے۔ مختلف جرائد نے بھی اس کو اپنے صفحات میں شائع کیا ہے۔ مثلاً ہفت روزہ نئی دنیا ۱۱ نومبر ۱۹۸۵ اور ہفت روز بلٹز ۲ نومبر ۱۹۸۵ روزنامہ منصف حیدر آباد ۴ نومبر ۱۹۸۵، وغیرہ۔

۶۔ اسلامی مرکز کا خاص مقصد عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرنا ہے۔ خدا کے فضل سے اس مقصد میں اسلامی مرکز کو اس حد تک کامیابی حاصل ہو چکی ہے کہ آج دنیا کے کسی بھی اسلامی ادارہ کے پاس عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود نہیں جو اسلامی مرکز کے پاس ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ حال ہو چکا ہے کہ جو شخص بھی اسلامی دعوت کو عصری اسلوب میں پیش کرنا چاہتا ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اسلامی مرکز کی مطبوعات سے استفادہ کرے۔ اگرچہ قوم کے اندر اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے یہ کام زیادہ تر بلا اعتراف ہو رہا ہے۔ اس کی مثالیں ہر روز مختلف انداز سے سامنے آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر ہفت روزہ تعمیر حیات (لکھنؤ) کے ایک مضمون میں الرسالہ کی ایک لمبی عبارت شامل کر لی گئی ہے جب کہ اس میں نہ الرسالہ کا حوالہ ہے اور نہ اس کے لکھنے والے کی حیثیت سے صدر اسلامی مرکز کا نام درج ہے۔ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الرسالہ جولائی ۱۹۸۵ صفحہ ۲۴-۲۳ اور تعمیر حیات ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ صفحہ ۱۱

۷۔ ڈاکٹر کرسٹین ڈبلیو ٹرال (برلن، ۱۹۴۳) ایک جرمن مستشرق اور پادری ہیں۔ ان کی مرتب کردہ ۳۰۲ صفحات پر مشتمل ایک انگریزی کتاب چھپی ہے جس کا موضوع ہے "ہندستان میں اسلام"۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے: دین کے بارہ میں تین ممتاز علماء کا خیال:

The Meaning of Din: Recent views of Three Eminent Indian Ulama

اس عنوان کے تحت مختصراً مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کے دینی تصور کا ذکر

ہے اور پھر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ "مولانا وحید الدین خاں" کے دینی تصور کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام و پتہ حسب ذیل ہے:

Islam in India: Studies and Commentaries
Edited by Dr. Christian W. Troll
Vikas Publishing House Pvt. Ltd., New Delhi 110002
pp. 231, Price Rs. 95.00

۸۔ ناندیڑ سے ایک صاحب کیسٹ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

الرسالہ کیسٹ کو یہاں پر سب لوگ پسند کیے ہیں اور دعا دے رہے ہیں کہ مولانا وحید الدین کی آواز نہیں وہ بلکہ خدائی آواز ہے۔ ہم سب دعا کرتے ہیں کہ ہر گھر میں یہ آواز سنائی دے یہی میری اللہ سے عرض ہے (۱۸ اکتوبر ۱۹۸۵)

۹۔ ایک صاحب نوادہ (بہار) سے لکھتے ہیں: محترم بزرگ کی تصنیف زلزلۂ قیامت ابھی پڑھ کر ختم کی ہے۔ جزاک اللہ فی الدارین خیرا۔ یہ کتاب اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے خود ایک زلزلہ ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظر سے گزرے۔ میں یہ کتاب یہاں دوسروں کو دے رہا ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو معلومات نہیں ہیں۔ عام طور پر قیامت حشر اور حساب و کتاب سے مسلمان واقف ہیں۔ مگر اسی بات کو مولانا محترم کے اسلوب اور اندازِ بیان نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ اثر آفرینی اور تاثیر کی کوئی حد نہیں (۲۳ اکتوبر ۱۹۸۵)

یہ دو خط بطور نمونہ یہاں نقل کیے گیے ہیں۔ اس قسم کے خط ہم کو ہر روز برابر موصول ہوتے ہیں۔

۱۰۔ نیویارک (امریکہ) میں مختلف مذاہب کی ایک بین اقوامی کانفرنس نومبر ۱۹۸۵ میں ہوئی صدر اسلامی مرکز کو بھی اس کانفرنس میں اسلام کی نمائندگی کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق انھوں نے اس بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ اور اپنا مقالہ اسلام کے موضوع پر پیش کیا۔ اس کا تفصیلی حال انشاء اللہ روداد سفر کے تحت الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۱۱۔ پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ کتاب کا انگریزی نام یہ ہے:

MUHAMMAD: The Prophet of Revolution

۱۲۔ مذہب اور جدید چیلنج کا عربی ترجمہ (الاسلام یتحدیٰ) اس سے پہلے عرب ملکوں میں چھپتا رہا ہے اب وہ مکتبہ الرسالہ سے بھی چھپ گیا ہے۔ شائقین اس کو یہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. R.N No 28822/76

Number 110

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

Rs 3.00

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

منزل پر پہنچنا صرف ان لوگوں کے لئے مقدر ہے
جو راستہ کے کانٹوں سے بچ کر آگے بڑھ جائیں

فروری ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۱ فروری ۱۹۸۶

فہرست

قدرت کا سبق

ایک شخص نے اپنا ایک تجربہ لکھا ہے کہ ایک ماہی گیر نے ایک بار مجھے بتایا کہ کیکڑے کی ٹوکری پر کسی کو ڈھکن لگانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی کیکڑا ٹوکری کے کنارے سے نکلنا چاہتا ہے تو دوسرے وہاں پہونچتے ہیں اور اس کو پیچھے کی طرف کھینچ لیتے ہیں :

> A fisherman once told me that one doesn't need a cover for a crab basket. If one of the crabs starts climbing up the side of the basket, the others will reach up and pull it back down.
>
> Charles Allen, in *The Miracle of Love.*

کیکڑے کی یہ فطرت یقیناً خدا نے بنائی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کیکڑے کا یہ طریقہ ایک خدائی طریقہ ہے۔ کیکڑے کی مثال سے خدا انسانوں کو بتا رہا ہے کہ انھیں اپنی اجتماعی زندگی کو کس طرح چلانا چاہیے۔

اجتماعی زندگی میں اتحاد کی بے حد اہمیت ہے۔ اور اتحاد قائم کرنے کی بہترین تدبیر وہی ہے جو کیکڑے کی دنیا میں خدا نے قائم کر رکھی ہے۔ کسی انسانی مجموعے کے افراد کو اتنا باشعور ہونا چاہیے کہ اگر ان میں سے کوئی شخص ذہنی انحراف کا شکار ہو اور اپنے مجموعے سے جدا ہونا چاہے تو دوسرے لوگ اس کو پکڑ کر دوبارہ اندر کی طرف کھینچ لیں۔ "ٹوکری" کے افراد اپنے کسی شخص کو ٹوکری کے باہر نہ جانے دیں۔

اسلامی تاریخ میں اس کی ایک شاندار مثال حضرت سعد بن عبادہ انصاری کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے مسئلہ پر ان کے اندر انحراف پیدا ہوا۔ بیشتر صحابہ اس پر متفق تھے کہ قبیلۂ قریش کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔ مگر سعد بن عبادہ کے ذہن میں یہ آیا کہ خلیفہ انصار کا کوئی شخص ہو یا پھر دو خلیفہ بنائے جائیں، ایک مہاجرین میں سے اور دوسرا انصار میں سے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ سعد بن عبادہ کے قبیلہ کے تمام لوگ اپنے سردار کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ انھوں نے سعد بن عبادہ کو کھینچ کر دوبارہ "ٹوکری" میں ڈال لیا۔ اور ان کو اس سے باہر جانے نہیں دیا۔

ایک عام برائی

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو نسل چلی ، بعد کو اس کی دو شاخیں ہوگئیں ۔ ایک بنی اسرائیل ، دوسرے بنی اسماعیل ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو پیغمبر آئے وہ سب بنی اسرائیل میں آئے ۔ اس کے بعد آخری پیغمبر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوئی ۔ بنی اسرائیل (یہود) نے آخری پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دیا ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ فعل حسد کی وجہ سے ہے ۔ ان کو اس بات کی جلن ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل کو کیوں اپنے فضل سے نوازا (ام یحسدون الناس علیٰ ما آتاھم اللہ من فضلہ ، النساء ۵۴) اس سے معلوم ہوا کہ وہ اخلاقی برائی جس کو حسد کہا جاتا ہے وہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنے سوا دوسرے کی بڑائی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہو ۔

یہ ایک عام بات ہے کہ کسی چھوٹے آدمی کی برائی کی جائے تو سننے والوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ اس کے برعکس کسی بڑے آدمی کی برائی کی جائے تو ہر آدمی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۔ ایک شخص کو ماحول میں کوئی بڑائی حاصل ہو جائے تو اس کے خلاف ہر الٹی بات کو لوگ بلا تحقیق مان لیتے ہیں اور فوراً اس کا چرچا کرنے لگتے ہیں ۔ آپ ایک دولت مند کی برائی بیان کریں ۔ ایک عزت یافتہ شخص کو بے عزت کرنے والی باتیں کریں ۔ ایک صاحب اقتدار کے ظلم کی داستانیں لوگوں کو سنائیں ۔ آپ دیکھیں گے کہ لوگ فوراً آپ کی بات مان رہے ہیں ۔ بہت جلد آپ کے گرد لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی ہے ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی کی بڑائی کو تسلیم نہیں کرتا ۔ وہ اپنے سوا کسی اور کو بلند مقام پر دیکھنا نہیں چاہتا ۔ اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی ماحول میں کسی شخص کو کسی اعتبار سے بڑائی کا مقام حاصل ہوتا ہے تو تمام لوگوں کے دل میں اس کے خلاف کھلا یا چھپا حسد پیدا ہو جاتا ہے ۔ ہر ایک اندر سے یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کو اس کی بڑائی کے مقام سے گرائے ۔ چنانچہ جب کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے جس سے بڑے کی بڑائی مجروح ہوتی ہو تو فوراً لوگ اس کو اپنے دل کی بات سمجھ کر مان لیتے ہیں ، وہ فوراً ایسے آدمی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں ۔

یہ مشغلہ آج لوگوں کو بڑا لذیذ مشغلہ معلوم ہوتا ہے ۔ مگر یہ یقینی طور پر ابلیس لعین کی سنت ہے ۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ ان کا وہی انجام ہو جو آدم کی بڑائی کو نہ ماننے کے نتیجہ میں ابلیس کا ہوا ۔

کامیابی کی قیمت

ایک طالب علم کے سرپرست کالج کے پرنسپل سے ملے ۔
" آپ لوگوں نے جو تعلیمی نصاب بنایا ہے وہ بہت لمبا ہے ۔ طالب علم کی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف پڑھنے میں گزر جاتا ہے " انھوں نے کہا
" اس کا حل تو بہت آسان ہے "، پرنسپل نے جواب دیا
" وہ کیسے "
" آپ مختصر نصاب بھی بنا سکتے ہیں ۔ اصل میں مدت کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ طالب علم کے اندر کیسا علمی معیار چاہتے ہیں ۔ قدرت کو شاہ بلوط (Oak) کا درخت اگانے میں سو برس لگ جاتے ہیں ۔ مگر جب وہ ککڑی کا درخت اگانا چاہتی ہے تو اس کے لیے صرف چھ مہینے درکار ہوتے ہیں ۔ اگر آپ معمولی معیار چاہتے ہوں تو چند سال کی تعلیم بھی کافی ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے تو بہرحال زیادہ وقت دینا پڑے گا "

یہی اصول زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے ۔ چھوٹی ترقی چھوٹی کوشش سے مل سکتی ہے ۔ لیکن اگر آپ بڑی ترقی چاہتے ہوں تو لازماً آپ کو بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی ۔ چھوٹی کوشش سے کبھی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ۔

ہرولڈ شرمن (Harold Sherman) نے اسی بات کو ان الفاظ میں کہا ہے :

Every worthwhile accomplishment has a price tag on it how much are you willing to pay in hard work and sacrifice, in patience, faith, and endurance to obtain it.

ہر کامیابی کے ساتھ قیمت کا ایک پرچہ لگا ہوا ہے ۔ اب یہ آپ پر موقوف ہے کہ آپ اس کو حاصل کرنے کے لیے محنت اور قربانی ، صبر ، یقین اور برداشت کی شکل میں کتنی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں ۔ بازار میں آدمی کو وہی چیز ملتی ہے جس کی اس نے قیمت ادا کی ہو ۔ اسی طرح ہر ترقی اور ہر کامیابی کی بھی ایک قیمت ہے اور آدمی کو وہی ترقی اور وہی کامیابی ملے گی جس کی اس نے قیمت ادا کی ہو ۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم ۔

مقصدیت

جاپان نے ۱۹۳۱ میں چین کے شمال مشرقی حصہ (منچوریا) پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں اپنی پسند کی حکومت قائم کر دی۔ اس کے بعد چین اور جاپان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ ۷ جولائی ۱۹۳۷ کو بیجنگ (پیکنگ) کے پاس مارکوپولو برج کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ نے دبے ہوئے جذبات کو بھڑکا دیا۔ اور دونوں ملکوں کے درمیان فوجی ٹکراؤ شروع ہو گیا جو بالآخر دوسری جنگِ عظیم تک جا پہونچا۔

اس وقت سے چین اور جاپان کے درمیان نفرت اور کشیدگی پائی جاتی تھی۔ چند سال پہلے جاپان اور چین کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس کے مطابق جاپان کو چین میں ایک اسٹیل مل قائم کرنا تھا مگر معاہدہ کی تکمیل کے بعد چینی حکومت نے اچانک اس کو منسوخ کر دیا۔

چین کے نئے وزیر اعظم ڈینگ زاپنگ (Deng Xiaoping) نے حال میں اشتراکی انتہا پسندی کو ختم کیا اور کھلے دروازہ (Open Door) کی پالیسی اختیار کی تو جاپان کے لیے دوبارہ موقع مل گیا۔ چنانچہ آج کل جاپان نے چین میں زبردست پوزیشن کر رکھی ہے۔ آپ اگر جاپان سے چین جانا چاہیں تو آپ کو ہوائی جہاز میں اپنی سیٹ تین ماہ پیشگی بک کرانی ہوگی۔ جاپان سے چین جانے والے ہر جہاز کی ایک ایک سیٹ بھری ہوئی ہوتی ہے۔

چین میں تجارت کے زبردست امکانات ہیں۔ جاپان چاہتا ہے کہ ان تجارتی امکانات کو بھرپور استعمال کرے۔ اس مقصد کے لیے جاپان نے یک لخت طور پر ماضی کی تلخ یادوں کو بھلا دیا۔ ایک سیاح کے الفاظ میں جاپان نے طے کر لیا کہ وہ چین کی طرف سے پیش آنے والی ہر ایذا رسانی (Pinpricks) کو یک طرفہ طور پر برداشت کرے گا۔

مذکورہ سیاح نے لکھا ہے کہ میرے قیام ٹوکیو (جون ۱۹۸۵) کے زمانہ میں ریڈیو بیجنگ نے اعلان کیا کہ چین ایک میوزیم بنائے گا جس میں تصویروں کے ذریعہ یہ دکھایا جائے گا کہ جاپانیوں نے چینیوں کے اوپر ماضی میں کیا کیا مظالم کیے ہیں۔ اس میوزیم کا افتتاح ۱۹۸۷ میں ہوگا جب کہ مارکوپولو کے حادثہ کو ۵۰ سال پورے ہو جائیں گے۔ جاپانیوں سے اس خبر پر تبصرہ کرنے کے لیے

کہا گیا تو انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ جب زیادہ زور دیا گیا تو انھوں نے جواب دیا :

You know, our Chinese friends have a way of twisting
our tails, and appealing to our conscience.

آپ جانتے ہیں کہ یہ ہمارے چینی دوستوں کا مہمیز لگانے کا طریقہ ہے۔ وہ ہمارے ضمیر کو متوجہ کر رہے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جون ۱۹۸۵)

جاپان کے سامنے ایک مقصد تھا۔ یعنی اپنی تجارت کو فروغ دینا۔ اس مقصد نے جاپان کے اندر کردار پیدا کیا۔ اس کے مقصد نے اس کو حکمت، برداشت، اعراض کرنا اور صرف بقدر ضرورت بولنا سکھایا۔ اس کے مقصد نے اس کو بتایا کہ کس طرح وہ ماضی کو بھلا دے اور تمام جھگڑوں اور شکایتوں کو یک طرفہ طور پر دفن کر دے تاکہ اس کے لیے مقصد تک پہونچنے کی راہ ہموار ہو سکے۔

بامقصد گروہ کی نفسیات ہمیشہ یہی ہوتی ہے۔ خواہ اس کے سامنے تجارتی مقصد ہو یا کوئی دوسرا مقصد۔ اور جب کوئی گروہ یہ صفات کھو دے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس گروہ نے مقصدیت کھو دی ہے۔ اس کے سامنے چوں کہ کوئی مقصد نہیں اس لیے اس کے افراد کا کوئی کردار بھی نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی بے کرداری ہے۔ جس میدان میں بھی تجربہ کیجیے، آپ فوراً دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے اپنا کردار کھو دیا ہے۔ ان کے اوپر کسی ٹھوس منصوبہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ جہاں بھی انھیں استعمال کیا جائے وہ دیوار کی کچی اینٹ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ دیوار کی پختہ اینٹ ہونے کا ثبوت نہیں دیتے۔

اس کمزوری کی اصل وجہ یہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے مقصد کا شعور کھو دیا ہے۔ وہ ایک بے مقصد گروہ ہو کر رہ گیے ہیں۔ ان کے سامنے نہ دنیا کی تعمیر کا نشانہ ہے اور نہ آخرت کی تعمیر کا نشانہ۔ یہی ان کی اصل کمزوری ہے۔ اگر مسلمانوں میں دوبارہ مقصد کا شعور زندہ کر دیا جائے تو دوبارہ وہ ایک جاندار قوم نظر آئیں گے۔ وہ دوبارہ ایک باکردار گروہ بن جائیں گے جس طرح وہ اس سے پہلے ایک باکردار گروہ بنے ہوئے تھے۔

بنیاد

مکان کی تعمیر کا آغاز بنیاد سے ہوتا ہے۔ ایک انجینیر کو "اسکائی اسکریپر" بنانا ہو تب بھی وہ بنیاد ہی سے اس کا آغاز کرے گا۔ بنیاد سے آغاز کرنا دوسرے لفظوں میں اس حقیقت واقعہ کا اعتراف کرنا ہے کہ آدمی کہاں کھڑا ہوا ہے اور وہ کون سا نقطہ ہے جہاں سے وہ اپنے سفر کا آغاز کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ یہاں ایک طرف قدرت (نیچر) ہے جو ہم سے الگ خود اپنے قوانین پر قائم ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں دوسرے انسان ہیں۔ ان میں سے ہر انسان کے سامنے اپنا مقصد ہے اور ہر شخص اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ ہم ان حقیقتوں کو جانیں اور ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

زندگی کا سب سے بڑا راز حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ اعتراف کرنے والا آدمی اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ جس طرح اپنے "ہے" کو جانتا ہے اسی طرح وہ اپنے "نہیں" سے بھی واقف ہے۔ وہ ایک طرف اگر یہ جانتا ہے کہ کیا چیز اس کے لیے قابل حصول ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی باخبر ہے کہ کیا چیز اس کے لیے قابل حصول نہیں۔ وہ آغاز اور انجام کے فرق کو جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ اپنا پہلا قدم اسے کہاں سے اٹھانا ہے اور وہ کون سا مقام ہے جہاں وہ آخر کار اپنے آپ کو پہونچانا چاہتا ہے۔

اعتراف بزدلی نہیں، اعتراف سب سے بڑی بہادری ہے۔ اعتراف کر کے آدمی بے عزت نہیں ہوتا، وہ عزت کے سب سے بڑے مقام کو پا لیتا ہے۔ جو شخص اعتراف نہ کرے وہ گویا فرضی خیالات میں جی رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اعتراف کرے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس نے فرضی تخیلات کے طلسم کو توڑ دیا ہے۔ وہ حقائق کی دنیا میں سانس لے رہا ہے۔ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ رہا ہے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

چیزوں کو ان کی اصل صورت میں دیکھنا دانش مندی کا آغاز ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو وہی کامیابی کے آخری زینہ پر پہونچتا ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو وہ یا تو اپنا سفر شروع نہ کر سکے گا اور اگر سفر شروع ہو گیا تب بھی وہ درمیان میں اٹک کر رہ جائے گا۔ وہ کبھی آخری منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔

قربانی

۱۹۶۲ کا واقعہ ہے۔ مسٹر سریش ایچ کامدار کی عمر اس وقت ۲۹ سال تھی۔ وہ کلکتہ کے میڈیکل کالج اسپتال میں اپنے ایک بیمار عزیز کو دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اس وقت ایک مریض لایا گیا۔ اس کا آپریشن ضروری تھا اور اس کے لیے فوری طور پر خون (Blood transfusion) کی ضرورت تھی۔ یہ اس آدمی کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ مسٹر کامدار کا بلڈ گروپ اے (A-Rh Positive) تھا۔ ان کو مریض پر ترس آیا۔ انھوں نے رضا کارانہ طور پر خون کی پیش کش کر دی۔ ایک زندگی بچالی گئی۔

مسٹر کامدار کی عمر اب ۵۳ سال ہو چکی ہے۔ کلکتہ کے مذکورہ تجربہ کے بعد انھوں نے خون دینے کو اپنا مستقل مسلک بنالیا۔ پچھلے ۲۴ سال کے اندر وہ ایک سو بار رضا کارانہ طور پر خون دے چکے ہیں۔ انھیں ریڈکراس سوسائٹی نے اعلیٰ امتیاز کے تمغے عطا کیے ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۲ دسمبر ۱۹۸۵)

دنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جو فوری جوش سے بھڑک اٹھیں اور لڑ کر اپنا خون دے دیں۔ مگر ایسے لوگ بے حد کم یاب ہیں جو سوچے سمجھے ذہن کے تحت مستقل خون دیں اور زندگی کے آخری لمحات تک دیتے رہیں۔

یہ دوسرے لوگ بظاہر چھوٹا کام کرنے والے لوگ نظر آتے ہیں۔ مگر یہی لوگ ہیں جو دنیا میں بڑا کام کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی انفرادی قربانیوں کے ذریعہ پوری قوم کو آگے لے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کی قربانی اگر لیڈر بناتی ہے تو دوسری قسم کی قربانی قوم تیار کرتی ہے۔ پہلی قربانی اگر حال کی تعمیر ہے تو دوسری قربانی مستقبل کی تعمیر۔

ایک بڑا مکان اچانک نہیں بنتا۔ سالہا سال تک ایک ایک اینٹ جوڑی جاتی ہے، اس کے بعد وہ مجموعہ تیار ہوتا ہے جس کو مکان کہتے ہیں۔ ایک تالاب اچانک نہیں بھر جاتا۔ بارش ایک عرصہ تک بوند بوند پانی اس میں پہونچاتی ہے تب ایک بھرا ہوا تالاب وجود میں آتا ہے۔ یہی معاملہ انسانی معاملات کا ہے۔ انسانی زندگی میں کوئی بڑا واقعہ اس وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ بہت سے لوگ اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ اپنی تھوڑی کوششوں کو لمبی مدت تک جمع کریں گے۔ انسانی کامیابی صابرانہ عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ وقتی اقدام کا نتیجہ۔

مایوسی نہیں

ابراہام لنکن (۱۸۶۵ - ۱۸۰۹) جدید امریکہ کا معمار ہے۔ امریکہ کی سیاسی تاریخ میں اس کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ مگر لنکن کو یہ کامیابی اچانک نہیں ملی۔ اس کامیابی تک پہونچنے کے لیے اس کو ناکامی کے اَن گنت زینے طے کرنے پڑے۔ لنکن کی زندگی کو ایک شخص نے چند الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

> This man had failed in business in '31. He was defeated in politics in '32, he failed once again in business in '34. He had a nervous breakdown in '41. In '43 he hoped to receive his party's nomination for Congress but didn't. He ran for the Senate and lost in '55; he was defeated again in '58. A hopeless loser, some said. But Abraham Lincoln was elected President of the United States in 1860. He knew how to accept defeat—temporarily.

ایک آدمی ۱۸۳۱ میں تجارت میں ناکام ہو گیا۔ اس نے ۱۸۳۲ میں سیاست میں شکست کھائی۔ ۱۸۳۴ میں دوبارہ اس کو تجارت میں ناکامی ہوئی۔ ۱۸۴۱ میں اس پر اعصاب کا دورہ پڑا۔ ۱۸۴۳ میں وہ الکشن میں کھڑا ہوا مگر ہار گیا۔ ۱۸۵۸ کے الکشن میں اس کو دوبارہ شکست ہوئی۔ لوگ اس کے بارے میں کہنے لگے کہ یہ شخص کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ مگر یہی وہ شخص ہے جو ۱۸۶۰ میں ابراہام لنکن کے نام سے امریکہ کا ۱۶ واں صدر منتخب ہوا۔ اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ شکست کو کیسے تسلیم کیا جائے، عارضی طور پر نہ کہ مستقل طور پر (ستمبر ۱۹۷۲)

کامیابی ہمیشہ ناکامیوں کے بعد آتی ہے۔ اس دنیا میں فتح صرف اس شخص کے لیے ہے جو شکست کو مان لینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور ناکامی کا اعتراف ہی کامیابی کی اصل قیمت ہے۔ جو لوگ یہ قیمت ادا نہ کریں وہ کبھی اس دنیا میں کامیابی کی منزل کو نہیں پہونچ سکتے۔

اس دنیا میں کامیابی کا راز صرف ایک ہے۔ یہ کہ آپ ناکامی کو وقتی واقعہ سمجھیں۔ ناکامی کو دوبارہ کامیابی میں بدلنے کے لیے آپ کبھی اپنا حوصلہ نہ کھوئیں۔

صحیح سبق

حضرت شفیق بلخی اور حضرت ابراہیم ادہم دونوں ہم زمانہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شفیق بلخی اپنے دوست ابراہیم ادہم کے پاس آئے اور کہا کہ میں ایک تجارتی سفر پر جا رہا ہوں۔ سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرلوں۔ کیوں کہ اندازہ ہے کہ سفر میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔

اس ملاقات کے چند دن بعد حضرت ابراہیم ادہم نے دیکھا کہ شفیق بلخی دوبارہ مسجد میں موجود ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ تم سفر سے اتنی جلدی کیسے لوٹ آئے۔ شفیق بلخی نے بتایا کہ میں تجارتی سفر پر روانہ ہو کر ایک جگہ پہونچا۔ وہ ایک غیر آباد جگہ تھی۔ میں نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں میں نے ایک چڑیا دیکھی جو اڑنے کی طاقت سے محروم تھی۔ مجھے اس کو دیکھ کر ترس آیا۔ میں نے سوچا کہ اس ویران جگہ پر یہ چڑیا اپنی خوراک کیسے پاتی ہوگی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ اتنے میں ایک اور چڑیا آئی۔ اس نے اپنی چونچ میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ وہ معذور چڑیا کے پاس اتری تو اس کے چونچ کی چیز اس کے سامنے گر گئی۔ معذور چڑیا نے اس کو اٹھا کر کھا لیا۔ اس کے بعد آنے والی طاقت ور چڑیا اڑ گئی۔

یہ منظر دیکھ کر میں نے کہا سبحان اللہ۔ خدا جب ایک چڑیا کا رزق اس طرح اس کے پاس پہونچا سکتا ہے تو مجھ کو رزق کے لیے شہر در شہر پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس چلا آیا۔ یہ سن کر حضرت ابراہیم ادہم نے کہا کہ شفیق، تم نے اپاہج پرندے کی طرح بننا کیوں پسند کیا۔ تم نے یہ کیوں نہیں چاہا کہ تمہاری مثال اس پرندے کی سی ہو جو اپنے قوت بازو سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے دوسرے ہم جنسوں کو بھی کھلاتا ہے۔ شفیق بلخی نے یہ سنا تو ابراہیم ادہم کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ ابو اسحاق، تم نے میری آنکھ کا پردہ ہٹا دیا۔ وہی بات صحیح ہے جو تم نے کہی۔

ایک ہی واقعہ ہے، اس سے ایک شخص نے بے ہمتی کا سبق لیا اور دوسرے شخص نے ہمت کا۔ اسی طرح ہر واقعہ میں بیک وقت دو پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہ آدمی کا اپنا امتحان ہے کہ وہ کسی واقعہ کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک زاویہ سے دیکھنے میں ایک چیز بری نظر آتی ہے، دوسرے زاویہ سے دیکھنے میں وہی چیز اچھی بن جاتی ہے۔ ایک رُخ سے دیکھنے میں ایک واقعہ میں منفی سبق ہوتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھنے میں مثبت سبق۔

مسائل اور مواقع

انگریزی کا ایک مثل ہے ـــــ مسائل کو بھوکا رکھو، مواقع کو کھلاؤ :

Starve the problems, feed the opportunities.

یہ ایک بہت بامعنی بات ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا ہے۔ جو شخص اس گہری حکمت کو جانے اور اس کو استعمال کرے وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے ں اس حکمت کو نہ جانے اور اس کو استعمال نہ کر سکے اس کے لیے ناکامی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آدمی ہمیشہ دو قسم کی چیزوں کے درمیان رہتا ہے۔ ایک مسائل وسرے مواقع۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کچھ مسائل سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیشہ ہوتا ہے کہ آدمی کے قریبی ماحول میں کچھ قیمتی مواقع موجود ہوتے ہیں جن کو بھرپور استعمال کرکے میابی کی منزل تک پہونچ سکتا ہے۔ یہ صورت حال ایک فرد کے ساتھ بھی پیش آتی ہے اور ایک قوم کے ساتھ بھی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ دنیا لوگوں کا امتحان لے رہی ہے۔ جو شخص صرف اپنے مسائل کو اور اس میں الجھ جائے وہ اپنے مواقع کو کھو دے گا۔ اس کے برعکس جو شخص مواقع کو دیکھے اور بھرپور استعمال کرے وہ مسائل میں زیادہ توجہ نہ دے سکے گا۔ مسائل کو "کھلانا" مواقع کو کا" رکھنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص مواقع کو کھلائے وہ اس قیمت پر ہوگا کہ اس سائل بھوکے رہ جائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ہمیشہ مسائل کو نداز کرنا پڑتا ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مسائل میں الجھنا کبھی کسی کے لیے مفید نہیں ہوتا۔ آخری نتیجہ کے طور پر وہ صرف ت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو مواقع کے استعمال میں لگاتا ہے وہ نہ ف مواقع کا فائدہ حاصل کرتا ہے بلکہ اس کی کامیابی بالواسطہ طور پر اس چیز کو بھی حل کر دیتی ہے ں کو مسائل کہتے ہیں۔

خدا کا ذکر

عن قیس بن ابی حازم قال کان عبد اللہ بن رواحۃ واضعاً راسہ فی حِجرِ امرأتہ فبکی فبکت امرأتہ۔ قال ما یبکیک قالت رأیتك تبکی فبکیت قال انی ذکرت قول اللہ عز وجل (وان منکم الا وارِدھا) فلا ادری انجو منھا ام لا۔ وفی روایۃ وکان مریضاً

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۲)

قیس بن حازم تابعی حضرت عبد اللہ بن رواحہ صحابی کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ وہ اپنا سر اپنی بیوی کے گود میں رکھے ہوئے تھے کہ وہ رو پڑے۔ ان کی بیوی بھی رونے لگیں۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم کو کس چیز نے رلایا۔ بیوی نے کہا کہ میں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو میں بھی رونے لگی۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد آیا کہ تم میں سے ہر شخص جہنم سے گزرے گا (مریم) تو مجھے نہیں معلوم کہ میں اس سے بچ جاؤں گا یا نہیں بچوں گا۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضرت عبد اللہ بن رواحہ بیمار تھے۔

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں۔ ایک جلیل القدر صحابی کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کو شریعت میں "ذکر" کہا جاتا ہے۔ ذکر الفاظ کے ورد کا نام نہیں۔ وہ ایک معنوی طوفان کا نام ہے جو ایک بندے کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے رب کو یاد کرے۔

ایک شخص جو واقعۃً اللہ پر یقین رکھتا ہو وہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ اس کی عظمت سے دہل اٹھتا ہے۔ وہ اس کے سامنے پیشی کے تصور سے کانپنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر کی کیفیت بے اختیارانہ طور پر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی ذکر ہے۔ خدا کا ذکر خدا کو اپنے سینہ میں اتارنے کا نام ہے، ایسے خدا کو جس کی برداشت پہاڑ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طوفان خیز لمحہ میں جو ربانی کلمات انسان کی زبان سے نکلتے ہیں انھیں کا نام ذکر ہے۔ ذکر خدا کو پانے کا نام ہے نہ کہ کسی قسم کے الفاظ کو پانے کا۔

موت

موت کیاہے ، موت معلوم دنیا سے نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ ہے ۔ موت " اپنی دنیا " سے " دوسرے کی دنیا " میں جانا ہے ۔ کیسا چونکا دینے والا ہے یہ واقعہ ۔ مگر انسان کی یہ غفلت کیسی عجیب ؤہ اپنے چاروں طرف لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے ، پھر بھی وہ نہیں چونکتا ۔ حالاں کہ ہر مرنے والا ال سے دوسروں کو بتا رہا ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزرا یہی تمہارے اوپر بھی گزرنے والا ہے ۔

آدمی پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ کامل بے بسی کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے فرشتوں کے ردے ۔ موت کا واقعہ ہر آدمی کو اسی آنے والے دن کی یاد دلاتا ہے ۔

موت کا حملہ سراسر یک طرفہ حملہ ہے ۔ یہ طاقت اور بے طاقتی کا مقابلہ ہے ۔ اس میں انسان کے ں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کامل عجز کے ساتھ فریق ثانی کے فیصلہ پر راضی ہو جائے ۔ وہ رفہ طور پر شکست کو قبول کرلے ۔

موت انسانی زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حد فاصل ہے ۔ موت آدمی کو موجودہ دنیا سے نیا کی طرف لے جاتی ہے ۔ یہ اختیار سے بے اختیاری کی طرف سفر ہے ۔ یہ امتحان کے بعد اس کا پانے کے دور میں داخل ہونا ہے ۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا ۔ وہ معقولیت کے آگے جھکنے پر راضی ہوتا ۔ موت اس لیے آتی ہے کہ اس کو بے یار و مددگار کرکے حق کے آگے جھکنے پر مجبور کر دے ۔ جس ت کو اس نے باعزت طور پر قبول نہیں کیا تھا اس کو وہ بے عزت ہو کر قبول کرے ۔ جس حق کے آگے پنے ارادہ سے نہیں جھکا تھا ۔ اس حق کے آگے مجبورانہ طور پر جھکے اور اس کی تردید کے لیے کچھ بھی سکے ۔

انسان آج حق کی تائید میں چند الفاظ بولنا گوارا نہیں کرتا ۔ جب موت آئے گی تو وہ چاہے گا کہ ی کے سارے الفاظ حق کی موافقت میں استعمال کر ڈالے ، مگر اس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے لکو سنے ۔ انسان آج ڈھٹائی کرتا ہے ، موت جب اس کو پچھاڑے گی تو وہ سراپا عجز و نیاز بن جائے راس وقت کوئی نہ ہوگا جو اس کے عجز و نیاز کی قدردانی کرے ۔

قدردانی

چارلس ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) اپنے اسکول کے زمانہ میں اچھا طالب علم نہ تھا۔ اس کے والد نے ایک بار اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ "تم بس شکار کھیلتے رہتے ہو اور کتوں کے ذریعہ چوہا پکڑنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے ہو"۔ اسکول کی تعلیم کے بعد اس کے والد نے اس کو ڈاکٹری کے کورس میں داخل کیا مگر وہ ڈاکٹری کا کورس مکمل نہ کر سکا۔ اس کے بعد اس نے پادری بننے کا ارادہ کیا اور کیمبرج یونیورسٹی میں دینیات میں داخلہ لیا۔ مگر یہاں بھی وہ ناکام رہا۔

کیمبرج کے قیام کے زمانہ میں ڈارون کو تاریخ طبیعی (Natural history) کے موضوع سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ مضمون اگرچہ اس کے ڈگری کورس کے نصاب میں شامل نہ تھا۔ تاہم ذاتی شوق کے تحت وہ اس کو پڑھتا رہا۔ تاریخ طبیعی اور علم طبقات الارض سے دلچسپی نے ڈارون کو پروفیسر ہنسلو (J.S. Henslow) تک پہونچا یا۔ پروفیسر ہنسلو نہایت علم دوست اور وسیع الظرف آدمی تھے۔ ان سے تعلق ہی ڈارون کے لیے پہلا زینہ تھا جس نے اس کو علم کی دنیا میں چوٹی کے مقام پر پہونچا دیا۔

اس زمانہ میں برطانی حکومت نے اپنے بحریہ کے ایک خاص دخانی جہاز کو جس کا نام بیگل (Beagle) تھا تحقیقات کی مہم پر روانہ کیا۔ یہ جہاز بحر الکاہل اور اٹلانٹک کے ساحلی ملکوں کا پانچ سال (۳۶ - ۱۸۳۱) تک سروے کرتا رہا۔ پروفیسر ہنسلو نے اپنے ذاتی اثرات سے کام لے کر ڈارون کو اس جہاز میں جگہ دلادی۔ ڈارون اس جہاز میں تاریخ طبیعی کے عالم (Naturalist) کے طور پر مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح اس کو موقع مل گیا کہ دنیا کے مختلف حصوں کا عملی مشاہدہ کر سکے۔ ڈارون اس وقت بطور خود بیگل میں جگہ نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ یہ صرف پروفیسر ہنسلو تھے جنھوں نے نوجوان ڈارون کی صلاحیت کو پہچانا اور اس کو اس تاریخی کشتی میں سفر کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اس پانچ سالہ مدت میں ڈارون نے مختلف ملکوں کو دیکھا اور سواحل پر واقع جنگلوں اور پہاڑوں کے سفر کیے۔ کہیں پیدل اور کہیں گھوڑے پر وہ میلوں تک اندر گیا اور ہزاروں کی تعداد میں مختلف قسم کے پودوں اور جانوروں کا مشاہدہ کیا اور ان کے نمونے جمع کیے۔ ساتھ ہی اس نے پتھروں

یں محفوظ مختلف جانداروں کے باقیات (Fossils) کا ذخیرہ بھی اکٹھا کیا۔

اس سفر کے مشاہدات سے اس نے بہت سے نظریات قائم کیے۔ مثلاً یہ کہ مختلف اقسام کے جانور یک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود بہت سے پہلوؤں سے باہم مشابہت رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ کہ لوئی جاندار جس ماحول میں رہتا ہے وہ اسی ماحول کی مناسبت سے اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہے، وغیرہ۔ بنیادی طور پر یہی وہ مشاہدات تھے جو مزید مطالعہ کے بعد ڈارون کے نظریۂ ارتقار کی صورت میں ڈھل گیے۔

راقم الحروف ذاتی طور پر ڈارون کے نظریۂ ارتقار کو سراسر وہم سمجھتا ہے جس کا حقیقت سے لوئی تعلق نہیں۔ تاہم ڈارون کی زندگی میں یہ سبق ہے کہ "بڑوں" کی قدر دانی کس طرح "چھوٹوں" لو آگے بڑھاتی ہے اور ان کی صلاحیت کو نمایاں ہونے کا موقع دیتی ہے۔ جس معاشرے میں بڑے لوگ جوہر کی بنیاد پر افراد کی قدر دانی کریں وہاں افراد ترقی کریں گے اور جہاں ایسا ہو کہ وقت کے بڑے لوگ صرف اپنے حاضر باشوں اور خوشامد پرستوں کی قدر کرنا جانیں وہاں افراد کی صلاحیتیں مرجھا کر رہ جائیں گی۔ ایسا معاشرہ کبھی اعلیٰ ترقی تک نہیں پہونچ سکتا۔

ڈارون کی زندگی کا ایک اور واقعہ بہت سبق آموز ہے۔ ڈارون کے ساتھ ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ ڈارون نے ۱۸۵۲ میں طبیعی انتخاب (Natural Selection) کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کر لیے تھے مگر ابھی اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جون ۱۸۵۸ میں اس کو الفرڈ ویلیس (Alfred Wallace) کا ایک خط موصول ہوا۔ اس خط میں اس نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مقالہ کا ذکر کیا تھا۔ اس مقالہ میں اس نے عین وہی بات لکھی تھی جو ڈارون نے اپنے مقالہ میں لکھ رکھی تھی۔ ڈارون یہ کر سکتا تھا کہ اولیت کا کریڈٹ لینے کے لیے وہ فوراً اپنے مقالے کو شائع کر دے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ اپنے اور ویلیس کے خیالات کو ایک مشترکہ مقالہ کی صورت میں لندن کی سوسائٹی (Lennean Society) کے سامنے پیش کرے تاکہ یہ نیا نظریہ لوگوں کے سامنے زیادہ طاقت اور اہمیت کے ساتھ لایا جا سکے۔ چنانچہ ۲۰ جون ۱۸۵۸ کو ارتقار کا نظریہ ایک مشترکہ مقالہ کی صورت میں لندن کے اہل علم کے اجتماع کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور فوراً ہی اہمیت کا موضوع بن گیا —— اجتماعی عمل ہمیشہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے، بشرطیکہ افراد اپنی انفرادی خواہشوں کو روکیں اور اجتماعی انداز میں کام کرنے کا حوصلہ کر سکیں۔

اعتراف نہیں

نئی دہلی کے ایک خاندان کو ٹیلی گرام ملا۔ اس کا مضمون یہ تھا :

Nani expired

یعنی نانی کا انتقال ہو گیا۔ یہ ٹیلی گرام پڑھ کر گھر کے سب لوگ پریشان ہو گئے۔ پورا خاندان فوری طور پر اس مقام کے لیے روانہ ہو گیا جہاں مذکورہ نانی رہتی تھیں اور جہاں سے ٹیلی گرام موصول ہوا تھا۔ یہ لوگ جب گھبرائے ہوئے اور کافی پیسہ خرچ کر کے مذکورہ مقام پر پہونچے تو وہاں نانی صاحبہ زندہ سلامت موجود تھیں۔

معلوم ہوا کہ ٹیلی گرام کا اصل مضمون یہ تھا کہ نانی پہونچ گئیں Nani reached مگر وہ موصول کرنے والے کلرک کی غلطی سے نانی انتقال کر گئیں (Nani expired) بن گیا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶ دسمبر ۱۹۸۲)

ٹیلی گراف آفس کو اس افسوسناک غلطی کی طرف توجہ دلائی گئی۔ مگر اس کا جو نتیجہ ہوا وہ اخبار کے الفاظ میں یہ تھا :

> The P&T department has not yet accepted the charge of inefficiency, regrets only the inconvenience, if any.
>
> The Times of India, 7.12.1985

محکمہ ڈاک و تار نے اپنی غفلت تسلیم نہیں کی۔ اس نے صرف یہ کہا کہ اگر اس کی وجہ سے کوئی زحمت ہوئی ہو تو اس کو اس کا افسوس ہے۔

اوپر کی مثال صرف محکمۂ تار کی مثال نہیں، یہی موجودہ زمانہ میں تمام لوگوں کا حال ہے۔ "میں نے غلطی کی" صرف چار الفاظ کا ایک جملہ ہے مگر چار الفاظ کا یہ جملہ ادا کرنے والے چار انسان بھی مشکل سے آج کی دنیا میں ملیں گے۔ لوگوں کی ڈکشنری میں صرف یہ الفاظ ہیں کہ "تم غلطی پر ہو"۔ لوگوں کی ڈکشنری ان الفاظ سے خالی ہے کہ "میں غلطی پر ہوں"۔ آج کا انسان کسی قیمت پر اپنی غلطی کو نہیں مانتا، خواہ اس کی خاطر اسے حقیقت کو ذبح کرنا پڑے۔ خواہ ایک غلطی کو نہ ماننے کی کوشش میں وہ مزید بے شمار غلطیاں کرتا چلا جائے۔

انسان کی شخصیت

ایک برتن میں پانی ہے۔ اس سے ایک قطرہ ٹپکا۔ یہ قطرہ اگر بدبودار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ برتن کا سارا پانی بدبودار ہے۔ پانی کا قطرہ پانی کے پورے ذخیرہ کا نمائندہ ہے۔ پانی کا ایک قطرہ جیسا ہے، سمجھ لیجیے کہ سارا پانی ویسا ہی ہوگا۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ہر انسان گویا پانی کا ایک ذخیرہ ہے اس ذخیرہ سے بار بار اس کی بوندیں ٹپکتی رہتی ہیں۔ ان ظاہر ہونے والی بوندوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اندر کا انسان کیسا ہوگا۔ کسی آدمی سے آپ بات کریں اور بات چیت کے دوران اس کی زبان سے ایک ہلکی بات نکل جائے، کسی آدمی سے آپ معاملہ کریں اور معاملہ میں وہ کوئی کمزوری دکھائے، کسی آدمی کے ساتھ آپ کا سفر پیش آئے اور سفر میں اس کی طرف سے کوئی برا سلوک ظاہر ہو تو یہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ وہ آدمی اچھا آدمی نہیں۔

آدمی ایک مکمل مجموعہ ہے۔ جیسے برتن کا پانی ایک مکمل مجموعہ ہوتا ہے۔ کسی آدمی سے ایک کمزوری ظاہر ہو تو وہ اس کی شخصیت کا انفرادی یا استثنائی واقعہ نہ ہوگا بلکہ وہ اس کی پوری شخصیت کا اظہار ہوگا۔ وہ ایک عکس ہوگا جس میں اس کی پوری شخصیت جھلک رہی ہوگی۔ کوئی آدمی کسی معاملہ میں کمزور ثابت ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ ہر معاملہ میں کمزور ہے۔ آدمی ایک معاملہ میں ناقابل اعتماد ثابت ہونے کے بعد ہر معاملے میں اپنے آپ کو ناقابل اعتماد ثابت کر دیتا ہے۔ اس کلیہ میں صرف ایک استثنار ہے اور وہ اس انسان کا ہے جو اپنا محاسبہ کرتا ہو۔ جس کے اندر احتساب کی صلاحیت زندہ ہو۔ جو بار بار اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہو کہ اس نے کیا صحیح کیا اور کیا غلط کیا۔ اس کی زبان کس موقع پر انصاف کی بات بولی اور کس موقع پر وہ انصاف سے ہٹ گئی۔

ایک شخص تجربہ میں غلط ثابت ہو۔ اس کے بعد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ آپ سے معافی مانگے تو سمجھ لیجیے کہ وہ صحیح انسان ہے۔ وہ غلطی کر کے اس کی تصحیح کرنا جانتا ہے۔ مگر جس کا حال یہ ہو کہ اس سے قول یا فعل کی غلطی صادر ہو اس کے بعد اس کا ضمیر اسے نہ تڑپائے۔ اس کے اندر احتساب کی کیفیت نہ جاگے اور اس کی زبان معافی مانگنے کے لیے نہ کھلے تو ایسا انسان بالکل بے قیمت انسان ہے وہ اس قابل نہیں کہ اُس پر کسی بھی معاملہ میں بھروسہ کیا جا سکے۔

جانے بغیر بولنا

۲۲ دسمبر ۱۹۸۵ کا واقعہ ہے۔ میں کچھ ساتھیوں کے ہمراہ دہلی کا زو (چڑیاگھر) دیکھنے گیا۔ مختلف جانوروں کو دیکھتے ہوئے ہم اس مقام پر پہونچے جہاں آہنی کٹہرے کے اندر سفید شیر رکھا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت شیر اپنے غار کے باہر ٹہل رہا تھا اور زائرین کو موقع دے رہا تھا کہ وہ اس کو بخوبی طور پر دیکھ سکیں۔

میں کٹہرے کے پاس دوسرے زائرین کے ساتھ کھڑا ہوا تھا کہ ایک صاحب کی پرجوش آواز کان میں آئی ــــ "سفید شیر اب دنیا میں صرف یہی ایک ہے۔ مہاراجہ ریوا کے پاس دو سفید شیر تھے جو انھوں نے آزادی کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کو دے دیے۔ ان میں سے ایک مر چکا ہے اور ایک باقی ہے جس کو ہم لوگ اس وقت دیکھ رہے ہیں"

مجھے اس وقت تک اس سلسلہ میں زیادہ معلومات نہ تھیں۔ میں ان کی بات سن کر آگے بڑھ گیا مگر چند قدم چلا تھا کہ کٹہرے کے پاس لگا ہوا بڑا سا بورڈ نظر آیا جس پر زو کے ذمہ داروں کی طرف سے سفید شیر کے بارے میں تفصیلی معلومات درج تھیں۔ یہ معلومات دو زبانوں (انگریزی اور ہندی) میں تھیں۔ میں نے اس کو پڑھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت دنیا میں کل ۶۹ سفید شیر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ سفید شیر صرف ہندستان میں ہیں۔ بورڈ میں ۶۹ سفید شیروں کی موجودگی کا ذکر تھا اور عین اس کے قریب ایک صاحب یہ اعلان کر رہے تھے کہ دنیا میں اس وقت صرف ایک سفید شیر پایا جاتا ہے۔ اور یہ واحد شیر دہلی کے زو کی ملکیت ہے۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ لوگ حقیقتوں سے کتنا زیادہ بے خبر ہوتے ہیں اس کے باوجود وہ حقیقتوں کے بارہ میں کتنا زیادہ بولتے ہیں۔ آج کی دنیا میں یہ عام مزاج بن گیا ہے کہ آدمی باتوں کی تحقیق نہیں کرتا۔ اس کے باوجود وہ اس کو اپنا فطری حق سمجھتا ہے کہ وہ ہر موضوع پر بے تکان بولے، خواہ اس کے بارے میں اسے کچھ بھی واقفیت نہ ہو۔

کہنے سے پہلے جانیے۔ اظہار رائے سے پہلے تحقیق کیجیے۔ واقفیت کے بغیر بولنا اگر جہالت ہے تو تحقیق کے بغیر رائے ظاہر کرنا شرارت۔ اور دونوں یکساں طور پر برائی ہیں۔ ان میں اگر فرق ہے تو درجہ کا ہے نہ کہ نوعیت کا۔

مفاد پرستی

ایک لطیفہ ہے کہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر جب یروشلم گیے تو اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناہن بیجن ان کو دیوار گریہ کے پاس لے گیے جو یروشلم میں یہودیوں کی مقدس ترین جگہ ہے۔ وہاں جمی کارٹر نے دعا کرتے ہوئے کہا اے خدا عربوں کو اور اسرائیل کو امن تک پہونچنے میں مدد کر۔ بیجن نے کہا "آمین"۔ اس کے بعد کارٹر نے دعا کی کہ خدایا، مصریوں کو اور اسرائیل کو پرامن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ بیجن نے کہا "آمین"۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے دعا کی کہ خدایا، اسرائیلیوں کو بتادے کہ وہ عربوں کو وہ تمام علاقے واپس کر دیں جن پر انھوں نے ۱۹۶۷ کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ یہ سن کر بیجن نے کہا "جناب صدر، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک دیوار کو خطاب کر رہے ہیں"۔:

When former US president Carter visited Jerusalem, Israel's Prime Minister Begin took him to the Wailing Wall. "Oh God," Carter prayed, "please help the Arabs and Israelis to find peace."
"Amen," said Begin.
"And please, God, let the Egyptians and Israelis live in peaceful co-existence."
"Amen," said Begin.
"And please tell the Israelis to return to the Arabs all the territories they occupied in the 1967 War."
"I would like to remind you, Mr President," said Begin, "that you are talking to a wall."

Reader's Digest, May 1981

یہ صرف اسرائیلی وزیر اعظم کا لطیفہ نہیں، یہی موجودہ زمانہ کے تمام انسانوں کی تصویر ہے۔ لوگ انصاف کی باتیں کرتے ہیں مگر اس سے مراد صرف وہ انصاف ہوتا ہے جس کا فائدہ ان کی اپنی ذات کو مل رہا ہو، جو انصاف ان کی اپنی ذات کے خلاف فیصلہ دے اس سے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ دعاؤں پر آمین کہتے ہیں مگر ان کی آمین صرف اس دعا کے لیے ہوتی ہے جس کی زد دوسروں پر پڑ رہی ہو، جس دعا کی زد خود ان کے اپنے اوپر پڑے اس دعا کے اوپر کوئی آمین کہنے والا نہیں۔ لوگ حق پرستی کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی حق پرستی کا مطلب دوسروں پر اپنے حقوق ثابت کرنا ہے، جو حق انھیں ان کی اپنی ذمہ داریاں یاد دلائے اس حق کا آج کی دنیا میں کوئی خریدار نہیں۔

مغالطہ

کولن ولسن (Colin Wilson) انگریزی زبان کا شاعر تھا۔ اس کے خیالات بہت سخت تھے۔ اس کو بیسویں صدی کے سارے مغربی ادب کا انسان شکست خوردہ، مفلوج اور قنوطیت زدہ نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک آج کا انسان اس ذہنی مرض میں مبتلا ہے جس کو وہ (Fallacy of significance) یعنی بے اہمیتی کا مغالطہ کہتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کا زیادہ بڑا ذہنی مرض وہ ہے جو اس کے برعکس نفسیات پیدا کرتا ہے اور وہ اہمیت کا مغالطہ (Fallacy of insignificance) ہے۔ کچھ لوگ بعض تاریخی یا غیر تاریخی اسباب کے تحت اپنے آپ کو غیر ضروری طور پر اہم سمجھ لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ اپنے آپ کو صحیح طور پر سمجھ پاتے اور نہ دوسروں کے بارے میں حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنے میں کامیاب ہوتے۔

بے اہمیتی کا مغالطہ ایک ذہنی مرض ہے۔ تاہم اس ذہنی مرض کا نقصان آدمی کی صرف اپنی ذات کو پہونچتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو فرضی طور پر غیر اہم سمجھ لے وہ اقدام سے گھبرائے گا۔ وہ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے اپنے آپ کو نااہل سمجھے گا۔ وہ اپنی فعالیت کھو دے گا اور متحرک دنیا میں بے حس و حرکت پڑا رہے گا۔ مگر یہ سب ذاتی نقصان کی چیزیں ہیں۔ بے اہمیتی کے مغالطہ کی قیمت آدمی کو خود ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس مغالطہ کی دوسری قسم اس سے زیادہ سنگین ہے۔ بے اہمیتی کا مغالطہ اپنی ذات کے حق میں زہر ہے اور اہمیت کا مغالطہ پورے سماج کے حق میں زہر۔

اہمیت کے مغالطہ میں مبتلا ہونے والا آدمی اپنے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ لیتا ہے جتنا کہ فی الواقع وہ ہے۔ وہ غیر واقعی طور پر اپنے کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کو جو درجہ دیتے ہیں وہ اس کو اس سے کم نظر آتا ہے جو اس کے اپنے نزدیک اس کا درجہ ہے۔ اس لیے دوسرے تمام لوگ اس کو ظالم نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے سوا ہر ایک کو برا سمجھنے لگتا ہے۔ وہ ہر ایک کا دشمن بن جاتا ہے۔ بے اہمیتی کا مغالطہ اگر آدمی کے اندر پست ہمتی پیدا کرتا ہے تو اہمیت کا مغالطہ آدمی کو جارح بنا دیتا ہے۔ اور جارحیت بلاشبہ سماج کے حق میں پست ہمتی سے زیادہ ہلاکت خیز ہے۔

قرآنی طریقہ

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذالک خیر واحسن تاویلا۔ الم ترالی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالاً بعیدا (النساء ۶۰-۶۱)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اہل امر کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز کے بارہ میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے اچھا ہے کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو تمہارے اوپر اتری ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں۔ حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ وہ انھیں بھٹکا کر بہت دور کر دے۔

قرآن کی اس آیت کا ایک خاص پس منظر ہے جو تاریخ سے اور شان نزول کی روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کو یہاں مختصراً بیان کریں گے۔

یہ آیت اسلامی تاریخ کے اس دور میں اتری جس کو مدنی دور کہا جاتا ہے۔ مدینہ کے ابتدائی دور میں اسلام کا مکمل اقتدار قائم نہ تھا۔ اس زمانہ میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی جس کے پاس لوگ اپنے باہمی جھگڑوں کے فیصلہ کے لیے آتے تھے۔ اسی کے ساتھ سابقہ روایت کے مطابق یہودی سرداروں کی گدیاں بھی اب تک قائم تھیں۔ جو لوگ چاہتے وہ اپنے جھگڑے ان کے پاس لے جاتے اور ان سے اپنے معاملہ میں فیصلہ لیتے۔ گویا وہاں تقریباً وہی صورت حال موجود تھی جس کا ایک نقشہ موجودہ ہندستان میں نظر آتا ہے۔ ہندستان میں ایک طرف اسلامی اداروں کے دار الافتار

یں جن سے مسلمان اپنے قضیوں کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہاں غیر مسلم عدالتیں ہیں جو ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتی ہیں جو ان کے یہاں جائیں اور ان سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ چاہیں۔

سورۂ نسار کی مذکورہ آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کے سلسلہ میں تفسیر کی کتابوں میں مختلف قصے نقل کیے گیے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعیت کے متعدد واقعات مدینہ میں پیش آئے۔ اس کے بعد قرآن میں یہ آیت اتری۔ ان میں سے ایک واقعہ کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

قدیم مدینہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر دو یہودی قبیلے تھے۔ بنو قریظہ نسبتاً کمزور قبیلہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں بنو نضیر کو مال اور تعداد کے اعتبار سے زیادہ بڑی حیثیت حاصل تھی۔ بنو نضیر نے اپنی برتر حیثیت سے فائدہ اٹھا کر یہ اصول مقرر کر ایا کہ اگر بنو قریظہ کا ایک آدمی بنو نضیر کے ایک آدمی کو قتل کرے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا، یا وہ دیت کے طور پر ایک سو وسق کھجور ادا کرے گا۔ اس کے برعکس اگر بنو نضیر کا ایک آدمی بنو قریظہ کے آدمی کو قتل کرے تو قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کو صرف دیت دینا ہوگا، اور دیت بھی ۷۰ وسق کھجور ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے تو دونوں یہودی قبیلوں کے کچھ افراد مسلمان ہوگیے۔ ان نومسلموں میں یہ واقعہ ہوا کہ بنو نضیر سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان نے بنو قریظہ سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد دونوں طرف کے لوگوں میں جھگڑا ہوا۔ بنو نضیر (اور اس کے حلیف قبیلۂ اوس) نے بنو قریظہ سے کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان پہلے سے طے ہے کہ ہمارا قاتل قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کو صرف ۷۰ وسق کھجور بطور دیت دینا ہوگا۔ اس کے مطابق ہم تم کو ۷۰ وسق کھجور دینے کے لیے تیار ہیں۔ بنو قریظہ (اور ان کے حلیف قبیلہ خزرج) نے کہا کہ یہ وہ چیز ہے جو جاہلیت کے زمانہ میں رائج تھی۔ تم نے اپنی طاقت کے زور پر اس غیر منصفانہ اصول کو ہم سے منوا لیا تھا۔ مگر اب ہمارے درمیان اسلام آچکا ہے اور اسلام میں مساوات کا اصول ہے۔ یہاں ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے اب مساوی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔

جھگڑا بڑھا تو بنو قریظہ نے کہا کہ رسول اللہ ؐ کے پاس چلو اور ان سے فیصلہ لو۔ انھیں یقین تھا کہ رسول اللہ ؐ جو فیصلہ کریں گے وہ ان کے حق میں ہوگا۔ مگر بنو نضیر اس کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ کیوں کہ انھیں اندیشہ تھا کہ رسول اللہ ؐ کے یہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ نہ لے سکیں گے۔ چنانچہ بنو نضیر نے کہا کہ

کعب بن اشرف (یہودی سردار) کے پاس چلو اور اس سے فیصلہ لو۔ اس پر یہ آیت اتری۔

سورہ نسار کی مذکورہ آیت میں ایک خاص بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے صرف مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے۔ اس میں یہودی عدالت کے خلاف کوئی بیان نہیں جہاں مدینہ کے یہ مسلمان اپنا فیصلہ لینے گئے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کے معاملہ میں اصلاح کا قرآنی طریقہ کیا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ ساری توجہ مسلمانوں کی اصلاح پر صرف کی جائے۔ کیوں کہ اس خرابی کا اصل سبب مسلمانوں میں ہے نہ کہ غیر مسلم عدالت میں۔

کوئی عدالت خود سے اقدام کرکے کسی کے معاملہ میں دخل نہیں دیتی۔ عدالت اپنا فیصلہ صرف اس وقت دیتی ہے جب کہ کوئی شخص اپنا فیصلہ لینے کے لیے اس کے یہاں جائے اور ان شہادتوں (Evidences) کی بنیاد پر فیصلہ کرتی ہے جو اس کے سامنے پیش کی گئی ہوں۔

مسلمان اگر غیر مسلم عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جائیں تو غیر مسلم عدالت کو یہ موقع ہی نہ ملے گا کہ وہ مسلمانوں کے معاملہ میں اپنا فیصلہ دے۔ گویا اس طرح کے معاملہ میں غیر مسلم عدالت کے خلاف چیخ پکار کرنا اپنی غلطی کا الزام دوسرے کے سر ڈالنا ہے۔ اور اس قسم کا غیر منصفانہ عمل یقینی طور پر اسلامی اصول کے سراسر خلاف ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں اصل قصور وار مسلمان ہیں نہ کہ غیر مسلم عدالت۔ اور جب قصور وار مسلمان ہیں تو دوسرے کے خلاف ہنگامہ کرنے سے کیا فائدہ۔

مذکورہ قرآنی طریقہ کی روشنی میں اب اس معاملہ کو جانچئے جو حال میں شاہ بانو اور محمد احمد (اندور) کے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد پیش آیا ہے۔ قرآن کے مطابق اس معاملہ میں مسلم قائدین کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ملامت کرتے کہ تم غیر مسلم عدالت میں کیوں اپنا مقدمہ لے جاتے ہو۔ تمہارے وہاں جانے ہی کی وجہ سے غیر مسلم عدالت کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ تمہارے عائلی معاملات میں اپنا فیصلہ دے۔ اس کے بجائے تم کو یہ کرنا چاہیے کہ تم اپنے مقدمات اپنے علمار کے سامنے پیش کرو اور وہ از روئے شریعت جو فیصلہ دیں اس کو مان لو۔ اس ملک میں کثرت سے دار الافتار ہیں۔ امارت شرعیہ ہے۔ پھر تم ان کو چھوڑ کر غیر مسلم عدالت میں کیوں جاتے ہو۔ مسلم قیادت نے یہ اصل کام تو نہیں کیا۔ البتہ وہ سپریم کورٹ اور غیر مسلم حکومت کے خلاف ہنگامہ کرنے میں معروف ہے۔ یہ طریقہ بلاشبہ قرآنی طریقہ نہیں۔ یہ لیڈری ہے نہ کہ قرآن کی پیروی۔

ایک سفر

دسمبر ۱۹۸۵ میں بماکو (افریقہ) میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر راقم الحروف نے ہندستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس سفر کا راستہ تھا: دہلی۔ روم۔ ڈکار۔ بماکو۔ دوسرے لفظوں میں ایشیا سے یورپ اور پھر یورپ سے افریقہ۔ کانفرنس کے بعد بماکو۔ پیرس۔ لندن۔ کویت۔ دبئی۔ دہلی کے راستے سے واپسی ہوئی۔

بہت سے لوگوں کے لیے سفر ایک تفریح ہوتا ہے۔ مگر میرے لیے سفر ایک مصیبت ہے۔ چنانچہ میں گھر سے بادل ناخواستہ ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ دلی ایرپورٹ پر پہونچ کر مجھے اس قدر وحشت ہونے لگی کہ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ واپس چلو، مجھے سفر پر نہیں جانا ہے۔ میرے قدم کسی طرح آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ مگر ساتھی کے اصرار اور دینی مصلحت کے خیال سے مجھے آگے جانا پڑا۔

میرے مزاج میں فطرت پسندی اتنی زیادہ ہے کہ مجھے ہر مشینی سفر سے وحشت ہوتی ہے۔ اگر پیدل سفر کرنا ممکن ہو تو یقیناً میں پیدل سفر کروں۔ مگر ظاہر ہے کہ ایشیا سے یورپ، اور یورپ سے افریقہ اور امریکہ کا سفر پیدل طے نہیں کیا جا سکتا۔

میری یہ کیفیت بھی عجیب ہے۔ جن دنیوی چیزوں کو پاکر عام لوگ خوش ہوتے ہیں ان کو پاکر میں ایسا غمزدہ ہوتا ہوں جیسے وہ چیز مجھے کاٹ رہی ہو۔ ۴ دسمبر ۱۹۸۵ کی رات کو پالم ایرپورٹ پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش وخرم چہروں کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ مگر میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ میرے ہاتھ میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ میرے لیے روم (اٹلی) اور ڈکار (سینیگال) میں ہوٹل کے کمرے رزرو تھے۔ بماکو (افریقہ) پہونچ کر مجھے فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ مگر میرا حال یہ تھا کہ جیسے قدم اٹھ نہ رہے ہوں۔ آخر جب میں جہاز کے اندر داخل ہوا تو میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میرے دل کو ایک لمحہ کا سکون بھی حاصل نہ تھا۔

اللہ اپنے اس بندے پر رحم فرمائے جس کا حال یہ ہے کہ جہاں لوگ ہنستے ہیں وہاں اسے رونا آتا ہے۔ جہاں لوگ اپنے کو پایا ہوا سمجھتے ہیں وہاں اس کو ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیوی کامیابی پر قانع نہ ہونے والے آدمی کی اندرونی حالت اتنی مختلف ہوتی ہے کہ اس کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو دنیوی کامیابی پر قانع ہو گئے ہوں۔

صبح کے ناشتہ کے وقت جہاز کے اندر ایر انڈیا کا مینو کارڈ دیا گیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا :

Indian hospitality across five continents

(ہندستانی میزبانی پانچ برّ اعظموں کے درمیان) مطلب یہ ہے کہ ایر انڈیا کی سروس پانچوں برّ اعظموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا مسافر دنیا کے جس برّ اعظم میں بھی جائے وہ ایر انڈیا کو اپنے لیے بہترین میزبان کے طور پر پائے گا۔ میں ناشتہ سے فارغ ہو کر ٹائلٹ جانے کے لیے اٹھا تو جہاز کے عملے کے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا :

You enjoyed your breakfast, Sir.

(جناب، کیا آپ اپنے ناشتہ سے محظوظ ہوئے) ظاہر ہے کہ یہ سب تجارتی اخلاق کی باتیں ہیں۔ تاجر اپنی تجارت کے لیے کتنے خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ دین کی دعوت کو بھی قرآن میں ایک تجارت کہا گیا ہے۔ مگر دین کے داعی اپنے مدعو کے لیے موجودہ زمانہ میں خوبصورت الفاظ نہ پا سکے۔ ان کے پاس اپنے مدعو کو صرف متوحش کرنے والے الفاظ ہیں نہ کہ اس کو مانوس کرنے والے الفاظ۔

دہلی سے روم کا فاصلہ ۶۰۰۰ کیلو میٹر ہے۔ یہ دوری آٹھ گھنٹے میں طے ہوئی۔ ہم ۴ دسمبر کی صبح کو روم کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ روم سے اگلا جہاز شام کو تھا۔ چنانچہ یہاں ایر انڈیا کی طرف سے ہمارے لیے ایک دن کے قیام کا انتظام تھا۔ یہاں میں ہوٹل (Holiday Inn) کے کمرہ نمبر ۲۲۷ میں ٹھہرا۔ یہاں میں نے تین نمازیں پڑھیں ۔ فجر، ظہر، عصر۔

روم اٹلی کا دار السلطنت ہے۔ یہ دنیا کے انتہائی قدیم شہروں میں سے ہے۔ اس کا آغاز غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہوا۔ اس وقت یہاں صرف چند معمولی مکانات تھے۔ اس کے بعد رومیوں کی ترقی کے ساتھ روم کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ایک عظیم شہر بن گیا۔ رومی اس کو ابدی شہر (Eternal City) کہتے تھے۔ روم کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے یورپ میں ایک ہزار سال تک تہذیب کے مقدر پر حکومت کی ہے :

> For well over a millenium Rome controlled the destiny of all civilization known to European man, then fell into dissolution and disrepair. (15/1066)

روم کا ایر پورٹ کافی بڑا ہے۔ اس کو دیکھ کر روم کے بارے میں شاندار تصور ذہن میں آتا ہے۔ مگر حقیقت میں روم اتنا شاندار نہیں۔ جب شہر میں داخل ہوں تو اس کی آبادیاں دوسرے درجہ کے شہر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روم اب ایک زوال یافتہ شہر ہے جہاں زندگی کے ہر جزء پر تنزل کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مشہور

رومی سیاست داں مارکس سسرو (Marcus Tillius Cicero) نے دو ہزار سال پہلے کہا تھا کہ بجٹ متوازن ہونا چاہیے، ورنہ حکومت دیوالیہ ہو جائے گی۔ مگر آج روم کی حکومت پر ۴۰۰ کرور روپئے سے زیادہ کا قرض ہے۔ اس قرض پر اس کو روزانہ تقریباً ایک کرور روپیہ کا سود ادا کرنا پڑتا ہے۔

تعلیم، واٹر سپلائی، اسپتال، ڈاک، ہر چیز کا نظام غیر معیاری ہے۔ ہم کو نیویارک سے دہلی کے لیے ٹیلی فون منٹوں میں مل گیا تھا۔ یہاں سے ہم نے دہلی ٹیلی فون کرنا چاہا مگر کافی کوشش کے بعد بھی سلسلہ نہیں ملا۔ روم میں بجلی کے بارے میں ایک میگزین میں یہ لطیفہ پڑھا کہ روم میں بجلی نہ اے سی ہے اور نہ ڈی سی ہے۔ وہ ایم سی ہے۔ یعنی خراب کرنٹ:

It is neither AC nor DC,
but MC Malfunctioning Current.

اسی طرح ایک اور لطیفہ پڑھنے میں آیا کہ روم کے ایک شخص کے نام ۹۷۶ ٹیلی فون کالوں کا بل آگیا جب کہ درخواست کے باوجود ابھی تک اس کے یہاں ٹیلی فون بھی نہیں لگا تھا۔

روم میں جرائم بھی کافی ہوتے ہیں۔ ایک فرانسیسی سیاح ایک مقام پر اپنی موٹر کار روک کر اترا۔ پولس نے اس کو ہدایت کی کہ وہ کار کے دروازے اچھی طرح بند کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ مگر جب وہ سیر کر کے واپس آیا تو اس کی کار کے سات سوٹ کیس چوری ہو چکے تھے۔ اس کے بعد وہ قریب کے پولس دفتر میں رپوٹ درج کرانے گیا جب وہ واپس آیا تو اس کی کار بھی غائب تھی۔

ایک سیاح نے بتایا کہ روم میں اس کا ایک مسئلہ پیدا ہوا تو ایک مقامی باشندے نے اس سے کہا:

Don't get upset. Rome is Rome. The key
word, my friends, is PAZIMENZA (patience)

پریشان نہ ہو میرے دوست، کلیدی لفظ صرف ایک ہے، اور وہ ہے برداشت۔

روم کی ایک خاص چیز ویٹیکن سٹی ہے۔ یعنی مسیحی پیشوا کا شہر۔ ویٹیکن سٹی رقبہ کے اعتبار سے ایک مربع میل سے بھی کم ہے۔ یہ دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بے حد چھوٹا ہونے کے باوجود وہ خود اٹلی سے بھی زیادہ ذی اثر ہے۔ وہ رومن کیتھولک چرچ کا عالمی مرکز ہے۔ ویٹیکن اٹلی کے اندر ہونے کے باوجود مکمل طور پر خود مختار ہے۔ مگر یہ خود مختاری اس کو اس قیمت پر ملی ہے کہ اس نے اپنے اختیارات کو غیر سیاسی دائرہ میں محدود کر لیا۔

ویٹیکن سٹی کا اپنا ٹیلی فون سسٹم ہے۔ اپنا پوسٹ آفس ہے۔ اپنا طاقت ور ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اپنی پولس ہے۔ اپنا بینکنگ نظام ہے۔ اپنی کرنسی ہے۔ اس کے باشندے ایک ہزار سے بھی کم ہیں مگر ان کا اپنا علاحدہ پاسپورٹ ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر چرچ کے عہدیدار اور کارکن مرد اور عورتیں ہیں۔ ویٹیکن میں بہت سے چرچ ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین چرچ چوتھی صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ یہاں تقریباً ہر چیز باہر سے آتی ہے۔ مثلاً کھانا، پانی، بجلی گیس وغیرہ۔ یہاں کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔

ویٹیکن سٹی کی آزاد اور خود مختار حیثیت مسولینی کی حکومت کے زمانے میں ۱۹۲۹ میں منظور ہوئی۔ یہاں کی لائبریری اور یہاں کے میوزیم میں بہت سے قیمتی نوادرات موجود ہیں جن کو دیکھنے کے لیے لوگ برابر آتے رہتے ہیں۔ ویٹیکن کا اپنا طاقت ور اطالوی اخبار ہے جس کا نام ہے L'Osserva-tore Romano یہاں کا پریس اتنا بڑا ہے کہ وہ ہر زبان میں کتاب چھاپ سکتا ہے۔ جارجیا کی قدیم زبان سے لے کر ہندستان کی تامل تک ہر زبان میں یہاں کتاب چھاپی جا سکتی ہے۔

سب سے پہلے سینٹ پال روم میں آئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ پیٹر بھی روم آئے تھے۔ قرون وسطیٰ میں پوپ عملاً پورے یورپ کا مقتدر اعلیٰ تھا۔ وہ کسی بادشاہ کو معزول کرنے کا حق رکھتا تھا۔ مگر بعد کو بادشاہوں نے بغاوت کی یہاں تک کہ چرچ اور اسٹیٹ کی علاحدگی عمل میں آئی۔ بادشاہ سیاست کا حکمراں قرار پایا اور پوپ مذہب کا۔ یورپ میں پوپ کا سیاسی اقتدار باقاعدہ طور پر ۱۸۷۰ میں ختم ہوا۔

ویٹیکن میں ایک اسلامی شعبہ بھی قائم ہے۔ اس شعبہ کے ذمہ دار کا نام و پتہ یہ ہے :

Rev. Fr. Thomas Michel
Secretariats pro Non-Christians
00120 Cittadel Vaticano
Roma; Italy

ویٹیکن پورے معنوں میں ایک "اسٹیٹ" ہے، صرف یہ کہ اس کے پاس باقاعدہ فوج نہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں ۱۰۸ ملکوں سے اس کے سفارتی تعلقات ہیں۔ پچھلے پوپ عام طور پر ویٹیکن سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر موجودہ پوپ بہت متحرک قسم کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کثرت سے بیرونی سفر کیے ہیں اور دوسری غیر روایتی سرگرمیاں دکھائی ہیں۔ انھیں میں سے ایک ہے : ویٹیکن کے دو حریفوں اینگلیکن چرچ اور اسلام سے تعلقات قائم کرنا۔ اگرچہ ایک مبصر کے الفاظ میں پوپ کو پہلے معاملے میں کامیابی ہوئی اور دوسرے معاملہ میں

کامی:

He initiated moves for a new relationship with Islam without success, and with the Anglican Church with success.

ہندستان میں عیسائیوں کی تعداد ۲ فی صد ہے۔ مگر دنیا بھر میں کیتھولک عیسائی تقریباً ایک ارب کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے تمام کیتھولک چرچ براہ راست طور پر ویٹیکن کے ماتحت ہیں۔ ان کے تمام معاملات ویٹیکن کی ماتحتی میں انجام پاتے ہیں۔ چرچوں میں پادریوں کا تقرر، ان کا معاوضہ، ان کی ترقی یا عزل سب براہ راست ویٹیکن کرتا ہے۔ صرف ہندستان میں گیارہ ہزار (Catholic priests) پادری ہیں اور وہ سب کے سب مکمل طور پر ایک بیرونی ادارہ (ویٹیکن) کے احکام کے تحت عمل کرتے ہیں۔ ویٹیکن اپنی ساری وسعت کے باوجود ایک انتہائی منظم عالمی ادارہ کے طور پر کام کرتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا ایسا کوئی ادارہ ہو تو غالباً اس کی ہر شاخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا کہ وہاں جس شخص کو مقامی انچارج بنایا جائے گا وہ پہلی فرصت میں یہ منصوبہ بنائے گا کہ قانونی یا غیر قانونی تدبیر کرکے اپنی زیر انتظام شاخ کو ایک الگ ادارہ بنائے اور آزادانہ طور پر خود اس کے اوپر قابض ہو جائے۔

مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ ماتحتی کو قبول نہیں کرتے۔ اور بلاشبہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

دہلی اور روم میں وقت کا فرق ساڑھے چار گھنٹے ہے۔ دہلی سے ہمارا جہاز دو بجے رات کو روانہ ہوا تھا۔ جب وہ روم پہونچا تو مقامی وقت کے لحاظ سے صبح ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا، جب کہ اس وقت دہلی کی گھڑی میں دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کی گھڑی کے لحاظ سے ہم ساڑھے چار گھنٹہ پہلے روم پہونچ گئے —— ہندستان سے مغرب کی طرف سفر کریں تو آپ وقت کو حاصل کرتے ہیں اور اگر ہندستان سے مشرق کی طرف سفر کریں تو آپ وقت کو کھو دیتے ہیں۔

۵ دسمبر کو میں دکار (سینیگال) پہونچا۔ روم سے دکار کا سفر ایر افریق (Air Afrique) کے ذریعہ ہوا۔ یہاں تقریباً ۲۰ گھنٹے قیام رہا۔ ہوائی سفر کا قاعدہ ہے کہ اگر آپ کو کسی مقام پر جہاز بدلنے کے لیے ٹھہرنا ہے اور آگے کی فلائٹ میں آپ کی سیٹ کنفرم ہے تو ہوائی کمپنی اپنے خرچ پر آپ کو ہوٹل میں ٹھہرائے گی۔ اور ہوائی اڈہ سے ہوٹل آنے جانے کے لیے سواری بھی اپنی طرف سے مہیا کرے گی۔ اس کے لیے ہوائی اڈہ

پر مستقل ڈسک ہوتے ہیں۔ روم کے ہوائی اڈہ پر یہ ڈسک پیسنجر سروس کے نام سے ہے اور دکار میں ایر افریق اور ایر فرانس کے نام سے۔ آپ یہاں اپنا ٹکٹ دکھا کر کاغذ بنوا لیجیے۔ اس کے بعد ہوٹل کے لوگ بطور خود آپ کا انتظام کریں گے۔ اگر وقت کافی ہو تو سفر کے آغاز سے پہلے ہی بذریعہ ٹیلکس ہوٹل کا رزرویشن ہو جاتا ہے۔

دکار میں میرا قیام ہوٹل میریڈین (Meridien) کے کمرہ نمبر ۵۶۹ میں تھا۔ یہ ہوٹل وسیع پہاڑی ماحول میں قائم ہے۔ ہوا نہایت خوش گوار ہے۔ یہاں نماز پڑھتے ہوئے دعا نکلی : خدایا میں نے تیرے آگے ایشیا میں سجدہ کیا تھا۔ پھر میں نے یورپ میں تیرے آگے سجدہ کیا اور اب افریقہ میں تیرے آگے سجدہ کر رہا ہوں۔ تو میری نمازوں کو قبول فرما اور مجھے بخش دے۔

دکار سینیگال کی راجدھانی ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ لوگ یا تو فرانسیسی زبان بولتے ہیں یا مقامی زبان۔ تاہم عربی اور انگریزی بولنے والے بھی بقدر ضرورت مل جاتے ہیں۔ یہاں موریطانیہ کے ایک صاحب ملے۔ وہ وہاں ریڈیو اور ٹیلی وزن کے محکمہ میں کام کرتے ہیں۔ وہ عربی اچھی جانتے تھے اور میری کتاب (الاسلام یتحدّیٰ) سے واقف تھے۔

دکار (Dakar) افریقہ کے چند اہم شہروں میں سے ایک ہے۔ سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے اس کو ترقی کے کافی مواقع ملے ہیں۔ ۱۹۰۴ سے ۱۹۵۹ تک وہ فرانس کے قبضہ میں رہا۔ ۱۶۷۷ میں پہلی بار فرانسیسی یہاں سمندر کے راستہ سے داخل ہوئے تھے۔ سینیگال میں تقریباً ۹۰ فی صد مسلمان ہیں۔ دکار کی آبادی ایک ملین کے لگ بھگ ہے۔

دکار کا ہوٹل میریڈین عین سمندر کے کنارے ہے اور نہایت وسیع رقبہ میں رزورٹ کے انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس کے ایک طرف دور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب مناظر ہیں اور دوسری طرف سمندر کی لہریں موجیں مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ گویا ایک طرف جمالِ خداوندی کے مناظر ہیں اور دوسری طرف جلالِ خداوندی کے۔ مگر لوگوں کے چہرے بتاتے ہیں کہ وہ یہاں صرف تفریح کے لیے آتے ہیں۔ انھوں نے یہاں نہ خدا کے جمال کو دیکھا اور نہ اس کے جلال کا مشاہدہ کیا۔

ڈچ نے ۱۶۱۷ء میں یہاں کا ایک چھوٹا جزیرہ خرید کر حاصل کیا تھا۔ اس وقت سے یہاں مغربی تدخل کا آغاز ہوا۔ فرانسیسیوں نے اس جزیرے پر ۱۶۷۷ میں قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہاں برطانی آئے۔ بالآخر فرانسیسیوں نے اس کا بڑا حصہ ۱۸۵۰ میں فتح کیا۔ ۱۸۸۵ میں یہاں پہلی ریلوے قائم کی گئی۔ دکار کا صدارتی محل

دنیا کے چند خوبصورت ترین صدارتی محلوں میں سے ہے۔ دکار کا یوف ایرپورٹ (Yof Airport) امریکہ کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ یہاں مونگ پھلی کافی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم تک یہاں کی مونگ پھلی تیل تیار کرنے کے لیے فرانس جاتی تھی۔ اب خود ملک میں اس کے کارخانے کھل گیے ہیں۔ دوسری بہت سی صنعتیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔ نہر سوئز بند ہونے کے زمانہ میں دکار کی بندرگاہ کی تجارتی سرگرمیاں کافی بڑھ گئی تھیں۔ دکار اپنی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے سیاحوں کا مرکز ہے۔

دکار میں جب ہم مقررہ وقت پر ہوٹل سے ایرپورٹ پہونچے تو معلوم ہوا کہ کسی ٹکنکل سبب (Technical Reason) سے جہاز مزید لیٹ ہوگیا ہے۔ دوبارہ ہم ایک اور ہوٹل میں لے جائے گیے جس کا نام ہوٹل ترنگا (Hotel Sofitel Teranga) تھا۔

ہوٹل کے نام میں "ترنگا" کا لفظ دیکھ کر ہمیں ہندستانی لفظ ترنگا یاد آیا۔ جس کے معنی ہیں تین رنگ والا۔ مگر مقامی زبان میں اس لفظ کا مطلب ہے تکریم۔ ہوٹل ترنگا کا مطلب ہے عزت وتکریم والا ہوٹل۔

دوبارہ جب میں دکار کے ایرپورٹ پر پہونچا تو یہاں گامبیا کے ایک صاحب (احمد ڈرامے) سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آج جب کہ میں یہاں دکار کے ایرپورٹ پر تھا۔ دکار کا ایک آدمی آیا۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کو کسی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ آپ آج یہاں سے گزر رہے ہیں۔ اس نے آپ کی عربی کتابیں اور مجلۃ الامۃ (قطر) میں آپ کے بارہ میں مضمون پڑھا تھا۔ میں نے جب بتایا کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ سے ملا ہوں تو وہ بہت حیرت کے ساتھ مجھ سے آپ کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ وہ دیر تک ایرپورٹ پر رہا۔ پھر مایوس ہوکر چلا گیا۔ واضح ہو کہ ہوائی جہاز لیٹ ہو جانے کی وجہ سے اس وقت میں ہوٹل ترنگا میں تھا۔ یہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۲۰۳ میں تھا۔

دکار کے ہوائی اڈہ پر دو امریکی مسلمانوں (سلیم بن غانم، حسن عجرم) سے ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں اصلاً لبنانی ہیں۔ مگر ان کے آبار امریکہ میں رہنے لگے۔ یہ لوگ اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ اپنی آبائی زبان عربی سے برائے نام واقف ہیں۔

ان کو میں نے الرسالہ (انگریزی) دیا۔ وہ اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ اس کے مضامین پڑھتے جاتے تھے اور "گڈ، گڈ" کہتے جاتے تھے۔ الرسالہ (انگریزی) کی زبان کی انھوں نے خاص طور پر بہت تعریف کی۔

انھوں نے کہا کہ امریکہ میں اسلام کے تعارف کے لیے ہمیں انگریزی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت انگریزی میں جو کتابیں دستیاب ہیں وہ زیادہ تر ان لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں جو اسلام کو سیاسی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ انداز امریکیوں کو زیادہ اپیل نہیں کرتا۔ ہمیں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جس میں اسلام کو اس کے فطری اور ابدی انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ میں نے تعارفی سٹ (انگریزی) کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس سے بہت دل چسپی ظاہر کی۔ انشاء اللہ ان کو انگریزی کا تعارفی سٹ بھیج دیا جائے گا۔

ڈکار ایرپورٹ پر کئی غیر مسلم یورپی ملے۔ وہ بماکو جا رہے تھے۔ ایک صاحب اٹلی کے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا مضمون جیالوجی ہے۔ وہ ایک پروجکٹ میں مدد کرنے کے لیے اکسپرٹ کے طور پر بماکو جا رہے ہیں۔

اکثر افریقی ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مگر یہ ممالک مستقل طور پر اپنی پسماندگی کی قیمت مغربی اقوام کے تدخل کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ اولاً مغربی قوموں نے افریقہ میں سیاسی غلبہ حاصل کیا۔ اس کے بعد جب آزادی کا وقت آیا تو انھوں نے افریقی عوام کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر ان کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ اب وہ تکنکی ماہرین اور مسیحی مبلغین کے ذریعہ یہاں نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے قائدین اس کو ظلم سے تعبیر کریں گے مگر حقیقۃً یہ اپنی پسماندگی کی قیمت ہے جو افریقہ مسلسل ایک یا دوسری صورت میں ادا کر رہا ہے۔

ڈکار سے بماکو کے لیے ایر افریق سے روانگی ہوئی۔ جہاز میں ایر ہاسٹس نے کھانے کے لیے پوچھا۔ یہ غالباً افریقہ کی عیسائی خاتون تھی۔ میں نے کہا کہ "ویجیٹیرین"۔ وہ اچھی انگریزی جانتی تھی مگر ویجیٹیرین کا لفظ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیوں کہ یہاں کثرت سے لوگ گوشت کھاتے ہیں۔ میں نے کئی بار دہرایا تو اس نے حیرت کے ساتھ کہا:

Oh, you are vegetarian!

(اف، آپ سبزی خور ہیں)

ہم ۶ دسمبر کی صبح کو بماکو (Bamako) پہونچے۔ یہاں ہوٹل میں حسب معمول طرح طرح کی چیزیں بک رہی تھیں۔ شرکار اجتماع میں سے ایک صاحب زیور کی الماری کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے بچوں کے لیے زیور خریدنے لگے۔ یہ ایک افریقی عالم تھے اور عربی اچھی جانتے تھے۔ ان سے میری کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا کہ ایسے بن جائیے کہ آپ کو صرف آیات اللہ نظر آئیں۔ یہ چیزیں آپ کو دکھائی نہ دیں جو آیات الانسان کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہ میں بچوں کے لیے لے رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ اپنے بچوں کو بھی ویسا ہی بنائیے جیسا آپ کو بننا ہے۔ وہ ہنس کر کہنے لگے " آپ تو ابوذر غفاری ہیں۔ ہم لوگ ایسے کہاں بن سکتے ہیں "

۲ دسمبر ۱۹۸۵ کی صبح کو ہم ایرافریق کے ذریعہ بماکو پہونچے۔ بماکو مالی کی راجدھانی ہے۔ یہ سفر وقفہ کے لحاظ سے میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ طویل تھا۔ ۲ دسمبر کا دن گزار کر رات کو میں نے عشاء کی نماز دہلی میں پڑھی تھی۔ اس کے بعد برابر سفر میں رہا۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر کو فجر کی نماز بماکو میں پڑھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ نومبر ۱۹۸۵ کے تیسرے ہفتے میں امریکہ میں تھا۔ وہاں سے واپسی کے جلد ہی بعد دسمبر کے پہلے ہفتہ میں یورپ سے گزرتے ہوئے افریقہ آنا ہوا۔ اس تین ہفتہ کے اندر میں نے اپنی نمازیں چار بر اعظموں (امریکہ، ایشیا، یورپ، افریقہ) میں ادا کیں۔ اس طرح گویا خدا کی زمین کے بیشتر حصہ میں خدا کے آگے سجدہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ اپنی مغفرت کی دعا کے بعد دوسری دعا جو دل سے نکلتی رہی وہ یہ تھی کہ خدایا، بھٹکے ہوئے لوگوں کی ہدایت کا سامان فرما۔

مالی کا رقبہ ۱۲۴۰۰۰۰ مربع کیلو میٹر ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۷۰ کی مردم شماری کے مطابق تقریباً ستر لاکھ ہے۔ بماکو اس کی راجدھانی ہے۔ یہ ملک ۱۸۹۸ سے لے کر ۱۹۶۰ تک فرانس کے زیر قبضہ رہا۔ اب وہ آزاد ہے۔ مالی بنیادی طور پر زرعی ملک ہے۔ اس کا تقریباً نصف حصہ صحرا ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا دریا نائجر ہے۔ ۹۰ فی صد آبادی زراعت پیشہ ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان ابھی تک فرانسیسی ہے۔ آبادی میں تقریباً ۹۰ فی صد مسلمان ہیں۔ عیسائیوں کی تعداد صرف ۲ فی صد ہے۔ یہاں کے لوگ گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمان ہوئے۔ بماکو کی آبادی تقریباً چھ لاکھ ستّرہ ہزار ہے۔ تعلیم دس فی صد ہے۔ مالی میں لوہا پیدا ہوتا ہے۔ وہ ملک میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ باکسائٹ، مینگنیز، فاسفورس وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ سونا بھی ملتا جاتا ہے۔ تاہم ذریعہ آمدنی زیادہ تر زراعت اور مچھلی ہے۔ مچھلی نائجر دریا سے حاصل کی جاتی ہے۔ ریل صرف ۴۰۰ میل تک ہے زیادہ تر روڈ سے سفر کیا جاتا ہے۔ یہاں کی حکومت کا نظام جمہوری ہے۔ مالی کا انحصار فرانس کی مدد پر رہا ہے اب عرب ملکوں سے بھی اس کو کافی امداد مل رہی ہے۔ مالی مغربی افریقہ میں واقع ہے۔ اس کو سمندری کنارہ حاصل نہیں۔

بماکو میں میرا قیام ہوٹل (Hotel Sofitel L'Amitie) میں تھا۔ میرے کمرہ کا نمبر ۱۲۷ تھا۔ میرا مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ "درو دیوار" سے مجھے انس نہیں ہوتا۔ خواہ وہ تعمیراتی اعتبار سے کتنے ہی

شاندار کیوں نہ ہوں ۔ البتہ فطرت کے مناظر ہوں تو ان سے میں فوراً مانوس ہو جاتا ہوں ۔ میرے کمرے کے ایک طرف حسب معمول در و دیوار تھے مگر دوسری جانب دور تک سرسبز و شاداب مناظر پھیلے ہوئے تھے ۔ یہاں کی سب سے بڑی ندی نائجر سامنے سے گزر رہی تھی اور اس کے چاروں طرف درختوں کی ہریالی نظر آتی تھی ۔ دیوار سے دیوار تک لگے ہوئے شیشوں کے ذریعہ میں ہر وقت انھیں دیکھ سکتا تھا ۔ یا کمرہ کے باہر بالکنی میں جا کر ان کا ہم نشین بن سکتا تھا ۔ خدا کی مخلوقات میں خدا دکھائی دیتا ہے ۔ اگرچہ بہت سے لوگ مخلوقات میں صرف مخلوقات ہی کو دیکھ پاتے ہیں ۔ ان کی نظر اس سے آگے نہیں جاتی ۔

مالی میں مختلف عرب ملکوں کے تعاون سے بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں ۔ بماکو میں سعودی عرب کی امداد سے ایک مسجد بنائی گئی ہے جو یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے ۔ ۶ دسمبر کو ہم نے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں پڑھی ۔ یہ مسجد ایک بہت بڑے ہال کی مانند ہے ۔ ہال کا اندرونی حصہ ۸۰ اونچے اونچے کھمبوں پر کھڑا کیا گیا ہے ۔ پوری مسجد بالکل جدید انداز میں بنائی گئی ہے ۔ جمعہ کے خطبہ کے لیے عام طور پر الگ ممبر ہوتے ہیں جن سے مسجد کے آگے کا ایک حصہ گھرا ہوا ہوتا ہے ۔ یہاں ممبر کی صورت یہ ہے کہ دیوار کے اوپری حصہ میں اس کے لیے جگہ نکالی گئی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے دیوار میں بہت بڑا طاق بنا دیا جائے جس میں آسانی سے آدمی کھڑا ہو سکے ۔ اس " طاق " کے نچلے حصہ میں بالکنی کی مانند تھوڑا سا حصہ آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور اس پر ریلنگ کے انداز میں گھیرا بنا دیا گیا ہے ۔

عرب ملکوں کے ذریعہ اس قسم کے بے شمار کام ساری دنیا میں ہو رہے ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انتظام ہے جو اس نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو زندہ رکھنے کے لیے کیا ہے ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیڈروں کے شاندار الفاظ کے باوجود مسلمان زمانہ کے لحاظ سے آج اتنا پیچھے جا چکے تھے کہ اگر " پٹرو ڈالر " کی خدائی طاقت ظاہر نہ ہوئی ہوتی تو مسلمان موجودہ زمانہ میں بین اقوامی اچھوت بن کر رہ جاتے ۔

دہلی اور بماکو میں وقت کا فرق ساڑھے چھ گھنٹہ ہے ۔ بارہ بجے رات کو جب بماکو کے کیلنڈر میں ایک تاریخ ختم ہو کر دوسری تاریخ شروع ہوتی ہے ، اس وقت دہلی میں ابھی کیلنڈر بدلنے کے لیے ساڑھے چھ گھنٹے کی مدت باقی رہتی ہے ۔ اگر آپ ایک مقام کی گھڑی دوسرے مقام پر بغیر بدلے ہوئے پہنے رہیں تو آپ مقامی وقت کے لحاظ سے چھ گھنٹہ آگے یا چھ گھنٹہ پیچھے رہیں گے ۔

یہاں کناڈا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ ان کو ہمارا انگریزی الرسالہ برابر جا رہا ہے ۔ ان

میں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے اس کے مضامین کے بارہ میں بہت اچھے تاثر اظہار کیا۔ انھوں نے کہا :

Very simple, very effective

ہت سادہ اور بہت اثر انگیز) ایک صاحب کینیا سے آئے تھے۔ ان کو بھی انگریزی الرسالہ جارہا ہے۔ ہوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کم از کم دس آدمی پابندی سے آپ کا انگریزی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ان کو ایک سالہ کے بعد دوسرے رسالہ کا انتظار رہتا ہے۔ اور یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو انگریزی زبان ے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔

یہاں کی اسلامی کانفرنس میں ایک صاحب سوئزر لینڈ سے آئے تھے۔ ان کو بھی انگریزی الرسالہ ابر جارہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں کئی لوگ اس کو پابندی سے پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس کے بان و بیان کا پرزور الفاظ میں اعتراف کیا۔ مزید انھوں نے بتایا کہ سوئزر لینڈ میں ایک صاحب انگریزی الرسالہ کے اتنا زیادہ قدر داں ہیں کہ انھوں نے اس کے کئی مضامین کو ٹیپ پر منتقل کیا اور اس کو وہاں کے ریڈیو ٹیشن سے نشر کرایا۔

میں اپنے ساتھ کتابیں نہیں لے گیا تھا۔ میرے ساتھ صرف عربی کتاب (الدین فی مواجہۃ العلم) کے چند لنسخے تھے اور انگریزی الرسالہ کی چند کاپیاں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جس سے بھی کتاب یا رسالہ کا ذکر آیا وہ بے حد شوق اور احترام کے ساتھ اس کو لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ بور است اسے مل سکے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں بے شمار لوگ اسلام کو وقت کے اسلوب میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر آج اسلامی مرکز کے سوا غالباً کوئی بھی ادارہ نہیں جو اسلام کی تعلیمات کو جدید عصری اسلوب میں پیش کر رہا ہو۔ بعض لوگ اسلام کو سیاسی اسلوب میں پیش کرتے ہیں اور غلطی سے سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کو عصری اسلوب میں پیش کر رہے ہیں۔ حالاں کہ عصری اسلوب سائنٹفک اسلوب کا نام ہے نہ کہ سیاسی اسلوب کا۔

کانفرنس میں ویسٹ انڈیز کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی مادری زبان انگریزی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم امریکہ میں حاصل کی ہے۔ وہ انگریزی الرسالہ سے واقف نہ تھے۔ ان کو انگریزی الرسالہ کا ایک شمارہ (نومبر ۱۹۸۵) دیا گیا۔ انھوں نے رات کو سونے سے پہلے پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد بار بار تقاضا کرتے رہے کہ یہ رسالہ میں مستقل طور پر پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے بہ تکرار وعدہ لیا کہ میں انھیں

انگریزی الرسالہ روانہ کروں گا۔

ان سے میں نے انگریزی الرسالہ کے بارے میں ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا :

It is a very impressive and relevant piece of literature about Islamic realities.

(یہ اسلامی حقیقتوں کے بارہ میں ایک بے حد موثر اور بہت متعلق ادب پارہ ہے) موصوف گیانا کے اسلامک سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔

افریقہ کا مشہور تاریخی شہر تمبکتو (Tumbukto) اسی مالی میں واقع ہے۔ تمبکتو چودھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک اس علاقہ میں اسلامی تعلیم اور اسلامی ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ تمبکتو کی بنیاد غالباً ۱۱۰۰ء میں پڑی۔ ابتداءً اس نے تجارتی مرکز کی حیثیت سے ترقی کی۔ اس کے بعد وہ ثقافتی اور علمی مرکز بن گیا۔ یہاں قدیم زمانہ میں کئی اسلامی یونیورسٹیاں قائم تھیں جن میں علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کے طلبہ آتے تھے۔ تمبکتو کی مرکزی حیثیت ۱۵۹۱ء میں ختم ہوئی جب کہ وہ مراکو کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد وہاں بار بار انقلابات آتے رہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا گیا تھا اور کانفرنس کے تمام شرکاء اس کے ذریعہ تمبکتو کو دیکھنے کے لیے جانے والے تھے۔ مگر بعض وجوہ سے مجھے جلد دہلی پہونچنا تھا اس لیے میں تمبکتو کے سفر میں شریک نہ ہوسکا اور ۹ دسمبر کی شام کو بماکو سے دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔

۹ دسمبر ۱۹۸۵ کو یہاں کا اسلامی مرکز دیکھا۔ بماکو کا یہ اسلامی مرکز شارع زائد بن سلطان پر واقع ہے وہ ۲۵ ہزار مربع میٹر کے رقبہ میں پانچ ملین ڈالر کے خرچ سے بنایا گیا ہے۔ اس کا فنڈ عرب ملکوں نے ادا کیا ہے۔ یہاں کی مسجد میں میں نے دو رکعت نماز ادا کی۔

کانفرنس کے تمام شرکاء اجتماعی طور پر مرکز میں لے جائے گئے تھے۔ یہ مرکز ابھی بن کر تیار ہوا ہے۔ تاہم ابھی اس میں کام نہیں شروع ہوا ہے۔ لوگ گھوم گھوم کر شاندار مرکز کے مختلف حصے دیکھ رہے تھے اور پرجوش طور پر باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموش اپنے خیالات میں کھویا ہوا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس دوران ایک افریقی عالم استاذ احمد درامے میرے پاس آئے اور مسکراتے ہوئے میرے بارہ میں کہا :

يُعجبُ الناس بالمباني ويُعجبُ الشيخ بالمعاني

موجودہ زمانہ میں اس طرح کے بڑے بڑے اسلامی مراکز دنیا کے ہر حصہ میں بنائے گئے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ یہ ہے کہ وہ بالواسطہ یا براہ راست طور پر حکومتوں کے عطیہ سے بنتے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ پسند طبقہ کا بڑا حصہ اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہے۔ وہ جگہ جگہ مسلم حکومتوں کے خلاف سیاسی انقلاب اٹھائے ہوئے ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مسلم حکومتوں کی نظر میں معتوب یا کم از کم مشتبہ ہو گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ ٹی سیاست نہ چلاتے تو یہ تمام مراکز ان کے قبضہ میں ہوتے اور ان سے وہ دعوت اسلامی کا زبردست ۔ مگر اپنی سیاست پسندی کی وجہ سے وہ یا تو ان مراکز سے محروم ہیں یا اگر کہیں کوئی مرکز ان کے ہاتھ آگیا ہے تو پنے غلط قسم کے سیاسی ذہن کی وجہ سے مفید نہیں بنا پاتے۔

مالی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ نوآبادیاتی دور میں جن مقامات پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا ے اعلیٰ طبقوں میں انگریزی زبان رائج ہو گئی۔ اسی طرح جن علاقوں میں فرانس کی حکومت تھی وہاں کے اونچے کی زبان فرانسیسی ہو گئی۔ یہ صورت حال اب بھی جاری ہے جب کہ انگریز اور فرانسیسی ان علاقوں سے پہلے سیاسی طور پر واپس جا چکے ہیں۔ یہاں کے عوام علاقائی زبان بولتے ہیں۔ مگر خواص کی زبان ابھی تک ی اور فرانسیسی ہے۔

یہی معاملہ قدیم زمانہ میں عربی زبان کے ساتھ ہوا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب شمالی افریقہ فتح اس کے بعد مسلمان سمندر کو پار کر کے اسپین اور سسلی میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے صرف حکومت نہیں ایک شاندار تہذیب کی بنیاد ڈالی جو اس وقت کی عیسائی دنیا سے بہت زیادہ آگے تھی۔ چنانچہ ان علاقوں سائی کثرت سے عربی لکھنے اور بولنے لگے۔ غیر مسلموں نے اس زمانہ میں عربی زبان اور عربی علوم میں اتنی ت پیدا کی کہ ٹامس براؤن (Thomas Brown) جو انگلستان کا ایک عیسائی تھا وہ اسلامی عہد میں کے اندر قاضی مقرر کیا گیا۔

پھر جب اس علاقہ سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک اسپین لی کا اعلیٰ طبقہ عربی زبان بولتا رہا۔ اور عدالتوں اور دفتروں میں عربی زبان رائج رہی۔ اگرچہ عوام علاقائی زبان عبرانی اور لاتینی تھی مگر خواص کی زبان بدستور عربی ہی بنی رہی۔

برٹرینڈ رسل نے سسلی میں مسلم عہد کے بعد عربی زبان اور تہذیب کے غلبہ کا اعتراف ان الفاظ لیا ہے:

> Greek and Arabic were still living languages in Sicily. Frederick learnt to speak six languages fluently (including Arabic). He was at home in Arabian philosophy, and had friendly relations with Mohammadans.
>
> *A History of Western Philosophy* p. 436

باکو کی اسلامی کانفرنس کا افتتاح ۶ دسمبر ۱۹۸۵ کی شام کو ہوا۔ افتتاح کی تقریب میں مالی کے و
خارجہ، وزیر داخلہ، وزیر تعلیم اور دوسرے بہت سے ذمہ دار موجود تھے۔ اس کانفرنس میں تین زبانیں رائج
ـــــ عربی، انگریزی اور فرانسیسی۔ اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے نمائندہ افراد شریک ہوئے۔ چنا
کویت کے نمائندہ نے تقریر کی تو انھوں نے اپنی تقریر میں یہ الفاظ استعمال کیے :

اتینا من مشارق الارض ومن مغاربها

اس کانفرنس میں حسب ذیل ملکوں کے اہل علم مسلمان شریک تھے : کناڈا، مالی، قبرص، یونان، سعودی ع
مالدیپ، سوئزرلینڈ، میڈاگاسکر، انگلینڈ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، برازیل، سوڈان، کینیا، ہندس
ترکی، کویت، پاکستان، گیانا، شام، فلپائن، فلسطین، غانا، گامبیا، ہالینڈ، یوگوسلاویہ، افغان
کوریا، تیونس، نائجریا، یمن، جاپان ۔

کانفرنس میں زیادہ تر دو قسم کے امور پر تقریریں اور مباحثے ہوئے، ایک اسلامی دعوت، دو
اسلام یا مسلمانوں پر دوسری قوموں کے حملے۔ تاہم کانفرنس پر دوسرا موضوع زیادہ نمایاں رہا۔ ہر علاقے کے لو
نے اپنے اپنے علاقے کی مشکلات بیان کیں۔ خاص طور پر وہ مشکلات جو صہیونیت، کمیونزم اور جدید استع
طرف سے پیدا کی گئی ہیں۔

دعوت کا موضوع زیادہ تر دفاعی طور پر سامنے آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسیحی مبلغین کافی سرگرمی کے
مسلمانوں پر کام کر رہے ہیں۔ پوپ نے پچھلے چند برسوں میں چار بار افریقہ کا سفر کیا ہے۔ مسیحی چرچ نے طے کیا۔
مسلمانوں کے بڑے حصہ کو یا تو مسیحی بنا دیا جائے اور اگر وہ مسیحی بننے پر راضی نہ ہوں تو ان کے ذہن کو اس طرح
دیا جائے کہ اپنے مذہب میں ان کی فکری جڑیں باقی نہ رہیں۔ وہ نہ مسلمان ہوں اور نہ عیسائی۔

کانفرنس کے شرکا کا عام احساس یہ تھا کہ چرچ کے لوگ جتنے منظم طور پر اپنا دعوتی کام کرتے ہیں
منظم طور پر مسلمان اپنا دعوتی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے اسلامی دعوت کے کام کو زیادہ منظم اور زیادہ
بنانے کی ضرورت ہے۔

کانفرنس میں اس موضوع پر کافی گفتگو ہوئی کہ افریقہ میں مسیحی مبلغین مسلمانوں کو عیسائی بنارہے ہیں۔ ں کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ ایک افریقی نمائندے نے بتایا کہ مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کی کامیابی کی اصل وجہ مسلمانوں افلاس ہے۔ افریقہ کے بہت سے حصوں میں زندگی بے حد سخت ہے۔ لوگوں کے پاس لباس اور مکان تک نہیں۔ یحیت قبول کر کے انھیں یہ سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم سب کچھ کھو چکے ہیں۔ پھر کیا حرج ہے اگر ہم ین کو بھی کھو دیں (فقدنا کل شئ فلا باس اذا فقدنا الدین لان المسألة الآن مسألة لبقاء والانقراض من الحیاة)

بتایا گیا کہ یہی وجہ ہے کہ مذہب بدلنے کے تمام واقعات صرف دیہاتی علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں افلاس زیادہ ہے۔ شہروں میں کوئی مسلمان مذہب نہیں بدلتا۔ کیوں کہ وہاں مذہب بدلے بغیر آدمی اپنے لیے اسبابِ معاش پالیتا ہے۔ مادی محرک کے تحت عیسائی ہوجانے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ جو مسیحیت قبول کرتے ہیں وہ بعد کو دوبارہ مسلمان ہوجاتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ تبدیلیٔ مذہب کی اصل وجہ مادی افلاس نہیں بلکہ ذہنی افلاس ہے۔ اسلامی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے (کل هذا ناتج عن فقدان الوعی الاسلامی) ان کا خیال تھا کہ ہم کو سب سے زیادہ افریقی مسلمانوں، خاص طور پر دیہات کے مسلمانوں، کی تعلیم پر زور دینا چاہیے۔ یہ لوگ اگر تعلیم یافتہ ہوجائیں تو اپنے آپ اس قسم کے فتنوں سے بچ جائیں گے۔

ایک عرب عالم نے بتایا کہ یورپ کے ایک شخص کو اسلام کا مطالعہ کرایا گیا۔ مطالعہ کے بعد اس نے کہا: اے وہ جس کے پاس سچا دین ہے کاش اس کے پاس مردانِ کار بھی ہوتے (یا لہ من دین لو کان لہ رجال) یہ ایک حقیقت ہے کہ آج آسمان کے نیچے اسلام ہی واحد سچا دین ہے مگر اس کے حامل مسلمان اس قدر بے جان ہوچکے ہیں کہ ان کے بل پر کوئی حقیقی کام کرنا ممکن نہیں۔ مسلمانوں کی مثال دیمک زدہ لکڑی کی ہے۔ دیمک زدہ لکڑی سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔

ایک مصری عالم نے مسلمانوں کی حالت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے کہا کہ مسلمان اس کے عادی ہوگیے ہیں کہ آج زمین میں دانہ ڈالیں اور کل سے پہلے اس کے پھل کی امید کریں (تعوّد المسلمون ان یبذروا البذرة الیوم ویرجون الثمرة قبل امس) تاہم انھوں نے کہا کہ ہمیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں اس اندیشے سے بیٹھ نہیں جانا چاہیے کہ ہمیں ناکامی ہوگی (لایجب ان نصاب بالشلل للحذر خشیة

الفنشل)

افغانستان کے نمائندہ نے بتایا کہ افغانستان اگرچہ ایک چھوٹی قوم ہے مگر اس کا جذبہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا جہاد صرف افغانستان کو آزاد کرنے پر ختم نہیں ہوگا۔ بلکہ افغانستان کو آزاد کرانے کے بعد ہم سرحد کو پار کرکے آگے بڑھیں گے اور ان مسلمانوں کو بھی آزاد کرائیں گے جو روسی سرحد کے اندر ہیں اور اشتراکی حکومت کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

افسوس کی یہ بات مجھے خوش نہ کر سکی۔ کیوں کہ جوش کی یہ قسم وہ ہے جو مسئلہ کو صرف بڑھاتی ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں مسئلہ کو ختم کرنے والی نہیں بنتی۔

ایک بار چند آدمیوں کے درمیان دنیائے اسلام کی موجودہ حالت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک عرب عالم نے کہا کہ آج مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے معاملات کی قیادت جاہلوں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ عالموں کے ہاتھ میں (قیادة امور المسلمین فی ایدی الجهلة لا فی ایدی العلماء)

یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ مگر فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کبڑنی موت الکبرائی کا معاملہ ہے۔ یعنی حقیقی علم والے لوگ موجود نہیں ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے معاملہ کے ذمہ دار وہ لوگ ہوگئے ہیں جن کے پاس جہالت کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ قیادت کے اعتبار سے علم والے وہ لوگ ہیں جو ایک طرف کتاب وسنت سے بخوبی واقف ہوں، اسی کے ساتھ وہ زمانہ کے تقاضوں کو پوری طرح جانتے ہوں۔

میرا مزاج یہ ہے کہ میں بولتا کم ہوں اور سنتا زیادہ ہوں۔ کانفرنس میں بھی میں ایسا ہی کر رہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ دوسروں کے مقابلہ میں کم بولتے ہیں۔ میں نے کہا :

I am trying to be a good listener

(میں کوشش کر رہا ہوں کہ میں اچھا سننے والا بنوں) موجودہ زمانہ کی مسلم جماعتوں میں صرف تبلیغی جماعت میں یہ مزاج پایا جاتا ہے کہ اس کے افراد یہ جانتے ہیں کہ چپ رہنا اور دوسرے کی بات سننا بھی ایک کام ہے۔ ورنہ ہماری اکثر جماعتوں کے افراد کو صرف یہ معلوم ہے کہ انھیں مسلسل بولنا چاہیے، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ چپ رہنا ان کے لیے فرض کے درجہ میں ضروری ہو گیا ہو۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس وقت ساری دنیا میں تقریباً ۱۰ ملین پناہ گزیں (لاجئین)

ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ظلم وستم کی وجہ سے اپنے وطن کو چھوڑنے پر ہوئے ہیں (معزز مقرر خود بھی ایک پناہ گزین تھے جو اپنے وطن کو چھوڑ کر اب یورپ کے ایک ملک میں رہتے ہیں) پناہ گزینوں کی اس تعداد میں تقریباً سات ملین مسلمان ہیں۔ نصف ملین پناہ گزیں اس وقت صرف سوڈان میں موجود ہیں۔ ایک صاحب نے اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا :

Why they are refugee? Because they are fighting for Islam.

(یہ لوگ کیوں پناہ گزیں ہیں، اس لیے کہ وہ اسلام کی خاطر لڑ رہے ہیں)

یہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مسلمان مبتلا ہیں۔ وہ دنیا بھر میں اپنے قومی مقاصد کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں اور اس کو جہاد کہتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ لڑائیاں بھی بے فائدہ لڑائیاں ہیں، کیوں کہ وہ حقیقی تیاری کے بغیر لڑی جا رہی ہیں۔ اس قسم کی جھوٹی لڑائیوں کو اسلامی جہاد کہنا میرے نزدیک اسلامی جہاد کے لفظ کی سخت ناقدری کرنا ہے۔

ایک ادارہ کے ذمہ دار نے بتایا کہ ان کے ادارہ میں ایک معمر خاتون آئیں اور کہا کہ میں حج پر جانا چاہتی ہوں۔ مگر میرے پاس سفر خرچ کی رقم نہیں ہے۔ آپ لوگ میرے لیے سفر خرچ کا انتظام کر دیں تاکہ میں حج کے لیے جا سکوں۔ خاتون سے کہا گیا کہ جب آپ کے پاس سفر خرچ نہیں ہے تو شرعی طور پر آپ کے اوپر حج فرض بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں اس کے لیے سوال کر رہی ہیں۔ خاتون نے جواب دیا :

میں سترہ سال سے برابر ہر سال حج کے لیے جا رہی ہوں، پھر اس سال میں کیوں اس سے محروم رہوں

جب اسلام اپنی حقیقی شکل میں باقی نہ رہے تو اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔

اسلام کا اصل ہتھیار دعوت ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی قوت ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان اگر دعوت کو بالکل بھول گئے ہیں۔ تاہم اسلام اپنے زور پر برابر لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ ہالینڈ کے بارہ میں ایک تقریر میں وہاں کے مسلمانوں کے حالات بتائے گئے۔ اس سلسلہ میں مقرر نے جو تفصیلات پیش کیں ان میں یہ بھی تھا کہ ہالینڈ کے شہر اوترخت (Utrecht) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں یورپ اور امریکہ کے کئی مسلمان شریک ہوئے۔ اجتماع کے دوران ایک نشست ہوئی جس میں مسیحی چرچ کے نمائندو نے بھی شرکت کی۔ اس سلسلہ میں مقرر نے جو کچھ کہا اس میں یہ الفاظ بھی تھے :

وقد شاركت الكنيسة في حوار جرى في هذا الملتقى حول العلاقة بين المسيحي

والاسلام ۔ وقد اعلن احد المهندسین البلجیکیین اسلامہ فی ھذا الملتقیٰ

اس اجتماع کے دوران مسیحی چرچ نے بھی ایک نشست میں شرکت کی ۔ اس میں مسیحیت اور اسلام کے تعلق کے بارہ میں ڈائیلاگ ہوا ۔ اس موقع پر بلجیم کے ایک عیسائی انجنیر نے اسلام قبول کر لیا ۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اجتماع کے بعد ہالینڈ کے ایک گاؤں میں بہت سے عیسائی اسلام میں داخل ہو گئے ۔

اسلام کی دعوت اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے ۔ مگر اسلام کے علَم بردار اس کی اسی قوت کو موجودہ زمانہ میں سب سے کم استعمال کر رہے ہیں ۔

افریقہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ ممباسا کے ایک عیسائی نے اسلام قبول کر لیا ۔ اس کے بعد اس نے سواحلی زبان میں ایک کتاب لکھی ۔ اس کتاب کا نام ہے : میں نے مسیحیت کو کیوں چھوڑا ۔

اس کتاب میں مذکورہ نومسلم نے بتایا کہ انجیل کے مطابق مسیح نے فرمایا کہ میں یہود کے لیے آیا ہوں ۔ اس کے برعکس محمدؐ نے فرمایا کہ میں ساری دنیا کی طرف بھیجا گیا ہوں ــــــ اسلام عالمی اپیل کے لیے اپنے اندر کس قدر زیادہ سامان رکھتا ہے ۔ مگر مسلمان اپنے چھوٹے چھوٹے قومی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں ۔ وہ اسلام کے عالمی اظہار کے لیے موجودہ زمانہ میں کچھ نہ کر سکے ۔

بماکو سے واپسی میں ایک فرانسیسی انجنیئر سے ایرپورٹ پر ملاقات ہوئی اس نے اپنا نام بانار (Barnar) بتایا ۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک گفتگو رہی ۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ میں بائبل پڑھتا ہوں اور اس پر عقیدہ رکھتا ہوں مگر میں چرچ نہیں جاتا ۔ میں نے پھر پوچھا کہ کیوں ، اس نے کہا کہ ، اس لیے کہ بائبل اور چرچ میں تضاد پایا جاتا ہے ۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجیے ۔ اس نے کہا : مثلاً بائبل میں بت بنانا سختی سے منع کیا گیا ہے مگر چرچ میں آپ جائیے ، تو وہاں آپ دیکھیں گے کہ بت بنا بنا کر رکھے ہوئے ہیں ۔ حضرت مسیح کی ابنیت کے بارہ میں اس نے کہا کہ " مسیح حقیقی معنوں میں خدا کے بیٹے نہیں تھے ۔ "بیٹے" کے لفظ کو میں تمثیلی مانتا ہوں نہ کہ حقیقی ۔ اس طرح کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں ۔

امریکہ سے آنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ ۸۵ - ۱۹۸۴ میں ایتھوپیا میں قحط کا مسئلہ پیدا ہوا تو امریکی حکومت نے ابتداءً اس میں کوئی دل چسپی نہ لی ۔ مگر بعد کو یہ مسئلہ اخبارات میں بہت زیادہ نمایاں ہوا ۔ مختلف ملکوں نے اس مد میں بڑی بڑی رقمیں دیں ۔ اس کے بعد یہ مسئلہ امریکہ کے لیے ساکھ کا مسئلہ بن گیا کیوں کہ امریکہ عالمی قیادت کا دعویدار ہے اور اتنے بڑے انسانی مسئلہ میں حصہ نہ لینا اس کی قیادت کو

نقصان پہونچانے کا سبب بنتا۔

چنانچہ امریکی وزیر خارجہ جارج بش نے ایتھوپیا کی امداد کے لیے کام کرنے والی بعض انجمنوں کے ذمہ داروں کو بلایا جس میں مسلمان بھی شامل تھے۔ جارج بش نے ایتھوپیا کے قحط زدگان کی امداد کے لیے امریکی حکومت کی طرف سے ایک بلین ڈالر کا چیک اس طرح لکھا کہ اس کی پوری کارروائی ٹیلی وزن پر نشر کی جا رہی تھی اور پریس کے ۲۰ نمائندے وہاں موجود تھے تاکہ امریکہ کی اس فیاضی کو کل صبح کے اخبارات کی سرخی بنا سکیں۔

بہت سے کام آدمی کرتا ہے جو بظاہر خیر اور اصلاح کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر یہ سارا کام محض اپنی قیادت کو باقی رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ قیادتی مصلحت کے سوا اس سے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔

ایک عرب عالم نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر دردمندانہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنا کام ہمیشہ چوٹی سے شروع کرتے ہیں (مع الاسف ، المسلمون یبدؤن من القمة) یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی کام تکمیل کے مرحلہ تک نہیں پہونچتا۔ کام کی تکمیل کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ نیچے سے شروع کیا جائے نہ کہ اوپر سے ——— افسوس کہ یہ کمزوری آج دنیا بھر کے مسلمانوں میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

کانفرنس کے بعد واپسی پیرس اور لندن کے راستے سے ہوئی۔ بماکو سے روانہ ہو کر ۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ کو میں پیرس پہونچا۔ پیرس سے آگے کے لیے میرا رزرویشن کنفرم نہیں تھا۔ کھڑکی پر متعین خاتون کو میری سیٹ کے لیے آدھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا پڑا۔ ٹیلی فون، ٹیلکس اور کمپیوٹر میں وہ بہت دیر تک مشغول رہی۔ مزید یہ کہ پیرس سے دہلی براہ راست فلائٹ نہ ملنے کی وجہ سے راستہ بدلنا پڑا۔ اس کی وجہ سے اس کو بار بار حساب کتاب کرنا پڑا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ نہ اکتائی اور نہ اس کے اندر جھنجلاہٹ پیدا ہوئی۔ بالآخر اس نے برٹش ایرویز کی لندن سے دہلی کی فلائٹ پر میرے لیے جگہ حاصل کر لی۔ اس سارے کام میں کافی دیر ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں بھاگ کر برٹش ایرویز کے جہاز تک پہونچا۔ جب میں جہاز کے اندر داخل ہوا تو اچانک یاد آیا کہ میں اپنا کتابوں کا بنڈل مذکورہ کھڑکی پر چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے جہاز کے عملہ سے کہا۔ انھوں نے کہا کہ آپ اپنی سیٹ پر بیٹھیے۔ ہم ابھی آپ کا پیکٹ منگاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جہاز کے اندر سے ٹیلی فون پر مذکورہ خاتون سے کہا۔ اس نے فوراً میرا پیکٹ بھیجا۔ پیکٹ مجھ کو جہاز کے اندر عین اس وقت مل گیا جب کہ جہاز روانہ ہونے والا تھا۔

اس پورے واقعہ کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ سب کچھ اتنے معیار اور اتنی مستعدی کے ساتھ ہوا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا کو جس چیز کی ضرورت

ہے وہ "بہتر نظام" نہیں ہے بلکہ روح کی غذا ہے جس سے آج کا انسان محروم ہے۔ اسلام کو روح کی غذا کی حیثیت سے پیش کرنا ہی آج دعوتِ اسلامی کا اصل کام ہے۔

پیرس سے لندن تک ایر فرانس کے ذریعہ سفر ہوا۔ لندن سے دہلی کے لیے برٹش ایرویز کے ذریعہ روانگی ہوئی جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا ماہنامہ تھا۔ اس کا نام انھوں نے اونچی زندگی (Highlife) رکھا ہے۔ اسی طرح اس کے صفحہ ۱۲۸ پر سیکو گھڑی کا اشتہار تھا۔ اس میں گھڑی کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Man invented time. Seiko perfected it:

(انسان نے وقت ایجاد کیا۔ سیکو نے اس کو معیاری حیثیت دی) آدمی کو جب کسی کام سے دل چسپی ہو تو وہ اسی طرح اپنی بات کہنے کے لیے خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ بڑے الفاظ بولنا ہمیشہ صرف اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ آدمی جس معاملہ میں بول رہا تھا اس معاملہ سے اس کو کوئی قلبی لگاؤ نہ تھا۔

برٹش ایرویز کے اندر جب مسافروں کو لاؤڈ اسپیکر پر ہدایات دی گئیں تو سب سے پہلے عرب خاتون کی زبان سے عربی میں اعلان کیا گیا۔ اسی طرح مختلف اعلانات عربی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ٹائیلٹ میں حسب ذیل اعلان اس طرح لکھا ہوا تھا کہ انگریزی کی لائن نیچے تھی اور عربی کی لائن اوپر:

الرجاء عدم رمي المناشف المستعملة في المرحاض

جہاز کے اناؤنسر نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارے عملہ میں انگریزی، جرمن، فرنچ، اسپینی، عربی، اردو اور پنجابی جاننے والے لوگ موجود ہیں۔ آپ کسی بھی ضرورت کے لیے ان سے اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں۔ یہ اعلان سن کر میں نے سوچا کہ برٹش ایرویز کو بین اقوامی سطح پر اپنی تجارت چلانا ہے اس لیے اس نے اپنے عملہ میں ہر زبان کے آدمیوں کا انتظام کیا ہے۔ مگر عالمی اسلامی دعوت کا جذبہ اتنا موثر نہ ہو سکا کہ ہمارے کسی اسلامی ادارہ کے اندر ہر زبان کے جاننے والے فراہم کیے جائیں تاکہ ہر زبان کے جاننے والے ان سے اسلام کا تعارف حاصل کر سکیں۔ شاید دنیوی محرک انسان کے لیے اُخروی محرک سے زیادہ طاقت ور ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام صرف ایک قوم کے لیے آیا تھا تو تمام مسلمان اس سے لڑ جائیں گے۔ مگر عملاً تمام مسلمان اسلام کو ایک قوم کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔

۱۱ دسمبر ۱۹۸۵ کی صبح کو میں دہلی واپس پہونچا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز-۱۶

الرسالہ کو خدا کے فضل سے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جو لوگ اس کی ایجنسی چلاتے ہیں وہ مقصدی تعلق کے تحت چلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پونہ کے ایک صاحب عرصہ دراز سے ایجنسی کے طور پر ۲۵ پرچے منگا رہے ہیں مگر وہ کوئی کمیشن نہیں لیتے۔ وہ ہمیشہ پوری قیمت روانہ کر دیتے ہیں۔ ان کو اس سلسلہ میں خط لکھا گیا تو انھوں نے جواب دیا ـــــ ۱۲۶۰ روپیوں کا ڈرافٹ حاضر خدمت ہے۔ جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے کہ کمیشن میں نہیں لوں گا۔ آج بھی میں اپنے وعدہ کا پابند ہوں۔ مجھے کمیشن نیلی چھتری والے سے ملے گا۔ انشاء اللہ میں اسی سے لوں گا۔

(۱۶ دسمبر ۱۹۸۵)

آسٹریلیا کی ایک مسلم تنظیم نے انگریزی کی تعارفی کتابوں کا سٹ ڈیڑھ سو کی تعداد میں منگوا کر آسٹریلیا کے ایک "یوتھ فیسٹیول" کے موقع پر نوجوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ فیسٹیول وہاں دسمبر ۱۹۸۵ میں ہوا تھا۔ یہ ڈیڑھ سو سٹ آسٹریلیا کے مختلف حصوں سے آنے والے نوجوانوں کو دیا گیا ہے۔

۳۔ حیدر آباد میں ہر سال بڑے پیمانہ پر نمائش ہوتی ہے۔ موجودہ سال کی نمائش (جنوری ۱۹۸۶) میں اسلامی مرکز کی کتابوں کا اسٹال بھی رکھا گیا ہے۔ اس طرح کے مواقع سے دوسرے مقامات کے احباب کو بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔

۴۔ صدر اسلامی مرکز کی دو کتابیں اللہ اکبر (۲۸۸ صفحات) اور عظمت قرآن (۱۵۲ صفحات) چھپ کر آگئی ہیں۔ تذکیر القرآن کی کتابت کا کام جاری ہے۔ وہ خدا کے فضل سے ۲۵ ویں پارہ تک ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کی دوسری جلد چھپ جائے گی۔ " الرسالہ کیسٹ " جلد اول اور کئی دوسری کتابیں زیر طبع ہیں۔

۵۔ ۲۶ نومبر ۱۹۸۵ کو علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے بڑے پیمانہ پر سیرت کا جلسہ ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو خصوصی طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس موقع پر علی گڑھ کا سفر کیا اور وہاں سیرت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس سلسلہ میں یونیورسٹی کی مختلف شخصیتوں سے ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

۶۔ "قرآن کامطلوب انسان" نامی کتاب کا عربی ترجمہ ایک مصری عالم (دکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم) نے کیا ہے اور وہ قاہرہ سے اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اس کا عربی نام ہے —— "الانسان القرآنی"۔

۷۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں صدر اسلامی مرکز نے افریقہ کا سفر کیا۔ یہ سفر ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے تھا۔ اس سفر کی تفصیلی رپورٹ آئندہ انشاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے ذیل میں شائع کر دی جائے گی۔

۸۔ اسلامی مرکز کے سلسلے میں ہم کو روزانہ کی ڈاک سے جو خطوط موصول ہوتے ہیں ان میں سے چند بطور نمونہ یہاں نقل کیے جارہے ہیں۔ ایک صاحب بمبئی سے اپنے خط (۸ نومبر ۱۹۸۵) میں لکھتے ہیں :

I was truely impressed with the monthly chronicle published by your organization, in fact, I am so disappointed for remaining ignorant about such a highly educating magazine, that I made up my mind to subscribe for it immediately. Moreover, a request is made to you to kindly enlighten me with some knowledge as to how this material is gathered. I am sure your organization is full of intellectuals which must be a very prestigious issue for you.

۹۔ ایک صاحب پورنیہ سے لکھتے ہیں :

"کئی مہینوں سے آپ کا الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک ایسا پرچہ ہے کہ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر مہینہ کے رسالہ میں اکثر عنوان ایسے ہوتے ہیں کہ پڑھنے کے بعد آنکھ سے آنسو نکلنے لگتا ہے اور خوفِ خدا ایسا پیدا ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایکزامینیشن ہال جیسا گارڈ ہماری حرکتوں کو دیکھ رہا ہے۔ بہرحال یہ ایک بہترین نسخہ ہمارے لیے ہے۔ اللہ آپ کو لمبی حیات دے تاکہ ہماری رہنمائی آپ ایسی کتابوں کے ذریعہ فرماتے رہیں۔ (۲۳ دسمبر ۱۹۸۵)

۱۰۔ ایک صاحب بنگلور سے لکھتے ہیں : میں کئی سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہونچا۔ اس سے پہلے میں حق کی پگڈنڈی پر چل رہا تھا، اب میں حق کی شاہراہ پر چلتے ہوئے مومن کی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ مولانا کا انداز بیان میرے

احساس میں ایسا اترتا ہے جیسے انھوں نے میرے دل کی باتوں ہی کی تصدیق کی ہے۔ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ مولانا صاحب سے مجھے بہت تقویت ملی ہے (۲۸ اکتوبر ۱۹۸۵)

۱۱۔ ایک نوجوان بنگلور سے اپنے خط میں لکھتے ہیں : الرسالہ کیسٹ "ایمان" موصول ہوا۔ تمام دوست و احباب کے ساتھ سنا تو ایسا محسوس ہوا کہ اب ہم اسلام میں صحیح طور پر داخل ہوئے ہیں اور اب ایمان لائے ہیں۔ بعض دوست و احباب کے تو آنسو نکل آئے۔ چوں کہ ابھی میں کم عمر صرف ۱۸ سال کا ہوں۔ جس کی وجہ سے بعض باتیں سمجھ میں نہ آسکیں۔ تو میں نے اپنے والد محترم سے ان باتوں کو سمجھا۔ جتنے بار بھی ہم تقریر سنیں گے تو بس یہی محسوس ہوتا ہے کہ اب ہمارا ایمان واقعی ایمان ہے (۱۵ دسمبر ۱۹۸۵)

۱۲۔ ایک صاحب جبل پور سے لکھتے ہیں : میں الرسالہ پچھلے چار سال سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی خرید لیا ہوں اور بہت شوق و ذوق سے اس کو پڑھتا ہوں الرسالہ مجھے ایسی عمر میں ہاتھ آیا جب میں اپنی زندگی کی شروعات کرنے جا رہا تھا۔ مجھے اسلامی لٹریچر میں اس سے معیاری اور کوئی رسالہ اب تک نظر نہ آیا۔ الرسالہ کے مختصر مضامین نے مجھے سوچ سمجھ عطا کی اور میری زندگی کو پوری طور پر تعمیری کاموں کے لیے بنا دیا۔ میں نے اپنے گھریلو مسائل حل کر لیے۔ کرایہ داروں کے مقدمات ختم کرنے میں مدد ملی۔ وغیرہ۔ غرض یہ کہ خط سے بیان نہیں کر سکتا کہ خدا نے مجھے کتنی نعمتوں سے نوازا۔ میرے خاندان میں میں سب سے چھوٹا ہوں لیکن خدا نے مجھے سب سے ہر معاملہ میں آگے رکھا ہے۔ خدا سے دعا ہے میری جلد ملاقات آپ سے ہو جائے اور میں تفصیل سے اپنی زندگی کے حالات بتاؤں۔ "الرسالہ ہر مرض کی دوا ہے" جس انداز میں جیسا چاہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں (۲۵ دسمبر ۱۹۸۵)

۱۳۔ امریکہ کی عالمی مذاہب کانفرنس (نومبر ۱۹۸۵) میں صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کے ذریعہ سے عالمی سطح پر مختلف مذاہب کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں ہوئیں اور روابط قائم ہوئے۔ اس سلسلہ میں واپسی کے بعد خطوط کا تبادلہ جاری ہے ایک خط جو مذکورہ عالمی کانفرنس میں شرکت کرنے والی غیر مسلم خاتون کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کو موصول ہوا ہے اس کا عکس متابل کے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

Dr. (Sayimatha) **SIVA BRINDA DEVI**
President, World Women Organisation

☎ 2342
Thilagavathiar Thiruvarul Adheenam
Machuvadi, PUDUKKOTTAI-622 001.
Tamil Nadu, South India.

26-11-1985

My most affectionate brother:

I consider it a matter of great good fortune that I had the rare opportunity of meeting you in USA during the conference of World's Religions and getting acquainted with you and with your culture.

I Pray to God to bless you and your country men with all prosperity, great achievement, satisfaction and peace.

You would not have forgotten me while receiving these my heart-felt greetings

You will remember me as the Hindu Religious Head who recited the Rig Veda, lighted the candle, chanted the mantra for peace and offered prayers, representing Hinduism.

I Pray to God, with all the motherly tenderness I have, to make the world the abode of peace and bliss.

Yours Sincerely,

Dr (Sayimatha) Siva Brinda Devi.

Maulana Wahiduddin Khan
C-29, Nizamuddin West
New Delhi - 110 013
INDIA

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd No D(SE) 243
Regd R N No 28822/76

February 1986
Number 111

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

برے سلوک کا بہترین جواب اچھا سلوک ہے
جہالت کا بہترین حل اس کو نظر انداز کر دینا ہے

مارچ ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۲

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	5 -
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	3 -
تعمیر ملت	3 -
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	5
عقلیات اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	3 -
سبق آموز واقعات	3 -
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیات طیبہ	3/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	3/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
راز حیات	

The Way to Find God	4/
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۲ مارچ ۱۹۸۶

فہرست

تاریخ کا فیصلہ

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں فلسطین فتح ہوا۔ اس موقع پر عیسائیوں کی فرمائش پر خود حضرت عمر مدینہ سے فلسطین گئے تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان معاہدہ کی تکمیل کریں۔ اس سلسلے میں جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے:

حان وقت الصلوٰۃ وھو جالس فی صحن کنیسۃ القیامۃ۔ فالتفت الی البطریرك وقال لہ این اُصلّی۔ فقال مکانك صلِّ۔ فقال ما کان لِعُمَر ان یصلّی فی الکنیسۃ فیاتی المسلمون من بعدی ویقولون ھُنا صلّی عمر ویبنون علیہ مسجدا۔ وابتعد عنھا رمیۃ حجر وفرش عباءتہ وصلّی۔ وجاء المسلمون من بعدہ وبنوا علیٰ مصلّاہ مسجدا وھو قائم علیٰ رمیۃ حجر من کنیسۃ القیامۃ الیٰ یومنا ھـذا

عبداللہ التل، خطر الیہودیۃ العالمیۃ علی الاسلام والمسیحیۃ۔ دار القلم، القاھرہ، ۱۹۶۴ صفحہ ۱۲۹

حضرت عمر یروشلم میں کنیسۂ قیامہ کے صحن میں بیٹھے تھے کہ نماز کا وقت آگیا۔ وہ بطریق کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا کہ میں نماز کہاں پڑھوں۔ بطریق نے کہا اپنی جگہ پر پڑھ لیجئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ عمر کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ گرجا کے اندر نماز پڑھے۔ پھر مسلمان میرے بعد آئیں اور کہیں کہ یہاں عمر نے نماز پڑھی تھی اور اس پر مسجد بنائیں۔ حضرت عمر وہاں سے ایک پتھر پھینکنے کی مسافت کے بقدر دور گئے اور وہاں اپنی عبا بچھائی اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد مسلمان آئے اور ان کے نماز پڑھنے کی جگہ پر مسجد بنائی۔ یہ مسجد آج بھی کنیسۂ قیامہ سے ایک پتھر پھینکنے کی دوری پر موجود ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلام کی عظیم تاریخ بنائی۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نزاع کے مقام سے ہٹ کر اپنی مسجد بناتے تھے۔ ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنھوں نے اصرار کیا کہ وہ جھگڑے کی جگہ پر نماز پڑھیں گے اور نزاع کے مقام پر اپنی مسجد بنائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کے قلعہ میں ایک اینٹ کا بھی اضافہ نہ کر سکے۔ بلکہ اسلام کا جو قلعہ بن کر کھڑا ہو چکا تھا اس کو بھی انھوں نے اپنی نادانی سے ڈھا دیا۔

حقیقی حل

ایک فارسی شاعر نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے دوست سے سو بار جنگ کی اور سو بار صلح کی۔ مگر اس کو ہماری جنگ و صلح کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ کیوں کہ یہ سب ہم خود ہی خود اپنے اندر کرتے رہے :

صد بار جنگ کردہ بہ او صلح کردہ ایم   اورا خبر نہ بودہ ز صلح و زجنگ ما

یہ بات بظاہر شاعری کی دنیا کی ہے مگر یہ حقیقت کی دنیا کے لیے بھی نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے جس صلاحیت کے افراد درکار ہوتے ہیں وہ بھی عین وہی صلاحیت ہے جس کا ذکر اس شعر میں کیا گیا ہے۔ یعنی اپنے اندر پیدا ہونے والی شکایت کو خود ہی اپنے اندر اندر ختم کر لینا۔

کوئی بڑا مقصد کوئی شخص تنہا حاصل نہیں کر سکتا۔ ہر بڑے مقصد کے لیے بہت سے آدمیوں کی متحدہ کوشش ضروری ہوتی ہے۔ مگر متحدہ کوشش ہمیشہ ایک مسئلہ بھی پیدا کرتی ہے۔ اور وہ ہے افراد کا باہمی اختلاف۔

جب بھی بہت سے لوگ مل کر کوشش کریں تو لازماً ان کے درمیان طرح طرح کی شکایتیں اور تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کبھی تقسیم میں کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو باعتبار عہدہ اونچی جگہ ملتی ہے اور کسی کو نیچی۔ کسی کی کوئی بات دوسرے کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ کسی کا کوئی عمل دوسرے کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آتا ہے۔ غرض بار بار ایک دوسرے کے درمیان ایسی باتیں ہوتی ہیں جو آپس کی تلخی پیدا کریں۔ جو ایک کو دوسرے کے خلاف غصہ، حسد، انتقام اور عداوت میں مبتلا کر دیں۔

ایسے موقع پر قابل عمل حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر آدمی ایک خود اصلاحی مشین (Self-correcting machine) بن جائے۔ وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے ہیجان کو خود ہی ٹھنڈا کرلے۔ وہ اپنی شکایت کو خود ہی اپنے اندر رفع کرلے۔

خلیفہ دوم عمر فاروق ؓ نے جب خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالاری کے عہدہ سے معزول کیا تو فوری طور پر حضرت خالد کے دل میں شدید ردعمل پیدا ہوا مگر پھر اسی لمحہ انھوں نے یہ کہہ اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ تم جو کچھ کر رہے تھے خدا سے انعام پانے کی امید میں کر رہے تھے۔ پھر تم کو عمرؓ سے خفا ہونے کی کیا ضرورت۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے شکایت کرنے کے بجائے اپنی اصلاح آپ کرلی۔

تاریخ پکارتی ہے

مغل بادشاہ اورنگ زیب (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) کے آخر عمر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھ سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پاس ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا۔ عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر دکن تک لہرا رہا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان آپ کے دل میں باقی ہے جس کے لیے آپ رو رہے ہیں۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر چپ رہے اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا:

سعد اللہ، مردے خواہم — سعد اللہ میں ایک مرد چاہتا ہوں۔

اورنگ زیب کے سامنے وہ کون سا مسئلہ تھا جس نے انھیں گھلا رکھا تھا۔ اور وہ ایک مرد کو حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ ان کو نظر آرہا تھا کہ ان کے بعد جو لوگ عظیم مغل سلطنت کے وارث بننے والے ہیں وہ سب خود غرض لوگ ہیں۔ وہ اونچی سطح سے معاملات کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے پاس ذاتی مفاد کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کے بعد ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑیں گے اور عظیم مغل سلطنت کو تباہ کرکے رکھ دیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ نصف صدی تک حکومت کرنے کے بعد ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس وقت اورنگ زیب کے تین لڑکے تھے جن کا نام معظم، اعظم اور کام بخش تھا۔ اورنگ زیب کے آخر وقت میں شہزادہ معظم کابل کا گورنر تھا۔ شہزادہ اعظم گجرات کا گورنر تھا اور شہزادہ کام بخش بیجاپور کا گورنر تھا۔ اورنگ زیب نے مسئلہ کا آخری قابل عمل حل یہ نکالا کہ اس نے ایک وصیت چھوڑی۔ اس وصیت کے مطابق اس نے مغل سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کرکے تینوں لڑکوں کو دیدیا تاکہ اس کے لڑکے اپنے اپنے دائرہ میں رہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہ کریں۔

مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب کے مرتے ہی تینوں شہزادے دہلی کے تخت کے دعویدار بن کر کھڑے ہوگیے۔ تقریباً دو سال تک آپس میں لڑائیاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ شہزادہ اعظم اور شہزادہ کام بخش اس میں مارے گیے۔ شہزادہ معظم اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کرکے ۱۷۰۸ء میں دہلی کے تخت

بیٹھا اور اپنے لیے شاہ عالم کا لقب اختیار کیا۔

مگر شاہ عالم کو یہ معلوم نہ تھا کہ موت اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ دہلی کے تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی اس کو چار سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۷۱۲ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے چار لڑکے چھوڑے جن کے نام یہ تھے: جہاں دار شاہ، عظیم الشان، جہاں شاہ، رفیع الشان۔ ان لڑکوں کے سامنے اپنے باپ کا اسوہ تھا۔ چنانچہ چاروں لڑکوں میں دوبارہ جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی۔ بالآخر ان میں سے تین لڑکے قتل ہو گئے اور جہاں دار شاہ تخت پر بیٹھا۔ مگر اس کو ایک سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے مقتول بھائی عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کے دل میں اپنے باپ کے لیے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ آخر کار اس نے سازش کرکے جہاں دار شاہ پر قابو پا لیا۔ اس نے جہاں دار شاہ کو تخت سے اتار کر لال قلعہ میں اس کو سولی دے دی۔ یہ ۱۷۱۳ء کا واقعہ ہے۔

فرخ سیر نے اگرچہ اپنے چچا کو مار کر دہلی کا تخت حاصل کر لیا مگر وہ خود بھی صرف چھ سال دہلی کے تخت پر بیٹھ سکا۔ لال قلعہ کے اندر جلد ہی اس کے مخالفین پیدا ہو گئے۔ بالآخر ۱۷۱۹ء میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک روز بھرے دربار میں لوگوں نے فرخ سیر کو تخت سے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ اس کے بعد اسے مار مار کر جیل کے اندر ڈھکیل دیا گیا۔ وہ جیل کے اندر ہی رہا یہاں تک کہ گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد شہزادہ رفیع الدرجات دہلی کے تخت پر بیٹھا مگر اس کی مدت حکومت اور بھی کم ثابت ہوئی۔ وہ ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو تخت پر بیٹھا اور ۴ جون ۱۷۱۹ء کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد وہ مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تپ دق کا مریض تھا۔

مغل شہزادوں کی آپس کی جنگ نے دہلی کی مرکزی حکومت کو بالکل کمزور کر دیا۔ صوبوں پر مرکز کی مضبوط گرفت باقی نہ رہی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے مختلف حصوں میں آزادی اور خود مختاری کا ذہن پیدا ہو گیا۔ صوبوں کے حاکم دہلی کے برائے نام بادشاہ سے آزاد ہو کر اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرنے لگے:

On the decline of the central authority at Delhi, the inevitable centrifugal tendency was manifest in different parts of the Empire, and the provincial viceroys made themselves independent of the titular Delhi Emperor.

An Advanced History of India, (1978) p. 529

چنانچہ دکن کا صوبہ ۱۷۲۴ء میں میر قمر الدین خاں (نظام الملک) کے تحت آزاد ہوگیا۔ صوبہ اودھ میں سعادت خاں نے ۱۷۵۴ء میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ صوبہ بنگال میں سرفراز خاں نے ۱۷۳۹ء میں آزاد ہوکر نواب بنگال کا لقب اختیار کرلیا۔ اسی طرح راجپوت ریاستوں (اودے پور، جودھ پور، جے پور، وغیرہ) نے دہلی کی سیاسی وفاداری ترک کرکے آزاد حیثیت حاصل کرلی۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جو عظیم سلطنت بنائی تھی وہ اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہوکر رہ گئی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت بظاہر ڈیڑھ سو سال تک باقی رہی۔ مگر یہ ڈیڑھ سو سال صرف باہمی قتل وخون کے سال تھے۔ مغل شاہزادے اور امرار اور وزرار ذاتی اقتدار کے لیے مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ اور مغل سلطنت دن بدن کمزور اور منتشر ہوتی چلی گئی۔ انگریز اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ملک میں دخیل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے انھوں نے پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔ لال قلعہ میں بظاہر مغل تاج دار موجود تھا۔ مگر عملاً سارا اقتدار انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ کہا جانے لگا کہ :

حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم۔

اور یہ کہ تحت بہادر شاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔

آخرکار ۱۸۵۷ کا انقلاب برپا ہوا اور یہ نام کی مغل سلطنت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

مغل سلطنت کی یہ کہانی تمام مسلمانوں کی کہانی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جس کی ایک تصویر اوپر کی مثال میں نظر آتی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کا حال یہ رہا کہ جس شخص کو بھی کوئی موقع ملا وہ ذاتی بڑائی قائم کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ وہ ملے ہوئے مواقع کو اجتماعی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر چھوٹی چھوٹی بڑائیاں تو قائم ہوئیں۔ مگر ملت کی عظیم تر بڑائی قائم نہ ہوسکی۔

ایک فرد جب اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی ہوتا ہے اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ پورے مجموعہ کی بڑائی قائم ہو۔ فرد کی قربانی ہی مجموعہ کی بڑائی کی اصل قیمت ہے۔ جس قوم کے افراد کا یہ حال ہو کہ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لیے دوڑے، ایسی قوم کبھی عظمت کا مقام حاصل نہیں کرسکتی۔ نہ پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ آج ایسا ہوسکتا ہے۔

آغاز و انجام

۲۸ جنوری ۱۹۸۶ کو امریکہ میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ ایک خلائی سواری (Space shuttle) ایک بلین ڈالر سے زیادہ رقم خرچ کرکے تیار کی گئی۔ اس کا نام چیلنجر (Challenger) تھا۔ وہ ایک خاص اسٹیشن سے ۲۸ جنوری کو خلا کی طرف اڑائی گئی۔ مگر داغے جانے کے صرف ایک منٹ بعد دھماکہ ہوا اور سواری جل کر راکھ ہو گئی۔ اس کے سات مسافر بیک وقت مر گیے۔ کوئی مشینی یا انسانی چیز باقی نہ رہی جو حادثہ کی تفصیلات سے بعد والوں کو باخبر کر سکے۔

پہلی بار انسان ۱۹۵۷ میں خلا میں گیا تھا۔ موجودہ چیلنجر اپنی قسم کی ۲۵ ویں خلائی سواری تھی۔ یہ پورا واقعہ ٹیلی وژن پر دکھایا جا رہا تھا، چنانچہ کروروں لوگوں نے چیلنجر کو زمین سے اوپر جاتے اور اچانک اس کو برباد ہوتے ہوئے دیکھا۔ سات مسافر جو اس حادثہ میں ہلاک ہوئے ان کو اخبارات نے خلائی ہیرو (Space heroes) کا لقب دیا ہے۔

ان مسافروں میں ایک خاتون ٹیچر کرسٹا میک آلف (Christa McAuliffe) بھی تھیں۔ ۳۷ سالہ کرسٹا میک آلف نے سفر سے پہلے ۲۲ جولائی ۱۹۸۵ کو ایجوکیشنل نیوز سروس کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ خلائی سفر میں غالباً میں اپنے آپ کو نیویارک کی سڑکوں پر چلنے سے زیادہ محفوظ پاؤں گی:

> I feel, probably, safer going into space than driving around the New York streets.
>
> *The Times of India* (New Delhi) January 30, 1986

ہمارے دیہات کا ایک آدمی دہلی کے باشندوں پر رشک کرتا ہے۔ جو شخص دہلی میں ہے وہ نیویارک میں رہنے والے آدمی پر رشک کرتا ہے۔ اور نیویارک میں رہنے والے کا حال یہ ہے کہ وہ نیویارک میں مطمئن نہیں۔ وہ امید کرتا ہے کہ وہ خلا میں زیادہ محفوظ سفر کرنے کے قابل ہوگا۔ مگر جب وہ زمین سے نکل کر خلا کی طرف روانہ ہوتا ہے تو سفر شروع ہونے پر ابھی ایک منٹ گزرتا ہے کہ اس کی پوری سواری جل کر بھسم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی تمام امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ راکھ بن کر فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ کیسا عجیب ہے انسان کا آغاز اور کیسا عجیب ہے انسان کا انجام۔

عجیب محرومی

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ. وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ

(الاعراف ۱۷۵-۱۷۶)

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دیں، پھر وہ ان سے نکل بھاگا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ پس وہ گمراہ لوگوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے۔ مگر وہ دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔

ہدایت کے راستہ پر چلنا برتر مقصد پر چلنا ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ پست مقاصد میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اس سے اٹھ کر برتر مقصد کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ وہ وقتی فائدہ کی خاطر ابدی فائدے کو کھو دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو ایک نئی تاریخ بنانا مطلوب تھا۔ آپ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ شرک کے دور کو ختم کیا جائے اور توحید کو ہمیشہ کے لیے ایک غالب فکر بنا دیا جائے۔ اس خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لیے بلاشبہ قربانی درکار تھی۔ قربانی کا یہ سوال بہت سے لوگوں کے لیے اس کا ساتھ دینے میں رکاوٹ بن گیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ابتداءً اس میں شامل ہوئے مگر بعد کو جب ان کے سامنے وہ وقت آیا کہ وہ اپنی خواہشوں کے تقاضے کو ذبح کریں اور اپنی انا کے بُت کو توڑ کر اس کا ساتھ دیں تو وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ اپنی ذات کو بچانے کی خاطر خدا کے دین سے دور ہوگئے۔ یہی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئی اور یہی صورت ہر زمانہ میں پیش آتی ہے۔

کیسا عجیب ہے انسان۔ خدا اس کے سامنے واضح دلائل لے آتا ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ خدا اس کے لیے بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ کھولتا ہے مگر اس کے محدود مفادات اس کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ خدا اس کو تاریخ ساز بنانا چاہتا ہے مگر وہ خود ساز بن کر رہ جاتا ہے۔

تعصب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ آئے۔ اس وقت مدینہ میں کچھ یہود آباد تھے۔ ان کے ایک عالم عبد اللہ بن سلام آپ سے ملے اور کچھ خاص سوالات کیے۔ عبد اللہ بن سلام پر کھل گیا کہ آپ واقعی خدا کے رسول ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد یہودی قبیلہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ ان کو ابھی معلوم نہ تھا کہ عبد اللہ بن سلام نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ عبد اللہ بن سلام تمہارے درمیان کیسے آدمی ہیں (فأیُّ رجل فیکم عبد اللّٰہ بن سلام) اس کے جواب میں انھوں نے کہا: ذاك سیدنا وابن سیدنا واعلمنا وابن اعلمنا (وہ ہمارے سردار ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں۔ وہ ہمارے بڑے عالم ہیں اور ہمارے بڑے عالم کے بیٹے ہیں)

پھر پوچھا گیا کہ تمہارا ان کے بارے میں کیا خیال ہوگا اگر وہ اسلام قبول کر لیں۔ انھوں نے کہا خدا کی پناہ، وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ اس وقت عبد اللہ بن سلام اندر موجود تھے۔ وہ نکل کر باہر آئے اور یہود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ اللہ سے ڈرو۔ خدا کی قسم یہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ حق لے کر آئے ہیں۔ میں ان پر ایمان لایا ہوں تم بھی ان پر ایمان لاؤ۔ یہ سن کر فوراً یہود کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو (کذبت) ایک روایت کے مطابق انھوں نے عبد اللہ بن سلام کے بارہ میں کہا کہ تم نہایت برے ہو اور برے کے بیٹے ہو اور انھوں نے ان کی تحقیر کی (قالوا شرّنا وابن شرّنا وتنقّصوہ)

ایک اور روایت میں ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے یہود نے عبد اللہ بن سلام کے بارہ میں کہا کہ وہ ہمارے بہترین شخص ہیں اور بہترین شخص کے بیٹے ہیں۔ وہ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سردار کے بیٹے ہیں۔ (فجاءت الیھود فقال ای رجل عبد اللّٰہ فیکم۔ فقالوا خیرنا وابن خیرنا وسیدنا وابن سیدنا) مگر جب عبد اللہ بن سلام نے آکر ان کے سامنے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ نہایت برے شخص ہیں اور برے شخص کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ان کو ذلیل وحقیر کر دیا (قالوا شرّنا وابن شرّنا وانتقصوہ) سیرت ابن کثیر جلد ثانی، صفحہ ۹۶-۲۹۵

تعصب کی یہ قسم آج بھی اتنے ہی بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے جس طرح وہ قدیم زمانہ میں تھی۔

تنظیم کے بغیر

سینٹ برنارڈ صلیبی دور کا مسیحی پادری ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے صلیبی جنگوں کے زمانہ میں یورپ کی مسیحی سلطنتوں کو مقدس جہاد کے لیے ابھارا۔ مگر دو سو سال کی لمبی کوشش کے باوجود مسیحی اقوام کو مسلمانوں کے مقابلہ میں مکمل شکست ہوئی۔

برٹرینڈ رسل نے اس سلسلہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ سینٹ برنارڈ نے صلیبی جنگ کی تبلیغ کی۔ مگر بظاہر وہ اس حقیقت کو نہیں جانتا تھا کہ جنگ لازمی طور پر تنظیم چاہتی ہے۔ جنگ صرف مذہبی جوش کے تحت نہیں لڑی جا سکتی :

> Although he preached the Crusade, he did not seem to understand that a war requires organisation, and cannot be conducted by religious enthusiasm alone.
>
> *A History of Western Philosophy*, p. 431

یہ بات جو برٹرینڈ رسل نے صلیبی دور کے مسیحیوں کے بارہ میں لکھی ہے۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں بھی عین درست ہے۔ یہاں مسلمانوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ صادق آرہے ہیں کہ تم پچھلی امتوں کے اسوہ پر چلوگے۔ حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی اس کے اندر جا گھسوگے۔

مسیحی اقوام نے قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ یہ جنگ محض مذہبی جوش کے تحت تھی۔ اس میں تنظیم شامل نہ تھی۔ چنانچہ انھیں کامل شکست ہوئی۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی غالب اقوام کے خلاف بے شمار جنگیں کیں۔ مگر یہ تمام جنگیں تنظیم کی ضروری شرط سے خالی تھیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ مسلمانوں کو ہر محاذ پر شکست ہوئی۔ کیسی عجیب مشابہت ہے قدیم اہل کتاب میں اور جدید اہل کتاب میں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے پاس صرف جھوٹا جوش باقی رہتا ہے۔ وہ ہوش اس سے رخصت ہو جاتا ہے جو آدمی کے اندر سنجیدگی، حقیقت پسندی اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس سے وہی کردار ظاہر ہوتا ہے جس کا نمونہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مسیحی اقوام نے پیش کیا اور موجودہ زمانہ میں جس کا مظاہرہ مسلمان ساری دنیا میں کر رہے ہیں۔

بے صبری کا نتیجہ

۱۵ جنوری ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے۔ انڈین ایرلائنز کا ایک جہاز (فلائٹ نمبر ۴۰۶) بمبئی سے دہلی کے لیے اڑا۔ مگر صرف پندرہ منٹ بعد وہ واپس ہوا اور دوبارہ بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ جہاز کسی ٹکنکل سبب سے آدھ گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا۔ جہاز جب اوپر فضا میں پہونچا تو اس کے ایک مسافر نے کیپٹن بھٹناگر کے نام ایک نوٹ بھیجا کہ وہ بتائے کہ جہاز کیوں آدھ گھنٹہ لیٹ روانہ ہوا ہے۔

کیپٹن نے مذکورہ مسافر کو کاک پٹ میں بلایا اور وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ لیٹ ہونے کی وجہ کیا تھی۔ مسافر اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا اور کیپٹن کی پیٹھ پر گھونسہ مار کر کہا کہ میں نے تمہارے جیسے بہت پائلٹ دیکھے ہیں:

I have seen many pilots like you.

کیپٹن بھٹناگر اس صورت حال سے گھبرا اٹھے۔ انھوں نے فوراً جہاز کو موڑ دیا اور اس کو واپس لاکر دوبارہ بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتار دیا۔ اس کے بعد بمبئی کے ہوائی اڈہ پر کافی دیر تک ہنگامہ رہا۔ بالآخر انڈین ایرلائنز کے ذمہ داروں نے جہاز کو دوسرے پائلٹ کے ذریعہ روانہ کیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ جہاز جب بمبئی سے دہلی پہونچا تو وہ تین گھنٹہ لیٹ ہو چکا تھا۔ مسافر نے آدھ گھنٹہ کی تاخیر برداشت نہ کی۔ اس کی قیمت انھیں یہ دینی پڑی کہ وہ تین گھنٹہ تاخیر کے ساتھ اپنی منزل پر پہونچے۔ مزید یہ کہ انڈین ایرلائنز کے ذمہ داروں نے ایک انکوائری (High-level inquiry) بٹھائی ہے۔ مذکورہ مسافر بالفرض کسی سزا سے بچ جائے تب بھی وہ ایک انجام سے بچ نہیں سکتے۔ اسی چیز کی اور زیادہ قیمت دینا جس کی تھوڑی قیمت دینے پر وہ راضی نہیں ہوئے تھے، یعنی وقت۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کر رہا ہے۔ حالاں کہ وہ اپنے مقصد کو کھو رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہوں۔ حالاں کہ اس کی تیزی کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزل سے کچھ اور دور ہو جائے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۱۶ جنوری ۱۹۸۶)

صبر ایک مثبت عمل

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صبر ایک منفی عمل ہے مگر یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک مثبت عمل ہے بلکہ وہ مثبت عمل کی بنیاد ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر اس دنیا میں کوئی مثبت عمل نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اطراف عرب کے رئیسوں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ آپ کا یہ عمل واضح طور پر ایک مثبت عمل تھا۔ مگر اس مثبت عمل کی قیمت صبر تھی۔ اس سے پہلے آپ کو صبر کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ حالات پیدا ہوں جن میں مذکورہ قسم کا مثبت عمل انجام دیا جاسکے۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ رئیسوں اور بادشاہوں کے نام یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد روانہ کیے گیے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صلح حدیبیہ سے پہلے بھی ہو سکتا تھا۔ پھر آپ نے اس کو صلح حدیبیہ کے بعد کیوں انجام دیا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے آپ جنگ وقتال کے حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ صبح وشام دشمنوں کے حملہ کا خطرہ لگا رہتا تھا اور آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ساری توجہ دفاعی کاموں میں خرچ ہو رہی تھی۔ ایسے غیر معتدل حالات میں حکمرانوں کے نام دعوتی مہم کا منصوبہ بنانا اور اس کی تعمیل کرنا عملاً سخت دشوار تھا۔

صلح حدیبیہ حقیقۃً مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war pact) تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد حالات بالکل معتدل ہوگیے۔ اس کے بعد فوراً آپ نے حکمرانوں کے نام دعوت نامے بھیجنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی تعمیل فرمائی۔ جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر کے بغیر کوئی مثبت عمل ممکن نہیں۔ اگر آپ کو داعی بننا ہے تو مدعو کے ساتھ تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو متواضع اخلاق اختیار کرنا ہے تو اپنے سینہ کو تکبر کا قبرستان بنانا ہوگا۔ اگر آپ کو لوگوں کا خیر خواہ بننا ہے تو اپنے اندر اٹھنے والے حسد کے جذبات کو دبانا ہوگا۔ اگر آپ لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اندر پیدا ہونے والے انتقامی جذبات کو ذبح کرنا ہوگا۔ اور یہ سب وہ چیزیں ہیں جو صبر سے تعلق رکھتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان کا حصول ممکن نہیں۔

تاریخ ساز کردار

اگر ہر درخت یہ چاہے کہ وہ جہاں ہے وہیں کھڑا رہے تو کبھی زمین پر ریلوے لائن نہیں بچھ سکتی۔ اگر تمام دریا یہ چاہیں کہ ان کے سینہ کے اوپر کوئی پُل نہ بنے تو وہ لمبی شاہ راہیں نہیں بنائی جاسکتیں جن کے اوپر انسانیت کے قافلے ایک طرف سے دوسری طرف سفر کرتے ہیں۔ اگر زمین یہ چاہے کہ اس کے اوپر رولر چلاکر اس کے پست و بلند کو ہموار نہ کیا جائے تو وہ پر رونق دنیا تعمیر نہیں کی جاسکتی جس کو شہر کہا جاتا ہے۔

اس دنیا کا یہ اصول ہے کہ یہاں تخریب کے بعد تعمیر وجود میں آتی ہے۔ یہاں مجموعہ کی ترقی اجزار کی قیمت پر ہوتی ہے۔ یہاں کلّی فائدہ کی خاطر انفرادی نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہی اصول فطرت کی دنیا کے لیے ہے اور یہی اصول انسانی دنیا کے لیے۔

دین کا معاملہ بھی یہی ہے۔ یہاں بھی انفرادی قربانیوں کی زمین پر دین کا قلعہ بنتا ہے۔ افراد جب پیچھے ہٹنے پر راضی ہوتے ہیں اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ دین کے مجموعی قافلہ کو اگلی منزل کی طرف رواں دواں کرنے کے لیے راستہ ملے۔

ایک ہے دیندار بننا، اور ایک ہے تاریخ ساز بننا۔ پہلی شکل انفرادی دین داری کی ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ بہت سے لوگ اجتماعی قوت بن کر دین کی نئی تاریخ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ پہلا کام آسان ہے مگر دوسرا کام بے حد مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ مشکل اور کوئی کام اس دنیا میں نہیں۔

اگر آپ داڑھی رکھ لیں۔ آپ نماز روزہ جیسے دینی فرائض کے پابند بن جائیں تو ایسا کرنے کے بعد بھی آپ اپنی ذاتی مصلحتوں کے خانہ ہی میں رہتے ہیں۔ آپ کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اپنے خول کو توڑ کر اس سے باہر آئیں۔ مگر جب آپ دوسروں کے ساتھ مل کر دین کی ایک تاریخ بنانا چاہیں تو بات بالکل بدل جاتی ہے۔ اب آپ کی ذاتی مصلحتیں دوسروں کی مصلحتوں سے ٹکراتی ہیں۔ آپ کے انفرادی تقاضے اجتماعی تقاضوں سے مجروح ہوتے ہیں۔ یہ ایک بے پناہ آزمائش ہے جس سے عہدہ برآ ہونا بے پناہ صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

اس بنا پر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں بہت سے لوگ "مقتدی" بننے پر راضی ہوں تاکہ ایک

شخص کو "امام" کے فرائض انجام دینے کا موقع ملے ۔ اس عمل میں کچھ لوگ بظاہر کھونے والے بنتے ہیں اور کچھ لوگ بظاہر پانے والے ۔ مگر آخرت کے اعلیٰ تر مطلوب کی خاطر اسے برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ موجودہ دنیا میں اس کے بغیر کسی اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنا ممکن نہیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب وہ قیمتی انسانی گروہ ہیں جنھوں نے دین کی ایک تاریخ بنائی ۔ ان کے اس کارنامہ کے بارہ میں دو رائے نہیں ہو سکتی ۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تاریخ کو بنانے کے لیے انھیں اپنے آپ کو ہلاک کر دینا پڑا ۔

نبوت کے بیس سال بعد غزوۂ حنین پیش آیا ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بے شمار بربادیوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی مالِ غنیمت ملا ۔ آپ نے اس کو یک طرفہ طور پر قریش کے درمیان تقسیم کر دیا اور انصار کو اس میں سے کچھ نہیں دیا (ولم یعط الانصار شیئاً ، ابن ہشام) اسلام کی فتح میں اہلِ مکہ (قریش) اور اہلِ مدینہ (انصار) دونوں کی قربانیاں یکساں طور پر شامل تھیں ۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی مملکت کا خلیفہ مقرر کرنے کا وقت آیا تو اس کو صرف اہلِ مکہ کا حق قرار دے دیا گیا ۔ اور اہلِ مدینہ کو اس سے کلی طور پر محروم رکھا گیا ۔ خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولیدؓ کو عین اس وقت سپہ سالاری سے معزول کر دیا جب کہ وہ شاندار فوجی کارناموں کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا چکے تھے کہ ان کو فاتح شام کے لقب کا پروانہ بھیجا جائے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کی نئی تاریخ اس وقت وجود میں آتی ہے جب کہ کچھ لوگ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو بے تاریخ کرنے پر راضی ہو جائیں ۔ انھیں یک طرفہ طور پر محروم کیا جائے اور وہ اس کو برداشت کریں ۔ عہدوں کی تقسیم میں انھیں کوئی حصہ نہ ملے پھر بھی ان کا ذہنی سکون برہم نہ ہو ۔ بظاہر بلاسبب انھیں معزول کر دیا جائے ، اس کے باوجود وہ خوشی خوشی اپنی معزولی کے کاغذات پر دستخط کر دیں ۔ وہ موت کے فیصلہ کو اپنے لیے زندگی سمجھیں ۔ ان کے سر کا تاج اتارا جائے مگر وہ خوش دلی کے ساتھ اس کا استقبال کریں ۔

ایسے ہی لوگ تھے جنھوں نے اسلام کے دورِ اول میں اسلام کی تاریخ بنائی ۔ آج بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے جو دوبارہ اسلام کی تاریخ بنائیں گے ، اور ایسے ہی لوگوں کے کیے سے یہ کام ہو سکتا ہے ——
وما یلقّٰھا الا الذین صبروا وما یلقّٰھا الا ذو حظ عظیم ، حم السجدہ ۳۵)

دور سے کنٹرول

کیا آپ چاہتے ہیں کہ جب آپ چھٹیوں میں اپنے گھر سے باہر ہوں اس وقت بھی آپ اپنے دروازوں کے پردے کھولیں اور بند کر سکیں ۔ یا گھر سے دور رہتے ہوئے بھی آپ اطمینان کر سکیں کہ آپ کے بیرونی دروازہ کا تالہ بند ہے یا نہیں ۔ اسی طرح کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے گھر واپس پہونچنے سے پہلے اپنے گھر کا ایرکنڈیشنر چلا دیں ۔

یہ سب کام آپ کر سکتے ہیں ۔ جاپان کے بنائے ہوئے خودکار آلات کو اپنے گھر میں نصب کر کے آپ ٹیلیفون کے ذریعہ یہ سب کر سکتے ہیں جب کہ آپ کا گھر خالی ہو ۔

اس مشینی نظام کا نام ٹیلی کنٹرول سسٹم ہے ۔ اس نظام کو گھر کی مختلف چیزوں سے وابستہ کیا جاسکتا ہے ۔ بشمول ائرکنڈیشنر ، الکٹرک تالے ، گکر اور لائٹ ۔

گھر کے نئے خودکار سامانوں میں اور بھی کئی چیزیں شامل ہیں ، مثلاً آگ یا چوری کے خلاف برقی آلات کے ذریعہ حفاظت ۔ اسی طرح دور سے رابطہ قائم کرنے والا " ذہین " ٹیلیفون اور انٹرکام جو مختلف کمروں کو مربوط کرتا ہے ۔

ٹیلی کنٹرول نظام کے ذریعہ آدمی گھر کے برقی سامانوں کو کھول سکتا ہے یا ان کو بند کر سکتا ہے ۔ وہ آگ کا پتہ کر سکتا ہے ۔ گیس کے نکلنے کو معلوم کر سکتا ہے یا مخصوص آلات کے ذریعہ چوری کا پتہ کر سکتا ہے جو کوڈ کی شکل میں پیغامات بھیجتے ہیں ۔

- خدا کائنات کو کنٹرول کرتا ہے جب کہ وہ کائنات کے باہر ہے ، وہ ایک محدود انسان کی مانند کائنات کے اندر موجود نہیں ۔ یہ بات پہلے صرف ایک عقیدہ تھی مگر آج وہ ایک ایسی حقیقت بن گئی ہے جس کو ہم اپنے معلوم واقعات کے ذریعہ نہایت آسانی کے ساتھ قیاس کر سکتے ہیں ۔ مذکورہ ٹیلی کنٹرول نظام ایک گھر کی سطح پر اسی واقعہ کا گویا ایک ابتدائی مظاہرہ ہے ۔ جس کو خدا نے وسیع تر کائنات کی سطح پر زیادہ کامل انداز میں قائم کر رکھا ہے ۔

Telecontrol System to keep a watch

Tokyo, June 26, 1985, 1985 (Kyodo)

Want your curtains to open and close at home while you are on vacation? Or to make sure that the front door is locked? Or to turn on the airconditioner just before you get home?

You can do it all, by telephone, with Japanese made home automation equipment.

"Telecontrol systems" can be hooked up to many appliances, including airconditioners, electric locks, rice cookers and lights.

The new home automation products also include security systems to guard against fire or theft through electronic sensors, multi-function "intelligent" telephones for telecommunications, and intercoms linking rooms.

The telecontrol system allows the user to turn appliances on or off, and to check for fire, gas leaks or theft with special censors that send coded signals through a push-button telephone.

The Hindustan Times (New Delhi) June 27, 1985, p. 17)

Steering by satellite

Nineteenth-century clipper-ship captains looked to the stars to steer their course. Many modern skippers rely on Loran, a land-based navigation system using radio waves. Loran, however, has definite limitations: the system's radio transmitters don't cover most of the Pacific, and accuracy declines at sunset. In the future, many high-tech ships will chart their paths using an advanced navigational method called GPS. The system, developed by the U.S. military, will consist of a global network of 18 satellites. Using a $25,000 receiver and a special antenna, ships can pick up coded radio signals transmitted by the four closest GPS satellites. The timing of the signals indicates the location of the vessel. With such a system, modern sailors may seldom stray off course.

Newsweek. September 16, 1985. P. 5

عاجز انسان

جنرل مانک شا (S.H.F.J. Manekshaw) ہندستان کے پہلے فیلڈ مارشل تھے۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۸۶ میں جنرل کیری اپا (K.M. Cariappa) کو ہندستان کے دوسرے فیلڈ مارشل کا اعزازی خطاب دیا گیا ہے۔ ۳۵ سال پہلے وہ ہندستانی فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انھوں نے ہندستانی فوج میں جو خدمات انجام دیں اس کو انگریزی اخبارات نے شاندار فوجی کردار (Illustrious military career) سے تعبیر کیا ہے اور ان کو ملک کے قومی ہیروؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس موقع پر دہلی میں مختلف فوجی تقریبات ہوئیں جن میں جنرل کیری اپا شریک ہوئے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۶ کو نئی دہلی کے پریڈ گراونڈ میں وہ ہندستانی فوج کا معائنہ کر رہے تھے۔ فوجی جوان پُرعظمت انداز میں ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس دوران ۸۶ سالہ فیلڈ مارشل کیری اپا سے ایک اخبار نویس نے ان کا تاثر پوچھا۔ ان کا فوری جواب یہ تھا:

I envy them. I am not young to march with them.

مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ میں جوان نہیں کہ ان کے ساتھ مارچ کر سکوں (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جنوری ۱۹۸۶)

کیسا عجیب ہے زندگی کا تجربہ۔ انسان فوجی کارنامے انجام دیتا ہے۔ وہ فتوحات کر کے اپنے آپ کو قومی ہیروؤں کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کو سب سے بڑا فوجی اعزاز دیا جائے اور اس کو فیلڈ مارشل کے پُرعظمت خطاب سے نوازا جائے۔ مگر اس وقت انسان اتنا کمزور ہو چکا ہوتا ہے کہ ملنے والے انعام کو اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی طاقت اسے حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ان فوجیوں کے قدم بقدم چلنے سے بھی عاجز ہوتا ہے جن کو ساتھ لے کر اس نے کبھی معرکے سر کیے تھے اور قلعے فتح کیے تھے۔

انسان ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کا عجز اس کو حادثہ اور بڑھاپا اور موت کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے سبق لے۔ آدمی اس سب سے بڑی حقیقت کو سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے۔ وہ صرف اس وقت جاگتا ہے جب کہ خدا کا آخری فیصلہ ظاہر ہو کر اس کو خدا کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ مگر اس وقت کا جاگنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

دماغ ایک نشانی

آدمی کو روزانہ نیند آتی ہے اور وہ سو جاتا ہے ۔ اس کو وقت پر بھوک لگتی ہے اور وہ کھانا کھاتا ہے ۔ یہ سب سے زیادہ عام تجربہ ہے جو ہر انسان کو پیش آتا ہے ، خواہ وہ امیر ہو یا غریب ۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک عام تجربہ ہے کہ دماغ کو جب کوئی سخت جھٹکا لگتا ہے تو نیند اور بھوک دونوں اڑ جاتی ہیں ۔ اب رات آتی ہے مگر آدمی سو نہیں پاتا ۔ کھانے کا وقت آتا ہے مگر اشتہا نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کھانا کھائے ۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس پورے معاملہ کا تعلق دماغ سے ہے ۔ انسان کا جسم بظاہر اسباب کا ایک نظام ہے ۔ مگر یہ نظام دماغ کے حکم کے تحت عمل کرتا ہے ۔ دماغ حکم دیتا ہے کہ نیند آئے اس وقت آدمی کو نیند آتی ہے ۔ دماغ حکم دیتا ہے کہ بھوک لگے اس وقت آدمی کو بھوک لگتی ہے اور وہ کھانا کھاتا ہے ۔ جب دماغ کسی ناگہانی سبب سے منتشر ہو جائے تو وہ اپنے معمول کے احکام نہیں دے پاتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی حالت میں جسم کا نظام معطل ہو جاتا ہے ۔ یہ انسانی واقعہ چھوٹی سطح پر زیادہ بڑے واقعہ کا نمونہ ہے ۔ یہ خدا کی خدائی کو سمجھنے میں ہماری مدد کر رہا ہے ۔

دماغ کا جو تعلق جسم سے ہے ، وہی تعلق خدا کا پوری کائنات سے ہے ۔ کائنات بظاہر ایک مکمل نظام ہے ۔ اس کا ڈھانچہ اسباب و علل کا ایک کارخانہ دکھائی دیتا ہے ۔ مگر ان سب کے اوپر ایک برتر دماغ ہے اور وہ خداوند عالم کی ذات ہے ۔ دنیا کا ہر واقعہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ خدا اس کا حکم دے ۔ رات اور دن کا آنا ، فصل کا اگنا ، بارش کا برسنا ، زندگی اور موت کے واقعات سب کے سب براہِ راست خدا کی طرف سے کنٹرول ہو رہے ہیں ۔ قرآن کے الفاظ میں یہ پورا کا پورا کن فیکون کا نظام ہے ۔ خدا جس چیز کو کہتا ہے کہ ہو ، وہ ہو جاتی ہے ۔ اور خدا جس چیز کے ہونے کا حکم نہیں دیتا وہ نہیں ہوتی ۔

موجودہ دنیا کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں کے مادی واقعات معنوی حقیقتوں کی تمثیل بن گئے ہیں ۔ دماغ اور جسم کا تعلق خدا اور کائنات کے تعلق کی تمثیل ہے ۔ آدمی اگر چاہے تو خود اپنی ذات میں خدا کی معرفت حاصل کر سکتا ہے ۔ اور اگر وہ نہ چاہے تو ساری کائنات بھی اس کو معرفت تک پہونچانے کے لیے کافی نہیں ۔

یہ اسلام نہیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں : اس کا خون ، اس کا مال اور اس کی آبرو (کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ)

قرآن وحدیث میں اتنی سخت تنبیہ کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کرتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال چھینتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی آبروریزی کرتا ہے۔ یہ کام صرف عام لوگ نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو اسلام کے علَم بردار بنے ہوئے ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ وہ اسلام سے کم کسی چیز پر راضی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جب کسی کے خلاف ایسا کرنے والے ہوتے ہیں تو وہ یہ کرتے ہیں کہ سب سے پہلے اس کو اسلام سے خارج ثابت کرتے ہیں ـــــ یہ مرتد ہے ، یہ منافق ہے ، یہ بدنیت ہے ، یہ دشمنوں کا ایجنٹ ہے ، وغیرہ۔ اس قسم کا الزام لگانے کے بعد مسلمان نفسیاتی طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس شخص کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کرنے کا انھیں لائسنس مل گیا۔ اب ان کے لیے جائز ہے کہ ایسے شخص کو بے آبرو کریں۔ وہ اس کی معاش کو تباہ کریں حتیٰ کہ اس کو قتل کر ڈالیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب شیطانی افعال ہیں۔

اسلام میں کسی کو سزا دینے کا مقرر اصول ہے۔ محض الزام بازی پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ مرتد شرعی طور پر صرف وہ شخص ہے جو خود اپنے ارتداد کا اعلان کرے۔ اور ایسے مرتد کی سزا بھی صرف ایک قائم شدہ عدالت دے سکتی ہے نہ کہ عام افراد۔ منافق کے لیے شریعت میں اس قسم کی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کو بھی کوئی سزا نہیں دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مر گیا۔ بدنیتی خالص قانونی معنوں میں کوئی جرم نہیں۔ نیت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس سے صرف اللہ واقف ہے اور وہی کسی آدمی کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق معاملہ کرسکتا ہے۔ کسی انسان کو ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ ایک شخص کو بدنیت قرار دے کر اس کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کو اپنے لیے جائز کرلے۔

مسلم معاشرہ میں اس قسم کی باتیں صرف اس لیے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کا ڈر نہیں۔ اگر لوگ اللہ سے ڈریں تو وہ کبھی کسی کے خلاف اس قسم کی کارروائی نہ کریں۔

یہودی کردار

یہودی کردار دراصل اعتراف نہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو کسی بھی مرحلہ میں دوسرے کو تسلیم نہیں کرتا۔ نہ ابتدائی مرحلہ میں اور نہ آخری مرحلہ میں۔ اس کردار کی مثال قرآن میں کتّے سے دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ایسا انسان کتے کی مانند ہے کہ اس کو چھوڑ دو تب بھی ہانپے اور باندھے رکھو تب بھی ہانپے۔ یعنی وہ دوسرے کے فضل کا اعتراف نہ اس وقت کرتا جب کہ وہ تصوراتی حیثیت رکھتا تھا اور نہ اس وقت کرتا جب کہ اس کی شخصیت ایک واقعہ بن چکی ہو۔ (اعراف ۱۷۵)

اس کی وضاحت کے لیے سورہ یوسف کی مثال لیجئے۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف جب چھوٹے تھے تو ان کے سوتیلے بھائیوں کو ان سے جلن ہوگئی۔ انھوں نے چاہا کہ انھیں مار ڈالیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کو گھر سے دور ایک سنسان مقام پر لے گئے اور وہاں ان کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ بظاہر حضرت یوسف کو اس اندھے کنوئیں میں اپنی موت آپ مر جانا چاہیے تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ وہ اس سے نکل کر مصر پہونچے۔ وہاں دوبارہ آپ کے لیے ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ آپ مصر کی حکومت میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوگیے۔

اس کے بعد دوبارہ وہ اسباب پیدا ہوئے جس نے حضرت یوسف کے بھائیوں کو حضرت یوسف کے دربار میں اس حال میں پہونچایا کہ حضرت یوسف بڑے تھے اور وہ ان کے سامنے چھوٹے بن کر کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت جب سوتیلے بھائیوں کو معلوم ہوا کہ جس نوجوان کو انھوں نے اندھے کنوئیں میں ڈالا تھا وہ مصر پہونچ کر یہاں کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا: خدا کی قسم، اللہ نے تم کو ہم سے اوپر کر دیا (تاللہ لقد آثرک اللہ علینا) حضرت یوسف کے بھائیوں نے اگرچہ پہلے مرحلہ میں حضرت یوسف کا اعتراف نہیں کیا تھا مگر دوسرے مرحلہ میں وہ ڈھ پڑے اور کھلے دل سے حضرت یوسف کے فضل کا اعتراف کر لیا۔

حضرت یوسف کے بھائی اگر یہودی ذہنیت کے ہوتے تو وہ کتے کی طرح پہلے بھی ہانپتے اور بعد کو بھی ہانپتے۔ یعنی پہلے اگر وہ جلن میں مبتلا ہوئے تھے تو اب وہ کہہ دیتے کہ مصر کے مشرک بادشاہ کی خوشامد کر کے اس نے مصر میں یہ عہدہ حاصل کیا ہے۔ وہ حضرت یوسف کے معاملہ میں پہلے جس طرح بے انصاف بنے ہوئے تھے بعد کو بھی وہ ان کے حق میں بے انصاف ثابت ہوتے۔

دانش مندی

دنیا دانش مندی کا امتحان ہے۔ یہاں ہر آدمی آزمائش کے مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ جو شخص دانش مندی کا ثبوت دے وہ امتحان میں پورا اترے گا۔ اور جو شخص دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دانش مندی کیا ہے۔ دانش مندی حقیقۃً کسی آدمی کی اس صلاحیت کا نام ہے کہ وہ غیر معتدل حالات میں معتدل ذہن سے سوچ سکے۔ وہ عملی بحران کے وقت بھی فکری بحران میں مبتلا نہ ہو۔ غیر معتدل حالات ہی میں دراصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون شخص فی الواقع دانش مند ہے اور کون شخص دانش مند نہیں۔

زندگی کا سب سے نازک امتحان یہ ہے کہ آدمی واقعات کو ان کے صحیح رُخ سے دیکھ سکے۔ اکثر ناکامیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی واقعات کو ان کے صحیح رُخ سے نہیں دیکھتا اس لیے وہ ان کے بارے میں صحیح رائے بھی قائم نہیں کر پاتا۔

مثال کے طور پر اکثر ایک واقعہ کے ساتھ دوسرا واقعہ شامل رہتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کو جاننا پڑتا ہے کہ کب اسے ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے الگ کر کے دیکھنا ہے اور کب اسے ایسا کرنا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے ملا کر دیکھے۔ زندگی میں کبھی پہلی دانش مندی مطلوب ہوتی ہے اور کبھی دوسری دانش مندی۔ یہاں ہم مسئلہ کی وضاحت کے لیے دونوں قسم کی مثالیں نقل کریں گے۔

دشمن کو رہنما بنانا

قدیم عرب میں موجودہ زمانہ کی طرح راستوں کے نشانات نہیں تھے اور نہ اس وقت آج کل کی طرح سڑکیں پائی جاتی تھیں۔ آدمی مجبور تھا کہ وہ سنسان پہاڑوں اور لق و دق صحراؤں کے درمیان اپنا سفر طے کرے۔ چنانچہ دور کا سفر کرنے کے لیے لوگوں کو رہنما کی ضرورت پڑتی تھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت

کا فیصلہ فرمایا تو اس وقت آپ کے سامنے یہی مسئلہ تھا۔ مزید یہ کہ آپ دشمن کی نظروں سے بچنے کی خاطر یہ چاہتے تھے کہ معروف راستہ کو چھوڑ کر غیر معروف راستے سے اپنا سفر طے کریں۔ آپ کو ایک ایسے اچھے رہنما کی ضرورت تھی جو آپ کو مطلوب راستے سے چلا کر بحفاظت مدینہ پہونچا دے۔ اس وقت جو صورت پیش آئی اس کا ذکر سیرت ابن ہشام میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

فاستاجرا عبد اللّٰہ بن ارقط، رجلاً من بنی الدیل بن بکر، وکانت امہ امرأۃ من بنی سہم ابن عمرو وکان مشرکا یدلھما علی الطریق۔

(الجزء الثانی، صفحہ ۹۸)

(رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر نے) عبد اللہ بن ارقط سے اجرت پر معاملہ کیا۔ وہ بنو دیل بن بکر کا ایک شخص تھا اور اس کی ماں بنو سہم بن عمرو سے تعلق رکھتی تھی۔ عبد اللہ بن ارقط ایک مشرک تھا۔ وہ راستہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔

عبد اللہ بن ارقط کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ مشرک تھا۔ یعنی وہ رسول اللہ کے دشمن گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ صحرائی راستوں کا ماہر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقط کے ان دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا۔ اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ اس کو اپنے سفر کا رہنما بنائیں۔ اگر آپ اس کے رہنما ہونے کی حیثیت کو اس کے مشرک ہونے کی حیثیت سے الگ کر کے نہ دیکھتے تو کبھی ایسا نہ ہوتا کہ آپ ہجرت جیسے نازک سفر میں اس کو اپنے راستہ کا رہنما بنائیں۔

انتقام نہ لینا

دوسری مثال کے ذیل میں ہم ایک غیر مسلم کا واقعہ نقل کریں گے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کا مقابلہ اپنی زندگی سے کر کے دیکھیں کہ کیا وہ دانشمندی کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو کبھی ایک غیر مسلم تک کے یہاں پایا جاتا تھا۔

سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ حضرت حمزہؓ کے اسلام کے ذیل میں آیا ہے۔ مکی دور میں ایک بار ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صفا کے پاس تھے۔ ابو جہل وہاں سے گزرا۔ ابو جہل نے آپ کو برا بھلا کہا اور آپ کے ساتھ بدزبانی کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بالکل خاموش رہے۔ عبد اللہ بن جدعان

کی ایک خادمہ نے اس پورے واقعہ کو دیکھا۔ وہ واپس ہوئی تو راستہ میں اس کی ملاقات آپ کے چچا حمزہ بن عبد المطلب سے ہوئی جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔

حمزہ اس وقت شکار سے واپس آرہے تھے اور ان کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ خادمہ نے ان سے کہا کہ اے ابو عمارہ، کاش آپ دیکھتے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ ابو الحکم بن ہشام (ابوجہل) نے کیا کیا۔ اس نے آپ کے بھتیجے کو یہاں بیٹھا ہوا دیکھا تو ان کے ساتھ بدزبانی کی اور ان کو سخت برا بھلا کہا۔ حمزہ کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ فوراً ابوجہل کی تلاش میں چل پڑے۔ یہاں تک کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ کعبہ کے اندر اپنے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تیزی سے اس کے پاس پہونچے اور اپنی کمان اس کے سر پر اتنے زور سے ماری کہ خون بہنے لگا۔

اس کے بعد ابوجہل کے قبیلہ (بنو مخزوم) کے لوگ دوڑے کہ حمزہ کو ماریں۔ مگر ابوجہل نے فوراً انھیں روک دیا۔ اس نے کہا کہ ابو عمارہ (حمزہ) کو چھوڑ دو۔ کیوں کہ خدا کی قسم میں نے ان کے بھتیجے کو بہت زیادہ برا بھلا کہہ دیا تھا (دعوا اباعمارة فانی واللّٰہ قد سببت ابن اخیه سبًا قبیحًا. سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۲)

یہ مثال بتاتی ہے کہ ابوجہل نے دو واقعات کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا۔ اپنی بدزبانی کو اور حمزہ کے مارنے کو۔ اگر وہ اپنی بدزبانی کو الگ کر دیتا اور صرف حمزہ کے مارنے کو دیکھتا تو وہ بھی غصہ ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر حمزہ کو مارنا شروع کر دیتا۔ مگر جب اس نے حمزہ کے فعل کے ساتھ خود اپنے فعل کو ملا کر دیکھا تو اس کو معاملہ برابر سرابر نظر آیا اس لیے اس نے نہ خود حمزہ کو برا کہا اور نہ اپنے ساتھیوں کو ان کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت دی۔

موجودہ دنیا میں حقیقتیں ملی جلی صورت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کو ایک رخ سے دیکھا جائے تو وہ کچھ نظر آتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو وہ کچھ بن جاتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آدمی کو عقل دے کر اسے اس امتحان میں ڈالا ہے کہ وہ اپنی عقل کے استعمال سے صحیح رخ کو جانے۔ وہ واقعات کو ان کے صحیح ترین رُخ سے دیکھ سکے۔ اگر آپ واقعہ کو صحیح رخ سے نہ دیکھیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس معاملہ میں آپ کا رویہ بالکل غلط ہو کر رہ جائے گا۔

اخلاق کا معیار

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی سے تمہاری دشمنی ہو جائے تو تم ایسا مت کرو کہ اس کے ساتھ بے انصافی کرنے لگو، بلکہ تم ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ کے مطابق ہے (لا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ)

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے: یعنی کسی کا بغض تم کو نہ ابھارے کہ اس کے معاملہ میں تم انصاف کو چھوڑ دو۔ بلکہ ہر ایک کے معاملہ میں انصاف کرو خواہ وہ دوست ہو یا دشمن (ای لا یحملنکم بغض قوم علیٰ ترک العدل فیھم بل استعملوا العدل فی کل احد صدیقاً کان او عدواً)

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ موجودہ دنیا میں تقویٰ کا سب سے زیادہ یقینی معیار ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان معتدل تعلقات ہوں تو دونوں بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اعلیٰ اخلاق پر قائم ہیں۔ مگر کسی کے اخلاق کو جانچنے کا یہ صحیح معیار نہیں۔ کوئی شخص اخلاقی اعتبار سے کیسا ہے، اس کا اندازہ معتدل حالات میں نہیں ہوتا۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ دونوں کے درمیان تلخی اور شکایت کی فضا پیدا ہو گئی ہو۔

ایک پھل اندر سے کیسا ہے، اس کا اندازہ آپ پھل کے چھلکے کو دیکھ کر نہیں کر سکتے۔ اس کا پتہ صرف اس وقت چلتا ہے جب کہ پھل کو توڑا جائے۔ اسی طرح کوئی انسان حقیقۃً کیا ہے، اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ جب آدمی کے ساتھ کوئی خلافِ مزاج واقعہ پیش آتا ہے، اسی وقت معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ عام حالات میں آدمی اپنے آپ کو چھپائے رہتا ہے۔ مگر جب اس کی شخصیت کو کوئی شدید جھٹکا لگتا ہے اس وقت اس کا اندر اس کے باہر آ جاتا ہے۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ وہ شریف تھا یا غیر شریف۔ وہ بے اخلاق تھا یا با اخلاق۔

جس شخص سے آپ کا بگاڑ نہیں ہوا اس سے خوش اخلاقی برت کر آپ خدا کے نزدیک خوش اخلاق نہیں ہو سکتے۔ خدا کے نزدیک آپ اس وقت خوش اخلاق قرار پائیں گے جب کہ آپ اس شخص کے معاملہ میں خوش اخلاق ثابت ہوں جس سے آپ کا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

یہ انسان

ایک ہے کسی چیز کو دور سے دیکھنا۔ اور ایک ہے اس کا قریب سے تجربہ کرنا۔ دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ دور سے دیکھنے میں ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے مگر جب قریب سے اس کا تجربہ کیا جائے اسی وقت صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔

دور سے دیکھئے تو ناگ پھنی بھی آپ کو اچھی معلوم ہوگی۔ حتی کہ بہت سے لوگ ناگ پھنی کے پودے کو گملے میں لگا کر اس کو اپنے گھر کی زینت بناتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ناگ پھنی کے پتوں کو رومال اور تولیہ کے طور پر استعمال کریں تو اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ ناگ پھنی حقیقت میں اس سے بالکل مختلف تھی جو وہ دور سے دیکھنے میں نظر آرہی تھی۔

یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ لوگوں سے رسمی طور پر ملئے، میز کرسی کی سطح پر ان سے باتیں کیجئے۔ تو ہر آدمی اچھا نظر آئے گا۔ مگر جب حقیقی تجربہ پیش آتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو وہ دور سے دیکھنے میں نظر آرہا تھا۔ لوگ اپنے الفاظ میں کچھ ہیں اور عمل میں کچھ۔ لوگ رسمی ملاقاتوں میں اچھے نظر آتے ہیں۔ مگر حقیقی تجربہ فوراً بتا دیتا ہے کہ وہ اتنے برے تھے کہ کوئی جانور بھی اتنا برا نہیں ہوتا۔

آپ جانور کے بارہ میں پیشگی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اسی وقت ستائے گا جب کہ آپ خود پہلے اس کو ستائیں۔ مگر انسان یک طرفہ اپنے دوسرے بھائی کو ستاتا ہے۔ آپ لوہے کے بارہ میں پیشگی طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ اس کو آپ جہاں بھی استعمال کریں گے وہ ہمیشہ "لوہا" ثابت ہوگا۔ وہ مٹی اور لکڑی نہیں بن جائے گا۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ آپ اس کی باتوں کے فریب میں آکر اس کو لوہا سمجھ لیتے ہیں مگر عملی تجربہ میں وہ مٹی کی طرح کمزور ثابت ہوتا ہے۔

آہ، لوگوں کو معلوم نہیں کہ آخرت میں ان کے ساتھ بہ اعتبار حقیقت معاملہ کیا جائے گا نہ کہ باعتبار ظاہر۔ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو پردہ میں چھپا لیتا ہے مگر آخرت میں اس کے جھوٹے الفاظ اس کو چھپانے والے نہیں بنیں گے۔ آخرت میں آدمی اپنے ظاہر میں بھی ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ وہ اپنے باطن میں تھا۔

May 3, 1985

Assembly of the World's Religions

A Project of the

International Religious Foundation, Inc.

c/o Unification Theological Seminary
10 Dock Road
Barrytown
NY 12507
(914) 758-6838/39
Telex: 4991393 NWERA
Cable IRFINC

Maulana Wahiduddin Khan
C-29, Nizamuddin West
New Delhi - 110 013
India

Dear Mr. Khan

This letter is to invite you to attend an Assembly of the World's Religions, which will occur at the American Great Gorge Conference Center, McAfee, New Jersey (near New York City) on Friday, November 15th to Thursday, November 21st, 1985.

The Assembly of the World's Religions, 1985, is the first in a major series of events in world ecumenism, to be followed in 1989 by a second gathering. These events are to be preparatory meetings for a major Assembly to take place in 1993, in commemoration of the 100th anniversary of the 1893 World's Parliament of Religions that was held in conjunction with the Columbian Exposition in Chicago, Illinois, U.S.A. (see enclosed brochure for more details).

The Assembly is sponsored by the International Religious Foundation; Inc. (I.R.F.) established by the Unification Church (see last page of enclosed brochure). The Assembly grows organically out of two I.R.F. projects· the annual international conference on "God: The Contemporary Discussion" initiated by New ERA (the New Ecumenical Research Association) and the "Youth Seminar on World Religions".

The theme of the 1985 Assembly is, "The Recovery of our Classical Spiritual Heritage", emphasizing the worldwide phenomena of a return to roots and the retrieval of traditional values. The Assembly seeks, through an integrated program of prayer, meditation, study, dialogue, film, art and ritual, to discern patterns of unity and understanding among the world's religious traditions. It seeks to provide a new environment for global religious exchange in order to foster international harmony, social justice and authentic human development.

This event will bring together approximately 600-700 spiritual teachers, scholars, scientists, lay leaders, artists and youth. The Assembly's program of plenary speakers will feature spiritual leaders from the world's traditions, including Venerable Samdhong Rinpoche, His holiness Swami Chidananda, Professor Wande Abimbola and others. The Assembly wil strive to reflect a balanced representation of the religious traditions, genders, cultures and regions of our world. Participants will select membership in one of 12 working themes, which will then be subdivided into smaller groups of 20-25 contributors. The 12 themes of the 1985 Assembly will be:

1. Interreligious Dialogue
2. Family Life and Learning
3. Spiritual Journey and the Formation of Persons
4. Social, Political and Economic Systems
5. Images of God, Woman, and Man
6. Stewardship of Creation and the Fate of the Earth
7. Spiritual Disciplines and Practices
8. Poverty and Human Rights
9. Communication, Language, Symbol and Art
10. Science and Technology
11. The Encounter with Secularity
12. Morality, Ethics and Values

ایک سفر

نومبر ۱۹۸۵ میں کرۂ ارض کے اس حصہ کا سفر ہوا جس کی بابت خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں کہا تھا:

کولمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

یہ سفر امریکہ کے دو شہروں، نیویارک اور نیوجرسی کے لیے تھا۔ نیویارک کے لیے میرا پہلا سفر اپریل ۱۹۸۳ میں ہوا تھا۔ اس کی مختصر روداد الرسالہ جون ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسرا سفر موجودہ سفر تھا۔ یہ سفر ایک عالمی مذاہب کانفرنس کے دعوت نامہ پر ہوا۔

مذاہب کی پارلیمنٹ (World's Parliament of Religions) کے نام سے ایک کانفرنس امریکہ کے شہر شکاگو میں ۱۸۹۳ میں ہوئی تھی۔ اس تاریخی کانفرنس کی یاد میں امریکہ میں زیادہ وسیع پیمانہ پر ایک بین اقوامی کانفرنس ہوئی جس میں ساری دنیا سے مختلف مذاہب کے نمائندے بلائے گئے۔ اس کانفرنس کا مقصد روحانی اتحاد (Spiritual Unity) اور عالمی امن بتایا گیا تھا اس کو انٹرنیشنل ریلیجس فاونڈیشن (نیویارک) نے منظم کیا تھا۔ انٹرنیشنل ریلیجس فاونڈیشن کے ایک ذمہ دار پروفیسر ہیوسٹن اسمتھ (Huston Smith) ہمارے مرکز (نئی دہلی) میں بھی اس سے پہلے آئے تھے جس کا ذکر الرسالہ مارچ ۱۹۸۵ کے خبرنامہ میں شائع ہو چکا ہے۔

مجھ کو اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ کے طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت نامہ کے مطابق میں اس کانفرنس میں شریک ہوا اور وہاں اپنا مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا:

The Concept of Morality in Islam

یہ مقالہ انشاء اللہ الرسالہ (انگریزی) میں شائع کر دیا جائے گا۔ کانفرنس کی طرف سے جو دعوت نامہ موصول ہوا اس میں درج تھا کہ آپ اپنے بچوں میں سے کسی کو لانا چاہیں تو اپنے ساتھ لا سکتے ہیں چنانچہ میرے لڑکے ثانی اثنین بھی میرے ساتھ اس سفر میں شریک تھے۔

اس کانفرنس کا نام اس کے ذمہ داروں نے (Assembly of the World's Religions)

یعنی عالمی مذاہب کی اسمبلی رکھا تھا۔ ہندستان سے اس "اسمبلی" میں کئی درجن افراد شریک ہوئے جو ہندوازم، جین ازم، بدھزم، سکھ ازم وغیرہ مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندستان سے شریک ہونے والے دوسرے مسلمان ڈاکٹر سید اوصاف علی (ڈائرکٹر اسلامک انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد نئی دہلی) تھے۔ وہ اسمبلی کی پلاننگ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔ اس اعتبار سے غالباً یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی کہ اس میں دنیا بھر کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۵ کو ہم دہلی ایرپورٹ میں داخل ہوئے اور اگلے دن ۱۴ نومبر کو آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ ایرپورٹ پر اتنا زیادہ وقت کیسے لگا۔ اس کا سبب ہوائی جہاز کا وقت تھا۔ دہلی سے ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت رات کو بارہ بج کر ۴۵ منٹ پر تھا۔ انگریزی کیلنڈر کے مطابق ۱۲ بجے رات کو ایک تاریخ ختم ہوتی ہے اور ۱۲ بجے رات کے فوراً بعد اگلی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ہوائی اڈہ پر اگرچہ ہم صرف تھوڑی دیر رہے۔ مگر اسی تھوڑی دیر میں کیلنڈر کی ایک پوری تاریخ بدل چکی تھی ——— زندگی ایک عجیب سفر ہے۔ اس میں کبھی ایک تاریخ سے دوسری تاریخ تک پہونچنے کے لیے "۲۴ گھنٹے" لگ جاتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک تاریخ سے دوسری تاریخ تک کا سفر صرف چند لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔

ہندستان سے امریکہ کا سفر بہت لمبا سفر ہے۔ ہوائی جہاز سے تقریباً ۲۰ گھنٹے۔ مزید یہ کہ ہوائی حادثات کی تاریخ میں ۱۹۸۵ سب سے زیادہ برا سال رہا ہے۔ اس سال اگست ۱۹۸۵ تک کے اعداد وشمار کے مطابق ۲۲ ہوائی حادثات ہوئے۔ ان میں مجموعی طور ۱۷۹۸ مسافر ہلاک ہوئے۔ پچھلے ۲۰ سال کے اندر ہوائی حادثات میں مرنے والوں کا اوسط سالانہ ۹۰۰ تھا۔ اس لحاظ سے ۱۹۸۵ کا اوسط تقریباً تین گنا زیادہ ہے۔ ۲۳ جون ۱۹۸۵ کو اٹلانٹک کے اوپر ایر انڈیا کا حادثہ خاص اسی راستہ میں ہوا تھا جس میں ۳۲۹ آدمی ہلاک ہوگیے۔ اگرچہ عام حادثات میں لوگوں کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ مگر ہیگ پروٹوکول کے مطابق ہوائی حادثہ میں ہلاک ہونے والے ہر مسافر کے پس ماندگان کو ۲۰ ہزار ڈالر دینا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

ان حالات میں جب میں دہلی میں ایر انڈیا کی فلائٹ ۱۰۴ پر بیٹھا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک پرخطر سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ دل میں تھوڑی دیر کے لیے دہشت کا احساس ہوا۔ پھر مجھے

جان شیڈ (John Shedd) کا قول یاد آیا کہ جہاز بندرگاہ پر محفوظ ہوتا ہے مگر جہاز اس لیے نہیں کہ وہ بندرگاہ پر کھڑا رہے :

A ship in harbour is safe, but that is not what ships are for.

یہ جہاز بوئنگ ۷۴۷ تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا جہاز ہوتا ہے۔ اس کے اندر آپ ایک سرے پر کھڑے ہوں تو آپ دوسرے سرے کے مسافر کو پہچان نہیں سکتے۔ ایسے ایک جہاز کی قیمت تقریباً پچاس کروڑ روپے ہوتی ہے۔ اس قسم کے جہاز زیادہ تر امریکہ میں بنائے جاتے ہیں۔ جہازسازی کی صنعت میں امریکہ آج سب سے آگے ہے۔ کسی جہاز پر خواہ ایر انڈیا لکھا ہوا ہو یا ایر پاکستان، سعودی ایر لکھا ہوا ہو یا ایرانی ایر بہرحال وہ امریکی کارخانہ کا بنا ہوا ہوگا۔

ہماری پہلی منزل بمبئی تھی۔ جاتے ہوئے یہ جہاز دہلی، بمبئی۔ لندن۔ نیویارک کے راستے سے جاتا ہے اور واپسی میں نیویارک لندن۔ دہلی واپس آتا ہے۔ ہمارا یہ سفر ایک لحاظ سے "بمبئی" سے بمبئی "کے لیے تھا۔ ہندستان میں جو حیثیت بمبئی کی ہے۔ امریکہ کے اعتبار سے وہی حیثیت وہاں نیویارک کی ہے۔ نیویارک گویا زیادہ بڑا بمبئی ہے۔ چند سو سال پہلے نیویارک اور بمبئی دونوں یکساں طور پر سمندر کے کنارے کی دو معمولی بستیاں تھیں۔ مگر آج دونوں میں ترقی کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق ہو چکا ہے۔ بمبئی اگر ایک ملک کا اقتصادی مرکز ہے تو نیویارک ساری دنیا کا اقتصادی مرکز۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمی ایک ساتھ سفر شروع کرتے ہیں۔ مگر بعد کے حالات ایک کو آگے کر دیتے ہیں اور دوسرے کو پیچھے۔

۱۴ نومبر کی صبح کو ہوائی جہاز دبئی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ دبئی کا ہوائی اڈہ بہت منظم اور شاندار ہے۔ سب سے پہلے ہم کو مسجد کی تلاش ہوئی۔ اوپر کی منزل پر پہونچے تو وہاں ایک کنارے چھوٹی سی خوبصورت مسجد موجود تھی۔ اسی کے ساتھ نہایت صاف ستھرا حمام بھی تھا۔ ہم نے وضو کر کے سکون کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔

مسجد سے باہر نکلے تو خیال آیا کہ دبئی اور شارجہ میں کچھ لوگوں کو ٹیلیفون کیا جائے۔ دبئی میں مقامی ٹیلیفون کرنے کی کوئی قیمت نہیں۔ مقامی کال یہاں فری ہے۔ چنانچہ ہم نے دبئی کے ایک صاحب (شیخ علی الہاشمی) کا نمبر ملایا۔ نمبر فوراً مل گیا اور بغیر کسی اختلال کے گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد ایک

ٹیلی فون شارجہ (شکیل احمد چیف انجینیر) کو کرنا تھا۔ شارجہ ٹیلی فون کرنے کے لیے مشین میں ایک درہم ڈالنا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس یہاں کا "درہم" موجود نہ تھا۔ شرطہ کے ایک عرب نوجوان (محمد یوسف عبداللہ) نے ہماری مشکل کو محسوس کیا۔ انھوں نے فوراً اپنی جیب سے ایک درہم نکالا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ لیجیے۔ قاعدہ ہے کہ تین منٹ کے بعد ٹیلی فون پر روشن حروف میں لکھ اٹھتا ہے کہ مزید رقم ڈالیے ہم بات کر رہے تھے تو استاذ محمد یوسف عبداللہ دوسرا درہم ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے تھے کہ جیسے ہی نشان ظاہر ہو فوراً دوسرا درہم مقررہ سوراخ میں ڈال دیں۔ مگر ابھی نشان ظاہر نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے احتیاطاً دوسرا درہم بطور خود ڈال دیا۔

یہ دبئی کا حال تھا۔ دوسری طرف دہلی کا حال یہ ہے کہ ہم نے دہلی ایرپورٹ سے گھر پر ٹیلی فون کرنا چاہا۔ دہلی میں مقامی ٹیلی فون کے لیے پچاس پیسے کا سکہ ڈالنا ہوتا ہے، ہمارے پاس روپیہ تھا، پچاس پیسے کا سکہ نہیں تھا۔ ایرپورٹ کے کئی لوگوں اور دکانداروں سے کہا کہ وہ روپیہ لے کر پچاس پیسے کے دو سکے دیدیں مگر کسی نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ بمشکل پچاس پیسہ کا سکہ حاصل کیا تو اب ٹیلی فون کے نظام کا حال یہ تھا کہ بار بار کوشش کرنے کے باوجود سلسلہ قائم نہیں ہوا اور بات نہ ہوسکی۔ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ایک ہی دنیا کے دو حصوں میں پایا جارہا ہے۔

ہوائی کمپنیاں فرسٹ کلاس مسافروں کے لیے خصوصی رعایتیں دیتی ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ رعایتیں بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً امریکہ کی ہوائی کمپنی (PAN AM) نے امریکی ہوائی اڈہ پر اترنے والے مسافروں کو یہ سہولت دی ہے کہ وہ مخصوص قریبی مقامات پر انھیں ہیلی کاپٹر سے پہونچاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایر انڈیا کی اِن فلائٹ میگزین (نمسکار) نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں ایک صفحہ پر ایر انڈیا کے فرسٹ کلاس کا باتصویر اشتہار نظر سے گزرا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایر انڈیا اپنے فرسٹ کلاس مسافروں کے لیے کیا خاص خاص سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک چیز اس کے الفاظ میں یہ تھی:

A selection of the finest wines and liquor (p. 52)

یعنی بہترین اقسام کی منتخب شرابوں کی فراہمی۔ آزادی سے پہلے ہندستان کے مجاہدین آزادی شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرتے تھے۔ حتی کہ عربی مدارس کے مسلم طلبہ کی جماعت دہلی آتی تھی کہ یہاں شراب

دکانوں پر پکٹنگ کرے۔ یہ لوگ شراب کے خلاف مذہبی اور اخلاقی دلائل استعمال کرتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عمل کا کوئی بھی تعلق شراب کے مذہبی مسئلہ سے نہ تھا۔ اس کا مقصد صرف انگریزی حکومت کو لوگوں کی نظر میں برا دکھانا اور اس کے خلاف عوامی نفرت پیدا کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد اگرچہ ملک میں شراب کا رواج پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے مگر اب کوئی اس کے خلاف پکٹنگ کرنے والا نہیں۔ اس طرح کے سیاسی ذہن کے تحت جو تحریک چلائی جائے وہ صرف سماج کی برائیوں میں اضافہ پر ختم ہوتی ہے۔ خواہ اس کو کتنے ہی خوبصورت عنوان کے تحت شروع کیا گیا ہو۔

دبئی سے سات گھنٹہ مسلسل پرواز کرنے کے بعد ہمارا جہاز لندن پہونچا۔ یہ سفر بہت زیادہ اُکتا دینے والا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک ہزار سال پہلے کوئی شخص کہتا کہ وہ عرب سے انگلستان تک کا سفر سات گھنٹہ میں کرا دے گا تو لوگ اس کو عجوبہ سمجھتے اور جب وہ واقعۃً لوگوں کو سواری میں بٹھا کر سات گھنٹہ میں عرب سے انگلستان پہونچا دیتا تو لوگوں کو یہ مدت اتنی کم معلوم ہوتی کہ وہ کہتے کہ ابھی ہم سواری پر بیٹھے تھے اور ابھی اتر گئے۔ مگر آج تیز رفتار سواری کے دور میں سات گھنٹہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے ــــ انسان اکثر اضافی اصطلاحوں میں سوچتا ہے۔ مگر اکثر وہ غلطی سے سمجھ لیتا ہے کہ وہ حقیقی اصطلاحوں میں سوچ رہا ہے۔

لندن ایرپورٹ پر ایک گھنٹہ گزرا۔ یہاں کا ہوائی اڈہ بہت بڑا ہے۔ ہوائی اڈہ پر اندراجات انگریزی کے بعد عربی زبان میں نظر آئے۔ ہوائی اڈہ پر ایسا معلوم ہوا گویا یہاں انگریزی کے بعد دوسری زبان عربی ہے۔ یہاں ٹیلی فون کا نظام نہایت معیاری ہے۔ آپ ایرپورٹ پر لگی ہوئی مشین میں رقم ڈال کر ملک کے کسی بھی حصہ میں براہ راست ٹیلی فون کر سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک صاحب نے اسی طرح برمنگھم سے بات کی۔ لندن اور دہلی کے درمیان ڈائرکٹ ڈائلنگ ہے۔ چنانچہ ہم نے ایرپورٹ پر ٹیلی فون کرکے دہلی سے بات کی۔ صرف ایک بار ڈائل کرنے میں لائن مل گئی۔ آواز اتنی صاف تھی گویا کہ بالکل قریب سے بات ہو رہی ہو۔ اس کے مقابلہ میں دہلی میں ٹیلی فون کا حال یہ ہے کہ ایک مرتبہ انگریزی اخبار میں لطیفہ شائع ہوا تھا۔ ایک شخص نے دہلی فون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا " دہلی کے نصف باشندے کنکشن کا انتظار کر رہے ہیں اور بقیہ نصف ڈائل ٹون کا :

While half the people in the Capital are waiting for their telephone connections. the remainder are waiting for the dial tone.

لندن سے جہاز روانہ ہوا تو اعلان ہوا کہ لندن سے نیویارک تک کی دوری سات گھنٹہ میں پوری کی جائے گی۔ سات گھنٹہ کا لفظ حوصلہ شکن تھا۔ کیوں کہ دبئی سے لندن تک کے سات گھنٹے بہت اکتا دینے والے ثابت ہوئے تھے۔ مگر حیرت انگیز طور پر یہ سفر بہت آسانی سے طے ہوگیا۔ "ہم نیویارک پہونچنے والے ہیں" کا اعلان سنائی دیا تو ایسا محسوس ہوا گویا سات گھنٹے صرف سات منٹ میں پورے ہوگیے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ دبئی سے لندن تک کا وقت زیادہ تر جاگنے میں گزرا تھا۔ مگر جہاز جب لندن سے چلا تو ہمیں نیند آگئی اور تقریباً پورا سفر نیند کی حالت میں طے ہوا۔ یہاں تک کہ نیند اس وقت کھلی جب کہ جہاز کے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ "اپنی بیلٹ باندھ لیں" نیند بھی کیسی عجیب نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے راحت و سکون کے لیے بنائی ہے۔

نیویارک کے جے ایف کے ایرپورٹ میں داخل ہوئے تو وہاں دیوار پر ہر زبان میں "ویلکم" لکھا ہوا تھا۔ سواگتم، خوش آمدید اور مرحبا کے الفاظ بھی لکھے ہوئے نظر آتے۔ اس طرح گویا نیویارک کا ایرپورٹ بزبان حال اعلان کر رہا تھا کہ آپ ایک انٹرنیشنل ایرپورٹ پر پہونچ گیے ہیں۔

ایرپورٹ پر "اسمبلی آف دی ورلڈز ریلیجنز" کے نمائندے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا بینر لیے ہوئے موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں نیویارک سے نیوجرسی کا سفر شروع ہوا۔ نیوجرسی اور نیویارک کے درمیان تقریباً پچاس میل کا فاصلہ ہے۔ نیوجرسی اگرچہ ایک الگ علاقہ ہے تاہم وہ "عظیم تر نیویارک" کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

نیوجرسی میں ایک بہت بڑا ہوٹل ہے جو آٹھ سو ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ یہ رزورٹ (Resort) کے انداز میں پہاڑیوں اور سرسبز درختوں کے ماحول میں بنایا گیا ہے۔ بڑی بڑی کانفرنسیں اکثر اسی ہوٹل میں ہوتی ہیں۔ موجودہ کانفرنس کے لیے دنیا بھر سے ہر مذہب کے نمائندے بلائے گیے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً سات سو تھی۔ کانفرنس کے دوران ایک ہفتہ کے لیے پورا ہوٹل رزرو کر لیا گیا تھا۔ میرا قیام یہاں کمرہ نمبر ۶۲۲ میں تھا۔ ہوٹل کا نام و پتہ یہ ہے :

Americana Great Gorge Resort
Route 517, Mc Afee, New Jersey 07428 U.S.A.

کانفرنس کے منتظمین نے شرکا کے لیے ہر قسم کا بہترین انتظام کیا تھا۔ مگر چوں کہ یہ ایک مذہبی

کانفرنس تھی، کانفرنس کی گائڈ بک میں یہ الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے :

Alcoholic beverages will not be provided

یعنی کانفرنس کے ذمہ داروں کی طرف سے شرکا کے لیے شراب نہیں مہیا کی جائے گی۔

۱۵۰۰ء تک امریکہ ایک بالکل ناقابل ذکر علاقہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت تک امریکنوں کے پاس پہیہ دار گاڑیاں بھی نہیں تھیں۔ ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس کی کشتی اتفاقاً امریکہ کے ساحل پر پہونچی۔ کولمبس ایک اسپینی باشندہ تھا اور ایک عرب ملاح کے ساتھ اٹلانٹک میں سفر کر رہا تھا کہ وہ امریکہ کی سرزمین میں پہونچ گیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یورپی باشندے امریکہ آنا شروع ہوئے ۱۵۶۵ء میں اسپینیوں نے شمالی امریکہ میں پہلا قلعہ بنایا۔ اس وقت جو لوگ یورپ سے امریکہ آئے ان کو قدیم امریکی باشندوں نے آسمانی لوگ (Men from the sky) کا نام دیا۔

۱۶۰۷ میں برطانی لوگ اٹلانٹک کو پار کرکے امریکہ پہونچے۔ انھوں نے ورجینیا میں اپنی پہلی آبادی قائم کی۔ اس وقت امریکہ کی زمین اتنی کم قیمت رکھتی تھی کہ منہاٹن کے باشندوں نے صرف ۲۴ ڈالر میں منہاٹن کا پورا جزیرہ ڈچ کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ فرانسیسیوں نے یہاں کے باشندوں کو عیسائی بنانے کی مہم شروع کی۔ ابتداءً امریکہ مختلف یورپی قوموں کی شکار گاہ رہا۔ جس میں برطانی قوم کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اگست ۱۷۶۶ کی جنگ کے بعد برطانیہ نے نیویارک پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مزید علاقے اس کے قبضہ میں آتے رہے۔ آزادی کے بعد ۱۷۸۷ میں امریکہ کا پہلا دستور بنا۔

۱۷۹۰ میں پہلی بار امریکہ کی مردم شماری ہوئی اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کل آبادی تقریباً چار ملین تھی۔ امریکہ قدرتی ذخیروں سے مالامال ہے۔ چنانچہ اس کی دریافت کے بعد مختلف ملکوں کے لوگ کثرت سے آکر امریکہ میں بسنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ تک اس کی آبادی ۱۰۶ ملین تک پہونچ گئی۔ ان میں آٹھ ملین صرف انگریز تھے۔

یہ امریکہ کے لیے ایک ایڈوانٹج بن گیا۔ کیوں کہ اس طرح سے جو افراد آئے وہ سب حوصلہ مند اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ تھے۔ چنانچہ امریکہ نے تیزی سے ترقی شروع کی۔ ۱۹۱۴ کی جنگ عظیم میں امریکہ نے عالمی صنعتی طاقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ اور دوسری جنگ عظیم نے امریکہ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔

امریکہ میں مذہب کے اعتبار سے آبادی کی تقسیم حسب ذیل ہے ــــ پروٹسٹنٹ ۵۵ فی صد۔ رومن کیتھولک ۳۷ فی صد۔ یہودی ۴ فیصد۔ آرتھوڈاکس ایسٹرن چرچ ۳ فی صد۔ بقیہ ایک فیصد۔ آبادی کے لحاظ سے امریکہ کا سب سے بڑا شہر نیویارک ہے۔

امریکہ کا اصل دین تجارت ہے۔ صدر کالوین کولج (Calvin Coolidge) نے کہا تھا کہ امریکہ کا کام تجارت کرنا ہے:

(The business of America is business)

مگر ہندستان کے بنیا اور امریکہ کے بنیا میں یہ فرق ہے کہ ہندستان کا بنیا صرف بنیا ہے اور امریکہ کا بنیا سائنٹفک بنیا۔ اس وقت امریکہ کی سب سے بڑی تجارت اس کے جدید ترین ہتھیار ہیں۔ ۱۹۸۴ میں امریکہ نے ۸۰۰ ملین ڈالر کا ہتھیار ایشیائی ملکوں کے ہاتھ فروخت کیا۔

امریکہ کی دلچسپی زیادہ تر بھاری صنعتوں میں ہے۔ مگر جاپان کے تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ "چھوٹی" صنعتیں بھی "بھاری" صنعتوں کو شکست دے سکتی ہیں۔ مثلاً امریکہ بڑی بڑی قیمتی کاروں کے بنانے میں اجارہ داری حاصل کیے ہوئے تھا۔ جاپان نے چھوٹی کم خرچ کاریں بنانی شروع کیں۔ جاپان کو اس معاملے میں اتنی زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ آج امریکہ کی سڑکیں جاپانی کاروں سے بھری ہوئی ہیں۔ کوئی قوم خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس کے اندر کوئی گوشہ خالی رہتا ہے۔ اس خالی گوشہ سے داخل ہو کر آپ اس کے اوپر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

ہربرٹ ہوور (Herbert Hoover) نے ۱۹۲۸ میں کہا تھا کہ بہت جلد ہم خدا کی مدد سے امریکہ سے غریبی کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر اس کے بعد ۱۹۲۹ اور ۱۹۳۲ کے درمیان زبردست تجارتی بحران (Depression) آیا۔ اس میں پانچ ہزار بنک بند ہو گیے۔ کارخانوں کا مال بکنا موقوف ہو گیا۔ امریکہ کی ایک تہائی آبادی کا یہ حال ہوا کہ وہ بے روزگاری کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ اقتصادی بحران قوت خریداری نہ ہونے سے پیدا ہوا تھا نہ کہ سامانِ خریداری نہ ہونے کی وجہ سے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ وہ عجیب وغریب صورت حال پیدا ہوئی جو اس سے پہلے دنیا میں کبھی نہیں آئی تھی:

People went hungry while fruit, vegetables and grain were in abundance. Houses were unheated while coal piled up in mountains.

لوگ بھوکے تھے، جب کہ پھل اور سبزی اور غلّہ افراط کے ساتھ پایا جارہا تھا۔ مکانات ٹھنڈے پڑے ہوئے تھے جب کہ پہاڑوں میں کوئلہ کا ڈھیر موجود تھا۔

آج بظاہر امریکہ میں خوش حالی ہے۔ مگر یہ خوش حالی سراسر مصنوعی ہے۔ امریکی آبادی کا پچاس فی صد سے زیادہ حصہ بینکوں کا مقروض ہے۔ یہاں ہر آدمی کے پاس بینک کا کریڈٹ کارڈ ہوتا ہے۔ اس سے وہ کوئی بھی چیز ادھار لے سکتا ہے ــــ کار، ٹیلی وزن، مکان وغیرہ وغیرہ۔ اس سہولت کی وجہ سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بڑھائے۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی حقیقی آمدنی سے آگے بڑھ کر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ قرض پر گھر بناتا ہے جو اکثر لکڑی کے ہوتے ہیں۔ وہ گھر کے اندر ہر قسم کے تعیش کے سامان جمع کرتا ہے۔ یہ تمام قرضے سودی قرضے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کا بیشتر حصہ بینکوں کا مقروض ہے۔ وہ ساری عمر ان کے سود ادا کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی حال میں مرجاتا ہے۔

خود امریکی حکومت کا حال اس سے مختلف نہیں۔ ڈالر کی برتری قائم رکھنے کے لیے امریکی حکومت ڈالر پر بہت بڑھی ہوئی شرح سود دیتی ہے تاکہ لوگ اس کے بینکوں میں اپنا ڈالر جمع کریں۔ چنانچہ زیادہ سود کا لالچ دے کر امریکہ دنیا بھر کا ڈالر اپنے یہاں جمع کرلیتا ہے۔ اس طرح امریکی اقتصادیات میں زبردست کثرت نظر آتی ہے مگر یہ کثرت سراسر مصنوعی ہے۔ اگر دنیا بھر کے لوگ امریکی بینکوں سے اپنا ڈالر واپس لے لیں تو امریکہ اچانک دیوالیہ ہوجائے گا۔

۱۵ نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ ہوٹل کے ایک مخصوص کمرہ میں اجتماع کے مسلم شرکا ر اکٹھا ہوئے اور جمعہ کی نماز ادا کی۔ دکتور عصفوری (Dr. Z. Asfoury) نے نماز پڑھائی۔ وہ مصری ہیں اور لندن میں رہتے ہیں۔ انھوں نے فرش پر کھڑے ہوکر صرف ایک خطبہ دیا۔ درمیان میں بیٹھے نہیں۔ خطبہ میں عربی زبان کی اہمیت پر زور تھا۔ انھوں نے کہا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو صرف ایک زبان (عربی زبان) اختیار کرلینا چاہیے۔ ایک خطبہ کے بعد انھوں نے نماز پڑھائی تو اس میں پہلی رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰه کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں الم نشرح کی۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھاکر دعا نہیں کی۔

ہندستان میں کوئی شخص اس طرح نماز پڑھائے تو تمام نمازی کہہ اٹھیں گے کہ نماز نہیں ہوئی، اس کو دہراؤ۔ مگر یہاں کوئی شخص کچھ نہ بولا۔ نماز ادا کرنے کے بعد کچھ لوگ سنتوں میں مشغول ہوگیے،

اور کچھ لوگ خاموشی سے باہر چلے گئے۔

۱۵ نومبر کی شام کو "اسمبلی" کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ جدید طرز کے وسیع ہال میں ۸۵ ملکوں کے آٹھ سو سے زیادہ افراد موجود تھے جو روئے زمین کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۸۹۳ میں (World's Parliament of Religions) عالمی مذاہب کانفرنس شکاگو میں ہوئی تھی۔ اس میں ہندستان سے سوامی دیویکانند بحری سفر کر کے بڑی دشواریوں کے ساتھ شکاگو پہونچے تھے۔ وہ اس کانفرنس میں مدعو نہ تھے۔ محض ذاتی شوق سے وہاں گئے تھے۔ چنانچہ ان کو بڑی مشکل سے اس میں داخل ہونے اور تقریر کرنے کی اجازت ملی۔ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز اس لفظ سے کیا تھا کہ امریکہ کے بہنوں اور بھائیو :

Sisters and brothers of America

سو سال پہلے سوامی دیویکانند کا یہ انداز واقعہ کے مطابق تھا۔ کیوں کہ ۱۸۹۳ کی کانفرنس میں زیادہ تر امریکہ کے لوگ شامل تھے۔ مگر موجودہ کانفرنس کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ موجودہ کانفرنس " امریکی بہنوں اور بھائیوں " کی کانفرنس نہ تھی بلکہ وہ پورے کرۂ ارض کے تمام مذاہب کے نمائندوں کی کانفرنس تھی۔ چنانچہ اس کے صدر نے جب " اسمبلی " کا افتتاح کیا تو اس نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی :

Sisters and brothers, from south and north, from east and west

اس کانفرنس میں اول سے آخر تک صرف ایک زبان استعمال ہوئی اور وہ انگریزی تھی۔ لوگوں کے عقائد، ان کے حلیے اور ان کے لباس ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر سب ایک ہی زبان (انگریزی) بولتے تھے۔ اگرچہ لوگوں کے لہجہ میں کافی فرق تھا۔ مثلاً کوئی entity کو انٹاٹی کہتا تھا۔ کوئی your کو یوار۔ کوئی values کو فیلوز۔ کوئی modern کو ماڈرن۔ کوئی those کو زوز وغیرہ۔

انگریزی کا یہ استعمال انگریزی تہذیب کے غلبہ کی وجہ سے تھا۔ اولاً برطانیہ عظمیٰ نے انگریزی کو عالمی زبان بنایا۔ بیسویں صدی میں جب برطانیہ عظمیٰ نے عالمی طاقت کی حیثیت کھو دی تو امریکہ اس کی جگہ زیادہ بڑے پیمانہ پر عالمی طاقت بن چکا تھا۔ انگریزی زبان کا یہ عمومی استعمال بر بنائے واقعہ

تھا نہ کہ بر بنائے تعصب۔ اگر ہم اس کو تعصب سمجھیں تو اس کے خلاف احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرتے رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کو ایک واقعہ سمجھیں تو انگریزی زبان کی یہ توسیع ہم کو ایک نعمت معلوم ہوگی۔ اس سے ہمارے اندر عمل کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ کسی ایک زبان کے ذریعہ دنیا بھر کے تمام انسانوں کو خطاب کیا جاسکے۔

پوری کانفرنس میں غالباً صرف ایک شخص تھا جو انگریزی زبان سے واقف نہ تھا۔ یہ افریقہ کے قبائلی مذہب کا پیشوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں آیا تھا۔ وہ اپنے کندھے پر برابر ایک خاص طرح کا کوڑا رکھے رہتا تھا۔ وہ اپنی مقامی زبان میں بولتا تھا اور ایک شخص اس کی گفتگو کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرتا تھا۔ اس کے لیے ترجمان کا یہ استثنائی انتظام غالباً اس لیے کیا گیا تھا تاکہ مذاہب کی فہرست نامکمل نہ رہ جائے۔

اس کانفرنس کی منصوبہ بندی دو سال پہلے سے ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس کی ایک ایک بات پہلے سے طے شدہ تھی۔ اجتماع کے بارہ میں چھوٹی بڑی تمام تفصیلات کاغذ پر مرتب کر کے مدعو حضرات کو بھیج دی گئی تھیں۔ ہر شخص کو پیشگی طور پر معلوم تھا کہ کس روز اس کو نیویارک پہونچنا ہے۔ کس روز وہاں سے روانہ ہونا ہے اور اس درمیان میں اس کو کن کن کارروائیوں میں حصہ لینا ہے۔ اس سلسلہ میں منتظمین کی طرف سے اتنے خطوط اور کاغذات موصول ہوئے کہ ان کا ایک پورا فائل بن گیا۔ راقم الحروف کو اس کا دعوت نامہ چھ ماہ پہلے مل چکا تھا۔ میں نے بہت سی مسلم کانفرنسوں میں شرکت کی ہے مگر اتنا نظم اور اتنی مکمل منصوبہ بندی مجھے کسی مسلم کانفرنس میں نظر نہ آئی۔

اگرچہ شرکا، خاص طور پر مشرقی ممالک کے شرکا نظم کی پوری پابندی کا ثبوت نہ دے سکے۔ مثال کے طور پر جن لوگوں سے مقالہ تیار کرنے کی فرمائش کی گئی تھی ان سے کہا گیا تھا کہ مقالہ کو جدید الکٹرانک ٹائپ رائٹر پر دونوں طرف برابر سطروں (Both side aligned) میں ٹائپ کر کے بھیجیں۔ چنانچہ راقم الحروف نے اپنا مقالہ عین اسی قاعدہ کے مطابق ٹائپ کرا کر پیش کیا۔ مگر وہاں میں نے دیکھا کہ بہت کم لوگوں نے اس کی پابندی کی تھی۔ زیادہ تر مقالے عام طرز کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرائے گئے تھے جو ایک طرف برابر ہوتے ہیں اور دوسری طرف غیر برابر۔

نیویارک کی اس "اسمبلی" میں تمام مذہب کے نمائندے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ وہ ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ بے تکلف ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ ایک ہال میں جمع ہوکر ایک دوسرے کی باتیں سنتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ کہیں مناظرہ کی فضا پیدا نہیں ہو رہی تھی اور نہ کہیں متعصبانہ سلوک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہاں میں نے اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کے لوگوں سے باتیں کیں۔ مگر کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ کبھی کوئی ناخوش گوار صورت حال سامنے نہیں آئی۔

یہ بالکل ایک نئی چیز ہے۔ یہ صرف دور جدید میں ممکن ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگ سنجیدہ ذہن کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں، اور کسی اشتعال کے بغیر ایک دوسرے کی باتیں سنیں۔ قدیم زمانہ میں اس طرح کی مذہبی یک جائی ممکن نہ تھی۔ اس صورت حال نے ہمارے لیے دین کے تعارف کا بالکل نیا امکان کھول دیا ہے، ایک ایسا امکان جو اس سے پہلے کبھی پایا نہ جاتا تھا۔

۱۵ نومبر کی شام کو صرف افتتاح کا پروگرام تھا۔ اس کے بعد پروگرام کی ترتیب یہ تھی کہ ہر روز بڑے ہال میں ایک عام اجتماع ہوتا جس میں مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات پیش کرتے۔ اس کے بعد حلقہ وار اجتماعات ہوتے۔ تمام لوگ بارہ موضوعات کے تحت بارہ حلقوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ہر حلقہ روزانہ اپنے اپنے موضوع پر بحث کرتا اور کسی متفقہ رائے تک پہونچنے کی کوشش کرتا۔ میرا تعلق (Theme Group 12-A) سے تھا۔

اس اجتماع میں دنیا کے تمام مذاہب کے نمائندوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں افریقہ کے قبائلی مذہب کے نمائندے بھی تھے جو بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کے پیشوا اپنے عجیب وغریب عقائد کے تحت اپنے چہرہ کو گرم لوہے سے اس طرح داغتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے ان کے چہرے پر اس کا نشان پڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف اس میں ایسے مذاہب کے نمائندے بھی تھے جن کے پیشوا انتہائی جدید طرز پر رہتے ہیں۔ وہ رولس رائس کاروں پر سفر کرتے ہیں۔ اور ان کے پاس ان کے ذاتی ہوائی جہاز ہیں۔ اس کانفرنس میں بت پرست بھی تھے اور خدا پرست بھی۔ ان میں روح کو پوجنے والے بھی تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو خدا جیسی کسی چیز کو سرے سے نہیں مانتے۔

چنانچہ اس اجتماع میں ایک طرف خدا اور مذہب کی باتیں سننے میں آتی تھیں اور دوسری طرف خدا اور مذہب کے خلاف باتیں بھی۔ ان میں سے چند جملے یہ ہیں:

TITLES: WRITTEN CONTRIBUTIONS

Assembly of the World's Religions

Theme Group 12A

"Morality, Ethics and Values"

Rev. Dr. Oyinleye Samuel Abogunrin	COVENANT IN THE ETHICAL SYSTEM OF THE YORUBA
Dr. Anis Ahmad	'ADL AS A MAJOR OBJECTIVE OF ETHICS, MORALITY AI LAW IN ISLAM
Dr. Gianni Ambrosio	SOCIAL CHANGE AND MORAL QUESTIONS
Dr. Elizabeth Amoah	MODERATOR
Dr. Shlomo Biderman	IS JEWISH ETHICS POSSIBLE?
Father Laurent Bilgho	TRADITIONAL VALUES IN THE RELIGION OF MOSSI TRII "THE MOAAGA FAMILY"
Dr. Pal - Khn Chon	WON BUDDHIST VIEW ON EQUALITY
Dr. Abdullah Ciptoprawiro	ETHICS AS A MEANS TOWARDS SELF-REALIZATION AND PERFECTION
Mr. John Dickson	OBSERVER
Dasho Rigzin Dorji	MORALITY, ETHICS AND VALUES
Venerable Sonam Gyaltsen	COMPASSION AND BODHICITTA IN TIBETAN BUDDHISM
Dr. Erik Hoogcarspel	THE ETHICAL FOUNDATION OF INTERRELIGIOUS COMMUNICATION
Chief Ogundiya Iroko	OGUN AND YORUBA TRADITIONAL VALUES
Maulana Wahiduddin Khan	THE CONCEPT OF MORALITY IN ISLAM
Mr. Zillur Rahman Mollah	RELIGION AND MORALITY WITH SPECIAL REFERENCE TO ISLAM
Professor Adrian T. Peperzak	"VALUES" IN RELIGION AND MORALITY
Dr. Ramon C. Reyes	MORAL REFLEXION AS HERMENEUTICAL: FROM THE TELEOLOGICAL TO THE HISTORICAL
Dr. Abdulaziz A. Sachedina	THE IMPORTANCE OF LEADERSHIP IN NURTURING THE G SOCIETY: THE ISLAMIC PRESCRIPTION
Mr. Nimal Samarasundera	BUDDHIST ETHICS FOR WORLD PEACE
Pandit Chintaman Gowkarran Sharma	MORALITY, MORALS AND ETHICS
Professor Fernando Tola	ETHICS OF THE BHAGAVAD-GITA FOR THE MODERN WORLI
Reverend Levi Chris Williams	RELIGION AND BIOETHICS

The God of the theologians is dead.
I am a Buddhist, there is no God for me.
Life is nothing but a chemical process.
There is no other God than Truth.
Religious people are God-centered people.
I have no belief in God, but I do profess faith in the spirit of Man.
Man, ethically, is an end in himself.
The main aim of religion is peace and happiness.

اسلامی نقطۂ نظر سے اگر اس کانفرنس کا خلاصہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ بیشتر مذاہب کے نمائندوں نے یہ کہا کہ مذہب کا مقصد شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے نمائندوں نے تقریباً متفقہ طور پر اسلام کی امتیازی صفت یہ بیان کی کہ اسلام صرف فرد کا دین نہیں، وہ پورے اجتماعی نظام میں مکمل انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے کہ نہ اجتماع۔ اجتماعی تغیر اس کا بالواسطہ جزء ہے نہ کہ براہ راست۔ تاہم میں نے اس سے اعراض کیا کہ کانفرنس میں دیگر مذاہب کے نمائندوں کے سامنے مسلمانوں سے اختلافی بحث کرنے لگوں۔ البتہ الگ سے ان کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھنے کی کوشش کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی مذکورہ تعبیر درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر ہی خود اسلام کا مقصد بھی ہے جس طرح وہ دوسرے مذاہب کا مقصد بتایا جاتا ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو فرق ہے وہ کامل اور ناقص کا نہیں بلکہ مستند اور غیر مستند کا ہے۔ اسلام دین خداوندی کا محفوظ اور مستند اڈیشن ہے جب کہ دوسرے مذاہب دین خداوندی کا بگڑا ہوا اڈیشن۔ اصل مقصد کے اعتبار سے اسلام اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ مگر مقصد کے حصول کے لیے آج صرف اسلام ہی قابل اعتبار ماخذ ہے نہ کہ دوسرے مذاہب۔ دوسرے مذاہب اپنی اعتباریت کھو چکے ہیں۔

تحریف و تغیر کی وجہ سے دوسرے مذاہب میں اصل حقیقت بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ مثلاً ہندوازم انسانی شخصیت کی تعمیر معرفت خویش (Self realization) میں بتاتا ہے جب کہ اسلام کے نزدیک انسانی شخصیت کی تعمیر کا راز معرفت خدا (God realization) میں پوشیدہ ہے۔ عیسائیت کے نزدیک انسانی شخصیت کی تکمیل اس میں ہے کہ آدمی رسول کو ابن اللہ کی حیثیت سے پالے جب کہ اسلام کے نزدیک انسانی شخصیت کی تکمیل اس میں ہے کہ آدمی رسول کو خدا کے پیغام رساں کی حیثیت سے پا سکے۔ بدھزم اخلاقی احساس پیدا کرنے کا سرچشمہ موجودہ دنیا

میں تلاش کرتا ہے جب کہ اسلام کے نزدیک انسان کے اندر اخلاقی احساس پیدا کرنے کا ذریعہ آخرت کی جواب دہی کا یقین ہے۔ بعض مذاہب کے نزدیک انسانی شخصیت اس طرح بنتی ہے کہ وہ تمام مذاہب کو سچا سمجھے جب کہ اسلام کے نزدیک سچائی صرف ایک ہے اور اسی ایک سچائی کو دریافت کرکے وہ اپنی ذات کو ارتقار کی طرف لے جا سکتا ہے۔ بعض مذاہب یہ سمجھتے ہیں کہ فرد موت وحیات کے بلے مراحل سے گزر کر اپنی انتہا کو پہونچتا ہے، جب کہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اور یہاں کے عمل کی بنیاد پر آدمی موت کے بعد اپنا اچھا یا بُرا انجام پاتا ہے۔

دوسرے مذاہب میں تحریف کی وجہ سے خدا کی بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ جب کہ اسلام میں خدا کی بات اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں محفوظ ہے۔ انسان پورے اعتماد کے ساتھ اسلام کو اختیار کر سکتا ہے جب کہ دوسرے مذاہب کو اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کتاب کے صحیح اور مستند اڈیشن کی موجودگی میں اس کے ایسے نسخوں کو اپنے علم کا ماخذ بنایا جائے جس میں زمانہ کی دستبرد سے بے شمار غلطیاں ہو گئی ہوں۔

۱۸ نومبر کو ہم لوگ قافلہ کی صورت میں نیوجرسی سے نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ آج کا دن نیویارک کے اہم مقامات کو دیکھنے کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ ایک شخص جس نے نیویارک نہ دیکھا ہو اس کے ذہن میں نیویارک کی عظمت کا افسانوی تصور ہوتا ہے ـــــ تاریخ کی سب سے اونچی عمارتوں کا شہر، جدید صنعتی تمدن کا سب سے بڑا مرکز، وغیرہ۔ مگر جب ہم نے نیویارک پہونچ کر اس کو دیکھا تو اس کی عظمت کا طلسم ٹوٹ گیا وہ اس سے کم نظر آیا جتنا وہ خیالی طور پر محسوس ہوتا تھا۔ نیویارک صرف نیویارک تھا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

نیویارک میں ہم نے اقوام متحدہ (United Nations) کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھا جان ڈی راکفلر نے نیویارک میں سمندر کے کنارے سترہ ایکڑ کی قیمتی زمین اقوام متحدہ کے لیے وقف کردی۔ اس پر اقوام متحدہ کے صدر دفاتر کی عمارتیں بنائی گئیں۔ سترہ ایکڑ کا یہ علاقہ ایک آزاد علاقہ ہے۔ یہ صرف اس کے سکریٹری جنرل کے حکم کے تابع ہے۔

اقوام متحدہ کی بلند وبالا عمارتوں میں گھومتے ہوئے ہم اس کے ایک ہال میں پہونچے۔ یہاں اس وقت ٹرسٹی کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ وسیع ہال میں نیچے اوپر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مگر مقرر

اور دفتری کارکنوں کے سوا تقریباً سب کی سب خالی تھیں ، اسٹیج پر ایک مقرر تقریر کر رہا تھا جس کی ہلکی آواز خالی ہال میں گونج رہی تھی۔ وہاں سننے والے اتنے کم تھے کہ بے شمار کرسیوں کے درمیان انھیں تلاش کرنا پڑتا تھا کہ کچھ سننے والے ہیں بھی یا نہیں۔ اس کے قوام متحدہ کے سب سے بڑے ہال میں پہونچے جو جنرل اسمبلی کے اجلاس کے لیے خاص ہے۔ آج یہاں نمیبیا کے مسئلہ پر اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک شخص اسٹیج پر بیٹھا ہوا انگریزی میں تقریر کر رہا تھا۔ جس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ امریکی وزیر خارجہ جارج شلز بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ مگر یہاں بھی یہ حال تھا کہ جنرل اسمبلی کے ۱۶۰ ممبر ممالک کی تعداد کے بقدر بھی سامعین موجود نہ تھے۔ سننے والے اتنے کم تھے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام کرسیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔

اقوام متحدہ کی وسیع عمارتوں کے باہر ایک بہت بڑا اسٹیچو لگا ہوا ہے۔ یہ ایک طاقت ور آدمی ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا۔ وہ پوری طاقت سے بھاری ہتھوڑے کو تلوار پر مار رہا ہے۔ آرٹ کا یہ نمونہ سوویت روس نے ۱۹۵۹ میں اقوام متحدہ کو بطور عطیہ دیا تھا۔ اس پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

We shall beat our swords into plowshares

ہم اپنی تلواروں کو توڑ کر ان کے ہل بنائیں گے۔

۲۴ جون ۱۹۴۵ کو پچاس ملکوں نے مل کر اقوام متحدہ کو قائم کیا تھا۔ اب اس کے ممبر ملکوں کی تعداد ۱۶۰ ہو چکی ہے۔ ابتدائی عہد نامہ کے مطابق اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم سے برباد شدہ دنیا کو ازسرنو تعمیر کیا جائے۔ دنیا کو امن، تحفظ، ترقی اور باہمی احترام کا ماحول دیا جائے۔ اور قوموں کا ایک عالمی نظام (International order) قائم کیا جائے۔ مگر اقوام متحدہ پر چالیس سال گزر گیے اور اب تک وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس مدت میں قوموں کے درمیان پیدا ہونے والے سیکڑوں مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کو بھی اس نے حل نہیں کیا۔ آج اقوام متحدہ قوموں کی امیدوں کا مزار ہے نہ کہ قوموں کی امیدوں کی تکمیل کا قلعہ۔ اقوام متحدہ کی رونق اب صرف ان لوگوں کے ذریعہ ہے جو اس کو دیکھنے کے لیے ہر روز بڑی تعداد میں آتے ہیں اور جن کی اکثریت اسکول کے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر یہ دیکھنے والے لوگ نہ آئیں تو شاید اقوام متحدہ کے ادارہ میں قبرستان کا سناٹا

نظر آئے ـــــــ تصویر میں تلوار کو توڑ کر ہل بنانا کتنا آسان ہے اور عملی واقعہ میں تلوار کو توڑ کر ہل بنانا کتنا مشکل۔

نیویارک کی غیر معمولی وسعت کے لحاظ سے اس کی اندرونی سڑکیں تنگ نظر آئیں۔ دونوں طرف انتہائی اونچی عمارتوں کی قطار کے درمیان اس کی سڑکیں گلیوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ نیویارک اپنی انتہائی اونچی عمارتوں کے لیے مشہور ہے۔ یہ عمارتیں ضرورت کی پیداوار ہیں۔ لوگوں کے لیے افقی اضافہ (Horizontal growth) کا موقع نہ تھا اس لیے انھوں نے (Vertical growth) عمودی اضافہ کا عمارتی طریقہ اختیار کر لیا۔ تاہم یہ طریقہ اس لیے ممکن ہوسکا کہ نیویارک کی زمین بیشتر چٹانی ہے۔ دہلی کی جامع مسجد ایک چٹان پر بنائی گئی ہے۔ یہی معاملہ نیویارک کا ہے۔ نیویارک کی زمین کی سطح اگر چٹانی نہ ہوتی تو یہاں اتنی اونچی عمارتیں کھڑی کرنا ممکن نہ ہوتا۔

نیویارک کی امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ اس کی تعمیر میں ۶۰ ہزار ٹن لوہا استعمال ہوا ہے۔ اس میں ۱۸۶۰ سیڑھیاں ہیں۔ تاہم لفٹ کے ذریعہ آدمی صرف تین منٹ میں ۱۰۲ منزل پر پہونچ جاتا ہے۔ البتہ اس کے لیے اسے تین لفٹ بدلنی پڑتی ہے۔ ایک زمانہ میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ دنیا کی سب سے اونچی بلڈنگ سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب اس سے بھی زیادہ اونچی بلڈنگیں تیار ہوگئی ہیں۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت ۱۱۰ منزلہ ہے۔ شکاگو کے سیرس ٹاور (Sears Tower) کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ وغیرہ۔

نیویارک کی اونچی بلڈنگوں کے بارے میں بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً ایک لطیفہ ہے کہ ایک آدمی ایک اونچی بلڈنگ میں آیا۔ اس کو اوپر جانا تھا۔ جب وہ بلڈنگ کی لفٹ کے پاس پہونچا تو وہاں یہ نوٹس لگا ہوا تھا:

Complaints department on the 45th floor.
Lift out of order; please use the stairs.

شکایت کا شعبہ ۴۵ ویں منزل پر ہے۔ لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ براہِ کرم سیڑھیاں استعمال کریں۔

۱۸ نومبر کی شام کو "اسمبلی" کی ایک نشست نیویارک شہر میں ہوئی۔ یہ نشست میٹروپولیٹن

بائپنسٹ چرچ میں تھی۔ یہاں اچاریہ سوشیل منی کمار اور ڈاکٹر جوزف پیگ وغیرہ کی تقریریں ہوئیں۔ تقریر کے دوران زبردست تالیاں بجتی رہیں۔ کارروائی کے آخر میں "قرأت" کا پروگرام تھا۔ انگریزی انجیل کا ایک حصہ نہایت تجوید کے ساتھ پڑھا گیا۔ انجیل کی یہ قرأت جس شخص نے کی اس کا تعارف ساری دنیا میں انجیل کے بہترین قاری (Best Gospel singer of the world) کی حیثیت سے کرایا گیا۔ پہلے ایک شخص نے قرأت کی۔ اس کے بعد چار آدمیوں نے مل کر انجیل کا ایک حصہ کورس کی شکل میں پڑھا۔

اسمبلی کے اجتماع (امریکانا ہوٹل) میں ہر مذہب کے نمائندے روزانہ اپنے مذہب کی مقدس کتاب کی تلاوت کرتے تھے۔ ۱۹ نومبر کو منی سوشیل کمار نے جین مذہب کی مقدس کتاب کی تلاوت کی۔ اسی طرح بدھ ازم، ہندو ازم، سکھ ازم، یہودیت، زرتشت وغیرہ کی مقدس کتابیں پڑھی گئیں۔ ان قرأتوں کو سن کر میرے ذہن نے ان کا مقابلہ قرآن کی قرأت سے کیا۔ اس مقابلہ میں قرآن کی قرأت اتنی اعلیٰ اور جاذب نظر آئی کہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسری تمام کتابوں کے الفاظ انسانی الفاظ ہیں اور قرآن کے الفاظ خدائی الفاظ۔ اس کی وجہ سے قرآن کے الفاظ میں ایک عجیب عظمت اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے جو کسی دوسری مذہبی کتاب میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ساؤنڈ آرٹ (Sound art) کا ایک نادر نمونہ ہے۔ دنیا کی کوئی بھی کتاب اس معاملہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں ایک موثر دعوتی طریقہ یہ بھی ہے کہ ایسے ٹیپ تیار کیے جائیں جن میں مختلف مذہبی کتابوں کی قرأت ریکارڈ کی گئی ہو۔ ہر مذہب کی کتاب کی قرأت اسی مذہب کے قاری کے ذریعے کرائی جائے۔ اور پھر اس میں قرآن کی قرأت ایک اچھے قاری سے کرا کر شامل کی جائے۔ یہ کام اگر ویڈیو کیسٹ پر کرایا جائے تو اور بھی اچھا ہے تاکہ سننے والے یہ بھی دیکھیں کہ جس مذہبی کتاب کی قرأت ہے اس کو اسی مذہب کا ایک ماہر آدمی پڑھ رہا ہے۔ اگر اس طرح کے ویڈیو کیسٹ یا ریکارڈ تیار کرائے جائیں اور ان کو جگہ جگہ سنایا جائے تو صرف زبان اور آواز کا تقابل لوگوں کو سمجھنے کے لیے کافی ہوگا کہ کون سی کتاب انسانی کتاب ہے اور کون سی کتاب خالص خدائی کتاب

١۔ ٢٩ دسمبر ١٩٨٥ مہینہ کے آخری اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول مرکز (نظام الدین) میں ہفتہ وار درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے بعض قرآنی آیات کی روشنی میں واضح کیا کہ وہ کیا چیز ہے جس کو قرآن میں ازدیاد ایمان (اضافہ ایمان) کہا گیا ہے۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

٢۔ الرسالہ کا ذکر اب خدا کے فضل سے عالمی پریس میں آنے لگا ہے۔ انگلینڈ (لیسسٹر) سے ایک جرنل نکلتا ہے جس کا نام ہے مسلم ورلڈ (The Muslim World) اس نے اپنی اشاعت نمبر ٢، ١٩٨٦ء میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں ان مضامین کا احاطہ ہے جو "اسلام اور یورپ" کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اس میں اس نے صفحہ ٦٢ پر الرسالہ کے مضمون کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

٣۔ ٢٩ دسمبر ١٩٨٥ کی شام کو نیتی باغ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور خواتین نے شرکت کی۔ مرکز کو بھی اس کا دعوت نامہ ملا تھا۔ چنانچہ مرکز کی طرف سے ایک نمائندہ اس میں شریک ہوا۔ یہاں لوگوں نے مسلم پرسنل لا کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ مرکز کے نمائندہ نے مسلم علمار کے نقطہ نظر کی وکالت کی۔

٤۔ سندھ نیشنل اکیڈمی حیدر آباد (پاکستان) نے صدر اسلامی مرکز کو لکھا تھا کہ صوبہ سندھ میں بڑھتے ہوئے الحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ موصوف کی کتابوں کے ترجمے سندھی زبان میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے سندھی زبان میں شائع کیے ہیں۔ سندھی ترجمہ کے بعض نسخے مرکز میں موصول ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ اپنے خط (٢٩ دسمبر ١٩٨٥) میں انھوں نے لکھا ہے کہ "پاکستانی معاشرہ کا اصلی بحران اخلاقی نوعیت کا ہے۔ یہاں رجوع الی اللہ کی بنیاد پر فکری اور علمی تحریک کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی کتابیں سب سے زیادہ موثر ہیں۔"

٥۔ سعودی عرب کے اہل علم کا ایک وفد ہندستان آیا تھا۔ وہ چند دن دہلی میں ٹھہرا۔ اس موقع پر وفد کے ارکان ٤ جنوری ١٩٨٦ کو صدر اسلامی مرکز سے ملنے کے لیے مرکز میں آئے۔ وفد کے افراد حسب ذیل تھے: دکتور محمد علی الہاشمی۔ دکتور احمد ابرار الامیری۔ دکتور محمد حسن بریغش۔ دکتور حیدر الغدیر۔ استاذ احمد فہمی زمزم۔ اول الذکر چار افراد ریاض سے تعلق رکھتے تھے اور آخر الذکر انڈونیشیا کے باشندے تھے۔ ان حضرات نے تقریباً ایک گھنٹہ تک صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال

کیا۔ آنے والوں میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ سعودی عرب سے اسلامی تنظیمات کی ایک دلیل (ڈائرکٹری) چھپی ہے اس میں اسلامی مرکز کا بھی تعارف ہے اور اس کی مطبوعات وغیرہ کا تذکرہ شامل ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ افریقہ کے مختلف ملکوں میں گئے تو وہاں انھوں نے دیکھا کہ صدر اسلامی مرکز کی کتابیں ہر جگہ موجود ہیں۔ اور اہل علم طبقہ ان سے استفادہ کرتا ہے۔

۶۔ الرسالہ لوگوں میں کس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے، اس کا اندازہ لوگوں کے تاثرات سے ہوتا ہے۔ ایک صاحب حیدرآباد سے لکھتے ہیں: الرسالہ تقریباً ایک سال سے پابندی کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔ الرسالہ کا ایک مضمون حیدرآباد کے روزنامہ سیاست میں چھپا تھا۔ اس کو دیکھ کر پڑھنے کا شوق ہوا۔ اس وقت سے اب تک پابندی کے ساتھ الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ اس نے مجھے مثبت انداز فکر دیا۔ اور مجھ کو احساس محرومی سے نکالا۔ آہستہ آہستہ میرا جھوٹا فخر اور خوش فہمیاں بھی کم ہو رہی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس کا احساس تک بھی نہ تھا۔ ایک بات کا مجھے کافی افسوس ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کاش الرسالہ مجھے اور پہلے ملا ہوتا (۹ جنوری ۱۹۸۶)

۷۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۵ - ۱۷ جنوری ۱۹۸۶ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع تھا:

Science Education in the Country with
Special Reference to Indian Muslims.

اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو مذکورہ موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ موصوف نے اپنا مقالہ تیار کر لیا تھا۔ مگر آخر وقت میں بعض موانع پیش آنے کی وجہ سے صدر اسلامی مرکز سفر نہ کر سکے۔ ان کا مقالہ کانفرنس کے ذمہ داروں کو روانہ کر دیا گیا۔ یہ مقالہ انگریزی میں تھا۔ انشاء اللہ اس کو الرسالہ (انگریزی) میں شائع کر دیا جائے گا۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبد السلام نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔

۸۔ بنگلور میں خدا کے فضل سے اسلامی مرکز کی شاخ قائم ہو گئی ہے۔ پتہ یہ ہے:

No. 3, Opp. Vasantha Soapnut, K.G. Hally, Bangalore 45

۹۔ اردو اکیڈمی کی طرف سے دہلی میں ۸ - ۱۰ فروری ۱۹۸۶ کو ایک کل ہند سیمینار ہوا۔ اس موقع پر اکیڈمی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ایک مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا: ——————

"اردو صحافت اور اخلاقیات" یہ مقالہ آئندہ انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۱۰۔ اسلامی مرکز کا لٹریچر جن لوگوں تک پہونچا ہے وہ عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی تعارف کے لیے یہی سب سے زیادہ موثر لٹریچر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں زیادہ تر قومی اسلام کی ترجمانی کرتی ہیں نہ کہ حقیقۃً اصولی اسلام کی۔ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں کے تاثرات تقریباً ہر روز دفتر میں موصول ہو رہے ہیں۔ یہاں جناب پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ، بھوپال کا ایک خط (۴ دسمبر ۱۹۸۵) انھیں کے اپنے لفظوں میں بجنسہ نقل کیا جا رہا ہے۔ جناب گپتا صاحب الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ نیز انھوں نے مرکز کی متعدد مطبوعات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

۱۱۔ جناب بھائی مولانا وحید الدین صاحب، السلام علیکم۔
الرسالہ آپ کی دوری کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ امریکہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ خدا آپ کا سفر کامیاب کرے۔ میں نے حضورؐ کی سیرت پر دو کتابیں پڑھی۔ پہلی کتاب کا نام پیغمبر انقلاب اور دوسری کا نام دی آئیڈیل پروفٹ ہے۔ پہلی کتاب کے لیکھک آپ ہیں اور دوسری کے لیکھک مولانا سید سلیمان ندوی ہیں۔ جس نے دھرم کو آگے رکھا اور خود اس کے پیچھے چلا ایسا انسان کبھی بھٹکتا نہیں۔ جب انسان نے اپنے کو دھرم سے آگے رکھا وہ بھٹک گیا۔ پیغمبر انقلاب میں آپ نے قرآن کی آیت تحریر کی ہے یا پھر حدیث کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ کی قلم آگے بڑھ سکی ہے۔ جو آپ کی قلم نے لکھا وہ دھرم کی نمائندہ سیرت ہے۔ جیسے تنگ خیال ساہتکاروں نے قوم کی نمائندہ بنا رکھا تھا۔ جب کہ حضورؐ کی اصل سیرت قرآن اور حدیث ہے۔ جو کتھنی اور کرنی میں کھرا اترے وہ نبی ہے۔ آپ کی کتاب کے نبی جن جن اور گھر گھر کے نبی ہیں۔ دی آئیڈیل پروفٹ (خطبات مدراس کا انگریزی ترجمہ) میں لیکھک نے ویکتی گت خوبیوں کو سامنے رکھ کر قومی بڑائی کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ اس کی نظر میں قومی کتاب کا لکھا جانا اولین اور سیرت کا لکھا جانا دوئم نظریہ رہا۔ جہاں دھرم دوسرا نظریہ بن جائے وہیں انسان راہ سے بے راہ اور گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں نبی جن جن اور گھر گھر کے نہ ہوتے ہوئے ایک خاص قوم کے نبی ہو گیے۔ دوسرے مذہبوں میں جو ہیرو ورشپ پائی جاتی ہے ایسا سب کچھ اس (کتاب) میں پایا۔ اس لیے ہیرو ورشپ کا نظریہ ہی دھرم کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے اور نفرت کا باعث ہے نہ کہ محبت کا۔ آپ کا خادم، پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے کبے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

March 1986
Number 112

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اکثر لوگ اپنے آپ کو صد فی صد استعمال نہیں کرتے
یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ——————
اپنے مقصد میں صد فی صد کامیاب نہیں ہوتے

اپریل ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۳

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراطِ مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5 '-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۳ اپریل ۱۹۸۶

فہرست

ناقص تشریح

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں (الذاریات ۵۶) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مشہور مصنف لکھتے ہیں: "عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز، روزے اور اسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے لے کہ جن اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح و تہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گیے ہیں۔ یہ مفہوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرماں برداری اور نیازمندی کے لیے پیدا نہیں کیے گیے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجالانا، کسی اور سے تقویٰ کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھنا، اور کسی دوسری ہستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔"

مذکورہ تشریح میں عبادت کو چار چیزوں کا مجموعہ بتایا گیا ہے ——— پرستش، اطاعت، فرمانبرداری نیازمندی۔ محترم مصنف کے نزدیک یہ عبادت کا "پورا مفہوم" ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ پورا مفہوم اس کا صرف ناقص مفہوم ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ محبت نام ہے چار چیزوں کا: دل سے چاہنا، ملاقات کرنا، باتیں کرنا، ایک ساتھ کھانا۔ تو اس کو محبت کا ناقص مفہوم کہا جائے گا نہ کہ اس کا پورا مفہوم۔ کیوں کہ محبت چار چیزوں کا مجموعہ نہیں۔ محبت اصلاً صرف ایک چیز کا نام ہے اور وہ دل سے چاہنا ہے۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں وہ محبت کے مظاہر ہیں نہ کہ محبت کے مجموعہ کے چار مساوی اجزاء۔

اسی طرح عبادت اصلاً صرف ایک چیز کا نام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں اپنے رب کا پرستار بن جائے۔ بقیہ جو چیزیں شریعت میں ہیں وہ اسی اصل عبادت کے مظاہر ہیں۔ وہ اس اصل عبادت کے پیدا ہونے کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر آدمی کی زندگی میں ظہور کرتی ہیں۔ اگر پرستاری ہوگی تو بقیہ چیزیں بھی ہوں گی، اور اگر پرستاری نہیں ہوگی تو یقینی طور پر بقیہ چیزیں بھی نہیں ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تشریح نے عبادت کے مفہوم کو محدود کر دیا۔ اگرچہ نادانی کی بنا پر محترم شارح یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے اس کو جامع اور مکمل بنایا ہے۔

اصل اور تفصیل

بیج ایک بہت چھوٹا دانہ ہے۔ اس سے ایک بہت بڑا درخت نکلتا ہے۔ اس بیج اور اس درخت میں جو باہمی نسبت ہے وہ محدود اور مکمل کی نہیں ہے بلکہ اصل اور تفصیل کی ہے۔ درخت اپنے بیج کی تفصیل ہے نہ یہ کہ اس نے محدود کو مکمل کیا ہے۔

یہی معاملہ فکر اور عمل کا ہے۔ فکر آدمی کے اندر رہے اور اس کے اعمال بے شمار صورتوں میں اس کے باہر پھیلے ہوتے ہیں۔ مگر انسان کے فکر اور انسان کے عمل کے درمیان محدود اور مکمل کی نسبت نہیں۔ یہاں دوبارہ اصل اور تفصیل کی نسبت ہے۔ انسان کے پھیلے ہوئے اعمال اس کے فکر کی تفصیل ہیں نہ کہ وہ محدود کو مکمل کر رہے ہیں۔

اسی طرح خدا کے دین کی بھی ایک اصل ہے، اور ایک اس کی تفصیل۔ خدا کے دین میں اصل کی حیثیت توحید کو حاصل ہے۔ اس کے سوا جو دینی احکام ہیں وہ سب اسی اصل کی تفصیل ہیں۔ عقیدہ توحید اور احکام شریعت میں اصل اور تفصیل کی نسبت ہے نہ کہ محدود اور مکمل کی نسبت۔ یہ عقیدہ کی تصغیر ہے کہ اس کو محدود اور مسائل و احکام کو مکمل کہا جائے۔

قرآن میں بمشکل چند سو احکامی آیتیں ہیں۔ مگر فقہ کو دیکھیے تو اس میں آپ کو کئی لاکھ احکام ملیں گے۔ کیا قرآن محدود ہے اور فقہ اس کے مقابلہ میں مکمل ہے۔ نہیں۔ قرآن اور فقہ کا معاملہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ قرآن اصل ہے اور فقہ اس کی تفصیل ہے۔

ایمان و اسلام کو قرآن میں درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسلام سب سے پہلے دل کی زمین میں جڑ پکڑتا ہے، اس کے بعد وہ آدمی کی خارجی زندگی میں پھیلتا ہے۔ اسی طرح اسلام پہلے فرد کے اندر قائم ہوتا ہے، اس کے بعد وہ اجتماع میں ظہور کرتا ہے۔ گویا انفرادی دین اصل ہے اور اجتماعی دین اس کی تفصیل۔

یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ خدا کی دنیا میں ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان اصل اور تفصیل کی نسبت ہے نہ کہ محدود اور مکمل کی نسبت۔ اس دنیا میں جس نے بیج لگایا اس نے درخت لگایا، اور جس نے درخت لگایا اس نے کچھ بھی نہیں لگایا۔

خودساز، تاریخ ساز

آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خودساز، اور دوسرے تاریخ ساز۔ خود ساز آدمی کی توجہات کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اور تاریخ ساز آدمی کی توجہات کا مرکز وسیع تر انسانیت۔

خودساز آدمی کی سوچ اس کی ذاتی مصلحتوں کے گرد بنتی ہے۔ اس کے جذبات وہاں بھڑکتے ہیں جہاں اس کے ذاتی فائدہ کا کوئی معاملہ ہو۔ اور جس معاملہ کا تعلق اس کے ذاتی فائدے سے نہ ہو وہاں اس کے جذبات میں کوئی گرمی پیدا نہیں ہوتی۔

خودساز آدمی اپنے ذاتی نفع کے لیے ہر دوسری چیز کو قربان کرسکتا ہے، خواہ وہ کوئی اصول ہو یا کوئی قول و قرار، خواہ وہ کوئی اخلاقی تقاضا ہو یا کوئی انسانی تقاضا۔ وہ اپنی ذات کے لیے ہر دوسری چیز کو بھلا سکتا ہے، وہ اپنی خواہشات کے لیے ہر دوسرے تقاضے کو نظرانداز کرسکتا ہے۔

تاریخ ساز انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے خول سے نکل آتا ہے۔ وہ برتر مقصد کے لیے جیتا ہے۔ وہ اصولوں کو اہمیت دیتا ہے نہ کہ مفادات کو۔ وہ مقصد کے لیے تڑپنے والا انسان ہوتا ہے نہ کہ مفاد کے لیے تڑپنے والا انسان۔ وہ اپنے آپ میں رہتے ہوئے اپنے آپ سے جدا ہو جاتا ہے۔

تاریخ ساز انسان بننے کی واحد شرط خود سازی کو چھوڑنا ہے۔ آدمی جب اپنے کو فنا کرتا ہے اسی وقت وہ اس قابل بنتا ہے کہ وہ تاریخ ساز انسانوں کی فہرست میں شامل ہوسکے —— اس کے دل کو جھٹکے لگیں پھر بھی وہ اس کو سہہ لے۔ اس کے مفاد کا گھروندا ٹوٹ رہا ہو پھر بھی وہ اس کو ٹوٹنے دے۔ اس کی بڑائی اس کی آنکھوں کے سامنے مٹائی جائے پھر بھی وہ اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کرے۔

تاریخ سازی کے لیے وہ افراد درکار ہیں جو خودسازی کی خواہشات کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر راضی ہو جائیں۔ جو صرف اپنے فرائض کو یاد رکھیں اور اپنے حقوق سے دستبرداری پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کردیں۔

ایک آیت

یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قومًا بجھالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نٰدمین

(الحجرات ۶)

اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو نادانی سے ضرر پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

یہ قرآن کی ایک آیت ہے۔ اگر کوئی شخص ایک ایسا قرآن چھاپے جس میں اس کی یہ آیت حذف کردی گئی ہو تو تمام دنیا کے مسلمان اس کو کافر قرار دیں گے اور مطالبہ کریں گے کہ اس کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جائے۔ مگر یہی مسلمان قرآن کی اس آیت کو عملاً اپنی زندگیوں سے حذف کیے ہوئے ہیں اور کوئی نہیں جو اس کے خلاف ہنگامہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔

قوم کے اصاغر ہوں یا قوم کے اکابر آج سب کا یہ حال ہو رہا ہے کہ جو کچھ سنتے ہیں اس کو مان لیتے ہیں۔ کوئی نہیں جس کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ جس بات کو سنے پہلے اس کی تحقیق کرے۔ اس کے بعد اس کو بیان کرے۔ ہر آدمی کا یہ حال ہو رہا ہے کہ کسی کے خلاف جو بات بھی سنی اس کو فوراً مان لیا اور اس طرح بیان کرنا شروع کر دیا جیسے کہ وہ بالکل واقعہ ہے۔

مسلمان قرآن کے محفوظ کتاب ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کا فخر خدا کے یہاں کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ قرآن لفظی اعتبار سے مکمل طور پر محفوظ ہے۔ مگر اس حفاظت کا کریڈٹ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں۔ کیونکہ یہ حفاظت خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن کی لفظی حفاظت براہ راست خدا کی طرف سے کی جارہی ہے۔ مگر اس کی عملی حفاظت مسلمانوں کو کرنا تھا۔ اور مسلمان یہاں ناکام ہو کر رہ گئے۔

آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اپنے ایک ہم قوم یا ہم وطن کے خلاف کوئی بات سنیں تو وہ فوراً اس کو درست مان لیتے ہیں۔ وہ اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتے کہ وہ اس کی تحقیق کریں اور تحقیق کے بعد اس کے بارہ میں اپنی رائے قائم کریں۔ کسی قوم کا یہ رویہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے نہ کہ اس کی رحمت کو کھینچنے والا۔ اس عمل کے ساتھ مسلمان اگر "تحفظ قرآن" کا نعرہ لگا رہے ہوں تو ایسا نعرہ صرف ان کے جرم کو بڑھائے گا، وہ کسی اعتبار سے بھی اس کو کم کرنے والا نہیں۔

جھوٹا یقین

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخالفین کے ساتھ جو جنگیں پیش آئیں ان میں سے ایک جنگ وہ تھی جس کو جنگ احد کہا جاتا ہے۔

اس جنگ میں بعض وجوہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سخت زخمی ہو گئے۔ مسلمانوں کی فوج منتشر ہو گئی۔ روایات میں آتا ہے کہ جب مخالفین نے دیکھا کہ ان کی فتح مکمل ہو چکی ہے تو ان کے سردار ابوسفیان (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) ایک ٹیلہ پر چڑھے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی فتح کا اعلان کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا :

لنا عزّیٰ ولا عزّیٰ لکم — ہمارے پاس عزّیٰ ہے اور تمہارے پاس کوئی عزّیٰ نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو صحابہ سے فرمایا کہ تم اس کا جواب اس طرح دو :

اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم — اللہ ہمارا کارساز ہے اور تمہارا کوئی کارساز نہیں

عزّیٰ قدیم عرب کا ایک بڑا بُت تھا۔ عرب کے مشرکین کو اس بُت پر زبردست یقین تھا۔ اگر انھیں یقین نہ ہوتا تو اس نازک موقع پر ان کے سردار کی زبان سے یہ جملہ نہ نکلتا کہ لنا عزّیٰ ولا عزّیٰ لکم۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹی چیز پر بھی ایک آدمی کو کتنا گہرا یقین ہو سکتا ہے۔ عزّیٰ محض ایک پتھر کا مجسمہ تھا۔ اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ تھا۔ مگر قدیم عرب کے مشرکین کو یقین تھا کہ اس عزّیٰ کی وجہ سے ان کو مسلمانوں کے اوپر فتح حاصل ہوئی ہے۔ عزّیٰ کی اہمیت ان کے نزدیک پیغمبرِ آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کرام سے بھی زیادہ تھی۔ جو فخر آج مسلمانوں کو اپنے پیغمبر اور اصحاب پیغمبر پر ہے وہی فخر اس وقت کے مشرکین کو اپنے عزّیٰ پر تھا۔

جھوٹا یقین ہر دور میں انسان کا سب سے بڑا مرض رہا ہے۔ وہ آج کے لوگوں میں بھی اتنا ہی عام ہے جتنا کہ وہ پچھلے زمانہ کے لوگوں میں عام تھا۔ سچائی کو اس دنیا میں صرف وہ شخص پاتا ہے جو جھوٹے یقین کے خول کو توڑ کر اس کے باہر آسکے۔

بے فائدہ علم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: انا من غیر الدجال اخوف علیکم من الدجال۔ فقیل وما ھو یا رسول اللہ۔ فقال علماء السوء (رواہ احمد من حدیث ابی ذر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تمہارے بارہ میں دجال سے بھی زیادہ دوسروں سے ڈرتا ہوں۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول یہ دوسرے لوگ کون ہیں۔ فرمایا کہ برے علماء۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من ازداد علماً ولم یزدد ھدیً لم یزدد من اللہ الا بعداً (رواہ ابو منصور الدیلمی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص علم میں بڑھ جائے مگر وہ ہدایت میں نہ بڑھے وہ اللہ سے صرف دوری میں بڑھے گا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ اللہ بعلمہ (رواہ ابو داؤد الطیالسی وسعید من منصور وابن عدی فی الکامل)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب اس عالم کا ہوگا جس کو اللہ نے اس کے علم سے فائدہ نہیں پہونچایا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مررت لیلۃ اُسری بی باقوام تقرض شفاھھم بمقارض من نار۔ فقلت من انتم قالوا کنا نامر بالخیر ولا ناتیہ وننھی عن الشر وناتیہ (رواہ ابن حبان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معراج کی رات میرا گزر ایسے لوگوں سے ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کاٹے جا رہے تھے میں نے کہا کہ تم کون لوگ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم بھلائی کی تلقین کرتے تھے مگر خود بھلائی پر عمل نہیں کرتے تھے اور ہم برائی سے روکتے تھے مگر ہم خود برائی سے نہیں رکتے تھے۔

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع وقلب لا یخشع وعمل لا یرفع ودعاء لا یسمع (رواہ الحاکم من حدیث ابن مسعود)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ، میں تجھ سے ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو ڈرتا نہ ہو اور ایسے عمل سے جو تیری طرف اٹھایا نہ جائے اور ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے

افراد کی اہمیت

آدمی پر لازم ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح مقصد کو اپنائے۔ جو شخص صحیح مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے گا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر پائے گا۔ اور جو شخص غلط مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑا جائے گا اور اپنی بے راہ روی کے مطابق اس کی سزا پائے گا۔

تاہم موجودہ دنیا میں کامیابی کے لیے مقصد کا صحیح ہونا کافی نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مقصد کے گرد جو افراد اکٹھا ہوں وہ جاندار افراد ہوں۔ بے جان افراد نہ صحیح مقصد کو کامیاب بنا سکتے اور نہ غلط مقصد کو۔

افراد کے جاندار ہونے کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے کردار سے اپنے آپ کو قابل اعتماد ثابت کریں۔ کسی شخص کو جو اختیار سونپا جائے اس اختیار میں وہ صحیح معنوں میں امانت دار ثابت ہو۔ جاندار افراد کی خاص صفت امانت ہے اور بے جان افراد کی خاص صفت خیانت۔

مثال کے طور پر ہجرت کے آٹھویں سال وہ حالات پیدا ہوئے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف اقدام فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ۱۰ رمضان ۸ھ کو مدینہ سے مکہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ نے مدینہ میں اپنی جگہ پر کلثوم بن حصین کو حاکم مقرر کیا (ثم مضیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لسفرہ، واستخلف علی المدینۃ ابارُھم کلثومَ ابن حُصین بن عتبۃ بن خلف الغفاری

ابن ہشام جلد رابع صفحہ ۱۷)

اس کے بعد جب مکہ فتح ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں عمرہ ادا فرمایا اور ذوالقعدہ ۸ھ میں مدینہ کے لیے واپس روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ نے اپنی جگہ پر عتاب بن اُسید کو مکہ کا حاکم مقرر کیا (فلما فرغ رسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من عمرتہ انصرف راجعًا الی المدینۃ واستخلف عَتاب بن اُسید علیٰ مکۃ۔ ابن ہشام جلد رابع صفحہ ۱۴۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی غیر موجودگی میں مدینہ کا انتظام دیکھنے کے لیے کلثوم بن حصین پر بھروسہ کرنا پڑا۔ اسی طرح مکہ کے انتظام کے لیے آپ نے عتاب بن اُسید پر بھروسہ کیا۔ اب غور کیجیے کہ اگر

دونوں صاحبان بے جان اور بے بھروسہ افراد ہوتے تو کیا ہوتا ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے سفر کرکے مکہ پہونچے تو آپ کو یہ خبر ملی کہ کلثوم بن حصین نے بغاوت کرکے مدینہ میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی ہے۔ اسی طرح مکہ سے نکل کر جب آپ مدینہ کے لیے روانہ ہوتے تو راستہ میں کوئی خبر دینے والا آپ کو بتاتا کہ عتاب بن اسید نے آپ کی غیر موجودگی میں بغاوت کردی اور مکہ میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ آپ کے اصحاب بے حد جاندار لوگ تھے۔ اس کے برعکس اگر وہ بے جان لوگ ہوتے تو تاریخ میں ہمیں صرف باہمی لڑائیوں کے واقعات پڑھنے کو ملتے نہ کہ فتح ونصرت کے واقعات ۔

جب بھی کوئی بڑا کام کرنا ہو تو اس کے لیے ہمیشہ بہت سے لوگوں کی مشترک جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑا کام کوئی ایک آدمی کبھی انجام نہیں دے سکتا۔ اجتماعیت اور تنظیم کی اہمیت اسی لیے ہے تاکہ بڑے بڑے کام انجام دیئے جاسکیں۔ زندگی سے اجتماعیت اور تنظیم کو حذف کردیجئے تو تمام بڑے کام بھی اسی کے ساتھ حذف ہو جائیں گے ۔

جب بہت سے لوگ مل کر کوئی کام انجام دیں تو مختلف لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ کسی کو ایک چیز حوالے کی جاتی ہے اور کسی کو دوسری چیز۔ اس طرح تقسیم عمل کا نظام وجود میں آتا ہے۔ ایسے نظام کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ہر آدمی امانت دار ثابت ہو۔ جس کو جو چیز سونپی جائے وہ اس میں صحیح تصرف کرے ، اور اس کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو صحیح طور پر ادا کرے ۔

اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ اجتماعی نظام کی طرف سے جس کو جو چیز دی جائے اس کو وہ ذاتی ملکیت سمجھ لے ، وہ اپنے فرائض کو ادا کرنے کے بجائے اپنے حقوق کو مستحکم کرنے میں اپنی توجہ صرف کرنے لگے تو اجتماعی نظم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں الجھ کر رہ جائیں گے اور بڑے کام کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا تھا ۔ وہ اپنی تکمیل تک نہیں پہونچ سکے گا ۔

زندہ افراد زندہ تاریخ بناتے ہیں اور مردہ افراد مردہ تاریخ ۔

عورت کے بارہ میں

اسلام کی بنیاد دو باتوں پر ہے ——— اللہ کا خوف اور انسانوں کا احترام۔ اس کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

یاایھاالناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساء۔ واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا (النساء ۱)

اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو۔ جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اسی (کی جنس) سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے۔ اور تم اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو۔ اور قرابتوں کے باب میں بھی۔ بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے ۔

اس آیت میں خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا (خدا نے اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا) کا مطلب بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، اور اس کے بعد ان کے جسم سے ان کی ایک پسلی نکال کر ان کی بیوی حوا کو بنایا۔ مگر یہ تشریح صحیح نہیں، یہ بائبل کی بات ہے نہ کہ قرآن کی بات۔

بائبل میں حضرت حوا کی پیدائش کے بارہ میں اسی قسم کی روایت آئی ہے۔ یہاں ہم بائبل کے الفاظ نقل کرتے ہیں :

اور خداوند خدا نے آدم پر گہری نیند بھیجی اور وہ سو گیا۔ اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک کو نکال لیا اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا۔ اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم میں سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اسے آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ یہ تو اب میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس لیے وہ ناری کہلائے گی۔ کیوں کہ وہ نر سے نکالی گئی ہے۔ (پیدائش ۲: ۲۱—۲۳)

بائبل کی یہی روایت ہے جس کو بعد کے کچھ لوگوں نے قرآن کی تفسیر میں داخل کر دیا۔ اور اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنے لگے۔ مگر یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ بائبل ایک محرف کتاب

ہے ۔ اس میں پیغمبروں کے کلام کے ساتھ عام انسانی کلام کی آمیزش ہوئی ہے ، اس لیے اس کے بیان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔ اور نہ اس کی روشنی میں قرآنی آیت کی تشریح کرنا درست ہے ۔

قرآن کی مذکورہ آیت یا کسی بھی دوسری آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا ۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں جو لفظ ہے وہ منھا (اس سے) ہے نہ کہ من ضلع آدم (آدم کی پسلی سے) ۔ چنانچہ محقق مفسرین نے منھا سے مراد من جنسھا لیا ہے ۔ یعنی نفس واحدہ (آدم) کی جنس سے نہ یہ کہ خود آدم کے اپنے جسم سے ۔ ابو مسلم اصفہانی اور بعض دوسرے مفسرین سے یہی قول نقل ہوا ہے اور یہی قرآنی الفاظ کے مطابق ہے ۔ (القول الثانی ما هو اختیار ابی مسلم الاصفهانی ان المراد من قولہ وخلق منھا زوجھا ای من جنسھا ، تفسیر کبیر ۔ ویحتمل ان یکون المعنی من جنسہ لا من نفسہ حقیقۃ ، البحر المحیط)

منھا کو من جنسھا کے معنی میں لینے کی تائید بعض دوسری آیتوں سے ہوتی ہے ۔ قرآن میں نفس کا لفظ بار بار جنس کے معنی میں آیا ہے ۔ اس طرح یہ دوسری آیتیں سورہ نساء کی مذکورہ آیت کی نہایت واضح تشریح کر رہی ہیں ۔ یہاں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں :

واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا (النحل ۷۲)	اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں ۔
ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا (الروم ۲۱)	اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں بنائیں تاکہ تم سکون حاصل کرو ۔
فاطر السماوات والارض جعل لکم من انفسکم ازواجا ومن الانعام ازواجا (الشوریٰ ۱۱)	وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے ۔ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے اور اسی طرح مویشیوں میں سے جوڑے بنائے ۔

ان آیتوں پر غور کیجئے ۔ ان میں عام مردوں کی ازواج (بیویوں) کے لیے بھی عین وہی لفظ آیا ہے جو سورۂ نساء کی آیت میں حضرت آدم کی زوج (بیوی) کے لیے آیا ہے ۔ اس کے مطابق حوا کو جس طرح آدم کی "نفس" سے پیدا کیا گیا ۔ اسی طرح دوسرے تمام مردوں کی بابت بھی ارشاد ہوا ہے کہ

ان کی بیویوں کو ان کے " انفس " سے پیدا کیا گیا ہے ۔

ظاہر ہے کہ ان دوسری آیتوں کے یہ معنی نہیں لیے جا سکتے کہ ہر مرد کی بیوی اس کے اپنے جسم کے اندر سے نکالی گئی ہے ۔ یہاں لازمی طور اس کو جنس کے معنی میں لینا ہوگا ۔ یعنی یہ کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے تمہاری عورتیں بنائیں تاکہ وہ تمہارے لیے حقیقی معنوں میں رفیق زندگی بن سکیں ۔

جس طرح عام آدمیوں کی بیویاں ان کی ہم جنس ہیں نہ کہ حیاتیاتی معنوں میں ان کے جسم کا حصہ ۔ اسی طرح حضرت آدم کی بیوی (حوا) بھی ان کی ہم جنس تھیں ، وہ آدم کے جسم کے اندر سے نکالی نہیں گئیں ، اللہ نے آدم کی طرح ان کی بیوی کو بھی اپنی قدرت سے پیدا کیا ۔ جس طرح اس نے عام مردوں کی طرح ان کی عورتوں کو اپنی قدرتِ خاص سے پیدا فرمایا ہے ۔

احادیث

اب ایک سوال ان احادیث کا ہے جو اس سلسلہ میں نقل کی جاتی ہیں اور جن میں صراحۃً ضلع (پسلی) کا لفظ آیا ہے ۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ان احادیث میں آدم و حوا کی تخلیق کا کوئی ذکر نہیں ہے ۔ بلکہ وہ عام عورتوں کے بارہ میں ہیں ۔ یعنی ان احادیث میں ہر ہر عورت کی تخلیقی نوعیت کا ذکر ہے نہ کہ مخصوص طور پر حضرت حوا کی تخلیقی نوعیت کا ذکر ۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :

استوصوا بالنساء خیرا فانھا خلقت من ضلع (التفسیر المظہری)

عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو ۔ کیوں کہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں ۔

اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ عورت واقعۃً پسلی سے پیدا کی گئی ہے ۔ کیوں کہ پورے فقرہ کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں ۔ حدیث کا مدعا عورتوں کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کرنا ہے ۔ اس لیے اس کی وہی تشریح درست ہوگی جو اس اصل مدعا کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو ۔

" عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں " کا فقرہ یہاں مجازی معنوں میں ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا معاملہ پسلی جیسا معاملہ ہے ۔ وہ پسلی کی مانند ہیں ۔ چنانچہ دوسری روایت میں خود حدیث میں یہ صراحت موجود ہے ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا (بخاری، کتاب النکاح۔ مسلم، کتاب الرضاع)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورت پسلی کی مانند ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرو گے تو تم اس کو توڑ دو گے۔

بخاری و مسلم کی اس روایت میں واضح طور پر کالضلع کا لفظ ہے۔ یعنی یہ کہ عورت پسلی کی مانند ہے نہ یہ کہ وہ خود پسلی سے بنائی گئی ہے۔ پسلی کی مانند ہونے کا مطلب کیا ہے، یہ بھی صراحۃً حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو تم اس کو توڑ دو گے۔

"عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے" اور "عورت پسلی کی مانند ہے" دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ صرف ادبی اسلوب کا فرق ہے نہ کہ حقیقت کا فرق۔ ہر زبان میں یہ اسلوب عام ہے کہ جب تشبیہ میں شدت پیدا کرنا مقصود ہو تو "مثل" کا لفظ حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی بہادری بتانے کے لیے کبھی کہا جاتا ہے کہ وہ شیر کی طرح ہے۔ اور جب اس بات کو زیادہ زور دے کر کہنا ہو تو کہہ دیتے ہیں کہ "وہ شیر ہے"۔ جیسے میر انیس نے کربلا کے میدان کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

عورت کے بارہ میں نفسیات اور حیاتیات کا علم بتاتا ہے کہ وہ "صنف نازک" ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں کمزور اور نازک ہوتی ہے۔ اس کے مزاج میں انفعالیت ہے۔ چنانچہ کسی واقعہ سے وہ بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ہر آدمی جانتا ہے خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا۔ ہر باپ جانتا ہے کہ بیٹے سے سختی کی جا سکتی ہے مگر بیٹی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ وہ شدت کا تحمل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ خودکشی کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ خودکشی کرتی ہیں، وہ ایک معمولی واقعہ سے متاثر ہو کر خودکشی کر سکتی ہیں یا ذہنی اختلال کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہی وہ معلوم حقیقت ہے جس کو حدیث میں تمثیل کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ آدمی کے

سینے میں پسلی کی ہڈیاں کسی قدر خم دار ہوتی ہیں۔ ان کا خم دار رہنا ہی مصلحت کے مطابق ہے۔ کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں کرتا کہ آپریشن کے ذریعہ ان پسلیوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔

اسی معلوم واقعہ کی مثال دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ ان کی فطرت کے مطابق پیش آؤ۔ عورتوں سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہ ذہن میں رکھو کہ عورتیں فطری طور پر نازک اور جذباتی ہوتی ہیں۔ اللہ نے مخصوص مصالح کے تحت انھیں بالارادہ ایسا ہی بنایا ہے اس لیے تم ان کے ساتھ ہمیشہ نرم برتاؤ کرو۔ کوئی بات بتانا ہو تو نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بتاؤ اگر تم ان کے ساتھ سختی کروگے تو ان کی شخصیت اس کا تحمل نہ کر سکے گی۔ ان کا دل اسی طرح ٹوٹ جائے گا جس طرح پسلی سیدھا کرنے میں ٹوٹ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار سفر میں تھے۔ کچھ خواتین اونٹ پر بیٹھی ہوئی چل رہی تھیں ساربان نے اونٹ کو زیادہ تیز چلانا چاہا۔ اونٹ جب تیز چلتا ہے تو مسافر کا جسم کافی ہلنے لگتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساربان کو منع کیا اور فرمایا : رفقا بالقواریر (شیشہ کے برتنوں کے ساتھ نرمی کرو)

جدید تحقیقات

موجودہ زمانہ میں خالص علمی طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان بنیادی پیدائشی فرق پائے جاتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں خواتین کی حالت (Status of women) پر ایک مفصل مقالہ ہے۔ اس مقالہ کا ایک ذیلی عنوان یہ ہے :

Scientific studies of male-female differences

(مرد اور عورت کے فرق کا علمی مطالعہ) مقالہ کے اس حصہ میں مقالہ نگار نے دکھایا ہے کہ جدید تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان عین پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :

> **With respect to personality traits, men are characterized by greater aggressiveness, dominance, and achievement motivation, women by greater dependency, a stronger social orientation, and the tendency to be more easily discouraged by failure than men (19/907).**

اوصافِ شخصیت کے اعتبار سے، آدمیوں کے اندر جارحیت اور غلبہ کی خصوصیت زیادہ پائی گئی ہے۔ ان میں حاصل کرنے کا جذبہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عورتیں سہارا چاہتی ہیں۔ ان کے اندر معاشرہ پسندی کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔ اور ناکامی کی صورت میں مردوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسانی سے بے ہمت ہوجاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ میں بے شمار تجربات کیے گیے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ایک تجربہ یہ کیا گیا کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی کا انتخاب کیا گیا۔ دونوں کم عمر تھے۔ اور ابھی بولنے کی عمر کو نہیں پہونچے تھے۔ تاہم ان کی جسمانی صحت یکساں تھی۔ ان کو دو الگ الگ کٹہرے میں رکھ کر نکلنے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد لڑکی رونے چلانے لگی، جب کہ لڑکے نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اندازہ کرنا شروع کیا کہ کیا کسی طرف سے وہ نکلنے کا راستہ پا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک تجربہ میں پایا گیا کہ بارہ ماہ کی لڑکیاں کسی اجنبی کمرہ میں ہوں اور انھیں خوفزدہ کیا جائے تو وہ اپنی ماؤں کی طرف بھاگتی ہیں جب کہ اسی عمر کے لڑکے کچھ کرنے کی راہ ڈھونڈنے لگتے ہیں نیو یارک یونیورسٹی میں ریسرچ کرنے والوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی اگر بوتل پینے میں مشغول ہے تو وہ اس وقت پینے سے رک جاتی ہے جب کہ کوئی شخص کمرے میں آتا ہوا نظر آئے۔ اس کے برعکس ایک لڑکا کسی آنے والے پر کوئی دھیان نہیں دیتا وہ اپنا کام بدستور جاری رکھتا ہے۔

ماہرین نے بتایا ہے کہ عورت اور مرد کے تمام فرق ان کے جین کے اندر پائے جاتے ہیں نہ کہ سماجی حالات میں۔ عورتوں کے اندر انفعالیت کا سبب ان کے مخصوص ہارمون ہیں۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون میں یہ فرق پیدائش کے بالکل آغاز سے موجود رہتا ہے۔ (ٹائم میگزین، نیو یارک، ۲۰ مارچ ۱۹۷۲)

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے تمام احکام فطری حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطری تقاضوں کو قانونی صورت دینے ہی کا دوسرا نام شریعت ہے۔ عورت کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بھی اسی بنیادی اصول پر مبنی ہیں۔ نفسیات (اور حیاتیات اور عضویات میں موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ مرد کے مقابلہ میں عورتیں فطری طور پر منفعل مزاج ہوتی ہیں۔ مخصوص معاشرتی مصالح کی بنا پر خالق نے ان کو نسبتاً نازک پیدا کیا ہے۔

یہی وہ فطری حقیقت ہے جس کی رعایت اسلامی تعلیمات میں رکھی گئی ہے۔ اس بنا پر اسلامی شریعت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو تاکہ وہ بے حوصلہ نہ ہوں، تاکہ وہ دل شکنی سے محفوظ رہیں اور زندگی میں اپنے مخصوص فرائض کو بخوبی طور پر ادا کرسکیں۔ عورتیں لوہے کی مانند نہیں ہیں کہ ان پر ٹھونک پیٹ کا کوئی اثر نہ پڑے، وہ پسلی کی مانند ہیں۔ وہ فطرۃً جیسی ہیں ویسی ہی انھیں رہنے دو۔ اگر تم ان کے ساتھ لوہے جیسا برتاؤ کروگے تو تم ان کی شخصیت کو توڑ دوگے۔

خلاصہ

سورہ نساء کی آیت (خلق منہا زوجہا) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس جنس سے آدم کو بنایا، اسی جنس سے اس نے آدم کے جوڑے (حوا) کو بھی بنایا تاکہ دونوں میں موافقت رہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ دونوں دو الگ الگ جنس ہوتے، مثلاً ایک آگ سے بنایا جاتا اور دوسرا مٹی سے، تو دونوں کے درمیان باہمی توافق نہ ہوتا۔ پھر نہ خاندانی زندگی میں سکون پایا جاتا اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ دونوں مل کر مشترکہ جدوجہد سے تمدن کی تعمیر کریں۔

حدیث (ضلع) میں عورتوں کے بارے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا مقصد تمثیل کی زبان میں یہ بتانا ہے کہ عورتوں کی مخصوص فطری ساخت کی بنا پر ضروری ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار مختلف انداز سے یہ نصیحت فرمائی ہے اور خود اپنی پوری زندگی میں اس کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں رات کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ نماز کی اقامت کا بہت خاص اہتمام فرماتے تھے، لیکن خواتین کے ساتھ آپ کی رعایت کا یہ حال تھا کہ نماز میں اگر کبھی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ نماز کو جلد ختم کر دیتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

انی لاقوم فی الصلوٰۃ ارید ان اطول فیہا فاسمع بکاء الصبیّ فاتجوز فی صلاتی کراھیۃ ان اشق علی اُمّہ	میں مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ اس کو لمبا کروں، پھر میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اس اندیشہ کی بنا پر کہ میں اس کی ماں کو تکلیف دوں گا۔
(بخاری، کتاب الصلوٰۃ)	

حرص اور قناعت

پاکستان کے ڈاکٹر جاوید نے لکھا ہے کہ وہ امریکہ گیے ۔ وہاں وہ ایک کروڑ پتی سے ملے ۔ کروڑ پتی نے ان کو اپنے ایک خاص مکان میں ملاقات کے بلایا ۔ یہ مکان سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا ۔ جدید طرز کا وسیع مکان ۔ اس کے آگے شاندار لان ، اس کے آگے حدِ نظر تک پھیلی ہوئی سمندر کی لہریں ۔ چاروں طرف عیش اور خوبصورتی کے مناظر ۔ اس ماحول میں مہمان اور میزبان دونوں مکان کے سامنے لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے ۔

ڈاکٹر جاوید کہتے ہیں کہ میں اس ماحول میں گم تھا ۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں جنت کی دنیا میں بیٹھا ہوا ہوں ۔ مجھ پر محویت کا عالم طاری تھا ۔ امریکی کروڑ پتی بھی چپ چاپ کسی سوچ میں مبتلا تھا ۔ اچانک امریکی نے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا : مسٹر جاوید ، میں چاہتا ہوں کہ امریکہ کو چھوڑ کر پاکستان چلا جاؤں اور زندگی کے بقیہ دن وہیں گزاروں ۔

"کیوں" ڈاکٹر جاوید نے حیرت کے ساتھ پوچھا ۔

" یہ سب چیزیں مجھے کاٹتی ہیں ۔ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی سکون حاصل نہیں "

یہ واقعہ دنیا کی حقیقت کو بتا رہا ہے ۔ دنیا کا حال یہ ہے کہ جو شخص پائے ہوئے نہ ہو وہ سمجھتا ہے کہ پانے کا نام خوشی ہے ۔ مگر جو شخص پالے وہ محسوس کرتا ہے کہ پاکر بھی اسے خوشی حاصل نہیں ہوئی ۔ سب کچھ پاکر بھی اس نے خوشی کو نہیں پایا ۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہے چاہی ہوئی چیز کو نہ پانے کا ۔ جو لوگ اس راز کو جان لیں وہ نہ ملنے پر بھی اس طرح مطمئن رہتے ہیں جیسے کہ انھوں نے سب کچھ پالیا ہو ۔ اور جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ ہمیشہ اپنی چاہی ہوئی چیز کو پانے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں اور کبھی بھی اس کو نہیں پاتے ۔ کیونکہ پانے کے بعد جلد ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں جس کو انھوں نے پانا چاہا تھا ۔ وہ ایک نہ ملنے والی چیز کے غم میں پڑے رہتے ہیں ، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتے ہیں ۔

مذہب کی اصطلاح میں پہلی چیز کا نام قناعت ہے اور دوسری چیز کا نام حرص ۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کی ساری کہانی چھپی ہوئی ہے ۔

بے چین روح

بلیر فاولر (پیدائش ۱۹۲۱) امریکہ کے ایک راکٹ انجینیر ہیں۔ وہ اعلیٰ قابلیت کے ان انجینیروں میں شامل تھے جن کی کوششوں نے آخر کار سیٹرن راکٹ کی شکل اختیار کی۔ جنوری ۱۹۸۶ میں بلیر فاولر چند دن کے لیے نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے تاج پیلس (ہوٹل) میں ہندستان ٹائمس کے نمائندہ سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی اب ایک مکمل تبدیلی سے دوچار ہو چکی ہے۔ ان کی بیوی ایک کامیاب میڈیکل ڈاکٹر تھیں۔ اور وہ خود اپنے کیریر کی چوٹی پر پہونچ چکے تھے کہ دس سال پہلے دونوں نے اپنا اپنا کام یک لخت چھوڑ دیا۔

اس کے بعد وہ دونوں شہر سے باہر کیلی فونیا کے ایک معمولی فارم میں چلے گئے۔ یہاں وہ دونوں بالکل سادہ قدیم دیہاتی انداز میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے لکڑی کاٹتے ہیں۔ لکڑی کی آگ پر خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے ہیں۔ وہ مشینی دنیا سے بھاگ کر فطرت کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں اور اپنی اس سادہ زندگی پر بالکل خوش ہیں۔ انھوں نے کیوں ایسا کیا۔ مسٹر بلیر فاولر کے الفاظ میں، اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارا علم جتنا ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہم کو اپنی جہالت کا احساس ہوتا ہے:

As our knowledge grows the more one
gets convinced that he is ignorant.

انھوں نے علم کی دنیا میں اپنا سفر شروع کیا تھا۔ مگر آخر کار انھیں معلوم ہوا کہ ان کا ہر اگلا قدم صرف جہالت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انسانی علم آدمی کو حقیقی علم تک نہیں پہونچاتا۔

مزید یہ کہ مذکورہ سائنسی ماحول میں ان کو روحانی سکون حاصل نہ تھا۔ بلیر فاولر کو ایک ایسے احاطہ میں کام کرنا پڑتا تھا جس کے چاروں طرف چار فیٹ کی مضبوط دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ ہائیڈروجن گیس کو رقیق ہائیڈروجن میں تبدیل کریں۔ اس کے لیے بڑے سخت حالات میں کام کرنا پڑتا ہے نیز ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ گیس کا ذخیرہ پھٹ نہ جائے۔ یہ صورت حال ایک مستقل ذہنی تناؤ کا باعث بنی رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سے کمتر کوئی چیز انسان کو سکون عطا نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ سائنسی علوم ہوں یا مادی اور مشینی ترقیاں۔

Total change

NEW DELHI, Jan. 27 — "As our knowledge grows the more one gets convinced that he is ignorant" says Blair Fowler, an aero-jet engineer who worked on the first liquid propulsion rocket in the United States that ultimately became the Saturn rocket with several million pounds thrust.

On a brief holiday in India, Mr. Fowler told this correspondent at the Taj Palace, New Delhi that his life had now undergone a total change. At the peak of his career ten years ago he and his wife, who too had a prosperous medical practice, simply gave up their jobs and money and retired to a Californian ranch "to work with our bare hands"

Mr Fowler holds out his hands, now toughened and also rough by physical work like wood cutting, carpentry, blacksmithy, etc. "When I was in the rocket propulsion group my hands had become soft through constant paper work designing and redesigning."

At 65, Mr Fowler looks quite young and strong. "We do a lot of wood cutting for firewood in our home which is heated by log fire". There is a furnace and forge also in his ranch where he hammers iron into shape like the blacksmiths used to do in the olden days.

Looking back at the development in rocketry which now has put a man on the moon and done several extraordinary things, this aero-engineer recalls the way they worked to develop the liquid hydrogen and oxygen burning rocket motor under Theodore Von Carman, a well known rocket expert.

There were no electronic instruments at that time even though they had to work with pumps with speeds of 40,000 rpm. Kryogenics, the science of supercooling, was still in its infancy. How liquid hydrogen and oxygen would behave was also not known.

They worked behind three feet concrete walls and lived in constant fear of explosion. In fact there was one such explosion "but we escaped". To obtain even a few litres of liquid hydrogen, repeated cooling using liquid nitrogen and dripping techniques under high vacuums had to be utilised. "We learnt later that the Soviet scientist Kapista was also developing these engines parallely." Subsequently, Mr Fowler worked on nuclear rocket development but the project was given up as unpracticable.

Why did he and his wife give up their practice and money to go back to ranch life? He says: "Though we were quite well off, we were not living, each one busy in his own work. We did not have time to talk to each other. Today we are a happy couple as we share our work. My wife kneads the dough and bakes the bread and we have much time for mutual communication".

Mr Fowler is very much influenced by Gandhian thinking like hard physical work and its elevating nature, the need for man to be self-sufficient and simple living. He thinks that there is lot of sense in that philosophy.

The Hindustan Times, January 28, 1986

صحیح اندازکار

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کو شکست ہوئی۔ اس دوران پیرس میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں فرانس کے مختلف ذمہ دار شریک تھے۔ اس میٹنگ میں جن لوگوں نے تقریریں کیں ان سب کا مشترک خلاصہ یہ تھا کہ ہر ایک جرمنی کو اور نازی پارٹی کو برا بھلا کہتا رہا۔ آخر میں ایک فرانسیسی جنرل اٹھا اس نے کہا کہ ہماری شکست کا سبب جرمنی نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہمارے پاس نہ ہتھیار ہیں اور نہ لڑنے والے جوان :

No armament, no children

دوسری جنگ عظیم سے پہلے فرانس کی جنگی صنعت نسبتاً بہت پیچھے تھی۔ دوسری طرف فرانس میں جنسی اباحیت کے نتیجہ میں بہت بڑے پیمانہ پر یہ ذہن پیدا ہو گیا تھا کہ بچے نہ پیدا کیے جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں بچوں کی پیدائش کی شرح بہت گھٹ گئی۔ مذکورہ جنرل کے نزدیک یہ دو داخلی اسباب تھے جو فرانس کے شکست کا سبب بنے۔ ظاہر ہے کہ جب نہ ہتھیار ہو اور نہ فوج تو جنگ کیسے لڑی جائے گی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملات میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے خارجی اندازِ فکر اور دوسرا ہے داخلی اندازِ فکر۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر احیاءِ امت کی جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ سب کی سب خارجی اندازِ فکر پر چل رہی ہیں۔ ہر ایک نے اپنے سے باہر ایک "دشمن" دریافت کر رکھا ہے۔ اور ہر ایک اپنے دریافت کردہ دشمن کے خلاف تقریری یا غیر تقریری مہم چلانے میں مصروف ہے۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں اس اعتبار سے غالباً ایک ہی استثناء ہے اور وہ تبلیغی جماعت کا ہے تبلیغی جماعت واحد مسلم جماعت ہے جو داخلی اندازِ فکر پر چل رہی ہے۔ تبلیغی جماعت کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایمان و یقین کی کمزوری سے ان کے سارے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر اگر دوبارہ ایمان و یقین زندہ ہو جائے تو ان کے تمام مسائل بھی اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

راقم الحروف ذاتی طور پر اسی آخری طرزِ فکر کو صحیح سمجھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ ان کی داخلی کمزوری کا مسئلہ ہے۔ جو شخص واقعۃً کوئی نتیجہ خیز کام کرنا چاہتا ہو اس کو مسلمانوں کی داخلی اصلاح پر اپنی ساری طاقت لگا دینی چاہیے۔

خدا کی سنّت

قرآن میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ فرعون نے حق کو قبول نہیں کیا۔ اس نے اس کے مقابلے میں سرکشی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم نے کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور آرام دہ مکانات اور عیش کے سامان جن میں وہ خوش رہتے تھے چھوڑ دیے۔ اللہ مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ اور ان چیزوں کا وارث اللہ نے دوسروں (بنی اسرائیل) کو بنا دیا۔ پس نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انھیں مہلت مل سکی۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل کو ذلّت کے عذاب سے نجات دی یعنی فرعون سے۔ بے شک وہ سرکش اور حد سے نکل جانے والا تھا۔ اور اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا والوں پر ترجیح دی۔ اللہ نے ایسا اپنے علم کی بنا پر کیا اور ان کو ایسی نشانیاں دیں جن میں کھلا ہوا انعام تھا۔ (الدخان ۲۵-۳۳)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک قوم کا گرنا اور دوسری قوم کا ابھرنا اتفاقی طور پر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم اپنی ظالمانہ کارروائیوں سے دوسری قوم کے اوپر غالب آگئی۔ یہ تمام تر خدا کے علم کے تحت ہوتا ہے۔ یہ خدا ہے جو خود اپنے فیصلہ کی بنا پر ایک کے لیے مغلوبیت کا اور دوسرے کے لیے غلبہ کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور یہ فیصلہ اس استحقاق کی بنا پر ہوتا ہے جو کسی قوم نے علمِ الٰہی کے مطابق اپنے لیے ثابت کیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جب ایک قوم غالب اور دوسری قوم مغلوب ہو جائے تو دونوں کو چاہیے کہ اس واقعہ کو وہ خدا کی طرف منسوب کریں نہ کہ کسی اور کی طرف۔ اگر یہ ذہن ہو تو دونوں صحیح راستہ پر قائم رہیں گے۔ غالب قوم اپنے غلبہ پر خدا کا شکر ادا کرے گی نہ کہ وہ غلبہ کو اپنا کارنامہ سمجھ کر فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے۔

دوسری طرف مغلوب قوم اگر مغلوب ہونے کے بعد غالب قوم کے خلاف شکایت اور احتجاج کی مہم شروع کر دے تو یہ اس کے لیے سراسر ایک غلط فعل ہوگا۔ کیوں کہ غالب قوم خدا کے علم اور فیصلہ سے غالب ہوئی ہے نہ کہ محض اپنی سازشوں یا جارحانہ کارروائیوں کی وجہ سے اس نے غلبہ پایا ہے۔ ایسی حالت میں مغلوب

قوم کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی ان اندرونی خامیوں کو دور کرے جس کی وجہ سے وہ خدا کی نظر میں بے استحقاق ثابت ہوئی ہے۔ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو نہ کہ مفروضہ ظالموں کی طرف۔ جب اصل کرنے والا خدا ہے تو دوسروں کے خلاف ہنگامہ کرنے سے کیا فائدہ۔

یہ بات سادہ معنوں میں محض توجیہہ کی بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات ہے جس پر قوموں کا مستقبل بنتا ہے، یہی وہ بات ہے جس پر قوموں کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صحیح ذہن سے صحیح منصوبہ بندی وجود میں آتی ہے۔ اور اگر ذہن غلط ہو تو منصوبہ بندی بھی غلط ہو جائے گی۔ مسلمانوں کی جدید تاریخ اس کی نہایت واضح اور عبرت ناک مثال پیش کرتی ہے۔

جدید دور میں مسلمان ساری دنیا میں غیر مسلم قوموں سے مغلوب ہوگئے۔ کہیں براہ راست طور پر مسلمانوں کے اوپر غیر مسلم قوموں کا غلبہ قائم ہوگیا اور کہیں بالواسطہ طور پر۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اکثر ملکوں میں غیر مسلم اقوام کا براہِ راست غلبہ بظاہر ختم ہوگیا ہے۔ تاہم ان کا بالواسطہ غلبہ بدستور مزید شدت کے ساتھ باقی ہے۔

اس صورت حال کے پیش آنے کے بعد مسلمانوں نے کیا کیا۔ ساری دنیا میں مسلمانوں نے اس کے جواب میں ایک ہی کام کیا ہے۔ اور وہ ہے غیر مسلم اقوام کے خلاف چیخ پکار، یا ان سے ٹکراؤ۔ تاہم ایک صدی سے بھی زیادہ مدت کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی لفظی چیخ پکار فضا میں گم ہوگئی اور ان کی ٹکراؤ کی سیاست آخرکار صرف مزید بربادی پر ختم ہوئی۔ مسلمانوں کو ان کی پرشور کوششوں کا اتنا بھی فائدہ حاصل نہیں ہوا جتنا انھوں نے اپنے بچے ہوئے اثاثہ میں سے اس کی راہ میں خرچ کیا تھا۔

اس کی واحد وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی غلط ذہن کی وجہ سے غلط منصوبہ بندی۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں غیر مسلم اقوام کے غلبہ کو صرف اس نظر سے دیکھا کہ یہ کچھ ظالم لوگ ہیں جو اپنی سازشوں اور جارحانہ کارروائیوں کے ذریعہ مسلمانوں کے اوپر غالب آگئے ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ کو خود غالب قوموں کا معاملہ سمجھا نہ کہ خدا کا معاملہ۔ جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری توجہ غالب اقوام کے خلاف جھوٹی چیخ پکار اور جھوٹی لڑائیوں میں صرف ہوگئی۔

اس کے برعکس اگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ذہن قرآن کی روشنی میں بنا ہوتا تو وہ سمجھتے کہ

جو کچھ ہوا ہے وہ خدا کے علم اور خدا کے فیصلہ کے تحت ہوا ہے۔ یہ خود خدا ہے (نہ کہ کوئی قوم) جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مغلوب کرکے دوسری قوموں کو ان کے اوپر غالب کر دیا ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر یہ ذہن ہوتا تو وہ قوموں کی طرف دوڑنے کے بجائے خدا کی طرف دوڑتے۔ وہ دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے اپنی اندرونی اصلاح پر سارا زور لگا دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی نظر میں بے استحقاق ہونے کی وجہ سے مسلمان مغلوب کیے گئے تھے۔ اور خدا کی نظر میں استحقاق ثابت کرکے ہی وہ دوبارہ غالب حیثیت حاصل کر سکتے تھے۔ مگر مسلمان بروقت اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں پست اور بے قیمت ہو کر رہ جائیں۔

قابلِ توجہ

اگر آپ نے الرسالہ کو صرف ایک بار پڑھا

تو آپ نے الرسالہ کو نہیں پڑھا۔

اگر آپ الرسالہ کو پسند کرتے ہیں مگر آپ اس کو پھیلانے کی کوشش نہیں کرتے

تو ابھی آپ الرسالہ کو پسند کرنے والے نہیں بنے۔

الرسالہ کو بار بار پڑھیے، الرسالہ کو دوسروں میں پھیلائیے۔

اس کے بعد ہی آپ وہ حق ادا کر سکتے ہیں جو الرسالہ جیسے جریدہ کا آپ کے اوپر عاید ہوتا ہے۔

نیویارک کی ایک سڑک سے ہم رات کے وقت گزر رہے تھے۔ وہاں ایک روشن اشتہار نظر آیا۔ یہ جاپانی کار ٹویوٹا کا اشتہار تھا۔ یہ اشتہار انتہائی کامیاب اور انتہائی خوبصورت انداز میں بنایا گیا تھا۔ نیویارک کی سڑکوں پر امریکی کاروں (بیوک، فورڈ وغیرہ) کے اشتہار بھی نظر آئے مگر وہ جاپانی اشتہار کے مقابلہ میں بہت پھیکے تھے۔ امریکی اشتہار محض اوسط درجہ کے اشتہار تھے جب کہ جاپانی اشتہار آرٹ کا بہترین نمونہ تھا۔

اسی طرح اقوام متحدہ میں ہم نے دیکھا کہ وہاں آنے والے زائرین کی رہنمائی کے لیے بہت سی خاتون گائڈ مقرر ہیں۔ ہماری جماعت کے لیے جو گائڈ متعین کی گئی وہ ایک جاپانی لڑکی تھی۔ وہ اس قدر سرگرم تھی اور اس قدر کامیابی کے ساتھ شستہ انگریزی میں تمام چیزوں کا تعارف کرا رہی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ انسان ہے یا کوئی مشین۔ جاپانی لوگوں کی یہ عام خصوصیت ہے کہ وہ جس کام کو کرتے ہیں اس کو اعلیٰ ترین معیار پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو جائے انھیں کوئی چیز موجودہ دنیا میں کامیاب ہونے سے روک نہیں سکتی۔ خواہ قدرتی عطیات میں وہ سب سے کم ہوں، خواہ بموں کی بارش سے انھیں کھنڈر بنا دیا گیا ہو۔

ہوٹل کی ایک منزل پر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

Assembly of the World's Religions
BOOK DISPLAY

یہاں نہایت سلیقہ کے ساتھ مختلف مذہبی کتابوں کی نمائش کی گئی تھی۔ اس میں اسلامی مرکز کی اردو، عربی، اور انگریزی مطبوعات بھی رکھی گئی تھیں۔ بعض غیر مسلم صاحبان نے اس نمائش میں اسلامی مرکز کی کتابیں دیکھیں تو اس کے بعد وہ ہم سے ملے اور کتابوں کو حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

افریقہ، امریکہ، یورپ سے آنے ہوئے مسلمانوں کو انگریزی الرسالہ دکھایا گیا۔ انھوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ یہ لوگ ان علاقوں میں جو دعوتی کام کر رہے ہیں اس کے لیے انھیں موزوں لٹریچر نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ ہمارے دعوتی کام میں زبردست مددگار ثابت ہوگا۔

ایک صاحب کینیا سے آئے تھے جو وہاں کی یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں اور

:عوتی کام بھی کرتے ہیں۔ ان کا نام (Badru Dungu Kateregga) ہے۔ انھوں نے انگریزی الرسالہ لیا اور بیٹھے بیٹھے اس کے چند مضامین اسی وقت پڑھ ڈالے اس کے بعد ان کی زبان سے بے اختیار نکلا :

You are doing a wonderful work

ایک امریکی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ نیویارک کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا موجودہ نام (Ya-sin Andy Gold) یاسین اینڈی گولڈ ہے۔ وہ پانچ سال سے باقاعدہ مسلمان ہیں اور اب نیومیکسکو میں رہتے ہیں۔ ان کو انگریزی الرسالہ دیا گیا تھا۔ اس کو انھوں نے رات کو پڑھ لیا۔ اگلے دن ملاقات ہوئی تو انھوں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ ان کا تاثر ان کے اپنے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے :

I have read two issues of Al-Risala (English) and am very grateful for having been introduced with this publication. The work comes I believe from a place of deep understanding and is written in a way that is particularly appropriate for westerners. Not only is the language itself clear, but the thoughts are phrased in such a way as to be understood by those of us with a western conceptual framework. The articles are very much to the point, the meanings available on a number of levels.

Ya-Sin Andy Gold, Lama Foundation, P.O. Box 240,
San Cristobal, New Mexico 87564, U.S.A.

میں نے الرسالہ انگریزی کے دو شمارے پڑھے۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ایسی مطبوعات سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ میرا یقین ہے کہ یہ مضامین بہت گہری معرفت سے نکلے ہیں اور وہ اس طرح لکھے گیے ہیں جو خاص طور پر اہل مغرب کے لیے بہت موزوں ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی زبان بہت صاف ہے بلکہ خیالات اس طرح تحریر کیے گیے ہیں کہ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے قابل فہم ہیں جن کا ذہنی سانچہ مغرب میں بنا ہے۔ مضامین بالکل دو ٹوک انداز میں ہیں۔ ان کے معانی میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔

یہ ان بہت سے تاثرات میں سے صرف چند ہیں جو اس موقع پر مسلمانوں اور غیر مسلموں

کی طرف سے سامنے آئے۔

اس موقع پر ہر مذہب کو عبادت کے لیے ہال دیے گئے تھے۔ چنانچہ ایک ہال "مسجد" کے لیے بھی تھا۔ کانفرنس میں مختلف ملکوں کے تقریباً ۸۰ مسلمان شریک تھے۔ ان کی ایک قابلِ لحاظ تعداد نماز کے وقت مسجد میں جمع ہو جاتی۔ ان حضرات نے اپنے اپنے حلقہ میں ہونے والے مباحثہ کی رپورٹ دیتے ہوئے ایک بات مشترک طور پر کہی۔ وہ یہ کہ دوسرے مذاہب پر گفتگو کے وقت لوگ سنجیدہ رہتے ہیں۔ مگر جہاں اسلام کا ذکر آیا وہ جارحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ خود ہمارے حلقۂ بحث میں بھی یہ صورت پیش آئی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود مسلمانوں پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اسلام کا تعارف زیادہ تر سیاسی انداز سے کرایا ہے۔ اگر اسلام کا تعارف فطری انداز میں کرایا جائے تو اس قسم کا ردعمل اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

ایک مجلس میں میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان پروفیسر نے اسلام کو "ایک کامل ریاستی نظام" کے طور پر پیش کیا۔ اس کے بعد غیر مسلم حاضرین نے فوراً پاکستان، ایران، عراق اور دوسرے ملکوں کی مثالیں دے کر کہنا شروع کیا کہ وہاں ایسا اور ایسا ہو رہا ہے تو کیا اسلام کا ریاستی نظام یہی ہے۔ پھر جب منفی ذہن پیدا ہوا تو اس کے بعد دوسرے غیر متعلق اعتراضات بھی شروع ہو گئے جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کو آخرت کے انداز میں پیش کیا جائے نہ کہ سیاست اور حکومت کے انداز میں، جیسا کہ وہ فی الواقع ہے۔

آدمی ہمیشہ نظریہ کی تصدیق (Verification) چاہتا ہے۔ جب آپ اسلام کا تعارف سیاسی نظام کے انداز میں کرائیں تو قدرتی طور پر وہ اس کی تصدیق کے لیے موجودہ مسلم ملکوں کو دیکھتا ہے۔ اور جب ان ملکوں میں وہ کوئی بہتر نظام نہیں پاتا تو وہ اس کی صداقت کے بارہ میں شک میں پڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب آپ اسلام کا تعارف فطرت کے انداز میں کرائیں تو آدمی اس کی تصدیق کے لیے انسانی فطرت کو دیکھتا ہے اور یہاں وہ فوراً اس کی تصدیق پا لیتا ہے۔ کیوں کہ انسانی فطرت کا خالق خدا ہے اور اس نے اس کو سراسر حق کی بنیاد پر بنایا ہے۔ فطرت کے انداز میں پیش کیا ہوا اسلام خود آدمی کے اپنے دل کی سطح پر بلاتاخیر اپنی تصدیق پا رہا ہے۔ جب کہ

سیاسی نظام کے انداز میں پیش کیا ہوا اسلام کہیں بھی اپنی تصدیق نہیں پاتا۔

مسلم شرکار اور دوسرے مذاہب کے شرکار نے بطور خود بھی کچھ اجتماعات کیے۔ مثلاً مسلمانوں نے عام شرکار کو دعوت دی کہ وہ مسجد میں آئیں اور اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے مطابق ۱۹ نومبر کو "مسجد" میں ایک اجتماع ہوا۔ بعض مسلمانوں نے ابتداءً مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوئے۔ مگر محسوس ہوا کہ اس طرح کے اجتماع کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پیشگی طور پر ذہن بنایا جا چکا ہو۔ مثلاً یہاں اجتماع ہوا تو مسلمانوں نے آپس کے اختلافی مسائل پر بحث شروع کر دی۔ اس کا اثر اچھا نہیں پڑا اور کئی غیر مسلم شرکار درمیان میں اٹھ کر چلے گئے۔ آپس کے اختلاف پر گفتگو کا مقام آپس کی ملاقاتیں ہیں نہ کہ مشترک اجتماعات۔

ایک بات یہودی نمائندوں کے سلسلہ میں ہے۔ اکثر بنیادی مسائل میں مسلم نقطۂ نظر اور یہودی نقطۂ نظر تقریباً ایک رہتا تھا (مثلاً یہ کہ اخلاق اصولی طور پر ایک خدائی حکم ہے) اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام تحریف کے باوجود آج بھی بائبل اور قرآن میں بہت سے امور میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہودی ہی وہ قوم ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ مذہب جب قوم بن جائے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد قوم برتر حیثیت حاصل کر لیتی ہے اور مذہب اس کا تابع بن کر رہ جاتا ہے۔

عیسائی پادری (Paulos Mar Gregorios) نے ۱۹ نومبر کو (Christian heritage) عیسائی ورثہ پر تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ "اسمبلی" کے نمائندے ان کے استقبال کے لیے آدھ گھنٹہ تاخیر سے ایرپورٹ پہونچے۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں نے ایرپورٹ پر کسی کو نہیں دیکھا تو میں پبلک ٹیلیفون پر گیا کہ اسمبلی کے ذمہ داروں سے ربط قائم کروں اور اپنا بیگ اور سامان باہر چھوڑ دیا۔ ٹیلی فون کر کے واپس آیا تو میں اپنا سامان کھو چکا تھا۔ اس بیگ میں موصوف کی تیار شدہ تقریر بھی شامل تھی۔ یہ بات انھوں نے عام اجتماع میں اپنی تقریر کے آغاز میں کہی۔

یہ واقعہ نیویارک ہوائی اڈہ پر ہوا۔ اسی طرح اور واقعات معلوم ہوئے جس سے اندازہ ہوا کہ امریکہ اب اخلاقی تنزل کی طرف جانا شروع ہو گیا ہے۔ ایک انجینیر پندرہ سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۰ میں جو مکان ۲۰ ہزار ڈالر میں بہ آسانی مل جاتا تھا۔ اس کو حاصل

کرنے کے لیے اب ڈیڑھ لاکھ ڈالر دینا پڑتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پچھلے دس برسوں میں بہت تیزی سے امریکہ میں افراطِ زر (Inflation) ہوا ہے۔ ہر چیز کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ مگر اسی نسبت سے لوگوں کی آمدنیاں نہیں بڑھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ شروع میں جب میں امریکہ آیا تو ہر طرف خوش حالی نظر آتی تھی۔ اب وہ خوش حالی نظر نہیں آتی۔ اس مہنگائی سے اخلاقی تنزلی آنا شروع ہو گیا ہے۔ چوری، رشوت، مکان کی پگڑی، اس طرح کی چیزیں پہلے عام امریکی زندگی میں مطلق نہیں تھیں۔ مگر اب اس طرح کی مثالیں (اگرچہ بہت کم) سامنے آنا شروع ہو گئی ہیں۔

امریکہ میں افراطِ زر (مہنگائی) ویٹ نام کی جنگ کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ کے خلائی پروگرام (خلائی ہتھیاروں کے تجربات) نے اس کو بہت بڑھا دیا۔ خلائی پروگرام بے پناہ مہنگے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ بھی اپنی ساری دولت کے باوجود ان کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس کی قیمت اس کو بڑھتی ہوئی مہنگائی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ خلائی پروگرام کی مہنگائی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ ایک اسپیس اسٹیشن بنا رہا ہے جو ۱۹۹۰ میں مکمل ہوگا۔ اس خلائی اسٹیشن پر امریکی حکومت کو گیارہ بلین ڈالر خرچ کرنے ہوں گے۔ یہ اسٹیشن زمین سے ۲۳ ہزار میل اوپر قائم ہوگا۔ اسٹار وارس پروگرام میں صرف ریسرچ پر ۲۶ بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔

ایک یہودی نوجوان (Shlomo Biderman) اسرائیل سے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہودی مذہب میں سب سے زیادہ زور توحید پر ہے اور سب سے زیادہ غلط چیز بت پرستی ہے۔ حتیٰ کہ یہودی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ جو شخص بُت پرستی کے خلاف ہو وہ یہودی ہے:

One who is against idolatory is a Jew

یہ بات صحیح ہے کہ یہودی قوم میں پتھر کے بتوں کو پوجنے کا رواج نہیں۔ مگر یہود نے یہودی نسل کو جو مقام دیا ہے وہ خود ایک قسم کی بُت پرستی ہے۔ وہ پتھر کے بت نہ پوجنے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر عین اسی وقت وہ قوم کے بُت کو پوج رہے ہیں۔ یہی تضاد مختلف شکلوں میں خود مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بتوں اور قبروں کو نہ پوجنے والے بھی غیر اللہ کے پرستار ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو اس واقعہ کی خبر نہیں۔

مسٹر ایرک (Erik Hoogearspel) نیدرلینڈ سے آئے تھے۔ وہ عیسائی خاندان میں پیدا

ہوئے ۔ اس کے بعد ذاتی مطالعہ سے بدھسٹ ہوگیے ۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بدھ لوگ خدا کو نہیں مانتے کیا آپ بھی خدا کو نہیں مانتے ۔ انھوں نے کہا ہاں ۔ میں خدا کو نہیں مانتا ۔ میں نے کہا کیوں ۔ انھوں نے کہا اس لیے کہ خدا کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ میں نے کہا کہ اگر خدا کے وجود کا عقلی ثبوت نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقۃً بھی خدا کا وجود نہیں ۔ اس کی وجہ ہماری کمیاں (Limitations) ہیں ۔ ہم اپنی کمیوں کی وجہ سے کسی بھی چیز کو عقلی طور پر ثابت نہیں کر سکتے ۔ پھر جس طرح دوسری چیزیں قرینہ کی بنیاد پر مانی جاتی ہے اسی طرح خدا کو بھی قرائن کی بنیاد پر ماننے میں کیا رکاوٹ ہے ۔

جب میں نے دیکھا کہ منطقی دلیل سے وہ قائل نہیں ہو رہے ہیں تو میں نے کہا کہ میں اپنے بارہ میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا میری ذاتی دریافت ہے ۔ میں اپنی دریافت (Realization) کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے خدا کے بارہ میں کوئی شک نہیں ۔ جب میں نے اس طرح یقین کی زبان میں کہا تو میں نے دیکھا کہ وہ نرم ہوگیے ۔ اس کے بعد ان کا زور کلام ٹھنڈا پڑ گیا ۔ شاید بیشتر انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ استدلال سے زیادہ یقین سے متاثر ہوتے ہیں ۔

نیوجرسی اور نیویارک میں کافی مسلمان آباد ہیں ۔ ان میں سے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی انھوں نے زور دیا کہ آپ کانفرنس سے فراغت کے بعد مزید کم از کم ایک مہینہ ہمارے پاس ٹھہریے یہاں ہم مختلف مقامات پر لوگوں کو جمع کریں گے جن کے سامنے آپ اپنا دینی پیغام رکھ سکیں ۔ مگر میرے لیے ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے ان لوگوں سے معذرت کر دی ۔ تاہم جناب مرزا فرید بیگ صاحب (نیوکلیر انجینیر) کے اصرار پر مجھے ایک دن مزید ٹھہرنا پڑا ۔ مرزا فرید بیگ نہایت صالح اور ذہین نوجوان ہیں ۔ دینی امور کے سختی سے پابند ہیں ۔ چہرے پر نمایاں داڑھی بھی موجود ہے ۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۵ کی شام کو ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور مرزا فرید بیگ صاحب کے ساتھ لینڈنگ (نیوجرسی) کے لیے روانہ ہوئے ۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم فرید بیگ صاحب کے مکان پر پہونچے ۔ میں نے دیکھا کہ جیسے ہی گاڑی گیرج کے سامنے پہونچی گیرج کا دروازہ اوپر اٹھنا شروع ہوگیا ۔ یہاں تک کہ پورا دروازہ اٹھ گیا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی ۔ دروازہ کا یہ کھلنا ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ ہوا ۔ یہ دروازہ شٹر کی مانند بنایا جاتا ہے تاکہ وہ لپیٹا جا سکے ۔

دروازہ سے ملا ہوا ایک خاص طرح کا موٹر ہوتا ہے۔ یہ موٹر وائرلیس لہروں کے ذریعہ کنٹرول ہوتا ہے مرزا فرید بیگ کے ہاتھ میں سگریٹ لائٹر کی مانند ایک چیز تھی۔ انھوں نے اس کو میرے ہاتھ میں دیا۔ اس سے کوئی تار وغیرہ وابستہ نہ تھا۔ میں نے اس کا بٹن دبایا تو دروازہ اپنے آپ شٹر کی مانند اوپر اٹھنا شروع ہو گیا یہاں تک کہ پورا دروازہ اوپر چلا گیا۔ پھر میں نے دوبارہ بٹن دبایا تو دروازہ نیچے آنے لگا۔ یہاں کہ وہ پوری طرح بند ہو گیا۔

اس کو آج کل کی زبان میں ریموٹ کنٹرول سسٹم کہتے ہیں اور اس قسم کا ریموٹ کنٹرول امریکی زندگی میں عام ہو چکا ہے۔ آپ اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مشینی ڈبہ لے کر اس کے ذریعہ سے ٹیلی وژن کھول اور بند کر سکتے ہیں۔ ٹیلی فون کو ہاتھ سے چھوئے بغیر ربط قائم کر سکتے ہیں۔ گھر کی روشنی کو دور سے جلا یا بجھا سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

۲۰ نومبر کو ہوٹل چھوڑتے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کانفرنس کے ذمہ داروں نے ہمارے ہر قسم کے خرچ کی ذمہ داری لی تھی۔ مگر ٹیلی فون کے خرچ کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر تھی۔ ہم کو ہوٹل سے دہلی میں اور خود امریکہ میں کچھ ٹیلی فون کرنے پڑے۔ روانگی کے وقت جب ہوٹل کے دفتر سے حساب مانگا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کا حساب ادا شدہ ہے۔ ان سے بار بار کہا گیا کہ ہم نے تو ادا نہیں کیا پھر وہ کیسے ادا ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، ہمارا کمپیوٹر یہی بتاتا ہے کہ آپ کا حساب ادا ہو گیا ہے۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے کمپیوٹر کا بٹن دبایا اور ایک کاغذ چھپ کر سامنے آ گیا جس میں ہمارے نام کے ساتھ تقریباً چودہ ڈالر کا بل تھا اور وہ پورا ادا شدہ تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم نے یہ رقم ادا نہیں کی ہے اس لیے آپ کمپیوٹر کے اس حساب کے باوجود ہم سے یہ رقم لے لیجیے مگر وہ لینے پر راضی نہیں ہوئے۔ ایسا کیوں کر ہوا، یہ ایک معمہ تھا جس کا کوئی جواب نہ ہمارے پاس تھا اور نہ ہوٹل والوں کے پاس۔ کمپیوٹر کا یہ کاغذ ہمارے پاس موجود ہے۔

مرزا فرید بیگ صاحب کے ساتھ ایک دن گزار کر ہم ۲۱ نومبر ۱۹۸۵ کی شام کو ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بوٹن (Boonton) کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد بہت خوبصورت اور دو منزلہ ہے۔ ایرپورٹ پہونچے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہمارے پاس کتابوں کا ایک بنڈل تھا۔ اس کو پلاسٹک کی رسی سے باندھا گیا تھا۔ ہم کینڈی ایرپورٹ

میں داخل ہوئے تو چیکنگ کے ذمہ داروں نے اس کو کاٹنے کے لیے قینچی نکالی۔ میں بہت گھبرایا کہ اگر انھوں نے رسی کاٹ ڈالی تو یہاں ایرپورٹ پر دوسری رسی باندھنے کے لیے کہاں ملے گی۔ ہم نے ان کو منع کیا مگر وہ نہیں مانے۔ انھوں نے کہا، آپ گھبرائیے نہیں۔ ہم اس کو کاٹنے کے بعد دوبارہ ٹیپ کر دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے رسی کاٹ کر پھینک دی اور اس کو دیکھنے کے بعد دوبارہ اوپر سے کافی مقدار میں ٹیپ لگا کر پہلے سے زیادہ بہتر پیک کر دیا۔

مجھے یاد آیا کہ اسی قسم کا واقعہ یکم مارچ ۱۹۸۴ کو میرے ساتھ ایک مسلم ملک کے ایرپورٹ پر پیش آیا تھا۔ وہاں بھی ہمارے پاس کتابوں کا ایک بڑا پیکٹ تھا۔ چیکنگ کے عملہ نے اس کی رسیاں کاٹنے کے لیے قینچی نکالی۔ ہم نے بہت کہا کہ اس میں صرف دینی کتابیں ہیں اور کچھ نہیں۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ آپ نے رسیاں کاٹ دیں تو اس کو دوبارہ باندھنا ہمارے لیے سخت مشکل ہوگا۔ مگر انھوں نے کچھ نہیں سنا اور ساری رسیاں کاٹ ڈالیں۔ اس کے بعد انھوں نے نہ پیکٹ میں دوبارہ ٹیپ لگایا اور نہ کسی دوسرے طریقے سے ہماری مدد کی۔ بڑی مشکل سے ہم نے رسیوں کو جوڑ جوڑ کر پیکٹ کو دوبارہ باندھا۔ کتنا فرق ہے ایک قوم اور دوسری قوم میں۔

امریکہ میں ہندستان اور پاکستان جیسے ملکوں کے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہاں کی شہریت بھی لے لی ہے۔ تاہم ان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو یہاں کے سماج میں پوری طرح ضم ہو گئے ہوں۔

یہ لوگ بڑے عجیب عجیب مسائل سے دوچار ہیں۔ مثلاً اپنے ملکوں میں وہ عادی ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے بچوں کی نگرانی کریں۔ حتی کہ وہ انھیں تنبیہ کر سکیں۔ مگر یہاں وہ اس سلسلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ یہاں کا ایک باپ اپنے بچے کو تنبیہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ تنبیہ کرے تو بچے کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے باپ کے خلاف پولیس کو بلا سکے۔ یہاں پولیس کا ایک خاص دستہ مقرر ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ بچوں کو ستائے جانے سے بچائے۔ اس کو یہاں کی زبان میں "چائلڈ ابیوز" کہتے ہیں۔ اس کا ایک مخصوص ٹیلی فون نمبر ہے۔ کوئی بچہ اس نمبر پر رنگ کر کے فوراً اس کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتا ہے۔ ایسے واقعات معلوم ہوئے کہ باپ نے بگڑ کر بچے کو مارنا چاہا تو بچے نے فوراً کہا:

Don't touch me. I will call Child Abuse.

یعنی مجھ کو چھوتا مت ورنہ میں بچوں کی پولیس کو ٹیلی فون کر دوں گا ۔

اس سفر میں آمد و رفت کو ملا کر دس دن گزرے ۔ میرا یہ سفر گویا ساری دنیا کی طرف سفر تھا۔ اس سفر میں میں نے تقریباً دنیا کی ہر قوم کو دیکھا اور تقریباً ہر عقیدہ کے لوگوں کا تجربہ کیا۔ میرا آخری تاثر یہ تھا موجودہ دنیا میں ہر چیز ہے مگر وہی ایک چیز نہیں جس کو انسانی فطرت سب سے زیادہ چاہتی ہے یع خدا کا سچا مذہب۔ مذہب کے جو اڈیشن مذہب کے نمائندوں کے پاس ہیں اور جس کو وہ لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ سب کے سب بگڑے ہوئے مذہب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی فطر سے مطابقت نہیں کر پاتے ۔

انسان ایک خدا چاہتا ہے اور مشرکانہ مذاہب اس کو کئی خداؤں کی عبادت کی طرف بلا رہے ہیں۔ انسان سادہ مذہب چاہتا ہے اور عیسائیت اس کو فلسفیانہ موشگافیوں والا مذہب دے رہی ہے۔ انسان اصولی مذہب چاہتا ہے اور یہودیت کے پاس انسان کو دینے کے لیے صرف نسلی مذہب ہے۔ انسان ایک برتر خدا کی تلاش میں ہے اور ہندوازم اس کو یقین دلا رہا ہے کہ تم خود اپنی ذات میں خدا ہو۔ انسان روحانی سطح پر خدا کو پانا چاہتا ہے اور مادی مذاہب اس کو سیاست اور حکومت کی سطح پر مذہب کا نسخہ پیش کر رہے ہیں ۔

یہاں مسلمان جدید انسان کو رہنمائی دے سکتے تھے ۔ کیوں کہ ان کے پاس سچا خدائی مذہب با محفوظ حالت میں موجود ہے ۔ مگر یہاں بھی یہ مشکل ہے کہ اصل اسلام تو صرف کتاب میں ہے ۔ ا مسلمان عملاً جس مذہب کو لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ ان کی اپنی تعبیرات ہیں جو انھوں اصل خدائی دین میں تصرف کر کے بنائی ہیں۔ اصل اسلام تو بلاشبہ انسانی فطرت کے عین مطابق مگر جس تعبیری اسلام کی مسلمان آج نمائندگی کر رہے ہیں وہ انسانی فطرت کے مطابق نہیں ۔ لیے خود اسلام اور انسانی فطرت کے درمیان بھی عملاً وہی عدم مطابقت پیدا ہو گئی ہے۔ جو دوسرے مذاہب اور انسانی فطرت کے درمیان پائی جاتی ہے ۔

آج سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کے حقیقی روپ میں انسا سامنے پیش کر دیا جائے ۔ اس کے بعد ساری انسانیت خدا کی رحمتوں کے سایہ میں آجائے گی

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

۱۶ نومبر ۱۹۸۵ کو سورج نہیں دکھائی دیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کمرہ کے ایک طرف لگے ہوئے شیشے سے
ر دیکھا تو ہر چیز سفید ہو رہی تھی۔ سڑکوں اور پارکوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے حد سفید قسم کے روئی کے
ہوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر سے گر رہے ہیں اور سڑکوں اور پارکوں پر ان کا صاف و شفاف فرش بچھا ہوا ہے
ختیں بھی ان سے ڈھکے ہوئے نظر آتے تھے۔ معلوم ہوا کہ برف گر رہی ہے۔ تاہم یہ وہ برف نہ تھی جس کے لیے ہمارے
اں برف یا اولہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ اسنو (Snow) تھی۔ چوں کہ ہندستان جیسے ملکوں میں اسنو نہیں گرتی
ں لیے اردو زبان میں اس کے لیے کوئی لفظ بھی موجود نہیں۔ اس قسم کی اسنو میں نے پہلی بار روم میں اکتوبر
۱۹۷ میں دیکھی تھی اور دوسری بار ۱۶ نومبر ۱۹۸۵ کو نیو جرسی میں دیکھی۔

یہ اسنو سرد ملکوں کے لیے ایک عجیب نعمت ہے۔ یہاں کے کسان اسنو کے موسم سے کچھ پہلے زمین میں
ج بو دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا انکھوا نکل آتا ہے۔ انکھوا نکلنے کے بعد جب اسنو گرتی ہے تو ان کے اوپر
ں کی تہ جم جاتی ہے۔ اسنو چوں کہ روئی کی طرح بالکل نرم ہوتی ہے اس لیے وہ انکھوا کو نقصان نہیں پہونچاتی
ں کے بعد اسنو دھیرے دھیرے پگھلنا شروع ہوتی ہے اور فصل کو آہستہ آہستہ پانی پہونچاتی ہے۔ یہ ایک
ب قسم کی قدرتی آبپاشی ہے جو سرد ملکوں کے کسانوں کے لیے من و سلویٰ کی نعمت سے کم نہیں۔

ایک ہندستانی بزرگ امریکہ گئے۔ وہاں ایک روز انھوں نے ایک امریکی سے پوچھا: کیا آپ کے
ہاں ملاوٹ کا دودھ (Adulterated Milk) بھی ملتا ہے۔ یہ سن کر امریکی کچھ دیر چپ رہا۔ وہ سوچ
ہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولا: ہاں، ہمارے یہاں بعض اسٹور ملاوٹ کا دودھ بھی تیار
ستے ہیں۔ وہ قدرتی دودھ میں بعض وٹامن کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ اس کی غذائیت کو بڑھا سکیں۔

مذکورہ عمل کو انگریزی میں (Adulteration) نہیں کہا جاتا۔ اس کو (Enrichment) کہتے
یں۔ مگر امریکی ذہن چوں کہ اس تصور سے خالی تھا کہ دودھ میں پانی ملا دیا جائے اس لیے اس نے اڈلٹریشن
ے لفظ کو (Enrichment) کے معنی میں لیا۔ کتنا فرق ہے ہندستان کے تاجر اور امریکہ کے تاجر میں۔

ڈاکٹر خورشید احمد صاحب سے ۱۷ نومبر کو تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو اپنے مشن
ا تسلسل جاری رکھنے کے لیے افراد تیار کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے
یرت سے متعلق ایک بات کہی جو انھیں کے اپنے الفاظ میں یہ تھی:

" حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کارنامہ عظیم ہے۔ لیکن ایک پہلو جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے

وہ یہ ہے کہ آپ نے صرف دورِ رسالت مآب ہی نہ دیا، جو ایک معیاری اور مثالی دور ہے۔ بلکہ ایسے انسان تیار کیے کہ خلافتِ راشدہ کا ادارہ وجود میں آیا جس کے بارہ میں خود آپ ہی نے فرمایا کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین۔ اس طرح آپ نے ایک تاریخی عمل کا آغاز کیا جس نے مسلم تاریخ میں تسلسل (Continuity) قائم کیا۔ اور آپ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک ایسا گروہ چھوڑا جس کے ذریعہ اسلام کی دولت اور حضور کی سنّت دنیا کے گوشے گوشے تک پہونچ سکی"

ترکی کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ استانبول یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ میں نے کہا بعض لوگ کہتے ہیں کہ کمال اتاترک ایک یہودی تھا۔ انھوں نے کہا کہ نسلی اعتبار سے تو یہ بات صحیح نہیں۔ مگر وہ ہمارے لیے عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی زیادہ برا تھا۔ اس نے ترک قوم کو ذبح کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیسے ذبح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس نے ہمارا رشتہ ہماری تاریخ سے کاٹ دیا۔ اور کسی قوم کے لیے اس سے بڑا کوئی ذبیحہ نہیں۔

ایک مغربی ملک کے ایک پروفیسر نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو بہت سی مشکلات ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر کون سی قوم ہے جس کو مشکلات درپیش نہیں۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو بعض مشکلات درپیش ہیں۔ مگر مشکل زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ آپ کسی حال میں اس سے بچ نہیں سکتے۔ صرف صورت کا فرق ہے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان کو دیکھئے، ایران اور عراق کو دیکھئے۔ سعودی عرب لیبیا کو دیکھئے۔ سب کے درمیان مشکلات و مسائل ہیں۔ حالاں کہ یہ سب اسلامی ملک ہیں۔ مشکلات مسائل کا تعلق مسلم اور غیر مسلم سے نہیں۔ جہاں صرف مسلمان ہی مسلمان ہوں وہاں مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ مسائل اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک موجودہ دنیا کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، آپ صحیح کہتے ہیں:

We have to learn to live with problems
instead of protesting against them.

ایک سردار جی کناڈا سے آئے تھے۔ وہ تقریباً ۲۰ سال سے کناڈا میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے قرآن کے کئی ترجمے دیکھے مگر کسی سے تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ صرف ترجمہ پڑھنا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ کمنٹری بھی۔ انھوں نے کہا کہ کمنٹری ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ وہ چوں کہ اردو زبان بھی

جانتے تھے، ان کو تذکیر القرآن (جلد اول) پیش کی گئی وہ بہت خوش ہوئے۔

ایک صاحب جو اپنے سفید فام حلیہ سے کسی مغربی ملک کے باشندہ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے ملاقات کے وقت کہا :

What is your tradition?

اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ آپ کی روایت کیا ہے۔ مگر اردو استعمال کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں دین اور مذہب کے بارہ میں تصور یہ ہے کہ وہ ایک معاشرتی رواج ہے۔ اس کا ماخذ انسانی سماج ہے نہ کہ خدائی الہام۔ اسی کے مطابق تمام اصطلاحات بنی ہیں۔ اب مذہب کے بارے میں اس طرح کے الفاظ بولے جاتے ہیں :

Islamic heritage, Islamic tradition (اسلامی روایت، اسلامی ورثہ) اس طرح جدید انسان مذہب کو مان کر بھی مذہب کی نفی کر رہا ہے۔ مذہب اسی وقت مذہب ہے جب کہ وہ ایک خدائی حکم ہو۔ مذہب کو اگر سماجی ورثہ یا معاشرتی رواج قرار دیدیا جائے تو اس کی ساری اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو نیویارک کی ایک بڑی فرم میں نیوکلیر انجینیر ہیں۔ ان کو انگریزی الرسالہ دیا گیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ کا الرسالہ مجھ کو پسند آیا۔ مگر یہ بتائیے کہ آپ نے لکھنے کی یہ ٹکنک کہاں سیکھی۔ میں نے پوچھا کہ کون سی ٹکنک۔ انھوں نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے اور ایک ایک صفحہ کے مضامین کی ٹکنک۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ اپنی فیلڈ میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی ڈاکومنٹ تیار کریں تو ہمیشہ کم سے کم الفاظ میں لکھیں تاکہ ہمارے اوپر کے لوگ کم سے کم وقت میں اس کو پڑھ سکیں۔

میں نے کہا کہ مجھ کو یہ ٹکنک میرے دعوتی درد نے سکھائی۔ میں اس بات کی تڑپ رکھتا ہوں کہ آج کے انسان تک حق کا پیغام پہونچاؤں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ آج کا انسان اتنا مصروف ہے کہ وہ لمبا مضمون پڑھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے میں چھوٹے چھوٹے مضامین میں اپنی بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ آج کا انسان ان کو پڑھ سکے۔ اگر میں لمبے لمبے مضامین لکھوں تو آج کا انسان ان کو دیکھ کر رکھ دے گا اور میرا لکھنا بیکار ہو گا۔

امریکہ میں ایک طرف مادہ پرستی اپنے شباب پر ہے۔ دوسری طرف یہاں روحانیت کے مبلغین کی بھی کمی نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر ملاقات آرٹورو شمٹ (Artoro Schmidt) کی تھی۔

وہ ایک امریکی مبلغ ہیں۔ امریکہ میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے :

International Temperance Association

یہ ادارہ شراب نوشی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے خلاف ہے۔ موصوف اس سلسلہ میں بہت سے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ ہندستان بھی جا چکے ہیں ان سے بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔

آخر میں میں نے کہا کہ آپ لوگ شراب نوشی کے خلاف جو مہم چلا رہے ہیں اس کا محرک مذہب ہے یا طبی تحقیقات۔ انھوں نے کہا کہ دونوں۔ میں نے کہا کہ بائبل میں تو شراب کو جائز کرنے والی آیتیں موجود ہیں۔ پھر آپ بائبل کے حوالے سے کس طرح اس کے عدم جواز کو ثابت کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ بائبل کے موجودہ انگریزی ترجمہ کی بابت آپ کا کہنا صحیح ہے۔ مگر قدیم عبرانی بائبل سے شراب کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ قدیم عبرانی نسخہ میں اس سلسلہ میں دو الفاظ آتے ہیں۔

زازن (Yayin) یہ لفظ قدیم عبرانی میں انگور کا رس مع الکوہل کے لیے بولا جاتا ہے۔ دوسرا لفظ شکار (Shekar) ہے۔ یعنی انگور کا وہ تازہ رس جو بغیر الکوہل کے ہو بائبل کے موجودہ انگریزی ترجمہ میں یہ غلطی کی گئی ہے کہ مذکورہ دونوں لفظوں کے لیے ایک ہی لفظ (Wine) استعمال کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اصل عبرانی میں دو لفظ تھا۔ قدیم عبرانی متن کے مطابق انگور کا سادہ رس جائز ہے اور انگور کا وہ رس جو خمیر کے بعد نشہ آور ہو جائے، جائز نہیں۔

یہ لوگ بہت دلچسپ انداز میں شراب کے خلاف پرچار کرتے ہیں۔ مثلاً ایک لکچر میں انھوں نے شراب نوشی کے خلاف دلائل دیے۔ آخر میں انھوں نے حاضرین کے سامنے دو برتن رکھے۔ ایک برتن میں پانی تھا اور دوسرے برتن میں شراب، اس کے بعد حسب پروگرام ایک گدھا لکچر ہال کے اندر داخل کیا گیا۔ اب لکچرر نے اپنے سامعین سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ گدھا دونوں میں سے کس برتن سے پیئے گا۔ سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے کہا۔ "پانی کے برتن سے" لکچرر نے کہا بہت اچھا جناب۔ اب آپ یہ بتائیں گے کہ کیوں ایسا ہے کہ وہ شراب کے مقابلہ میں پانی کو ترجیح دیتا ہے۔ آدمی نے جواب دیا ــــ کیوں کہ وہ ایک گدھا ہے :

Because he's an ass.

یہاں دنیا بھر کے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور تب دل نے خیال ہوا پروفیسر ہوسٹن اسمتھ

(Prof. Huston Smith) سے بھی ملاقات ہوئی وہ ۱۹۸۵ میں ہمارے مرکز (نئی دہلی) میں آئے تھے۔ وہ موجودہ کانفرنس کی پلاننگ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔

امریکہ کے بارے میں کچھ مزید باتیں حسب ذیل ہیں :

ایک امریکی ایجنسی نے ۱۹۸۴ کے آغاز میں ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ یہ رپورٹ ہندستانی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۶ فروری ۱۹۸۴) میں بھی حسب ذیل عنوان کے ساتھ شائع ہوئی تھی :

Indians in US best educated minority

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں رہنے والے ہندستانی وہاں کی سب سے بہتر تعلیم یافتہ جماعت ہیں۔ اور اس بنا پر وہ امریکہ کے سب سے زیادہ خوش حال گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امریکہ میں تقریباً نصف ملین ہندستانی بستے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہندستانی امریکی (Indian Americans) کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر خود امریکی لوگ انھیں ایشیائی امریکی (Asian Americans) کہتے ہیں۔

یہ ہندستانی امریکی اکثر اعلیٰ لیاقت کے لوگ ہیں۔ وہ ڈاکٹر، پروفیسر، وکیل، انجینیر، اکاؤنٹنٹ اور سائنٹسٹ ہیں۔ بعض نے یہاں اپنا ذاتی بزنس شروع کر رکھا ہے۔ ان میں ایک تعداد وہ ہے جو کروڑ پتی ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جن کے پاس اپنا ذاتی ہوائی جہاز ہے :

Some even own aircraft for their private use.

رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ہندستانی امریکیوں کی اوسط خاندانی آمدنی ۲۴۹۹۳ ڈالر سالانہ ہے۔ جب کہ خود امریکیوں کی اوسط خاندانی آمدنی ۱۹۹۱۷ ڈالر سالانہ ہے :

The median family income of the Indian American community is $ 24.993 per year while the average for the all U.S. median family income is only $ 19.917.

امریکہ کی اصل آبادی میں برتر لیاقت کے لوگ بھی ہیں اور کم تر لیاقت کے لوگ بھی۔ مگر ہندستان سے جو لوگ امریکہ جاتے ہیں وہ سب منتخب لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی برتر قابلیت کے بل پر وہاں جانے کا حوصلہ کرتے ہیں اور اسی بنا پر وہاں کے مقابلوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ہندستان جیسے ملک کی اقلیتوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے۔ یہاں اکثریتی فرقے کے لوگوں کو

سفارش اور جانب داری کے تحت بھی جگہیں مل جاتی ہیں اس لیے اکثریتی فرقہ سے ہر قسم کے لوگ دفتروں اور اداروں میں بھر رہے ہیں۔ اس کے برعکس جب کوئی مسلمان لیا جاتا ہے تو وہ اپنی ممتاز لیاقت کی بنا پر لیا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا قدرتی انتخاب ہے۔ اس طرح اقلیت کے ٹاپ کے لوگ اوپر آتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا جب کہ اکثریت کی نمائندگی اس کے مخلوط افراد کر رہے ہوں گے اور اقلیت کی نمائندگی اس کے ٹاپ کے افراد۔

عام شہرت کے مطابق امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش حال ملک ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی خوشحالی حقیقی سے زیادہ مصنوعی ہے۔ امریکہ کی خوشحالی کا راز قرض ہے۔ امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ سود دیتا ہے۔ چنانچہ دنیا بھر میں لوگ امریکہ کے بنکوں اور تجارتی اداروں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۵ کے آخر میں امریکہ کے اوپر بیرونی قرضوں کی مقدار تقریباً پانچ سو بلین ڈالر ہے اس قرض میں امریکہ کو ہر سال تقریباً پچاس بلین سود ادا کرنا ہوتا ہے۔

زیادہ شرح سود کا براہ راست فائدہ امریکہ کو یہ ملا کہ اس کی کرنسی (ڈالر) کی اہمیت بڑھ گئی۔ آج کرنسی کی دنیا میں ڈالر کو "شہنشاہ" کا مقام حاصل ہے۔ آپ ہندستانی سکے لے کر باہر کی دنیا میں جائیں اس کی حیثیت وہی ہوگی جو شیخ سعدی نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے:

امیرزادۂ ناداں بہ شہر روا ماند   کہ در دیارِ غریبش بہ ہیچ نستانند

لیکن اگر آپ کے پاس ڈالر ہے تو دنیا کے ہر حصہ میں خالص سونے کی مانند آپ اس کی قیمت پا سکتے ہیں

اس سودی معاشیات کا سب سے بڑا نقصان ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی تجارت ہے۔ امریکہ کو جو ہر سال پچاس بلین ڈالر سود ادا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی جمع شدہ رقم کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش تجارت میں لگائے۔ موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ نفع بخش تجارت جنگی ہتھیار ہے۔ چنانچہ امریکہ بالقصد ساری دنیا میں جنگ کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے تاکہ اس کی جنگی صنعت کے مستقل خریدار حاصل رہیں یہاں باقاعدہ ایسے جرائد شائع ہوتے ہیں جن میں ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کی تفصیل درج ہوتی ہیں۔ کہ آپ ہم سے فلاں ہتھیار خریدیں تو اس کے ذریعہ آپ اتنی زیادہ تباہی برپا کر سکتے ہیں۔ اسلحہ کی اس تجارت کی کم از کم جزئی ذمہ داری سودی معاشیات پر ہے۔ امریکہ اگر ہتھیاروں کی صنعت کو مسلسل نہ بڑھائے تو وہ اپنے اوپر بڑھتے ہوئے عالمی سود کو ادا کرنے کے قابل نہ رہے گا۔

امریکہ میں جرائم کے بارے میں ایک رپورٹ یہ ہے :

One in three families in the U.S. were victims of a crime and a U.S. citizen was murdered every half hour last year, according to a survey carried out by the U.S. department of justice In 1983, 36 million 900 thousand crimes were committed in the country, reports *Public-Pool* from Montreal.

امریکہ میں جدید ترقیاں اپنے کمال کو پہونچ رہی ہیں اس کے باوجود وہاں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جرائم کا مادی ترقیات سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ لوگ غلط طور پر یہ کہتے ہیں کہ جرائم غریبی کے ساتھ جنم لیتے ہیں۔ اگر تمام لوگ خوش حال ہو جائیں تو جرائم اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ مگر جدید دنیا کا تجربہ اس کے خلاف ثبوت پیش کرتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جرائم کا سبب انسان کی آزادی ہے۔ انسان چوں کہ موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے اس لیے وہ جہاں موقع پاتا ہے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے جس کا دوسرا نام جرم ہے۔

انسان کو جرم سے باز رکھنے کی ایک ہی صورت ہے اور یہ کہ اس کو ایسا نظریہ دیا جائے جو اس سے اس کی آزادیٔ عمل چھین لے۔ جو اس کو پابند زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔ جو اس سے کہے کہ تمہاری آزادی ناحق کو چھوڑنے اور حق کو اختیار کرنے کے لیے ہے نہ کہ من مانی کارروائی کرنے کے لیے ——— ایسا نظریہ خدا کے آگے جوابدہی (Accountability) کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

ایک ہندستانی ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد امریکہ گیا۔ وہاں اس نے کافی دولت کمائی۔ اس کی ہندستانی بیوی سے اس کے یہاں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۹ میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی لڑکیاں اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اپنی لڑکیوں کی خاطر اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ لڑکیاں یونیورسٹی میں پہونچیں تو حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اس کی بڑی لڑکی نے اپنی آزاد مرضی سے ایک امریکی لڑکے سے شادی کر لی۔ تاہم صرف تین ماہ بعد اس سے طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد لڑکی نے باپ کا گھر چھوڑ دیا۔ وہ باہر رہنے لگی۔ چھوٹی لڑکی نے بھی ایک امریکی لڑکے سے اپنی ذاتی پسند کے تحت شادی کر لی۔ مگر اس سے بھی ایک سال کے اندر علٰحدگی ہو گئی۔ یہ لڑکی بھی باپ سے الگ ہو کر باہر نیویارک میں رہنے لگی۔

باپ کو اس کا بے حد رنج تھا۔ اس نے بیوی بھی کھوئی اور آخر میں دونوں لڑکی بھی کھو دی۔ اس نے ایک روز اپنی ایک لڑکی سے کہا کہ تم جو کچھ کر رہی ہو وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لڑکی نے فوراً جواب دیا کہ

آپ یہاں لمبی مدت سے رہ رہے ہیں۔ آپ کو خود یہ بات جاننا چاہیے :

You have lived here long enough and you should understand.

ان تلخ تجربات کے بعد آدمی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے امریکہ میں اپنا بزنس فروخت کر دیا اور دہلی واپس آگیا۔ دہلی میں اس کے پاس بہت بڑا امکان ہے۔ اس کے پاس دو شوفر ہیں۔ چار مالی ہیں اور دوسرے بہت سے گھریلو ملازم ہیں۔ مگر وہ آدمی تنہا ہے۔ اس کے لیے دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ شراب پی کر اپنا غم بھلاتا رہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۰ اگست ۱۹۸۵ صفحہ ۸)

امریکی بزنس کس طرح چلتی ہے، اس کی ایک دلچسپ مثال کوکا کولا ہے۔ آج ۱۳۵ ملکوں میں ا... کے ۱۹۰ ملین بوتل روزانہ فروخت ہوتے ہیں۔ کوکا کولا کے اجزا ر ۱۸۸۶ میں پمبر... (John S. Pemberton) نے دریافت کیے تھے۔ اس وقت سے آج تک اس کا فارمولا ایک راز ... جس کو صرف کمپنی کے چند ڈائرکٹر جانتے ہیں۔ کوکا کولا کے کارخانے ساری دنیا میں ہیں۔ مگر اس کا اصل جز بھی صرف امریکہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کا راز باقی رہے۔ اس سے پہلے یہ راز صرف چند دماغوں میں ... ب وہ کاغذ پر لکھ کر بینک میں مقفل کر دیا گیا ہے۔ اس مقفل بکس کو صرف کمپنی کے ڈائرکٹر ہی کھول سکتے ... ہندستان میں کوکا کولا کے ۲۲ کارخانے تھے۔ وہ ہندستان کا سب سے زیادہ مقبول ... مشروب (Soft drink) تھا۔ ۱۹۷۷ میں جنتا حکومت نے چاہا کہ اس کو (Indianise) ... اس مقصد کے لیے کمپنی کو اپنا فارمولا ہندستانی حکومت کو بتانا پڑتا۔ کمپنی نے اپنا فارمولا راز میں ر... یہ قیمت ادا کی کہ یک لخت ہندستان میں اپنا بزنس ختم کر دیا۔ مگر اپنا فارمولا ہندستانی حکومت کو ... پر راضی نہیں ہوئی۔

امریکہ میں پروسس کی ہوئی شکر جتنی تیار ہوتی ہے اس کا دس فی صد صرف کوکا کولا کمپنی ... ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوکا کولا میں کافین (Caffeine) کا ایک جز ڈالا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حا... ہے۔ اس کی تلخی کو گھٹانے کے لیے اس میں سب سے زیادہ جو چیز ڈالی جاتی ہے وہ شکر ہے۔

۱۹۵۴ میں مراکو میں یہ افواہ اڑگئی کہ کوکا کولا میں خنزیر کے خون کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ ا... وہاں کافی شور ہوا اور مسلمانوں نے کوکا کولا پینا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کمپنی والوں نے سلطان ... صاحبزادے کو آمادہ کیا۔ انھوں نے مجمع عام میں لوگوں کے سامنے کوکا کولا پی کر اس کی تردید ...

طرح یہ فضا ختم ہوئی ۔

امریکی قانون کے مطابق کسی تیار شدہ خوراک کے اجزا رکا اعلان ضروری ہے ۔ چنانچہ ۱۹۰۹ میں کوکاکولا کمپنی کے خلاف حکومت نے مقدمہ قائم کیا اور چاہا کہ عدالتی طور پر اس کو مجبور کرے کہ وہ اس کے اجزا رکا اعلان کرے ۔ کمپنی نے مقدمہ کی پیروی کی یہاں تک کہ وہ جیت گئی ۔ اس کے وکیلوں نے یہ ثابت کیا کہ شناختی معیار (Standard of identity) کو باقی رکھنے کے لیے کوکاکولا کے فارمولا کا راز میں رہنا ضروری ہے ۔

خارجی دنیا میں اپنی حیثیت کو بڑھانے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے امریکہ جتنا خرچ کرتا ہے اتنا شاید ساری تاریخ میں کبھی کسی قوم نے نہیں کیا ۔ مگر امریکہ کی خارجہ پالیسی اس نسبت سے کامیاب پالیسی نہیں ۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا حوالہ دینا کافی ہوگا ۔

ترکی سوویت روس کی سرحد پر واقع ہے ۔ اس اعتبار سے امریکہ کے لیے اس کی بے حد اہمیت ہے ۔ چنانچہ امریکہ نے ترکی سے تعلقات بڑھائے اور یہاں اس نے اپنے ۲۰ سے زیادہ فوجی اڈے قائم کر لیے ۔ ان اڈوں کا خاص مقصد روس کی جنگی تیاریوں کی نگرانی کرنا تھا ۔ مگر ۱۹۷۴ میں ترکی اور یونان میں کشمکش پیدا ہوئی ۔ ترکی نے قبرص میں آباد ترک باشندوں کی حفاظت کے لیے قبرص میں اپنی فوجیں داخل کر دیں ۔ اس وقت ترکی کی امیدوں کے خلاف امریکہ نے یونان کا ساتھ دیا ۔ حتی کہ اس نازک وقت میں ترکی کو اسلحہ بھیجنے پر پابندی لگا دی جس کا راستہ اس سے پہلے اس کے لیے آزادانہ طور پر کھلا ہوا تھا (ریڈرز ڈائجسٹ مئی ۱۹۷۶)

اس نازک موقع پر امریکہ کا ساتھ چھوڑنا ترکی کے لیے بہت تلخ تجربہ تھا ۔ چنانچہ اس نے اپنے ملک میں امریکہ کے تمام فوجی اڈے بند کر دیے ۔ ۳۰ سالہ تعلق یک لخت ختم ہوگیا ۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ولیم گریفتھ (William E. Griffith) نے لکھا ہے کہ اگر روسی یہ سب کرنا چاہتے وہ بھی اس سے زیادہ کامیابی کی امید نہیں کر سکتے تھے ۔

If the Russians had set out to accomplish all this, they could not have hoped for more success.

تاہم یہ حادثہ خود ترکی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ۔ ترکی اب تک اپنا رشتہ مغربی دنیا سے جوڑ

تھا۔ اس تلخ تجربہ نے اس کی خوش گمانیوں کا غبارہ توڑ دیا۔ اس کے بعد اس کی توجہات مسلم دنیا کی طرف مُڑ گئیں۔ ترکی کے صدر نے اس کے بعد سے بے شمار مرتبہ عرب دنیا کے دورے کیے ہیں۔ عرب لوگ کثرت سے ترکی جانے لگے ہیں۔ عربوں کو ترکی میں ایسی رعایتیں دی گئی ہیں جو اس سے پہلے انھیں حاصل نہ تھیں۔ مثلاً ایک قانون میں تبدیلی کرکے اس کی گنجائش پیدا کی گئی کہ عرب ترک شہروں میں جائداد خرید سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسلم دنیا سے اس تعلق کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر ترکی میں اسلام اور اسلامی تحریک کو نئے مواقع مل گئے جو کمال اتاترک اور عصمت انونو نے ختم کر رکھے تھے۔ جدید ترکی میں دوبارہ اسلام زندہ ہو رہا ہے اور یہ نتیجہ ہے امریکہ کی اس سیاست کا جو اس نے ۱۹۷۴ میں قبرص کے معاملہ میں اختیار کی تھی۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۵ کو میں دہلی واپس پہونچا۔

اسلامیت کیا ہے

لوگ کلمہ کے الفاظ دہراتے ہیں مگر ان کے کلمہ میں عرفانِ حق کی گہرائی نہیں۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں مگر ان کی نمازوں میں خشوع نہیں اور ان کے روزوں میں خوفِ خدا کی تڑپ نہیں۔ لوگ اپنے مومن ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر ان کے ایمان نے ابھی تک انھیں خدا کا دیدار نہیں کرایا۔

لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں مگر ان کی دینداری احتسابِ خویش سے خالی ہے۔ ان کی دینداری نے انھیں نہیں بتایا کہ وہ اپنے آپ کو ٹٹولیں اور اپنے اندر جھانک کر دیکھیں کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں اجتماعی مواقع پر لوگ دین کے خادم بنے ہوئے ہیں مگر ان کی تنہائیوں نے ابھی تک ان کے خادمِ دین ہونے کی گواہی نہیں دی۔ لوگ معمول کے حالات میں خوش اخلاق نظر آتے ہیں مگر جب غیر معمولی حالات پیدا ہوں تو وہ ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ انھوں نے خوش اخلاقی کا نام بھی نہیں سُنا۔

لوگ اجتماعات میں تقریر کرکے سمجھتے ہیں کہ وہ دین کے داعی ہیں۔ حالاں کہ دین کا داعی وہ ہے جو رات کی تنہائیوں میں لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہو۔ داعی وہ ہے جو اپنے مدعو کے لیے اتنا شفیق ہو کہ اس کی اصلاح کی خاطر یک طرفہ طور پر اس سے اپنی تمام شکایتیں ختم کر دے۔

لوگ انسانوں کے نزدیک دین دار بنے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ دین دار وہ ہے جس نے خدا کے نزدیک دین دار ہونے کا ثبوت دیا ہو۔ لوگ بھیڑ کے سامنے اپنی اسلامیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں حالاں کہ اسلامیت صرف وہ معتبر ہے جس کو نہ دکھائی دینے والے فرشتوں نے دیکھا ہو اور آخرت میں کھلنے والے رجسٹر میں جس کا اندراج ہوا ہو۔

آدمی ایک پھل کھائے تو وہ جانتا ہے کہ پھل نام ہے مغز کا نہ کہ چھلکے کا۔ آدمی کسی سے محبت کا امیدوار ہو تو وہ جانتا ہے کہ محبت نام ہے دل کے تعلق کا نہ کہ رسمی آداب کا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ یہی لوگ اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دین نام ہے حقیقت کا۔ خداپرستی یہ ہے کہ آدمی اللہ کے جلال سے کانپے، اللہ کی یاد اس کی روح کی غذا بن جائے۔

عجیب لوگ

الرسالہ (اکتوبر ۱۹۸۵) میں ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا "الفاظ کا رجسٹر" اس میں دکھایا گیا تھا کہ اردو زبان میں معیار بندی نہ ہونے کی وجہ سے یہ صورت حال ہے کہ بڑے بڑے لکھنے والے بھی اپنی تحریروں میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو جدید اصطلاح میں رجسٹر کے باہر کے الفاظ ہوتے ہیں۔

اس مضمون کو پڑھ کر ایک صاحب نے ہمیں پر جوش خط روانہ کیا ہے۔ ان کو اس مضمون پر سخت اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد میں نے اردو زبان کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے "انکوائری" کی کہ کیا ایسا کوئی رجسٹر موجود ہے مگر ہر ایک نے ایسے رجسٹر سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ ممکن ہے انگریزی زبان میں ایسے رجسٹر موجود ہوں مگر اردو میں ابھی تک ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی ہے جس میں رجسٹر کے اعتبار سے الفاظ کی تقسیم کی گئی ہو۔ ایسی حالت میں اردو کے اہل قلم حضرات کو کیوں کر اس بات کا مجرم قرار دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں رجسٹر کے باہر کے الفاظ استعمال کیے۔ جب خود رجسٹر کا وجود نہیں تو کیسے فیصلہ کیا جائے گا کہ فلاں لفظ رجسٹر کے باہر ہے اور فلاں لفظ رجسٹر کے باہر نہیں۔

ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ مذکورہ مضمون میں "الفاظ کا رجسٹر" سے مراد ذہنی رجسٹر ہے نہ کہ کوئی مطبوعہ رجسٹر۔ اس قسم کا رجسٹر ہمیشہ غیر مکتوب ہوتا ہے نہ کہ مکتوب۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے انھیں کم از کم اپنی بے خبری کو جاننا چاہیے تاکہ وہ جاننے والے سے پوچھیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو نہیں جانتے، مزید یہ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ وہاں بولتے ہیں جہاں انھیں چپ رہنا چاہیے۔ لوگ وہاں دوسرے کی غلطی کا اعلان کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں ان سے مطلوب تھا کہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کریں۔ لوگ صرف بولنے کو کام سمجھتے ہیں حالاں کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ لوگ اپنی واقفیت کے اظہار کو کمال سمجھتے ہیں حالاں کہ اپنی ناواقفیت کا اعتراف بھی کم کمال کی بات نہیں۔

۔ ۲۶ جنوری ۸۶ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز کا ماہانہ اجتماع نماز مغرب کے بعد ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے سورہ نسار (آیت ۶۰ ـ ۵۹) کی روشنی میں درس دیا۔ موصوف نے قرآن کی اس آیت کو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے حالات پر منطبق کرتے ہوئے تقریباً آدھ گھنٹہ تک اس کی تشریح کی۔

۱۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۶ کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (نئی دہلی) کے زیر اہتمام اہل علم کا ایک اجتماع ہوا۔ اس کا عنوان تھا:

Islam and Contemporary Problems

اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے صدر جلسہ کی حیثیت سے ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے اس نقطہ نظر کی تردید کی کہ زمانہ کی کسی تبدیلی کی وجہ سے اس کی ضرورت پیش آگئی ہے کہ اسلامی شریعت کے قوانین پر نظر ثانی کی جائے۔

۳۔ ۲۳ جنوری ۱۹۸۶ کو نئی دہلی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ کو ایک ہندو تنظیم نے منعقد کیا تھا اور اس میں زیادہ غیر مسلم حضرات شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز کو اس موقع اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں اسلام کے تصور آخرت کو پیش کیا۔

۴۔ بھوپال میں حلقۃ الرسالہ کی طرف سے ایک اجتماع ۱۹ ـ ۲۰ ـ ۲۱ اپریل ۱۹۸۶ کو ہو رہا ہے۔ اس میں دہلی سے صدر اسلامی مرکز بھی شرکت کریں گے۔ مقامی پتہ یہ ہے:

بنارسی کلاتھ اسٹورس۔ ابراہیم پورہ ـ بھوپال

ٹیلی فون نمبر ۷۵۸۹۴

۵۔ جدہ (سعودی عرب) میں اسلامی جرائد کی ایک نمائش فروری ۱۹۸۶ میں ہوئی۔ اس موقع پر دوسرے اسلامی جرائد کے ساتھ ماہنامہ الرسالہ کے انگریزی اور اردو شمارے بھی ذمہ داروں کی طرف سے نمائش کے لیے رکھے گئے۔ اسی طرح کیپ ٹاؤن (ساؤتھ افریقہ) میں مارچ ۱۹۸۶ میں اسلامی لٹریچر کی نمائش ہوئی۔ اس موقع پر بھی اس کے ذمہ داروں نے الرسالہ اور

مکتبہ الرسالہ کی مطبوعات کو منگوا کر نمائش کے لیے رکھا۔

۶۔ "الرسالہ کیسٹ" کے ذریعہ خدا کے فضل سے الرسالہ اور اسلامی مرکز کا پیغام ان لوگوں تک بھی پہونچ رہا ہے جو اردو زبان پڑھ نہیں سکتے البتہ سن کر سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک نئی بات یہ علم میں آئی کہ باہر کے ملکوں کے نوجوان جو کئی سال تک ہندستان میں زیر تعلیم رہنے کی وجہ سے اردو بول چال سمجھنے لگے ہیں وہ بھی الرسالہ کیسٹ سے دل چسپی لے رہے ہیں۔ چنانچہ دفتر میں سوڈان کے ایک نوجوان کا خط موصول ہوا ہے ، وہ ہندستان کی ایک یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ انھیں کسی ذریعہ سے ایک کیسٹ ملا تھا۔ اب وہ ہر کیسٹ کو سننا چاہتے ہیں اور اس کے مستقل خریدار بن گیے ہیں۔

۷۔ انگریزی الرسالہ خدا کے فضل سے دن بدن لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ ۳ جنوری کو ایک مسلم ملک کے سفارت خانہ کے کلچرل اتاشی اچانک مرکز میں آئے۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج ہی میں نے آپ کا انگریزی الرسالہ دیکھا۔ وہ مجھ کو بہت پسند آیا اور میں فوراً ملاقات کے لیے آگیا :

قرأتُ الرسالة وفرحتُ جداً وحضرتُ فوراً

وہ انگریزی زبان اچھی جانتے ہیں۔ انھوں نے پیش کش کی کہ اگر زبان کے اعتبار سے کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں اس کے لیے حاضر ہوں (اذا اردتم المساعدة من ناحية اللغة فانا موجود)

۸۔ بنگلور میں اسلامی مرکز کی شاخ نے اطلاع دی ہے کہ اس نے کنڑی زبان میں کچھ ترجمے تیار کر لیے ہیں۔ انشاء اللہ وہ جلد ہی شائع کیے جائیں گے۔

۹۔ ساتویں عالمی کتابی نمائش (ورلڈ بک فیر) نئی دہلی میں فروری ۱۹۸۶ میں ہوئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کا ایک اسٹال لگایا۔ اسلامی مرکز کے بک اسٹال کا نمبر ۲۰۹ تھا۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں لوگ اسٹال پر آئے۔ بہت سے لوگوں نے کتابیں خریدیں، الرسالہ کی خریداری قبول کی اور اعلیٰ تاثرات کا اظہار کیا۔ یہاں بطور نمونہ چند تاثرات نقل کیے جاتے ہیں :

قواکم اللہ وبارك في جهودكم (ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، جامعہ ملیہ نئی دہلی)

"اسلامک سینٹر کے اسٹال پر حاضری کی تمنا کئی روز سے تھی۔ الحمدللہ آج اس کا موقع ہاتھ آیا میں جناب مولانا وحید الدین خاں صاحب کی نگارشات کا برسوں سے مطالعہ کر رہا ہوں لیکن یہ اندازہ بالکل نہ تھا کہ مولانا محترم نے اس قدر کتابیں تصنیف فرمائی ہوں گی۔ کمیت اور کیفیت دونوں ہی قابل تعریف ہیں۔ مولانا کی تحریر نہایت فکر انگیز اور جدید ذہن کے عین مطابق ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کی عکاسی جس خوبی سے مولانا نے اپنی تصانیف میں کی ہے اس کی مثال کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ ڈاکٹر ثانی اثنین صاحب بھی مبارکباد کے قابل ہیں کہ انھوں نے اپنے اسٹال کو ایسا منظم کر رکھا ہے کہ ایسا سلیقہ کسی اور اسلامی اسٹال میں میں نے نہیں دیکھا۔"

Dr. Syed Ausaf Ali, Indian Institute of Islamic Studies, New Delhi

I welcome such publications so that even non-Muslims may understand the greatness of Islamic religion and culture.

N.S. Saksena, 139 Civil Lines, Bareilly 243001

Is it possible for a person to write so much. Perhaps not but with the grace of God.

Shabi Ahmed, LCHR, 35 Feroz Shah Road, New Delhi

۱۰۔ ۱۲ فروری ۸۶ کو نئی دہلی میں مسلم اور ہندو اہل فکر کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا جو بابری مسجد کے سلسلے میں حال میں ملک کے اندر پیدا ہوئی ہے۔ صدر اسلامی مرکز بھی اس موقع پر شریک ہوئے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۱۔ تذکیر القرآن کی تحریر اور کتابت کا کام خدا کے فضل سے مسلسل جاری ہے۔ اس کے ستائیس پارے تک تیار ہو گئے ہیں۔ انشاء اللہ امید ہے کہ ۱۹۸۶ میں اس کی دوسری جلد چھپ کر آجائے گی۔

۱۲۔ پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ چھپ کر تیار ہو گیا ہے اور حسب فرمائش اس کی روانگی شروع جلد ہی شروع ہو جائے گی۔

۱۳۔ اسلامی مرکز کے لٹریچر کو ہندی میں منتقل کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ پہلی کتاب کے طور پر "انسان اپنے کو پہچان" کا ہندی ترجمہ اس وقت زیر طبع ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

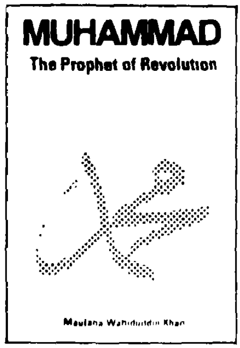
زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے نیو کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd No D(SE) 243
Regd R.N No. 28822/76

April 1986
Number 113



MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

باتوں کو بھلا دینے کی عادت ڈالئے ——————
ہر بات کو یاد رکھنا اپنے ذہن کو کباڑ خانہ بنانا ہے

مئی ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۴ مئی ۱۹۸۶

فہرست

قلبی عمل

غزوۂ تبوک میں کچھ لوگ عذر کی بنا پر شریک نہ ہو سکے تھے۔ ان کی بابت قرآن میں آیا ہے کہ ـــــ ضعیفوں پر اور مریضوں پر اور محتاجوں پر کچھ گناہ نہیں جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں۔ نیکی والوں پر کوئی الزام نہیں۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور نہ ان پر کوئی گناہ ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آئے تاکہ تم ان کو سواری دو، تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ میں تم کو سواری کے لیے دوں، وہ واپس ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس غم میں کہ ان کے پاس کوئی چیز نہیں جس کو وہ خرچ کریں۔ (التوبہ) محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ یہ سات افراد تھے جو انصار کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لقد خلفتم بالمدينة اقوامًا ما انفقتم من نفقة ولا قطعتم واديا ولا نلتم من عدو نيلا الّا وقد شركوكم في الاجر (قالوا وهم بالمدينة قال نعم حبسهم العذر)
(تفسیر ابن کثیر الجزء الثانی، صفحہ ۳۸۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم نے مدینہ میں ایسے لوگ چھوڑے ہیں کہ تم نے جو بھی خرچ کیا تم نے جو وادی بھی طے کی، اور تم نے دشمن پر جو کامیابی بھی حاصل کی، ان سب کے اجر میں وہ شریک تھے صحابہ نے کہا کہ اگرچہ وہ مدینہ میں تھے۔ آپ نے فرمایا ہاں، ان کو عذر نے روک دیا۔

آدمی نہ کر کے بھی کرنے والوں کے اجر میں شریک ہو سکتا ہے۔ بظاہر کچھ نہ پاکر بھی اس کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے بہت کچھ پایا۔ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس کام میں ہم عملاً شریک نہ ہو سکے اس میں ہم جذبے کے اعتبار سے شریک ہو جائیں۔ کسی کو اپنے سے بڑا دیکھیں تو اس پر حسد کرنے کے بجائے اس کی بڑائی کا اعتراف کریں۔ کسی کے پاس ہم سے زیادہ مال ہو تو ہم دل سے یہ چاہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا کرے اور اس کو حقوق کی ادائگی کی توفیق دے۔ کسی کو "مقرر" کے اسٹیج پر جگہ مل جائے اور ہم صرف "سامع" بنے ہوئے ہوں تو ہم اس کے لیے دعا کریں کہ خدایا تو اس کو توفیق دے کہ اس کی زبان سے جو کچھ نکلے حق نکلے اس کی زبان ناحق بولنے سے محفوظ رہے۔

تربیت کا مہینہ

رمضان کے مہینہ کو حدیث میں صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے ۔ قرآن کے مطابق رمضان
ینہ تقویٰ کے لیے مقرر کیا گیا ہے (البقرہ ۱۸۳) ۔ اس کا مطلب کیا ہے ۔ صبر اور تقویٰ دین کے وہ
ضے ہیں جو ہر روز اور سارے سال مطلوب ہیں ۔ پھر ان کو رمضان کے مہینہ کے ساتھ کیوں خاص
ا گیا ۔

اس کی وجہ رمضان کے مہینہ کی تربیتی اہمیت ہے ۔ تقویٰ اور صبر دین کا عمومی حکم ہے ۔ وہ ہر مسلمان
پورے سال اور پوری زندگی کے لیے مطلوب ہے ۔ اسی عمومی مطلوب کو ایک مہینہ میں خصوصی شدت
اہتمام کے ساتھ ادا کرایا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے مزاج میں داخل ہو جائے ۔ لوگ نفسیاتی طور پر اس
ل ہو جائیں کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں میں اس کو اپنی زندگی کے معاملات میں برتتے رہیں ۔

رمضان کے مہینہ میں ایک مقرر نظام کے تحت یہ کوشش کی جاتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ
دف ابھرے ۔ ان کے اندر یہ مزاج پیدا ہو کہ وہ اس دنیا میں صبر اور تقویٰ کے ساتھ رہنا سیکھیں ۔
خواہش کے باوجود ایک چیز کو نہ کھائیں ۔ نفس کے تقاضے کے باوجود ایک کام کو نہ کریں ۔ وہ ہر حال
دین کے تقاضوں پر قائم رہیں ، خواہ اس کی خاطر انھیں ناموافق باتوں کو برداشت کرنا پڑے ۔
ہ اس کی خاطر انھیں وہ چیز چھوڑنا ہو جس کو چھوڑنا انھیں کسی حال میں پسند نہیں ۔

رمضان کا مہینہ اسی شعور اور اسی احساس کو جگانے کے لیے ایک قسم کا ہنگامی کورس ہے ۔
ں کے ایک مہینہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ایک مقرر نظام کے تحت لوگوں کو عبادت
اطاعت کے کاموں میں مشغول رکھا جاتا ہے ۔ اس طرح آدمی کے اندر یہ احساس زندہ کیا جاتا ہے
وہ خدا کے بتائے ہوئے وقت پر سوئے اور خدا کے بتائے ہوئے وقت پر جاگے ۔ وہ خدا کے
م سے کھائے اور خدا کے حکم سے نہ کھائے ۔ وہ خدا کے کہنے سے کرے اور خدا کے روکنے سے
ک جائے ۔ یہ چیزیں ایک بندہ سے ہر روز مطلوب ہیں ۔ مگر چند خاص دنوں میں ان کو نظام کے
ر پر کرایا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ اس قابل ہو جائے کہ بعد کے دنوں میں وہ ان کو اپنی
یت کے زور پر کر سکے ۔

انجام پر غور کرنا

جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: یارسول اللہ اوصنی، فقال: استوص انت۔ فقال نعم۔ قال علیہ الصلوٰۃ والسلام: اذا ھممت بامر فتدبر عاقبتہ۔ فان کان رشداً فامضہ وان کان غیا فانتہ عنہ

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا، کیا تم واقعۃً نصیحت لینا چاہتے ہو اس نے کہا۔ ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے انجام پر غور کرو۔ اگر اس میں بھلائی ہو تو اس کو کرو۔ اور اگر اس میں برائی ہو تو اس سے رک جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر کام کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے۔ جو چیز باعتبار انجام ٹھیک ہو اس کو کرنا اور جو چیز باعتبار انجام ٹھیک نہ ہو اس کو نہ کرنا، یہ اسلام کا طریقہ ہے اور یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سکھایا ہے۔

عام طور پر لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ چیزوں کو محض ان کی ظاہری صورت (Face value) کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور بس فوراً اس میں کود پڑتے ہیں۔ مگر یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ چیزوں کو ان کی حقیقت کے اعتبار دیکھا جائے نہ کہ محض ظاہر کے اعتبار سے۔

جب بھی کوئی معاملہ سامنے آئے تو اقدام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ خاص طور پر یہ غور کیا جائے کہ اگر اقدام کیا جاتا ہے تو دوسروں کا ردعمل کیا ہوگا۔ کن طاقتوں سے مقابلہ پیش آئے گا۔ کن مسائل سے نمٹ کر اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا۔ اقدام کے نفسیاتی، سماجی اور سیاسی اثرات کیا ہوں گے۔ تمام ضروری پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد صرف اس وقت اقدام کیا جائے جب کہ یہ یقین ہو جائے کہ یہ اقدام مفید اور صحیح نتیجہ پر پہونچنے والا ہے۔

اقدام صرف وہ ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جو اقدام نتیجہ خیز نہ ہو، وہ اقدام نہیں، خودکشی ہے۔ ایسے اقدام سے پرہیز کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خودکشی سے پرہیز کرنا۔

عملِ باطل

شریعت میں جو چیزیں حرام ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں " اکل اموال الناس بالباطل " کہا گیا ہے ۔ اس سلسلہ میں قرآن میں چار واضح آیتیں آئی ہیں ۔ سورۂ نسار (آیت ۲۹) میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو ، آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر نہ کھاؤ اِلّا یہ کہ کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے کی جائے ۔ سورہ نسار (آیت ۱۶۱) میں ارشاد ہوا ہے کہ یہود کو اس لیے سخت سزا میں مبتلا کیا گیا کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے تھے ۔ سورہ توبہ (آیت ۳۴) میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو ، یہودیوں کے اکثر علمار اور مشائخ لوگوں کے مال ناحق طور پر کھاتے ہیں ، ایسے لوگوں کے لیے سخت عذاب ہے ۔ (اس لیے تم ایسا مت کرنا)

اسی عمل باطل کی ایک صورت وہ ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ (آیت ۱۸۸) میں ہے ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں : ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقاً من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ۔ سورہ بقرہ کی اس آیت کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ اور ان کے جھوٹے مقدمہ کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ یعنی ظلم کے کھا جاؤ ۔ اور تم کو اپنے جھوٹ اور ظلم کا علم بھی ہو ۔

اقوالِ مفسرین

اس آیت کی نہایت واضح تشریح حدیث اور آثار میں موجود ہے ۔ تفسیروں میں اسے دیکھا جاسکتا ہے ۔ مفسر ابن کثیر نے اس آیت کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا پورا ترجمہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

علی بن ابی طلحہ نے کہا اور عبداللہ بن عباس نے بھی کہ یہ آیت ایسے آدمی کے بارے میں ہے جس کے پاس کسی کا مال ہو اور اس مال کو لینے کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہ ہو پھر بھی وہ

مال کی ادائیگی سے انکار کرے۔ اور وہ حاکموں کی طرف مقدمہ لے جائے حالاں کہ وہ جانتا ہو کہ حق اس کے خلاف ہے اور وہ جانتا ہو کہ وہ گنہ گار ہے اور وہ حرام کو کھانے والا ہے۔ اور ایسا ہی قول مروی ہے مجاہد سے اور سعید بن جبیر سے اور عکرمہ سے اور حسن سے اور قتادہ سے اور سُدی سے اور مُقاتل بن حیان سے اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم سے، انھوں نے کہا کہ تم کسی سے جھگڑا نہ کرو جب کہ تم جانتے ہو کہ تم ظالم ہو۔ اور صحیحین میں ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سنو، بے شک میں ایک انسان ہوں اور میرے پاس جھگڑا آتا ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ زبان آور ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو میں جس شخص کو کسی مسلمان کا حق دے دوں تو بے شک وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، تو وہ چاہے اس کو لے جائے یا وہ اس کو چھوڑ دے۔

اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حاکم کا فیصلہ کسی چیز کو حقیقت میں نہیں بدلتا۔ وہ کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ جب کہ وہ حقیقۃً حرام ہو اور وہ کسی حلال کو حرام نہیں کر سکتا جب کہ وہ حقیقۃً حلال ہو۔ اور قاضی ظاہر کا پابند ہوتا ہے۔ اگر اس کا فیصلہ حقیقت کے مطابق ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ حاکم کے لیے اس کا اجر ہے اور حیلہ ساز کے اوپر اس کا بوجھ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام تک نہ لے جاؤ تاکہ تم لوگوں کے مال کا ایک حصہ بہ طریق گناہ کھاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو) یعنی تم اپنے دعویٰ کے باطل ہونے کو جانتے ہو مگر اپنے کلام میں اس کو گڈمڈ کرتے ہو۔

قتادہ نے کہا اے انسان جان لے کہ قاضی کا فیصلہ تمہارے لیے کسی حرام کو حلال نہیں کرتا۔ اور تم کو باطل کا حقدار نہیں بناتا۔ اور قاضی تو اس پر فیصلہ کرتا ہے جو اس نے دیکھا اور جو اس کے سامنے گواہی دی گئی۔ قاضی ایک انسان ہے، وہ صحیح بھی ہوتا ہے اور غلطی بھی کرتا ہے اور جان لو کہ جس شخص کے حق میں باطل کا فیصلہ کیا جائے اس کا مقدمہ ختم نہ ہوگا یہاں تک کہ اللہ دونوں فریقوں کو قیامت میں جمع کرے۔ پھر اللہ حق دار کے لیے بے حق والے کے اوپر اس سے بہتر فیصلہ کرے گا جو فیصلہ قاضی نے حق دار کے خلاف بے حق والے کے لیے دنیا میں کیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۲۵)

تشریح

مذکورہ آیت میں لا تأکلوا (نہ کھاؤ) کا لفظ ہے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ اُکل یہاں لفظی معنی میں نہیں ہے۔ یعنی اس سے مراد صرف کھانا نہیں، بلکہ یہ ایک تعبیر ہے اور اس سے مراد کسی بھی چیز کو اپنے قبضہ اور تصرف میں لے آنا ہے (عبّر به الاخذ والاستیلاء ، البحر المحیط) اسی طرح باطل کی تشریح صاحبِ روح المعانی نے ان الفاظ میں کی ہے: والمراد بالباطل الحرام وکل مالم یأذن باخذه الشرع۔ (باطل کا مطلب حرام ہے اور ہر وہ چیز جس کے لینے کی اجازت شریعت نے نہ دی ہو)

انسان کو جو چیز جائز طور پر نہ ملے اس کو وہ ناجائز طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی ذہنیت کو غلط اور حرام قرار دیا گیا ہے۔

انسان کا حال یہ ہے کہ جو مال شرعی طور پر اس کا حق نہ ہو اس کو وہ غیر شرعی کارروائیوں کے ذریعہ اپنے قبضہ میں لینا چاہتا ہے۔ جو چیز اس کو انصاف کے ذریعہ نہ ملے اس کو وہ دھاندلی کے ذریعہ حاصل کرنے کی تدبیر کرتا ہے۔ جس چیز کے متعلق اس کو اندیشہ ہو کہ وہ سچ بول کر اس کو نہیں پائے گا اس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ جھوٹ بول کر اس کا مالک بن جائے۔

انسان کا یہ مزاج اس کی زندگی کے ہر معاملہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس عہدہ پر وہ پرامن طور پر قابض نہ ہو سکا اس پر وہ تخریب کاری کے ذریعہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جو چیز شرافت کا طریقہ اختیار کرکے نہ ملے اس کو وہ کمینگی کا طریقہ اختیار کرکے حاصل کرتا ہے۔ جہاں حقیقی اشو پر قیادت نہ مل رہی ہو وہاں وہ جھوٹے اشو کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح قوم کے اوپر قائد بن جائے۔ جو چیز روایات کے دائرہ میں ملتی ہوئی نظر نہ آئے اس کو وہ روایات کو توڑ کر حاصل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے خواہ اس کے نتیجہ میں ساری انسانی زندگی فساد کی شکار ہو کر رہ جائے۔

یہ سب وہ چیزیں ہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے اور جو شخص اللہ کی پکڑ سے بچنا چاہتا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ان چیزوں سے بچے۔ وہ وہی لے جو شریعت کے مطابق اس کا حق ہے اور وہ نہ لے جو شریعت کے اس کا حق نہیں۔

تنگ نظری

لاروشے فوکالڈ (La Rochefoucauld) کا قول ہے کہ معمولی ذہن کے لوگ عام طور پر ہر اس چیز کو بُرا کہنے لگتے ہیں جو ان کی چھوٹی قامت سے زیادہ ہو :

Mediocre spirits generally condemn everything that exceeds their small stature.

انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی ذات کے لحاظ سے ناپتا ہے۔ جو چیز اس کی بڑائی میں اضافہ کرے یا کم ازکم اس کی بڑائی کو باقی رکھے اس کا وہ پرجوش طور پر حامی بن جاتا ہے اس کے برعکس جو چیز اس کو اپنی بڑائی کے لیے خطرہ نظر آئے اس کا وہ دشمن بن جاتا ہے، خواہ وہ بجائے خود کتنی اچھی چیز کیوں نہ ہو۔

عربی درس گاہوں میں عام طور پر قدیم معقولات کا کورس شامل رہتا ہے۔ یہ گویا معقولات کے نام پر نامعقولات ہے۔ کیوں کہ معقولات کے نام سے یہاں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن کا حقیقی عقلیات سے کوئی تعلق نہیں۔ عربی مدارس میں معقولات کا نصاب مکمل کرنے کے بعد بھی آدمی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ آج کی دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اسلام کو مدلل انداز میں پیش کرسکے۔

ایک عربی درس گاہ کے انتظامی ارکان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس کے نصاب سے قدیم معقولات کی تمام کتابیں خارج کر دی جائیں اور جدید علمی معیار کے مطابق معقولات کا نیا نصاب بنایا جائے۔ تاہم عملاً اس کو اختیار نہ کیا جاسکا۔ کیوں کہ درس گاہ کے شیخ المعقولات نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ اور وہ چوں کہ اس درس گاہ کے انتہائی سینیر استاد تھے ان کی بات لوگوں کو ماننی پڑی۔

اس مخالفت کا سبب یہ تھا کہ مذکورہ بزرگ صرف قدیم معقولات کے ماہر تھے۔ وہ جدید معقولات سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کو اندیشہ ہوا کہ درس گاہ میں اگر قدیم معقولات کو ختم کیا گیا تو اس کے بعد ان کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد ان کی مثال اس اردو ٹیچر کی ہو جائے گی جو اپنے آپ کو ایک ایسے اسکول میں پائے جہاں ذریعہ تعلیم صرف روسی زبان ہو۔

اجتماعی مہم

قرآن میں اہل ایمان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ جب رسول (بالفاظ دیگر امورمسلین کے ذمہ دار) کے ساتھ کسی امر جامع پر ہوں تو بلا اجازت وہاں سے اٹھ کر نہیں جاتے ، یہاں امر جامع سے مراد اجتماعی معاملہ ہے ۔ یعنی دین کا ایسا کام جس کے لیے مشترک عمل ضروری ہو ۔ اور " اجازت " کا ذکر بطور علامتی واقعہ کے ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ دین کے اجتماعی کام سے آدمی کو اسی طرح گہری وابستگی ہونی چاہیے جو اس کو اپنے ذاتی کام سے ہوتی ہے ۔

جس کام سے آدمی کے ذاتی فائدے وابستہ ہوں ، جس کا تعلق براہ راست اس کی شخصی مصلحتوں سے ہو ۔ وہاں ذاتی فائدہ خود ہی وہ طاقت ور محرک بن جاتا ہے جو آدمی کو اس کام سے جوڑے اور اس کو اس وقت تک اس سے جدا نہ ہونے دے جب تک اس کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ جو کام مطلوب تھا وہ انجام پا چکا ہے ۔ ذاتی کام کو آدمی اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اس لیے آدمی اس کو کیے بغیر نہیں چھوڑتا ۔ مگر جس کام کا تعلق مشترک اجتماعی معاملات سے ہو اس کو آدمی دوسروں کی ذمہ داری سمجھ لیتا ہے ۔ ایسے کام کے لیے آدمی کے اندر طاقت ور شخصی محرک نہیں ابھرتا ۔ اس لیے عام آدمی اس کو اپنے لیے بوجھ سمجھتا ہے ۔ ایسے کام میں بھرپور دلچسپی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر گہرا اجتماعی شعور موجود ہو ۔ وہ اجتماعی مفاد کو اسی طرح اہمیت دینے لگے جس طرح وہ ذاتی مفاد کو اہمیت دیتا ہے ۔

مومن سے یہ مزاج مطلوب ہے کہ جب بھی اسلام کا کوئی اجتماعی تقاضا ہو تو وہ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کے لیے دوڑ پڑے ۔ وہ آخر وقت تک بھرپور طور پر اس میں شریک رہے ۔ ایسا آدمی جب امیر اجتماع سے اجازت مانگتا ہے تو وہ فرار کے جذبہ کے تحت نہیں ہوتا ۔ بلکہ حقیقی سبب کے تحت ہوتا ہے ۔ اس لیے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو اس کو اجازت دے دو ۔ تاہم اجازت دینا اور اجازت مانگنا دونوں اس روح کے ساتھ ہونا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کے حق میں دعا کرتے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہوں ۔ دونوں کی زبان سے وہ دعائیہ کلمہ نکلے جو حقیقی خیر خواہی کا تقاضا ہے ۔

کامیابی کی شرط

آدمی خارجی دنیا کی جو معلومات حاصل کرتا ہے اس کا ۸۰ فی صد حصہ اس کو آنکھ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ خدا جب سورج کے ذریعہ دنیا میں روشنی پھیلاتا ہے تو گویا وہ اس بات کا امکان کھولتا ہے کہ آدمی اپنی آنکھ سے دنیا کی چیزوں کو دیکھے اور اپنے معلومات کے ذخیرہ میں اضافہ کرے۔ مگر اس امکان سے فائدہ اٹھانا ایک شرط کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ شرط یہ کہ آدمی اپنی آنکھ کو کھولے۔ اگر آدمی اپنی آنکھیں بند کرلے تو سورج کی کامل روشنی کے باوجود وہ کچھ بھی نہ دیکھے گا۔ اس کی معلومات میں ایک فی صد اضافہ بھی نہ ہوگا۔

اسی طرح خدا جب ہوا کو چلاتا ہے تو گویا وہ اس بات کا امکان کھولتا ہے کہ آدمی اس سے آکسیجن لے اور اپنے لیے زندگی کا سامان کرے۔ مگر آکسیجن کو پانے کی یہ شرط ہے کہ آدمی اس کو فطرت کے مقرر راستہ سے اپنے اندر داخل ہونے دے۔ جو آدمی اس شرط کو پورا نہ کرے اس کے لیے آکسیجن سے لدی ہوئی ہواؤں کا چلنا اور نہ چلنا برابر ہوگا۔ وہ ان سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہ کرسکے گا۔

فطرت کا یہی اصول انسانی زندگی کا اصول بھی ہے۔ انسانی زندگی میں کامیاب ہونے کا اصول بھی وہی ہے جو فطرت کی دنیا میں خدا نے قائم کر رکھا ہے۔

کامیابی کیا ہے۔ کامیابی مواقع کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے کچھ مواقع کھلتے ہیں۔ اگر وہ ان مواقع کو استعمال کرے تو یقینی طور پر وہ کامیابی کی منزل تک پہونچ سکتا ہے۔ اور اگر وہ ان مواقع کو استعمال کرنے میں غفلت کر جائے تو اسی کے نتیجہ کا دوسرا نام ناکامی ہے۔ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا ابدی اصول ہے۔

تاہم ہر موقع اپنے ساتھ کچھ شرطیں لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس شرط کو ملحوظ رکھ کر ہی آپ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر آپ متعلقہ شرط کو ملحوظ رکھنے میں ناکام رہیں تو آپ اس موقع کا فائدہ اٹھانے میں بھی ناکام رہیں گے۔ یہ دنیا خود اپنے اصولوں پر قائم ہے۔ دنیا کبھی ہماری خواہشوں کی پابندی نہیں کرے گی۔ بلکہ ہمیں اپنے آپ کو دنیا کے قائم شدہ اصولوں کا پابند بنانا پڑے گا۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی

کا واحد راز ہے ۔ اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں جس سے یہاں کامیابی حاصل کی جا سکے ۔

ایک مثال لیجئے ۔ موجودہ زمانہ میں ایک بہت بڑا امکان کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں اس وسعت کے ساتھ موجود نہ تھا ۔ یہ ہے آزادئ رائے کا حق ۔ موجودہ دور معلوم تاریخ کا پہلا دور ہے جب کہ عالمی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی پسند کا عقیدہ رکھے ۔ اور اگر وہ اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے تو دوسروں میں اس کی تبلیغ کرے ۔ عقیدہ اور اظہارِ رائے کی یہ آزادی موجودہ زمانہ میں کامل طور پر ہر شخص کو حاصل ہے ۔ اس میں کمیونسٹ ملکوں کے سوا کسی ملک کا کوئی استثنا نہیں ۔

تاہم یہ آزادی پر امن ذرائع (Peaceful means) کی شرط کے ساتھ مشروط ہے ۔ یعنی آپ جو کچھ کریں سمجھانے بجھانے کے انداز میں کریں ۔ زور زبردستی کے انداز میں نہ کریں ۔ اگر آپ اس شرط پر قائم ہوں تو آج کی دنیا میں اپنے عقیدہ اور نظریہ کی تبلیغ سے آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ۔

"پر امن ذرائع" کی شرط کوئی غیر متعلق شرط نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شرط خود مذکورہ اصولِ آزادی ہی کا ایک لازمی حصہ ہے ۔ کیوں کہ یہ آزادی کسی ایک شخص کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ہے ۔ اور جب ہر شخص کو یکساں آزادی دی جائے تو پر امن ذرائع کی شرط لازمی طور پر مطلوب ہو جاتی ہے ۔ کیوں کہ کسی شخص کا غیر پر امن ذریعہ اختیار کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کی آزادی چھین رہا ہے ۔ اس طرح غیر پر امن ذرائع کا طریقہ آزادی کا الٹا ہو جاتا ہے ۔ وہ اس کی نفی بن جاتا ہے وہ ایک کے حق میں آزادی اور دوسرے کے حق میں پابندی بن جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے ۔

اس جدید انقلاب نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے حق میں ایسے امکانات کھول دیئے ہیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائے نہیں جاتے تھے ۔ تاہم اس امکان کو حاصل کرنے کی ہمیں ایک لازمی قیمت دینی پڑے گی ۔ وہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو کامل طور پر پر امن ذرائع کے دائرہ میں محدود رکھیں ۔ اگر ہم اس لازمی شرط کو پورا کرنے میں ناکام رہیں تو یقینی طور پر ہم موجودہ مواقع کو استعمال کرنے میں بھی ناکام رہیں گے ۔ اگر ہم مذکورہ شرط کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اس امکان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو ہم اللہ کے یہاں مجرم ٹھہریں گے خواہ بطور خود ہم نے دوسروں کو مجرم ٹھہرا رکھا ہو ۔

شرعی قانون کی حکمت

اسلامی قانون میں چور کے لیے یہ سزا رکھی گئی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تاکہ آئندہ لوگ اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں اور اس کے انجام کو دیکھ کر دوسروں کو سبق حاصل ہو (مائدہ ۔ ۳۸)

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک بے رحمانہ قانون ہے۔ کسی معاشرہ میں اس پر عمل کیا جائے تو وہاں بے شمار لوگ بے ہاتھ ہو جائیں گے اور پورا معاشرہ بے کار معاشرہ بن کر رہ جائے گا۔ مگر یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ میڈیکل سائنس کا یہ نظریہ غلط ہے کہ کسی عضو میں سپٹک ہو جائے تو اس کو فوراً کاٹ دینا چاہیے۔ میڈیکل سائنس کے اس نظریہ کے عملی رواج کے باوجود اگر تمام لوگ بغیر ہاتھ پاؤں کے نہیں ہو گیے ہیں تو چوری کے بارہ میں اسلامی قانون کی وجہ سے لوگ بے ہاتھ کیوں ہو جائیں گے۔

یہ کوئی فرضی بات نہیں ہے۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ اس قانون کو نافذ کیا گیا، دور نبوت سے لے کر خلافت راشدہ کے خاتمہ تک صرف چھ آدمیوں کے ہاتھ کاٹے گیے اور ساری مسلم سلطنت میں امن قائم ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں سعودی عرب میں یہ قانون نافذ ہے۔ مگر برسوں گزر جاتے ہیں اور ایک ہاتھ کاٹنے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قانون اپنے اندر چوری کو روکنے کی خاصیت (Deterrent Value) رکھتا ہے۔ قطع ید کے حکم کا مطلب ہاتھ کاٹنے سے زیادہ یہ ہے کہ لوگوں میں دہشت پیدا ہو جائے اور کوئی شخص چوری کرنے کی ہمت ہی نہ کرے۔ یہ فائدہ اسلام کے قانونی نظام میں پہلے بھی حاصل ہوا اور آج بھی حاصل ہو رہا ہے۔

معاشرہ کو بے کار کرنے کا اعتراض زیادہ صحیح طور پر موجودہ قوانین پر عاید ہوتا ہے۔ ان قوانین میں چوری کی ہلکی سزا ہونے کی وجہ سے مجرموں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ چوری کی وارداتیں بے حد بڑھ جاتی ہیں اور بے شمار لوگ چوری کے جرم میں پکڑ کر قید میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح ہزاروں لوگوں کو عمل کے میدان سے ہٹا کر ان کو قوم کے اوپر بوجھ بنا دیا جاتا ہے۔ جب کہ شریعت کے مطابق چند آدمیوں کا ہاتھ کاٹ کر ہمیشہ کے لیے امن کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔ نتیجۃً سماج کے عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چند لوگوں کو سخت سزا دے کر سارے معاشرہ کو مستقل طور پر تحفظ کا احساس دے دیا جائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ چند لوگوں کی خاطر مستقل طور پر معاشرہ سے

تحفظ کا احساس ختم کر دیا جائے۔

یورپ اور امریکہ کے حالات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے کہ مادی فراوانی سے چوری خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں چوری کے واقعات غیر ترقی یافتہ ملکوں سے کم نہیں۔ البتہ شکلیں مختلف ہیں۔ پس ماندہ ملک کا ایک شخص دیہاتی چودھری کے مکان میں نقب لگاتا ہے اور امریکہ میں وہ بنک کے اوپر ڈاکہ ڈالتا ہے۔

قطع ید کی سزا نہ صرف سماج کو امن کی ضمانت دیتی ہے بلکہ ایک چور کا ہاتھ کاٹنا بہت سے لوگوں کو اس انجام سے بچاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں انتہائی بے رحمی کے ساتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ چور اور ڈاکو جب کسی کا مال لوٹنے آتے ہیں تو وہ صرف مال نہیں لوٹتے، بلکہ صاحب مال پر بھی حملہ کرتے ہیں اور کبھی ان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں، کبھی ناکارہ بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چور کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں تب بھی لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹتے رہیں گے اور دوسری صورت میں کٹنے کی تعداد یقینی طور پر پہلی صورت سے کہیں زیادہ ہوگی۔ جیسا کہ دنیا بھر کے تجربہ سے ثابت ہوا ہے۔

قطع ید کے حکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس "چوری" کی واردات ہوئی اور فوراً آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا گیا انسانی زندگی میں کوئی واقعہ بے شمار عوامل کے تحت ہوتا ہے اس لیے کسی متعین واقعہ پر حکم لگانے کے لیے سارے پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ ایک قاضی کا معاف کرنے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

چوری کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مجرمانہ ذہنیت کے تحت کی جاتی ہے۔ دوسری وہ جو ضرورتاً کسی سے کبھی صادر ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ مثلاً بھوک سے چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، اسی طرح باپ کا بیٹے کے مال سے یا بیٹے کا باپ کے مال سے لینے پر بھی نہیں۔ نابالغ اور غیر عاقل کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اور بہت سی صورتیں ہیں جن میں چوری کا واقعہ ہونے کے باوجود ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔

اسلام میں انسان کا اور اس کے "ہاتھ" کا جتنا احترام ہے کسی بھی دوسرے نظام میں اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص ظلماً کسی کا ہاتھ کاٹ دے تو اس کو ایک انسان کے قتل کی دیت کا نصف (پچاس اونٹ) مقطوع الید کو دینا پڑتا ہے۔ پیغمبر اسلام کے پاس ایک بار ایک

دیہاتی آیا، سلام کے بعد آپ نے اس سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے معذرت کی اور کہا کہ میرا ہاتھ موٹا کام کرنے کی وجہ سے سخت و درشت ہو گیا ہے۔ آپ نے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو چوم لیا اور فرمایا: جو ہاتھ محنت کی کمائی سے سخت ہو جائے، اس ہاتھ کو اللہ اور رسول بہت پسند کرتے ہیں۔

قرآن میں جہاں چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس کا مقصد "نکال" بتایا گیا ہے۔ یعنی عبرت۔ اس سے واضح ہے کہ اس سخت سزا کا اصل مقصد عبرت یا سبق ہے۔ یعنی لوگوں کو جرم سے روکنا سماج کے اندر سے مجرمانہ ذہنیت کو ختم کرنا۔

جرم کی سزا کے بارہ میں اسلام کا یہ اصول بظاہر سخت معلوم ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ انسانی معاشرہ کے حق میں بہت بڑی رحمت ہے۔ اس اصول کے تحت صرف وہی افراد سزا پاتے ہیں جو واقعی مجرم ہیں جب کہ مجرمین کو سخت سزا نہ دینے کی صورت میں مجرمین کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اس کی قیمت معاشرہ کو یہ دینی پڑتی ہے کہ اس کے اچھے افراد وہ سزا پانے لگتے ہیں جو سزا صرف برے افراد کو ملنی چاہیے۔

مجرمین اچھے اور برے لوگوں میں فرق نہیں کرتے، وہ صرف اپنی خواہش اور اپنے مفاد کو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ اکثر وہ سماج کے نہایت قیمتی افراد کو مار ڈالتے ہیں یا ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر انھیں اپاہج بنا دیتے ہیں۔ یہ صورت حال ایسے ہر سماج میں جاری رہتی ہے جہاں مجرمین کو سخت سزا کا اندیشہ نہ ہو۔

اسلام سماج کے برے افراد کو سخت سزا دیتا ہے تاکہ سماج کے اچھے افراد بچ جائیں۔ اس کے برعکس دوسرے سماجوں میں برے افراد کو ہلکی سزا دی جاتی ہے یا انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سماج کے اچھے افراد کو اپنا شکار بناتے ہیں۔

برے افراد کے لیے نرم قانون بنانا قانون سازی کی نفی ہے۔ کیوں کہ قانون کا مقصد جرم کو ختم کرنا ہے اور نرم قانون سازی سے وہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

خوف واحد چیز ہے جو کسی مجرم کو جرم سے روکنے کا سبب بنتا ہے۔ اگر قانونی نظام سے خوف کا عنصر نکال دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مجرم جرم کے لیے دلیر ہو جائے گا۔ اسلامی قانون مجرم کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور وضعی قانون مجرم کی حوصلہ افزائی۔

اس کے باوجود

قرآن میں اہلِ ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں ۔ (واذا ما غضبوا ھم یغفرون) یہ ایک معلوم بات ہے کہ ایک آدمی کو جب کسی شخص کے اوپر غصہ آئے تو اس کے نفس کے اندر زبردست ہیجان پیدا ہو جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں معاف کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اپنے جذبات کو دبائے ۔ اس حقیقت کو شامل کر کے دیکھا جائے تو مذکورہ قرآنی آیت کا پورا مطلب یہ ہوگا کہ ـــــــ وہ غصہ کے وقت لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں خواہ اس کے لیے انھیں اپنے جذبات کو دبانا پڑے اور اپنے نفس کو کچلنے کی نوبت آجائے ۔

اسی طرح جب بھی کوئی بات کہی جائے یا کوئی حکم دیا جائے تو اس میں کچھ الفاظ مذکور ہوتے ہیں اور کچھ الفاظ غیر مذکور ۔ دین میں غور و فکر کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ آدمی حکم کی گہرائی کو جاننے کی کوشش کرے وہ مذکور سے گزر کر غیر مذکور تک پہونچ جائے ۔

جب یہ کہا جائے کہ سچ بولو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سچ بولنے میں نقصان نظر آتا ہو تب بھی سچ بولو۔ یہ کہا جائے کہ امانت کو ادا کرو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امانت کو ادا کرنا تم پر شاق ہو تب بھی تم امانت کو ادا کرو ۔ یہ کہا جائے کہ لوگوں کے ساتھ انصاف کرو ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انصاف کرنا تمہاری خواہش کے خلاف ہو تب بھی تم انصاف کرو ۔

جب یہ کہا جائے کہ روزہ میں نہ کھاؤ تو اس جملہ میں یہ بات اپنے آپ شامل رہتی ہے کہ بھوک کے باوجود نہ کھاؤ ۔ یہی پوری شریعت کا معاملہ ہے ۔ شریعت کے ہر حکم پر عمل کرنے کے لیے آدمی کو اسی قسم کی قربانی دینی پڑتی ہے ۔

انفاق کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ مال کی محبت کے باوجود انفاق کرو ۔ دعوت پہونچانے کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے ایذا رسانی کے باوجود اسے دعوت پہونچاؤ ۔ حق کا اعتراف کرنے کے حکم کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی بڑائی ٹوٹنے کے باوجود حق کا اعتراف کرو ۔

اسی طرح ہر حکم میں مذکور الفاظ کے ساتھ کچھ غیر مذکور الفاظ ہوتے ہیں ۔ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ان غیر مذکور الفاظ کو پڑھے ۔ جو شخص ایسا نہ کرے وہ کسی بھی حکم پر صحیح عمل نہیں کر سکتا ۔

مذہب کے دروازہ پر

ڈاکٹر فرڈ ہائل مشہور سائنس داں ہے۔ اس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "ذہین کائنات" ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ کائنات کا جدید سائنسی مطالعہ حیرت انگیز طور پر اس ذہن کی تردید کرتا ہے جو انیسویں صدی میں قائم کیا گیا تھا۔ پہلے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ کائنات محض بے شعور مادہ کی اندھی کارفرمائی ہے۔ مگر بیسویں صدی کے آخر میں سائنس کے مختلف شعبوں میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ کائنات محض ایک مادی کائنات نہیں، وہ ایک "ذہین کائنات" ہے۔ یہاں اندھے مادی عمل کے بجائے ہر طرف ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

ان تفصیلات کو قلم بند کرتے ہوئے مصنف نے ایک بڑی عبرت انگیز بات لکھی ہے۔ مصنف کا یہ پورا پیراگراف ہم انھیں کے لفظوں میں نقل کرتے ہیں:

This indeed is just what orthodox scientists are unwilling to admit. Because there might turn out to be — for want of a better word — religious connotations, and because orthodox scientists are more concerned with preventing a return to the religious excesses of the past than in looking forward to the earth, the nihilistic outlook described above has dominated scientific thought throughout the past century.

Fred Hoyle, *The Intelligent Universe*
Michael Joseph Limited
44 Bedford Square, London WC1, 1983, p. 9

(زمین سے باہر کی طاقت کی کارفرمائی کی پہاڑ جیسی شہادتیں ملنے کے باوجود) یہ وہ چیز ہے جس کو راسخ العقیدہ سائنس داں تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ کیوں کہ انھیں یہ اندیشہ ہے کہ اس کا مذہبی مطلب نکل آئے گا۔ راسخ العقیدہ سائنس داں سچائی کو پانے سے زیادہ اس کے لیے فکرمند ہیں کہ وہ ماضی میں ہونے والے مذہبی مظالم کے اعادہ کو روکیں۔ مذکورہ منکرانہ نقطۂ نظر پوری گزشتہ صدی میں سائنسی خیالات پر چھایا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دور جدید میں علوم فطرت کے مطالعہ نے انسان کو مذہب کے دروازہ پر پہونچا دیا ہے۔ مگر جدید انسان جس کی پرورش عیسائی روایات میں ہوئی ہے وہ اپنی مخصوص تاریخ کی وجہ سے مذہب کے دروازے میں داخل ہونے سے ہچکچا رہا ہے۔ "مذہب" کا تصور آتے ہی اس کو سولھویں

اور سترھویں صدی کے وہ مظالم یاد آنے لگتے ہیں جب کہ یورپ میں سائنس کا آغاز ہوا اور عیسائی مذہب اس کو کچلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ جدید انسان مذہب کے نام سے صرف عیسائیت کو جانتا ہے اور عیسائیت اس کے نزدیک ایسے بے معنی عقائد کا مجموعہ ہے جس کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ علم کا سامنا کر سکے۔

سر فرڈ ہائل نے اپنی مذکورہ کتاب ذہین کائنات (The Intelligent Universe) میں لکھا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں پختہ مذہبی فکر نے یہ کیا کہ زمین کی پوری تاریخ کو بائبل کی روشنی میں چند ہزار سال کے اندر محدود کر دیا۔ اس نقطۂ نظر کی واضح غلطی پہلی بار جیمس ہیوٹن (۱۷۹۷-۱۷۲۶) کی تحقیقات سے ظاہر ہوئی جو پختہ مذہبی لوگوں کے سخت خلاف تھی اور اب بھی وہ ان کے سخت خلاف ہے۔ جیمس ہیوٹن نے اپنی ساری عمر زمین اور چٹانوں کے مطالعہ میں گزاری۔ اس کی تحقیقات نے بتایا کہ پہاڑوں اور وادیوں کے بننے میں کروروں سال لگے ہیں۔ عظیم ارضیات داں چارلس لائل (۱۸۷۵-۱۷۹۷) کی تحقیقات نے ہیوٹن کے نتائج کو مزید موکد کیا۔ لائل کی کتاب ارضیات کے اصول (Principles of Geology) ۱۸۳۰ میں چھپی۔ یہ کتاب سب سے بڑی وجہ تھی جس نے لوگوں کو مطمئن کر دیا کہ زمین کی عمر کے بارہ میں بائبل کا بیان غلط ہے، وہ اس قابل نہیں کہ سنجیدہ غور و فکر میں اس کا حوالہ دیا جا سکے۔ (صفحہ ۲۹-۲۸)

زمین کی عمر (اور اس طرح دوسری چیزوں کے بارے میں) بائبل غیر معتبر ثابت ہوئی تو لوگوں نے یقین کر لیا کہ وہ مذہبی امور کے بارہ میں بھی غیر معتبر ہے۔ یہ تاثر یہاں تک پہونچا کہ لوگوں نے خود مذہب ہی کو غیر معتبر چیز سمجھ لیا۔ مذہب کی غلط نمائندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خود مذہب کو غلط اور ناقابل اعتبار سمجھنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ دنیا کو اسلام سے متعارف کیا جائے عیسائیت کی خرابیاں تحریف کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ اسلام چوں کہ تحریف سے پاک ہے اس لیے وہ ان خرابیوں سے بھی پاک ہے۔ اسلام کو اگر اس کی حقیقی شکل میں جدید انسان کے سامنے لایا جائے تو بے شمار لوگ اس پر لبیک کہیں گے، کیوں کہ ان کے لیے یہ عین وہی چیز ثابت ہوگی جس کا وہ اپنی فطرت اور اپنے علم کے تقاضے کے تحت پہلے سے انتظار کر رہے ہیں۔ بائبل نے انھیں مذہب سے دور کیا تھا، اسلام دوبارہ انھیں مذہب سے قریب کرنے کا سبب بن جائے گا۔

آہ یہ مسلمان

ہندستان ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگیے۔ جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اندازہ ہے کہ پچھلے ۴۰ سال میں یہاں تقریباً دس ہزار فسادات ہوچکے ہیں۔ ہندستان کا تقریباً ہر فرقہ وارانہ فساد مسلمانوں کی بے صبری سے شروع ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر چھوٹی سی خلاف مزاج بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد معلوم اسباب کے تحت وہ دو قوموں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جس میں نقصان ہمیشہ مسلمانوں کے حصہ میں آتا ہے۔

ان فسادات کو ابھارنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری مسلم قائدین پر ہے۔ مسلمانوں میں جتنے بھی لکھنے اور بولنے والے ہیں سب متفقہ طور پر جہاد کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اندر برابر لڑنے کا مزاج بناتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم کہ قرآن میں صبر کی بھی آیتیں ہیں۔ تاہم دوسروں کو اپنی زبان و قلم سے جہاد پر ابھارنے والے یہ لوگ خود ہمیشہ جہاد کے میدان سے دور رہتے ہیں۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں اب تک بے شمار مسلمان مارے جا چکے ہیں مگر ان میں سے کسی فساد میں کوئی مسلمان قائد اب تک مارا نہیں گیا نہ کوئی چھوٹا قائد اور نہ کوئی بڑا قائد۔

مسلم قائدین صرف دوسروں کو للکارنے کے لیے بہادر ہیں، وہ خود لڑنے اور مرنے کے لیے بہادر نہیں۔

دوسری طرف مسلم عوام کا حال یہ ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر مخالف فرقہ کے ساتھ ہنگامہ آرائی شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے صبر اور اعراض کی بات کیجیے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ اگر ہم نے صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کیا تو مخالف طاقتیں دلیر ہو جائیں گی۔ مگر عملاً کیا ہوتا ہے۔ عملاً صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ابتدائی مرحلہ میں بے صبر ہو کر لڑ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ جلائے پھونکے جاتے ہیں اور پولیس آکر وحشیانہ طور پر انھیں کچلنے لگتی ہے تو وہی مسلمان بالکل دوسرے مسلمان بن جاتے ہیں۔ فساد کے آغاز میں مسلمان چپ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے مگر فساد کے خاتمہ پر ہر مسلمان نہایت بزدلانہ طور پر عین اسی مقام پر خاموش ہو جاتا ہے جہاں اس سے پہلے وہ کاغذ اور مائک کا شیر بنا ہوا تھا ——— کاش مسلمان جانتے کہ بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

بدگمانی

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص ؓ کہتے ہیں کہ وہ اس وقت موجود تھے جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے بعد مال غنیمت کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس سلسلے کی ایک طویل روایت کا ایک حصہ یہ ہے :

جاء رجل من بني تميم يقال له ذو الخُوَيصِرة. فوقف عليه وهو يعطي الناس. فقال يا محمد قد رأيت ما صنعت في هذا اليوم. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم، اجل فكيف رأيت. فقال لم أرَكَ عَدَلتَ.

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۴۴۱)

بنو تمیم کا ایک شخص آیا جس کا نام ذوالخُوَیصرہ تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور آپ اس وقت لوگوں کو دے رہے تھے۔ اس نے کہا کہ اے محمد، میں نے دیکھ لیا جو آپ نے آج کے دن کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا کہ میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے انصاف کیا ہو۔

حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ کہتے ہیں کہ عُیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے بھتیجے حُر بن قیس کے یہاں ٹھہرے۔ پھر وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق ؓ کے یہاں اجازت لے کر حاضر ہوئے۔ جب وہ آئے تو انھوں نے کہا :

هي يا ابن الخطاب، فوالله ما تعطينا الجزل ولا تحكم فينا بالعدل.

(ریاض الصالحین صفحہ ۱۱۳)

اے خطاب کے لڑکے، خدا کی قسم آپ نہ ہم کو کچھ دیتے ہیں اور نہ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔

مذکورہ دونوں الزام یقینی طور پر غلط تھے۔ پھر بھی دو معصوم ترین روحوں پر الزام لگانے کے لیے لوگوں نے الفاظ پالیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کسی کے ملزم ثابت ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ کچھ لوگ اس کے خلاف کچھ الفاظ پالیں۔ لوگوں کو بہر حال اس قسم کے الفاظ ملتے رہیں گے کہ وہ جس کو بدنام کرنا چاہیں بدنام کریں۔ یہاں تک کہ قیامت کا زلزلہ آئے اور لوگوں سے ناحق کلام کرنے کی آزادی چھین لے۔

کرنے کا کام

امیر تبلیغ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ تھا کہ وہ کسی جماعت کو دین کے راستہ میں بھیجتے تو روانگی کے وقت اس کو یہ نصیحت کرتے :

نیچی نظر، دل میں فکر ، زبان پر ذکر ،
قدم ملا کر چلوگے تو منزلیں آسان ہو جائیں گی ۔

اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ــــــ سنجیدگی ، احساس ذمہ داری ، اللہ کی عظمت کا اقرار اور اتحاد ، یہ چیزیں جن لوگوں کے اندر پیدا ہو جائیں ، وہ ضرور کامیاب ہوں گے ۔

یہ انتہائی اہم بات ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کے فرد فرد میں یہ شعور جگانا اور ایک ایک شخص کے اندر یہ جذبہ بھرنا ہی اصل کام ہے ۔ اسی میں آخرت کی بھلائی ہے اور اسی میں دنیا کی بھلائی بھی۔

قوم یا خارجی نظام کا بذات خود کوئی مستقل وجود نہیں ۔ اصلی اور مستقل وجود صرف فرد کا ہے ۔ فرد کے مجموعہ کا نام قوم ہے ۔ اور فرد کی کارکردگی کا نام نظام ۔ اس لیے فرد کو بنانا قوم کو بنانا ہے اور فرد کی اصلاح گویا پورے نظام کی اصلاح ہے ۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے تو وہی کام کام ہے جو فرد کو نشانہ بنا کر کیا جائے ۔ جس کام میں نظام یا حکومت کو نشانہ بنایا گیا ہو وہ صرف ایک ہنگامہ ہے ، وہ باعتبار حقیقت کوئی کام نہیں ۔ جو چیز آپ اجتماع کی سطح پر چاہتے ہیں اس کو آپ اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ آپ اس کو فرد کی سطح پر حاصل کر چکے ہوں ۔ فرد کی اصلاح کے بغیر اصلاح معاشرہ اور انقلاب حکومت کا نعرہ لگانا یا تو لیڈری ہے یا دیوانگی۔ اس کے سوا اس کی کوئی تیسری توجیہہ نہیں کی جا سکتی ۔

فرد فرد کے اندر وہ گہرا ایمان پیدا کیجیے کہ تواضع سے اس کی نظریں جھک جائیں ۔ آخرت کی جواب دہی کا احساس اس کے سینہ میں تڑپ بن کر داخل ہو جائے ۔ اللہ کی عظمت اس کے اوپر اتنی چھا جائے کہ وہ اس کو ہر وقت یاد کرنے والا بن جائے ۔ اس کی بے نفسی اس کو لوگوں کے ساتھ متحد کر دے ۔ افراد کے اندر اگر یہ اوصاف آجائیں تو اس کے بعد بقیہ چیزیں اسی طرح لازمی طور پر آئیں گی جس طرح ایک زندہ درخت کے اوپر پھل ۔

امتحان کے لیے

امتحان ہال میں طالب علم کو بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہوتی ہیں ـــــ بلڈنگ، میز، کرسی، ملازم کاغذ اور بہت سی دوسری چیزیں۔ وہ بلا روک ٹوک ان چیزوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ آزادانہ طور پر ان کے درمیان اپنی نشست پر بیٹھتا ہے۔

بلڈنگ اس کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہے۔ میز اور کرسی اس کو آرام کے ساتھ بیٹھنے کی جگہ فراہم کرتے ہیں۔ کاغذ اور دوسرے سامان اس کو موقع دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرے اور جو چاہے کاغذ کے صفحہ پر مرتسم کرے۔

مگر یہ سب کچھ جو طالب علم کو ملتا ہے وہ امتحان کے طفیل میں ملتا ہے۔ وہ صرف اس وقت تک کے لیے اس کا ہے جب تک امتحان کی مدت پوری نہ ہو جائے۔ جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوتی ہے اس سے وہ سب کچھ چھین لیا جاتا ہے جو اس کو اب تک بے روک ٹوک ملا ہوا تھا، جو دیکھنے والوں کو اس کا ذاتی اثاثہ دکھائی دے رہا تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ دنیا میں انسان کا ہے۔ یہاں آدمی کو بظاہر بہت سی چیزیں ملی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جس طرح چاہے یہاں رہے اور جس طرح چاہے اپنی ملی ہوئی چیزوں کو استعمال کرے۔

مگر یہاں جو کچھ انسان کے پاس ہے وہ سب امتحان کے طفیل میں ہے۔ خدا موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان لے رہا ہے۔ اور اس امتحان کے تقاضے کے تحت وہ بہت سی ضروری چیزیں انسان کو دے دیتا ہے۔ مگر یہ آدمی کے پاس صرف اس وقت تک ہے جب تک امتحان کی مدت ختم نہ ہو جائے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک اس سے سب کچھ چھن جائے گا۔ وہ آدمی جو آج بظاہر سب کچھ پائے ہوئے ہے وہ اس وقت بالکل بے کچھ ہو جائے گا۔ اس دن وہ اس مسافر کی طرح ہوگا جس کو اچانک لق و دق صحرا میں ڈال دیا جائے۔ وہ اس انسان کی طرح ہوگا جس کو لامتناہی خلا میں بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے۔

موجودہ حالت اور اگلی حالت کے درمیان صرف موت کی غیر مرئی دیوار حائل ہے۔

خود ساختہ اسلام

ایک نوجوان طالب علم کے ساتھی نے طالب علم کا تعارف کراتے ہوئے کہا " ان کو طلبہ کی اسلامی تحریک سے بہت دل چسپی ہے۔ وہ طلبہ کی اسلامی سرگرمیوں میں کافی حصہ لیتے ہیں اور آج کل مسلم طلبہ کے ایک تنظیم کے سکریٹری بھی ہیں۔ اس وقت وہ پانچ ضلع کو کور (Cover) کر رہے ہیں "۔

یہ لیڈروں کی ایک نئی قسم ہے جو مسلمانوں کے درمیان بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئی ہے۔ مسلمانوں میں آج کل بے شمار ایسے لیڈر ملیں گے جن میں سے کوئی پانچ ضلع کو کور کر رہا ہوگا کوئی پانچ ریاست کو، کوئی پانچ ملک کو کور کر رہا ہوگا کوئی پانچ براعظم کو، حتی کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی خوش قسمتی اس حد کو پہونچی ہے کہ انھوں نے اپنے لیے ایسے لیڈر پالیے ہیں جو ساری کائنات کو کور کر رہے ہوں :

ہے حقیقت اس کے دیں کی احتساب کائنات

مسلمانوں کے درمیان آج کل لیڈروں کی اتنی کثرت ہے کہ جتنے مسلمان ہیں شاید اتنے ہی ان کے درمیان لیڈر بھی ہوں۔ مگر یہ لیڈر سب کے سب وہ ہیں جو "دوسروں" کو کور کر رہے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جو خود اپنے آپ کو کور کر رہا ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں احتساب غیر کی دھوم ہے مگر احتساب خویش ان کے اندر اتنا کمیاب ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

یہ اسلام جس کی آج کل کے مسلمانوں میں دھوم ہے بلاشبہ وہ اسلام نہیں جس کی تعلیم خدا اور رسول نے دی ہے۔ یہ مسلمانوں کا اپنا بنایا ہوا اسلام ہے جس کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن وحدیث کے مطابق حقیقی مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو کور کرے۔ مومن اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے وہ جہنم کے اندیشہ سے کانپ رہا ہوتا ہے۔ یہی ایمان کی اصل ہے۔

ایسا ایمان کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ساری توجہ اپنے آپ پر لگ جاتی ہے۔ اپنے آپ کو حق پر کھڑا کرنا اس کا سب سے بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو حق پر کھڑا کرنے والے ہوں وہی اپنے باہر بھی حق کو کھڑا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ صرف یہ جانتے ہوں کہ انھیں دوسروں کے خلاف حق کا جھنڈا لے کر کھڑا ہونا ہے وہ صرف دنیا کے فساد میں اضافہ کریں گے وہ دنیا کی تعمیر کرنے والے نہیں بن سکتے۔

فکری انقلاب

عن محمد بن جبیر بن مطعم عن ابیہ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی المغرب بالطور۔ فلما بلغ ھذہ الآیۃ (ام خلقوا من غیر شئ ام ھم الخالقون ام خلقوا السماوات والارض بل لا یوقنون ام عندھم خزائن رحمۃ ربک ام ھم المصیطرون) کاد قلبی ان یطیر (بخاری ومسلم)

محمد بن جبیر بن مطعم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ وہ نماز مغرب میں سورہ طور پڑھ رہے تھے۔ جب آپ اس آیت تک پہونچے (کیا وہ خالق کے بغیر پیدا ہوگئے ہیں یا وہ خود ہی خالق ہیں۔ کیا انھوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا ان کے پاس خدا کی رحمت کے خزانے ہیں یا وہی اس اس پر داروغہ ہیں) جب میں نے اس کو سنا تو قریب تھا کہ میرا دل اڑ جائے۔

حضرت جبیر بن مطعمؓ بدر کی جنگ تک اسلام نہیں لائے تھے۔ وہ بدر کے واقعہ کے بعد اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے مکہ سے مدینہ آئے۔ اس وقت وہ مشرک تھے۔ مدینہ کے زمانہ قیام میں ان پر یہ تجربہ گزرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز کی امامت کر رہے تھے۔ آپ نے نماز میں سورہ طور پڑھی۔ جبیرؓ بن مطعم کے کان میں آواز آئی تو وہ اس کو سننے لگے۔ جب آپ اس کو پڑھتے ہوئے مذکورہ آیتوں تک پہونچے تو اس نے ان کے شعور کو اس طرح جھنجھوڑا کہ ان کے اندر ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ ان کا دل ان کے سینہ میں اڑنے لگا۔

جبیر بن مطعم اس وقت مشرک تھے۔ مگر اب ان کا ذہن توحید کی طرف مڑ گیا۔ وہ اپنا محاسبہ کرنے لگے اور شرک وتوحید کے فرق پر غور کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حق ان پر واضح ہوگیا۔ انھوں نے شرک کو چھوڑ کر توحید کو اپنا دین بنا لیا۔ اصحاب رسول سب اسی قسم کے لوگ تھے۔ وہ شعوری انقلاب کے ذریعہ اسلام میں آئے تھے۔ بعد کو ایسے لوگ اسلام کے حامل بنے جن کو پیدائشی اتفاق نے مسلمان بنا دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ پیدائشی اتفاق وہ کردار پیدا نہیں کر سکتا جو فکری انقلاب کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔

تاریخ ساز عمل

ہجرت کے بعد مخالفین کی جارحیت کی بنا پر جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک کے بعد ایک جنگیں ہو رہی تھیں مگر فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں مخالفین سے یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔ اسی صلح سے فتح کا دروازہ کھلا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رض نے فرمایا: فتح حدیبیہ سے بڑی کوئی فتح اسلام میں نہیں ہوئی (ماکان فتح اعظم فی الاسلام من فتح الحدیبیة)

مگر صلح حدیبیہ پر راضی ہونا انتہائی مشکل معاملہ تھا۔ کیوں کہ یہ ایک ایسی صلح تھی جو دشمنوں کی اپنی شرائط پر کی گئی تھی۔ چنانچہ ایک حضرت ابوبکر کو چھوڑ کر تمام کے تمام صحابہ اس کے مخالف ہوگئے حضرت عمر فاروق رض نے بعد کے زمانہ میں ایک شخص سے کہا:

لقد صالح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اهل مکة علی صلح واعطاهم شیئا لوان نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَمَّرَ عَلَیَّ امیرًا فصنع الذی صنع نبی اللہ ماسمعتُ ولا اطعتُ۔ وکان الذی جعل لهم اَنَّ مَن لحق من الکفار بالمسلمین ردّوه ومن لحق بالکفار لم یردّوه

(کنز العمال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں سے صلح کی اور ان کو کچھ چیزیں دیدیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اوپر کسی کو امیر بنایا ہوتا اور وہ امیر وہ کرتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تو میں نہ سنتا اور نہ مانتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے جو کچھ مقرر کیا اس میں سے یہ تھا کہ کافروں میں سے جو شخص مسلمانوں سے مل جائے تو مسلمان اس کو لوٹا دیں گے اور مسلمانوں میں سے جو شخص کافروں کو ملے تو کافر اس کو نہیں لوٹائیں گے۔

دور اول کے مسلمانوں نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ مگر اس سب سے بڑی کامیابی تک پہونچنے کا راز اس ناقابل برداشت کو برداشت کرنا تھا کہ ـــــ اپنی جو چیز دشمنوں کے قبضہ میں چلی جائے اس کو واپس لینے پر اصرار نہ کریں۔ اور دشمنوں کی جو چیز اپنے قبضہ میں ہو اس کو دوبارہ واپس کرنے پر راضی ہو جائیں۔

نصیحت کا اثر

قال سفیان بن حسین ۔ ذکرتُ رجلاً بسوءٍ عند ایاس بن معاویة ۔ فنظر فی وجھی فقال ۔ اغزوتَ الروم ۔ قلت لا ۔ قال السند والھند والترك ۔ قلت لا ۔ قال افسَلِمَ منك الروم والسند والھند والترك ولم یَسلم منك اخوك المسلم ۔ قال فلم اعد بعدھا

(البدایة والنہایة)

سفیان بن حسین کہتے ہیں ۔ میں نے ایاس بن معاویہ کے پاس ایک شخص کا ذکر برائی کے ساتھ کیا ۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا ۔ کیا تم نے روم سے جہاد کیا ہے ۔ میں نے کہا نہیں ۔ انھوں نے کہا کیا تم نے سندھ اور ہند اور ترک سے جہاد کیا ہے ۔ میں نے کہا نہیں ۔ انھوں نے کہا پھر کیا روم اور سندھ اور ہند تو تم سے محفوظ رہے اور تمہارا بھائی مسلمان تم سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ سفیان بن حسین کہتے ہیں کہ اس کے بعد پھر میں نے اس بات کو نہیں دہرایا ۔

قال ابن ابی حاتم قدم سفیان الثوری المدینة فسمع المعافری یتکلم ببعض ما یضحك به الناس فقال له یا شیخ اما علمت ان لله تعالیٰ یوماً یخسر فیه المبطلون ۔ قال فما زالت تعرف فی المعافری حتی لحق باللہ تعالیٰ

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع ، صفحہ ۱۵۱)

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ سفیان ثوری مدینہ آئے انھوں نے معافری کو سنا کہ وہ کچھ ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے لوگ ہنسیں ۔ سفیان ثوری نے ان سے کہا کہ اے شیخ ، کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہے جب کہ باطل لوگ گھاٹے میں رہیں گے ۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ نصیحت معافری میں پہچانی جاتی رہی یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے ۔

آدمی کا احساس زندہ ہو تو وہ نصیحت کو سن کر فوراً چونک اٹھتا ہے اور اپنی اصلاح کر لیتا ہے ۔ مگر جن لوگوں کا احساس مردہ ہو جائے ۔ وہ نصیحت کو سنتے ہیں مگر نصیحت ان کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتی ۔ نصیحت سننے کے بعد بھی ان کا وہی حال رہتا ہے جو نصیحت سننے سے پہلے ان کا حال تھا ۔

تیسری آنکھ

حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے : من لم ینفعہ ظنہ لم تنفعہ عینہ (جس شخص کا گمان اسے فائدہ نہ دے اس کی آنکھ بھی اس کو فائدہ نہیں دے سکتی) یعنی جو آدمی سوچ کر نہ سمجھے وہ دیکھ کر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز آنکھ سے دکھائی دیتی ہے وہی ساری بات نہیں ہوتی ہمیشہ ظاہری مشاہدہ کے سوا بھی کچھ باتیں ہوتی ہیں۔ آدمی اگر مشاہدہ کے ساتھ ان مزید باتوں کو نہ ملا سکے تو وہ بات کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا۔

مثلاً علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے جلسوں میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں مسلمان جوق درجوق آتے تھے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے کہہ دیا :

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مگر بعد کو جب مسلم قوم کے بارہ میں ان کو مزید تجربات ہوئے تو انھوں نے کہا :

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان میں غلاف کعبہ (۱۹۶۳) اور یوم شوکتِ اسلام (۱۹۷۰) کے جلوس نکالے۔ اس میں وہاں کے مسلمان لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہ دیکھ کر مولانا مودودی نے سمجھ لیا کہ پاکستان کے ۹۹ فی صد مسلمان اسلام چاہتے ہیں۔ وہ اسلامی نظام کا نعرہ لے کر الکشن میں کود پڑے مگر چار الکشنوں میں حصہ لینے کے باوجود انھیں پانچ فی صد سے زیادہ ووٹ نہیں ملے۔ اسی طرح ہندستان میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے ۱۹۶۷ میں اپوزیشن کے ساتھ مل کر یہ تحریک چلائی کہ کانگریس کو الکشن میں ہراو۔ اس وقت جلسوں اور جلوسوں میں مسلمانوں کی زبردست بھیڑ دکھائی دینے لگی۔ مسلم قائدین نے یہ اعلان کر دیا کہ ہندستان کے مسلمان اپنے تمام اختلافات کو مٹا کر ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گیے ہیں۔ مگر الکشن کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کا "عظیم الشان اتحاد" ختم ہو چکا تھا اور اسی کے ساتھ خود قائدین کا اپنا اتحاد بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں دو آنکھ کے ساتھ "تیسری آنکھ" کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس آدمی کے پاس تیسری آنکھ نہ ہو وہ دیکھنے کے بعد بھی نہیں دیکھے گا، وہ جاننے کے بعد بھی جاننے سے محروم رہے گا۔

الفاظ مل گیے

اچاریہ رَج نیش اپنے آپ کو دولت مندوں کا گرو (Guru of the rich) کہتے ہیں۔ انھوں نے ساری دنیا میں اپنے لاکھوں معتقد پیدا کر لیے۔ مغرب کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں ان کی مقبولیت کا خاص راز یہ ہے کہ وہ آزاد جنسی تعلق (Free sex) کے لیے خوبصورت نظریاتی جواز فراہم کرتے ہیں۔ وہ آزاد جنسی تعلق کے نہ صرف مبلغ ہیں بلکہ خود بھی اس پر باقاعدہ عامل ہیں۔

اپنے ایک انٹرویو (السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا ۲۹ ستمبر ۱۹۸۵) میں رَج نیش نے فخر کے ساتھ کہا کہ میں سب سے زیادہ عورتوں سے محبت کرتا ہوں۔ اس معاملہ میں میں پاک باز نہیں ہوں۔ آپ میری داڑھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اتنی جلد سفید ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے بہت سرگرم جنسی زندگی گزاری ہے۔ میں نے ۵۰ سال کے اندر ۲۰۰ سال کو نچوڑا ہے:

> You can see my beard. It has become grey so quickly. Because I have lived so intensely. That I have compressed in 50 years almost 200 years.

اچاریہ رَج نیش نے امریکہ میں بہت بڑا مرکز قائم کیا تھا۔ مگر نومبر ۱۹۸۵ میں وہ گرفتار کر لیے گیے اور پھر وہاں سے نکال دیے۔ اس کے بعد وہ ہندستان آئے۔ پھر نیپال گیے۔ اس کے بعد وہ اچانک یونان چلے گیے۔ یونان کے آرتھوڈاکس چرچ نے ان کو عوام کے لیے خطرہ (A public menace) بتایا۔ اور ان کے شاگردوں کو جنسی بدمستیوں (Sex orgies) کا مجرم قرار دیا۔ چرچ نے اعلان کیا کہ اگر ان لوگوں نے ملک نہ چھوڑا تو ان کو سنگسار کیا جائے گا۔

چنانچہ ۵ مارچ ۱۹۸۶ کو یونان کی پولیس نے ان کو ملک بدر کر دیا۔ اس کے بعد رَج نیش اپنے امیر ساتھیوں کے ہمراہ ایک خصوصی جہاز پر سوار ہو کر اسپین پہونچ گیے:

> The Bhagwan said at Athens airport, that Greeks had learned nothing since Socrates was executed in 399 BC for corrupting Greek youth and preaching false gods.

بھگوان رَج نیش نے ایتھنز ائرپورٹ پر کہا کہ یونان کا فلسفی سقراط ۳۹۹ ق م میں اس جرم میں ہلاک کر دیا گیا تھا کہ وہ نوجوانوں کو بگاڑتا ہے اور جھوٹے مذہب کی تبلیغ کرتا ہے۔ اس کے بعد

سے اب تک یونانیوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۶-۷ مارچ ۱۹۸۶)

رج نیش نے یونان سے نکالے جانے کے وقت سقراط کا حوالہ اس طرح دیا ہے گویا کہ ان کا معاملہ بھی وہی ہے جو قدیم یونانی فلسفی سقراط کا معاملہ تھا۔ حالاں کہ سراسر دھاندلی ہے ۔ دونوں کا معاملہ اتنا مختلف ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔

سقراط (۴۷۰-۳۹۹ ق م) قدیم یونان کے تین بڑے فلسفیوں (سقراط، افلاطون، ارسطو) میں سے ایک تھا۔ اس کو حکومت کے فیصلہ کے تحت زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ مگر یہ سراسر ظلم کا فیصلہ تھا، سقراط مسلمہ طور پر ایک بے قصور آدمی تھا۔

سقراط، تاریخی ریکارڈ کے مطابق، نہایت پاکباز آدمی تھا۔ اس کے شاگرد افلاطون نے اس کی بابت لکھا ہے کہ وہ اپنے وقت کا سب سے زیادہ صالح اور بے غرض آدمی تھا، رج نیش کا کا جرم خود غلط ہونا ہے۔ جب کہ سقراط کا معاملہ یہ تھا کہ وہ خود نہایت صحیح آدمی تھا، اس کو صرف اس لیے مجرم قرار دیا گیا کہ وہ مجرم لوگوں کو مجرم کہتا تھا۔

سقراط کے زمانہ میں یونان کا سماج بہت بگڑا ہوا تھا۔ سقراط اس کے خلاف تبلیغ کرتا تھا۔ وہ ظاہری نمائش کے اندر چھپے ہوئے فاسد اخلاق کی پردہ دری کرتا تھا۔ سقراط خدا پر گہرا عقیدہ رکھتا تھا۔ مگر وہ یونانیوں کے مشرکانہ اوہام پر سخت تنقید کرتا تھا، سقراط کی ان باتوں کی زد وہاں کے بڑے لوگوں پر پڑتی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ سقراط پر بگڑ گیے اور انھوں نے اس پر جھوٹے الزام لگاکر اس کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پیئے۔ برٹانیکا (۱۹۸۴) کے الفاظ میں، اس کے خلاف فرد جرم دو چیزوں پر مشتمل تھی ——— نوجوانوں کو بگاڑنا۔ اور جن دیوتاؤں کو شہر کے لوگ پوجتے ہیں ان کو نظر انداز کرنا:

There were two accounts in the accusation: corruption of the young, and neglect of the gods whom the city worships (16/1001-1002).

حقیقت یہ ہے کہ سقراط کے برعکس، رج نیش مسلمہ طور پر ایک غلط آدمی ہے، اس کے باوجود اس کو اپنی صفائی کے لیے الفاظ مل گیے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو اسی طرح اپنی صفائی کے لیے الفاظ ملتے رہیں گے، خواہ باعتبار حقیقت وہ کیسا ہی مجرم کیوں نہ ہو۔ قیامت کے بھونچال سے پہلے کسی شخص سے اس کی یہ آزادی چھننے والی نہیں۔

معنی نہ کہ الفاظ

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال : من جلس فی مجلس فکثر فیہ لغطہ فقال قبل ان یقوم من مجلسہ : سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک ، الا غفر اللہ لہ ما کان فی مجلسہ ذالک (ترمذی، نسائی)

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا : جو آدمی کسی مجلس میں بیٹھا۔ وہاں زور زور سے باتیں ہوئیں پھر اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اس نے کہا ، اے اللہ تو پاک ہے اور تیری حمد ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ تو اس مجلس میں جو باتیں ہوئیں ، اللہ ان کے لیے اسے معاف کر دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان " الفاظ " کو زبان سے کہدینے کی وجہ سے اللہ اسے معاف کر دیتا ہے یہ معافی دراصل ادائگی معنی کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ محض ادائگی الفاظ کی بنا پر۔

یہ اس شخص کا حال بیان ہوا ہے جس کے دل میں اللہ کا ڈر موجود ہو۔ ایسا شخص جب کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اور وہاں کسی موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو گفتگو کے درمیان کبھی اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ زور زور سے بولتا ہے ، وہ لوگوں سے غیر ضروری تکرار کرنے لگتا ہے۔

تاہم ابھی مجلس ختم نہیں ہوتی کہ اس کو احساس ہو جاتا ہے کہ میں نے غلط کیا۔ میں نے بے فائدہ کلام کیا۔ اس وقت اس کے دل میں شرمندگی کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اپنے اندر ہی اندر اپنا احتساب کرنے لگتا ہے۔ اس سے پہلے وہ بندوں سے مخاطب تھا۔ اب وہ اپنے رب سے مخاطب ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکل پڑتے ہیں جس کا ایک نمونہ اوپر کی حدیث میں نظر آتا ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ حقیقۃً دعا کے معنی کو بتا رہے ہیں نہ کہ محض دعا کے الفاظ کو۔

توہم پرستی

قدیم زمانہ میں زندگی کا سارا نظام توہماتی عقیدوں پر قائم تھا۔ لوگوں کے درمیان عجیب عجیب بے بنیاد خیالات رائج تھے۔ علم الافلاک کی ایک کتاب میں بتایا گیا ہے کہ قدیم زمانہ میں جب کبھی سورج گرہن ہوتا تھا تو چین کے لوگ سمجھتے تھے کہ سورج کو ایک بہت بڑا اژدہا نگل رہا ہے۔ ملک کی پوری آبادی مل کر زیادہ سے زیادہ شور مچاتی تھی تاکہ سورج کو بچایا جا سکے۔ اور وہ ہمیشہ کامیاب ہوتی تھی:

When an eclipse occurred, the Chinese thought that the Sun was being swallowed by a huge dragon. The whole population joined in making as much noise as possible to scare it away. They always succeeded!
Iain Nicolson, *Astronomy*, 1978.

جیسا کہ معلوم ہے، سورج گرہن یا چاند گرہن ہمیشہ ایک متعین وقت کے لیے ہوتا ہے، اس وقت کے بعد وہ لازماً چھوٹ جاتا ہے۔ اس فلکیاتی قاعدہ کی بنا پر گرہن اپنے وقت پر چھوٹ جاتا تھا۔ مگر قدیم چین کے جاہل عوام بطور خود یہ سمجھتے تھے کہ ان کے چلّانے اور شور مچانے کی وجہ سے اژدہا نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔

توہمات کی یہ قسم موجودہ زمانہ میں ختم ہو گئی۔ مگر اس نوعیت کے دوسرے توہمات بدستور پوری شدت کے ساتھ آج کی دنیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔ آج بھی یہ صورت حال بہت بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں موجود ہے کہ ایک واقعہ جو خارجی اسباب کے تحت آزادانہ طور پر پیش آیا ہے اس کو بطور خود اپنی طرف منسوب کر لینا۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں مذہب کا احیاء ہوا ہے۔ احیاء کے یہ مناظر ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے متعین عالمی اسباب ہیں اور اس پر بڑی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک کافی معلوماتی مقالہ انگریزی جریدہ اسپین (دسمبر ۱۹۸۴) میں چھپا تھا جس کا عنوان تھا: مذہب کی طرف واپسی (A Return to Religion) مگر آپ کو ایسے خوش فہم لوگ ملیں گے جو اس ہونے والے واقعہ کو اپنے "مفکر اعظم" کے نام سے منسوب کر لیں گے اور فخر کے ساتھ کہیں گے کہ جدید عہد ہمارے مفکر کا پیدا کردہ عہد ہے، وہی اس نئے عہد کا ہیرو ہے۔

توہم پرستی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ اس کی ایک قسم ختم ہوتی ہے تو انسان کا زرخیز ذہن دوسری توہم پرستی ایجاد کر لیتا ہے۔ توہم پرستی شاید قیامت سے پہلے ختم ہونے والی نہیں۔

تاریخ کی آواز

حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں ۱۴ھ میں ایران فتح ہوا۔ اس زمانہ میں لوگوں کے ذہن پر ایرانی شہنشاہ کی اتنی عظمت تھی کہ حضرت عمرؓ اس مہم کی سربراہی کے لیے خود مدینہ سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگیے۔ مگر لوگوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔ چنانچہ ایک صحابی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو اس مشکل مہم کا سپہ سالار بنایا گیا۔

اس مہم کا آخری معرکہ قادسیہ کے قریب ایک میدان میں ہوا۔ یہاں میدان جنگ کے کنارے ایک قدیم شاہی عمارت تھی۔ حضرت سعدؓ اس کی چھت پر چڑھے اور میدان کی طرف رخ کر کے تکیہ کے سہارے بیٹھ گیے۔ وہ جنگ میں خود شریک نہیں ہوئے۔ اپنی جگہ خالد بن عرفطہ کو میدان مقابلہ کا سردار مقرر کیا۔ حضرت سعد عمارت کے اوپر بیٹھے ہوئے مسلسل جنگ کا مشاہدہ کر رہے تھے اور حسب ضرورت اپنی ہدایات پرچی پر لکھ کر خالد بن عرفطہ کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔

یہ جنگ اسلامی تاریخ کی انتہائی ہولناک جنگ تھی۔ اس جنگ میں ایرانی ہاتھیوں کی فوج لائے تھے جن کا اس سے پہلے عربوں نے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک موقع پر ہاتھیوں کی کالی آندھی نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ حضرت سعد یہ دیکھ کر بے تاب ہوگیے اور بار بار کروٹیں بدلنے لگے۔ حضرت سعد کی اہلیہ سلمیٰ جو اس وقت ان کے پاس تھیں، یہ دیکھ کر بول اٹھیں "کاش آج مثنیٰؓ ہوتا"۔ حضرت سعد نے سلمیٰ کو تھپڑ مار کر کہا۔ "مثنیٰؓ ہوتا تو وہ کیا کر لیتا"، سلمیٰ نے جواب دیا۔ "سبحان اللہ، بزدلی کے ساتھ غیرت بھی"۔ سلمیٰ نے یہ بات اس لیے کہی کہ حضرت سعدؓ خود لڑائی میں شریک نہیں تھے۔

اس کے بعد تاریخ لمبی تفصیل بیان کرتی ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے ایران کی فوجی تیاریوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر شاندار فتح حاصل کی۔

اس جنگ میں ایرانیوں کا سردار رستم تھا۔ رستم کو ہلال نامی ایک مسلمان سپاہی نے قتل کیا۔ اگرچہ فردوسی نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ رستم کا مقابلہ حضرت سعد سے ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے شاہنامہ میں لکھا ہے:

زیک سوئے رستم زیک سوئے سعد

حضرت سعدؓ کے براہِ راست جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت فوج کے اندر کافی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ایرانیوں کی شکست کے بعد ایک مسلمان فوجی نے نظم کہی جس کے دو اشعار یہ تھے:

وَقَاتَلْتُ حَتّٰی اَنْزَلَ اللّٰہُ نَصْرَہٗ ۔۔۔ وَسَعْدٌ بِبَابِ الْقَادِسِیَّۃِ مُعْصِمٗ

فَاُبْنَا وَقَدْ اٰمَتْ نِسَاءٌ کَثِیْرَۃٌ ۔۔۔ وَنِسْوَۃُ سَعْدٍ لَیْسَ فِیْہِنَّ اَیِّمٗ

میں لڑا یہاں تک کہ اللہ نے اپنی مدد بھیجی۔ اور سعد قادسیہ کے دروازے سے چپٹے رہے۔ پھر ہم واپس ہوئے اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔ اور سعد کی بیویوں میں سے کوئی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نہایت جلیل القدر صحابی تھے۔ وہ اسلام کے بڑے بڑے مجاہدوں میں شامل تھے۔ لیکن مذکورہ واقعہ کو اگر اس کی ظاہری صورت میں لیا جائے تو ایک شخص یہ رائے قائم کرے گا کہ نعوذ باللہ وہ ایک بزدل آدمی تھے۔ انھوں نے دوسروں کی عورتوں کو بیوہ بنایا اور خود اپنی بیوی کے ساتھ شاہی قلعہ میں محفوظ بیٹھے رہے۔

مگر یہ شبہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ اصل واقعہ کو ادھوری شکل میں دیکھا جائے۔ واقعہ کو پوری شکل میں دیکھیے تو یہ شبہ باقی نہ رہے گا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو عرق النسار کی بیماری تھی۔ اور وقفہ وقفہ سے اس کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ ایرانی جنگ کی ابتدا میں وہ ٹھیک حالت میں تھے۔ چنانچہ قادسیہ کے آخری معرکہ سے پہلے دوسری جنگوں میں وہ براہ راست شریک رہے۔ مگر قادسیہ کے معرکہ کے موقع پر ان کو عرق النسار کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس وقت چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ اس بنا پر مقابلہ میں براہِ راست شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر ان کے جنگی تجربات اور ان کی اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ان کو بدستور سپہ سالاری کے عہدہ پر باقی رکھا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر جنگ میں شریک نہ تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی رہنمائی اور ان کی منصوبہ بندی ہی کی وجہ سے اس معرکہ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا۔

ان کی جنگی ذہانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے عین معرکہ کے وقت ایران کی ہاتھیوں کی فوج کا حل دریافت کیا جس نے کالی آندھی کی طرح مسلمانوں کو روندنا شروع کر دیا تھا۔ عرب ذہن کے لیے یہ بالکل ایک نیا مسئلہ تھا اس لیے وہ اس کا حل سوچنے سے عاجز ہو رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے یہ کیا کہ ان ایرانیوں کو بلایا جو پہلے پارسی تھے اور اب مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے نام ضخم اور سَلمؔ وغیرہ تاریخوں میں آتے ہیں۔

حضرت سعدؓ نے ان ایرانی نومسلموں سے پوچھا کہ اس کالے طوفان کا کیا علاج ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا حل یہ ہے کہ کسی طرح ان کے سونڈ اور ان کی آنکھیں بے کار کر دی جائیں۔

اس کے بعد حضرت سعد نے مسلم فوج سے کچھ خاص جوانوں کو طلب کیا۔ ان کو پوری بات سمجھائی اور ان کو ابھارا کہ تم جان پر کھیل اس مہم کو سر کرو۔ چنانچہ قعقاع اور کچھ دوسرے جوانوں نے دو ہاتھیوں کو منتخب کیا۔ یہ دونوں ہاتھی جسامت میں سب سے بڑے تھے اور بقیہ ہاتھیوں کے لیے سردار کا کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہاتھی کا نام ابیض تھا اور دوسرے کا نام اجرب۔ مسلم جوانوں نے ان دونوں ہاتھیوں کو نرغے میں لے لیا۔ انھوں نے نہایت پھرتی سے برچھا مار کر ان کی آنکھوں کو بے کار کر دیا۔ اس کے بعد سونڈ پر اتنے زور سے تلوار ماری کہ وہ کٹ کر الگ ہو گئی۔ اب دونوں ہاتھی پیچھے کی طرف بھاگے۔ ان کو دیکھ کر بقیہ ہاتھی بھی ان کے ساتھ مڑ کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ ہاتھیوں کی جو فوج پہلے مسلمانوں کو روند رہی تھی اس نے انتہائی بے دردی کے ساتھ خود ایرانی فوج کو روند ڈالا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے مذکورہ واقعہ میں دو بہت بڑے سبق ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کے خلاف کوئی بات سامنے آئے تو آدمی کو کبھی ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کو فوراً مان لے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ کی پوری جانچ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات اس سے بالکل مختلف تھی جو بظاہر ابتدائی رپورٹ سے سامنے آئی تھی۔ جس خبر میں کسی کے خلاف بدگمانی کا پہلو ہو اس کو مکمل تحقیق کے بغیر مان لینا سراسر ایمانی تقاضے کے خلاف ہے۔

دوسرا سبق وہ ہے جس کا ثبوت قادسیہ کے موقع پر عرب فوجیوں نے دیا۔ انھیں اپنے سردار سے زبردست شکایت تھی۔ حتیٰ کہ اس شکایت کا اظہار انھوں نے اشعار کی صورت میں کیا اور وہ اشعار تمام فوجیوں کے درمیان پھیل گیے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ لوگ اپنے سردار سے بغاوت کر دیں یا جنگ میں بے جگری کے ساتھ نہ لڑیں۔ سردار سے شکایت کے باوجود وہ اپنا فرض بھرپور طور پر ادا کرتے رہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج نہ ہو وہ صرف یہ کریں گے کہ آپس میں لڑ بھڑ کر بنتے ہوئے کھیل کو بگاڑ دیں اور ایک جنگ جو جیت پر ختم ہونے والی تھی اس کو شکست اور ناکامی میں تبدیل کر دیں۔

مہر کا مسئلہ

معاشرتی زندگی میں اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان ایک متوازن تقسیم قائم کی ہے۔ یہ تقسیم عمل کے اعتبار سے ہے۔ اسلام نے دونوں صنفوں کے درمیان ایک واضح تقسیم عمل کو ملحوظ رکھا ہے۔ اسلام کے مطابق، گھر کو سنبھالنے کی ذمہ داری بنیادی طور پر عورت کے اوپر ہے اور مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے اوپر۔ تقسیم کار کا یہ اصول جن نصوص سے نکلتا ہے ان میں سے ایک قرآن کی یہ آیت ہے:

الرجال قوّامون علی النساء بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ اللّٰہ۔ (النساء ۳۴)

مرد عورتوں کے اوپر قوّام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ مرد نے اپنے مال سے خرچ کیا۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والی، پیٹھ پیچھے نگہبانی کرنے والی ہیں اللہ کی حفاظت سے۔

ہر گھر ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ اس ریاست کا ایک مسئلہ اس کا اندرونی انتظام ہے۔ اور اس کا دوسرا مسئلہ اس کی مالیات (بالفاظ دیگر، خارجی اسباب حیات کی فراہمی) ہے۔ عورت اپنی پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے پہلے کام کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اور مرد اپنی پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے دوسرے کام کی زیادہ بہتر صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے اسلام کی معاشرتی اور انتظامی تقسیم میں یہ کیا گیا ہے کہ گھر کے داخلی امور کی ذمہ داری بنیادی طور پر عورت پر ڈالی گئی ہے۔ اور گھر کے خارجی امور اور مالیات کی فراہمی کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے اوپر ہے۔

نکاح کے وقت ایک مرد مہر کے نام سے جو رقم اپنی بیوی کے حوالے کرتا ہے اس کا تعلق اسی خاص پہلو سے ہے۔ اسلام کے مطابق چوں کہ مرد اصولی طور پر عورت کے اخراجات کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے جب وہ ایک عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہ نکاح کے ساتھ اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہے کہ وہ عورت کے تمام ضروری اخراجات کی کفالت کرے گا۔ مہر اسی کی ایک علامت ہے۔ مرد اپنی بیوی کو مہر کے طور پر ایک علامتی رقم ادا کر کے عمل کی زبان میں اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی مالیاتی

کفالت کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ مہر کی اصل حیثیت یہی ہے۔

مہر معجّل

مہر اصطلاحی طور پر اس رقم (یا کسی متعین چیز) کا نام ہے جو ایک مرد نکاح کے وقت اپنی بیوی کو ادا کرتا ہے۔ اس مہر کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس کو نکاح کے وقت فوراً ادا کر دیا جائے۔ مہر کی اس قسم کو مہر معجّل کہتے ہیں۔ معجّل کا لفظ عجلت سے بنا ہے۔ یعنی جلد یا بلا تاخیر ادا کی جانے والی مہر۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے زمانہ میں عام رواج مہر معجّل ہی کا تھا۔ وہ لوگ مختصر مہر باندھتے اور نکاح کے وقت ہی اس کو ادا کر دیتے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف تفصیلات حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں اس کا ایک جزء مہر کے بارہ میں ہے۔ نکاح کی بات طے ہونے کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ ہے:

فقال وهل عندك من شئ تستحلها به۔ فقلت لا والله يا رسول الله۔ فقال وما فعلت درع سلحتكها۔ فوالذى نفس علىّ بيده انها لحطمية ما قيمتها اربعة دراهم فقلت عندى۔ فقال قد زوجتكها فابعث اليها بها فاستحلّها بها۔ فان كانت لصداق فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

(البدایہ والنہایہ، جلد ۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، کیا تمہارے پاس کوئی چیز (بطور مہر) ہے جس کے ذریعہ تم فاطمہ کو اپنے لیے جائز کرو۔ میں نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم اے خدا کے رسول۔ آپ نے کہا کہ وہ زرہ کیا ہوئی جو میں نے تم کو دی تھی۔ (حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں علی کی جان ہے، وہ زرہ ٹوٹ چکی تھی، اس کی قیمت چار درہم بھی نہ تھی۔ پس میں نے کہا کہ وہ میرے پاس ہے۔ آپ نے کہا کہ میں نے تمہارا نکاح فاطمہ سے کر دیا تو اس زرہ کو فاطمہ کے پاس بھیج دو اور اس کے ذریعہ فاطمہ کو اپنے لیے جائز کرو۔ تو یہ تھا فاطمہ بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مہر۔

حضرت ربیعہ اسلمی کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اے ربیعہ تم نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں۔ یہ سوال وجواب کئی بار ہوا۔ آخر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انصار کے فلاں قبیلہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بھیجا ہے اور کہا ہے کہ تم فلاں عورت سے میرا نکاح کر دو۔ چنانچہ میں نے جاکر کہا اور انھوں نے میرا نکاح کر دیا۔ مگر مجھے یہ غم تھا کہ میرے پاس مہر دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں نے واپس آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا :

فقال رسول اللّٰہ صلے اللہ علیہ وسلم یا بُریدۃ الاسلمی اجمعوا لہ وزن نواۃ من ذھب۔ قال فجمعوا لی وزن نواۃ من ذھب۔ فاخذتُ ما جمعوا لی فاتیت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اذھب بھذا الیھم فقل لھم ھذا اصداقھا۔ فاتیتُھم فقلت ھذا صداقھا فقبلوہ ورضوہ وقالوا کثیر طیب

(البدایہ والنہایہ جلد ۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ اسلم کے سردار بریدہ اسلمی سے کہا کہ اے بریدہ، تم لوگ اس کے لیے ایک گٹھلی کے ہم وزن سونا جمع کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے میرے لیے ایک گٹھلی کے ہم وزن سونا جمع کیا پھر میں نے جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا لیا اور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو لے کر ان کے پاس جاؤ اور کہو کہ یہ اس کا مہر ہے۔ پھر میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ یہ اس کا مہر ہے انھوں نے قبول کیا اور وہ راضی ہو گیے انھوں نے کہا کہ بہت ہے، اچھا ہے۔

مہر مؤجل

مہر کی دوسری صورت یہ ہے کہ مرد یہ وعدہ کرے کہ وہ اتنی مدت میں اس کو ادا کر دے گا اس دوسری قسم کی مہر کا شرعی نام مہر مؤجل ہے۔ مؤجل کا لفظ اجل (مدت) سے بنا ہے۔ مہر مؤجل کا مطلب یہ ہے کہ وہ مہر جس کی ادائگی کے لیے ایک وقت اور ایک مدت مقرر کر دی جائے۔ اگر بوقت نکاح فوراً مہر ادا نہ کیا جا رہا ہو تو اسی وقت اس کی ادائگی کی مدت کی تعیین ضروری ہے۔

مہر مؤجل کی ایک مثال حضرت موسیٰؑ کے نکاح میں ملتی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکل کر مدین پہونچے تو وہاں انھوں نے حضرت شعیب کی صاحبزادی (صفو) سے نکاح کیا۔ یہ نکاح مہر مؤجل پر ہوا تھا۔ نکاح کی مہر طرفین کی رضامندی سے یہ قرار پائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بوڑھے خسر حضرت شعیب کی بکریاں چرائیں۔ اس گلہ بانی کی اجل (مدت) کم

م آٹھ سال زیادہ سے زیادہ دس سال تھی۔ اس کے مطابق حضرت موسیٰ کا نکاح ہوا اور پھر انھوں نے
دس سال تک حضرت شعیب کے گھر پر خدمت کی۔ اس طرح مہر موجل کو پورا کرکے وہ دوبارہ مدین سے
مصر کے لیے روانہ ہوگیے (القصص)

مہر مؤجل کسی قسم کے غیر متعین مہر کا نام نہیں ہے۔ شرعی اعتبار سے مہر موجل وہ ہے جس
کی ادائیگی کی اجل (مدت) بوقت نکاح طے ہو اور وہ اپنے مقررہ وقت پر پوری طرح ادا
کردی جائے۔

فقہار کی رائے

مہر کا اصل شرعی طریقہ یہ ہے کہ اس کو نکاح کے وقت فوراً ادا کر دیا جائے۔ اسی پر اکثر صحابہ
کا عمل رہا ہے۔ گویا اصل مہر وہی ہے جو مہر معجل ہو۔ مہر کی دوسری قسم (مہر مؤجل) دوسرا برابر درجہ
کا طریقہ نہیں۔ یہ صرف رخصت کا طریقہ ہے۔ اصلاً مہر کی ایک ہی قسم ہے، اور وہ فوراً ادا کردینا ہے تاہم
بطور رخصت یہ دوسرا طریقہ بھی رکھا گیا ہے تاکہ آدمی حسب ضرورت نکاح کے بعد بھی مقرر مدت پر
اس کو ادا کرکے بری الذمہ ہوسکے۔

مہر کے بارہ میں تفصیلی ابواب فقہ کی کتابوں میں آئے ہیں۔ عبدالرحمٰن الجزیری کی کتاب
الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں مہر (مباحث الصداق) پر ۸۵ صفحات ہیں۔ مہر کے مؤجل یا معجل
(تاجیل الصداق وتعجیلہ) کے مسائل چار صفحات میں بیان ہوئے ہیں۔ اس بارہ میں اگرچہ فقہار
کے درمیان بعض اختلافات ہیں مگر وہ تمام تر جزئی ہیں۔ ان جزئی اختلافات سے قطع نظر مختلف
فقہار کے اقوال کا خلاصہ صاحب کتاب کے الفاظ میں یہ ہے:

الحنفية: قالوا يجوز تأجيل الصداق وتعجيله كله اوبعضه۔ ولكن يشترط ان لا يكون الأجل مجهولاً۔	حنفیہ کا کہنا ہے کہ مہر کی تاخیر جائز ہے۔ اس کا کل یا جز فوری طور پر دیا بھی جاسکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مدت غیر متعین نہ ہو۔
المالكية: فاذا كان الصداق غير معين فانه يجوز كله اوبعضه بشرط ان لا يكون الأجل مجهولاً۔	مالکیہ کا قول ہے کہ مہر جب غیر معین ہو تو اس کا کل یا جز جائز ہے اس شرط پر کہ مدت مجہول (غیر متعین) نہ ہو۔

الحنابلة: قالوا يجوز ان يؤجل الصداق كلّه اوبعضه بشرط ان لا يكون الاجل مجهولاً۔

حنابلہ کا کہنا ہے کہ یہ جائز ہے کہ مہر کا کل یا جزء موخر کیا جائے اس شرط پر کہ مدت مجہول نہ ہو۔

الشافعية: قالوا يجوز تأجيل الصداق بشرط ان لا يكون الاجل مجهولاً سواءً كان الموجل كل الصداق اوبعضه۔

شافعیہ کا کہنا ہے کہ مہر کی تاخیر جائز ہے اس شرط پر کہ مدت مجہول نہ ہو۔ خواہ مہر کا کل حصہ موجل ہو یا اس کا جزئی حصہ۔

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ الجزء الرابع، مصر ۱۹۶۹، صفحہ ۱۵۶-۱۵۳

زیادہ مہر نہیں

مہر رقم میں بھی دی جا سکتی ہے اور کسی چیز کی صورت میں بھی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی مقدار حسب استعداد مقرر کی جائے۔ وہ اتنی ہی ہو کہ آدمی سہولت کے ساتھ اس کو اسی وقت ادا کر سکے۔ مہر کی کم سے کم حد کے بارہ میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں۔ تاہم ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مہر کی کم سے کم مقدار یہ ہے کہ وہ اتنی ہو کہ اس کے ذریعے سے ضرورت کی کوئی چیز خریدی جا سکے۔ ہر وہ رقم مہر بن سکتی ہے جو کسی چیز کی قیمت ہو (کل ما صح ثمنا صح صداقا، الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۴، صفحہ ۱۰۷)

احادیث میں کوئی بھی ایسی حدیث نہیں جس میں زیادہ مہر مقرر کرنے کی ہمت افزائی کی گئی ہو۔ اس کے برعکس بہت سی روایتیں ہیں جن میں کم مہر مقرر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اسلام کا طریقہ ہمیشہ تلقین کا ہوتا ہے نہ کہ تحریم کا۔ چنانچہ زیادہ مہر کو اگرچہ بالکل ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہے مگر تمام روایتیں اسی کے حق میں ہیں کہ مہر زیادہ نہ باندھی جائے۔ چند روایتیں یہ ہیں:

عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خیر النساء ایسرهن صداقاً۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سب سے بہتر عورت وہ ہے جس کا مہر سب سے آسان ہو۔

عن عائشة انه صلی اللّٰہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کی

قال : من يمن المرأة سهل امرها وقلة صداقها ۔

برکت میں سے یہ ہے کہ اس کا معاملہ سہل ہو اور اس کا مہر کم ہو ۔

روی احمد والبیهقی : اعظم النساء برکةً ایسرهن صداقاً

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ برکت والی عورت وہ ہے جس کا مہر سب سے آسان ہو ۔

عن ابی سلمة قال سألتُ عائشة کم کان صداق النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم. قالت کان صداقه لازواجه اثنتی عشر اوقیة ونش ۔ قالت اتدری ما النش ۔ قلتُ لا ۔ قالت نصف اوقیة (رواہ مسلم) فتلك خمس مأة درهم ۔ هذا صداق رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لازواجه ۔ لکن ام حبیبة اصدقها النجاشی عن النبیّ صلی اللّٰہ علیه وسلم اربعة آلاف درهم ۔

(التفسیر المظہری ، المجلد الثانی ، صفحہ ۵۱)

حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کا مہر کتنا تھا ۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مہر اپنی بیویوں کے لیے بارہ اوقیہ اور ایک نش تھا ۔ انھوں نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ نش کیا ہے ۔ راوی نے کہا کہ نہیں ۔ انھوں نے کہا کہ نصف اوقیہ ۔ یہ تقریباً پانچ سو درہم ہوا یہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مہر اپنی بیویوں کے لیے تھا ۔ لیکن ام حبیبہ کا مہر چار ہزار درہم تھا اور اس کو شاہ نجاشی نے (غائبانہ نکاح) میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خود مقرر کیا تھا ۔

غیر افضل طریقہ

روایات میں آتا ہے کہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ مہر میں کس نے چار سو درہم پر اضافہ کیا ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا مہر آپس میں چار سو درہم یا اس سے کم ہوتا تھا ۔ اور اگر مہر میں زیادتی تقویٰ اور عزت کی بات ہوتی تو تم مہر کے بارے میں ان سے آگے نہیں جا سکتے تھے ۔

دوسری روایت میں ہے کہ خلیفہ دوم نے فرمایا کہ اے لوگو ، تم عورتوں کے مہر زیادہ نہ باندھو ۔ اور مجھے جس شخص کے بارے میں بھی یہ اطلاع ملے گی کہ اس نے رسول اللہؐ کے مہر سے زیادہ مہر باندھا ہے

یا کسی کو اس سے زیادہ مہر دیا گیا ہے تو میں زیادہ مقدار کو لے کر اس کو بیت المال میں جمع کر دوں گا۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اترے تو قریش کی ایک عورت سامنے آئی۔ اس نے کہا اے امیر المومنین، اللہ کی کتاب زیادہ پیروی کے قابل ہے یا آپ کا قول۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ عورت نے کہا کہ ابھی آپ نے لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ عورتوں کے مہر میں زیادتی نہ کریں۔ اور اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ ــــــ اور اگر تم نے کسی عورت کو زیادہ مال دیا ہے تو (طلاق کے بعد) اس میں سے کچھ نہ لو۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: ہر ایک عمر سے زیادہ جانتا ہے (کل احد افقہ من عمر) آپ نے یہ فقرہ تین بار کہا۔ اس کے بعد حضرت عمر دوبارہ منبر پر آئے اور لوگوں سے کہا:

انی کنت نھیتکم ان تغالوا فی صداق النساء فلیفعل رجل فی مالہ ما بدا لہ (وعند ابی عمر بن فضالۃ فی امالیہ عن عمر قال) لو کان المھر سناءً و رفعۃ فی الآخرۃ کان بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ونساءہ احق بذلک (کنز العمال)

میں نے تم کو عورتوں کا مہر زیادہ باندھنے سے روکا تھا۔ اب ہر آدمی کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مال میں جو چاہے کرے (آپ نے مزید فرمایا) مہر اگر آخرت میں بلندی اور عظمت کی چیز ہوتی تو یقیناً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں اس کی زیادہ مستحق تھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نکاح میں زیادہ مہر باندھنا اگرچہ خالص قانونی اعتبار سے بالکل ممنوع چیز نہیں مگر وہ یقینی طور پر غیر افضل چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے مہر کم تھے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ اس نے اپنا یا اپنی بیٹیوں کا مہر زیادہ مقرر کیا ہو۔

صحابہ کی شادی

دور اول میں شادی کوئی دھوم کی چیز نہ تھی۔ وہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بس سادہ طور پر انجام دے لیا جائے۔ اس کے رسوم اور اس کے اخراجات اتنے مختصر ہوں کہ وہ طرفین کے لیے کسی بھی اعتبار سے بوجھ نہ بنے۔ صحابہ کے یہاں شادی کی تقریب ہر قسم کے تکلف اور نمائش سے بالکل خالی ہوتی تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ بابرکت

وہ ہے جس میں کم سے کم بوجھ ہو (اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ ، مسند احمد)
جھ والا نکاح یقیناً وہ ہے جو اپنے موجودہ وسائل کے ذریعے آسانی کے ساتھ ہو جائے ۔ نہ کردہ
ا تحمل اس کے وسائل نہ کر سکتے ہوں ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا معاملہ آیا جس کا نکاح ایک خاتون سے طے
ما ۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر دینے کے لیے کیا ہے ۔ اس نے کہا کہ کچھ نہیں ۔
نے دوبارہ پوچھا ۔ اس نے کہا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ۔ اس کے بعد آپ نے اس سے یہ نہیں کہا
ا کر کسی سے قرض لاؤ اور پھر اس کے ذریعہ سے نکاح کرو ۔ بلکہ اگلا سوال آپ نے یہ کیا کہ کیا
ے پاس کچھ قرآن ہے (قرآن کا کچھ حصہ تم کو یاد ہے) اس نے کہا کہ ہاں ۔ آپ نے فرمایا جاؤ،
ۃ قرآن کے اسی محفوظ حصہ کو مہر قرار دے کر اس خاتون کے ساتھ تمہارا نکاح کر دیا (زوجتکہا
بما معک من القرآن ، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ، جلد ۴ ، صفحہ ۱۰۷)

مشہور صحابی حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ نے مدینہ میں شادی کی ۔ اس وقت مدینہ میں
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم موجود تھے ۔ مگر انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
سرے بڑے صحابہ کو اس موقع پر بلائیں ۔ انھوں نے بس خاموشی سے ایک خاتون کے ساتھ نکاح کر لیا
سلہ میں امام احمدؒ نے مفصل روایت نقل کی ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے :

(عبد الرحمن بن عوف) وعليه
زعفران ۔ فقال رسول الله صلى الله
وسلم مَهْيَمْ ۔ فقال يا رسول الله تزوجت
امرأة ۔ قال ما اصدقتها ۔ قال
نواة من ذهب ۔
(البداية والنهاية جلد ۳)

حضرت عبد الرحمن بن عوف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان کے اوپر زعفران کی خوشبو کا اثر تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ کیا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایک عورت سے نکاح کر لیا ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کو کتنا مہر دیا ۔ انھوں نے کہا کہ کھجور کی گٹھلی کے وزن کے برابر سونا ۔

غلط رواج

موجودہ زمانہ میں نکاح کی اصل اسلامی روح تقریباً ختم ہو گئی ہے ۔ مسلمانوں میں آج نکاح

کا جو طریقہ عام طور پر نظر آتا ہے وہ اسلامی نکاح سے زیادہ رواجی نکاح ہے۔ اس کا ایک نمونہ مہر ہے لڑکی والے عام طور پر مہر زیادہ باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا مقصد مرد کے مقابلہ میں عورت کے مفاد کی حفاظت ہے۔

ڈکشنری آف اسلام میں اس سلسلہ میں حسب ذیل الفاظ درج ہیں :

> The custom of fixing heavy dowers, generally beyond the husband's means, especially in India, seems to be based upon the intention of checking the husband from ill-treating his wife, and, above all, from his marrying another woman, as also from wrongfully or causelessly divorcing the former. For in the case of divorce the woman can demand the full payment of the dower.
>
> *The Dictionary of Islam*
> by Thomas Patrick Hughes, (1979) p. 91

بہت زیادہ مہر باندھنے کا رواج جو شوہر کے ذرائع سے زیادہ ہو، خاص طور پر ہندستان میں، بظاہر اس مقصد سے ہے کہ شوہر کو اس سے روکا جائے کہ وہ بیوی کے ساتھ برا سلوک کرے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ دوسری شادی نہ کر سکے۔ اور مزید یہ کہ وہ غلط طور پر یا بلا سبب اپنی بیوی کو طلاق نہ دے۔ کیوں کہ طلاق کی صورت میں عورت پوری مہر کی ادائیگی کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

مذکورہ مقصد کے تحت مہر زیادہ باندھنا اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ نکاح کے موقع پر مہر تو مقرر کرنا ہے مگر اس کو ادا نہیں کرنا ہے۔ اگر نکاح کے ساتھ فوراً مہر ادا کر دیا جائے تو مانع طلاق یا اور کسی مانع کی حیثیت سے اس کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ جب مہر خود باقی نہیں رہا تو اس کے مانع ہونے کی حیثیت کیسے باقی رہے گی۔

مگر یہ مفروضہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اسلام میں مہر کی جائز صورتیں صرف دو ہیں۔ ایک مہر معجل، یعنی وہ مہر جو نکاح ہونے کے بعد اسی وقت ادا کر دیا جائے دوسرے مہر مؤجل، یعنی وہ مہر جس کو فوراً ادا نہ کیا جائے بلکہ اس کی ادائیگی بعد کو ہو۔ مگر یہ "بعد" لازمی طور پر متعین ہونا چاہیے۔ یعنی مرد اس کی ادائیگی کی ایک اجل (مدت) مقرر کرے اور اس مدت پر لازماً اس کو ادا کر دے۔ تیسری مروجہ شکل (نکاح کے وقت ادائیگی مہر کی مدت مقرر نہ کرنا) ایک غیر شرعی طریقہ ہے۔ اس کی بنیاد پر جو کچھ کیا جائے وہ بھی یقیناً غیر شرعی ہوگا۔

اب غور کیجئے کہ جب مہر کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ یا تو اس کو فوراً بوقت نکاح ادا کر دیا جائے یا نکاح کے وقت ایک متعین مدت مقرر کی جائے اور اس متعین مدت پر اس کو ضرور ادا کر دیا جائے تو ایسی صورت میں طلاق کو روکنے کے لیے زیادہ مُہر مقرر کرنا بالکل بے معنی ہے۔ صرف وہی مہر مانع کا کام کر سکتی ہے جو بلا تعین مدّت مقرر کی جائے۔ مگر یہ خود اسلامی طریقہ کے مطابق نہیں۔ مہر کے لیے ادائیگی مدت کی تعیین اپنے آپ اس کو اس اعتبار سے بے اثر کر دیتی ہے کہ وہ مرد کے لیے مانع طلاق کا کام دے۔

مکان بنانے کا کام بنیاد سے شروع ہوتا ہے

اور

قوم بنانے کا کام شعور بنانے سے۔

ماہنامہ الرسالہ قوم کی تعمیر کا یہی بنیادی کام کر رہا ہے۔

وہ افرادِ قوم کا شعور بنانے میں مصروف ہے۔

اس مہم میں ساتھ دینا ایک تاریخ ساز مہم میں ساتھ دینا ہے۔

الرسالہ کو پڑھیے

الرسالہ کو پڑھائیے

اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے جس میں آپ کو لگنا چاہیے۔

یہی آج کی سب سے بڑی مہم ہے جس میں آپ کو ساتھ دینا چاہیے۔

قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجئے

ایک گزارش

اسلامی مرکز کے تحت تعمیر ملت اور احیار اسلام کا جو کام ہو رہا ہے وہ خدا کے فضل سے کافی پھیل چکا ہے۔ مگر اسلامی مرکز کے پاس آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں۔ اس کا کام اب تک ہمدردوں اور متفقین کے تعاون سے چل رہا ہے۔

آپ سے ہماری گزارش ہے کہ آپ اس دینی تعاون میں اپنا حصہ ادا فرمائیں۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی اشاعت خدا کے فضل سے کافی بڑھ چکی ہے۔ مگر قیمت کم رکھنے کی وجہ سے عملاً وہ خسارہ پر چل رہا ہے۔ اشاعت میں اضافہ صرف اس کے خسارہ میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی تلافی کی واحد صورت یہی ہے کہ اصحاب خیر اپنے تعاون سے اس کے نقصان کو پورا فرمائیں۔ مزید نئی دعوتی اسکیموں کو شروع کرنے کا مسئلہ اس کے علاوہ ہے۔ ان کاموں کے لیے مختلف مد کی رقمیں بھیجی جا سکتی ہیں۔ آپ اپنی رقم بھیجتے ہوئے صراحت فرما دیں کہ وہ کس مد کی رقم ہے۔

وحیدالدین خاں
صدر اسلامی مرکز

خبرنامہ اسلامی مرکز ــ ۱۹

۱۔ نیویارک کی مذاہب کانفرنس (نومبر ۱۹۸۵) میں دنیا بھر سے تمام مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر تمام مذاہب کے لوگوں سے ربط قائم ہوا تھا۔ چنانچہ تمام نمائندوں کے مکمل پتے حاصل کر لیے گئے تھے۔ ان تمام پتوں پر الرسالہ انگریزی کے شمارے روانہ کیے گئے ہیں۔ اس طرح الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے دنیا کے ہر گوشے میں پہونچ گیا ہے۔

۲۔ مختلف مساجد اور اجتماعی اداروں سے اطلاع مل رہی ہے کہ الرسالہ کا ٹائٹل یا اس کا کوئی مضمون بورڈ پر لکھ کر عوامی جگہ پر آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اس قابل ہے کہ ہر جگہ اس کو استعمال کیا جائے۔

۳۔ عصری اسلوب میں اسلامی تعلیمات پیش کرنا اسلامی مرکز کی ایسی امتیازی خصوصیت بن چکا ہے کہ اب جو شخص اس موضوع پر کوئی موثر تقریر یا تحریر پیش کرنا چاہتا ہے وہ اسلامی مرکز کی مطبوعات سے استفادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی مثالیں بار بار سامنے آتی رہتی ہیں۔ مثلاً لاہور کے ماہنامہ حکمتِ قرآن (فروری ۱۹۸۶) میں اس کے فاضل ایڈیٹر کے قلم سے ایک خصوصی مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "سائنسی منہاج اور جدید فکر" اس مضمون کا بیشتر حصہ ان دو مضامین کی لفظ بلفظ نقل ہے جو ہماری کتاب "مذہب اور سائنس" اور "اسلام اور عصرِ حاضر" میں چھپ چکے ہیں۔ اگرچہ حوصلہ کی کمی وجہ سے مضمون نگار نے نہ صرف یہ کہ اصل کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے بلکہ پورا مضمون خود اپنے نام سے شائع فرمایا ہے۔ قدیم زبان میں اس کو "ادبی سرقہ" کہا جاتا تھا۔ مگر ہم اس کے بجائے اس کو "بلا اعلان اعتراف" کہنا پسند کریں گے۔

۴۔ الرسالہ کے افکار الرسالہ کے علاوہ دوسرے بالواسطہ انداز سے بھی پھیل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ اردو اور دوسری زبانوں کے متعدد جرائد الرسالہ کے مضامین کو اپنے صفحات میں مسلسل چھاپ رہے ہیں۔ مثلاً پاکستان کا روزنامہ آفاق "نشانِ منزل" کے تحت اپنے خصوصی کالم میں الرسالہ کا ایک مضمون پورے حوالے کے ساتھ مسلسل

شائع کر رہا ہے۔ روزنامہ آفتاب بیک وقت لاہور، راولپنڈی، سرگودھا، رحیم یارخاں اور کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ وغیرہ

۵۔ حیدرآباد کی سالانہ نمائش (جنوری۔فروری ۱۹۸۶) کے موقع پر اسلامی مرکز کی مطبوعات رکھی گئی تھیں۔ اس کا اہتمام ادبی ٹرسٹ (حیدرآباد) نے کیا تھا۔ معقول تعداد میں کتابیں فروخت ہوئیں اور بہت سے لوگوں نے ان کو دیکھا اور معلومات حاصل کیں۔

"پیغمبر انقلاب" کے بعض حصوں کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کیا گیا ہے اور وہ چھپ کر تقسیم ہو رہا ہے۔ اس کے ترجمے اور طباعت و اشاعت کا اہتمام پونہ کی مرکزی شاخ نے کیا ہے۔

۶۔ پونہ میں حلقۂ الرسالہ کے تحت ایک اجتماع ۲۰۔۲۱ مارچ ۱۹۸۶ کو ہوا۔ اس میں دہلی سے صدر اسلامی مرکز نے بھی شرکت کی۔

۷۔ الرسالہ اردو اور انگریزی نیز ہماری مطبوعات دن بدن اپنی مقبولیت بڑھاتی جا رہی ہیں۔ بیشتر لوگ اس کو دیکھتے ہی اس کو پسند کر لیتے ہیں اور مستقل طور پر اپنے مطالعہ میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ الرسالہ کے سابق شماروں کی مانگ بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں برابر ہم کو خطوط ملتے رہتے ہیں۔ یہاں دو ہندو بھائی کے خط نقل کیے جا رہے ہیں:

آپ کی کتاب "اللہ اکبر" مجھے اسی جمعرات کو عطا ہوئی۔ میں اس کے مطالعہ میں اس قدر کھو گیا کہ آج صبح یعنی سنیچر وار کو اس کو سارا پڑھ کے ہی دم لیا۔ یہ بھی اسی قادر مطلق کی شان ہے۔ ورنہ اتنی بڑی ضخیم کتاب کو اتنی جلدی پڑھ لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یقین مانیے کہ خیالات کی روانی کا نازل ہونا بھی عبادت کی راہ میں ایک سٹیج ہے۔ جس میں آپ اس وقت پہونچ چکے ہیں۔ میں آپ کو اس کے لیے بدھائی دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ "ہوز ور قلم اور زیادہ" تاکہ آپ اسی طرح بنی نوع انسان کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔ اگر آپ کی تحریروں سے ایک بھی غیر مومن، مومن بن گیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی محنت سپھل ہو گئی۔ آمین۔

Awal, Awal Enterprises, 1, Jangpura Road, Bhogal, New Delhi

۸۔ ایک انگریزی خط (۲۳ فروری ۱۹۸۶) اگلے صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

SHRI TILAK
ADVOCATE

Feb.23,1986

The Circulation Manager,
Al-Risala, Monthly,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi-110 013

Dear Sir,

I am interested in your Al-Risala and would like to subscribe to it as from its very first issue.

I would thankfully appreciate if you could kindly let me know if back numbers are available and quote its subscription charges.

Thanking you,

Yours faithfully,

(SHRI TILAK)

Residence
Kesa Sub Station wala Bungalow
2A/407, Azadnagar
Kanpur–208 002
Phone 244549
7 To 9 AM

Chamber
Behind P. P. Office
46 Collectorate
Kanpur–208 001
10 To 5 PM

Office
Sarsaiya Ghat Road
16/61, Civil Lines
Kanpur–208 001
Phone 61536
7 To 9 PM

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی
اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچ
الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ
تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین دریا
الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے
طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبو
اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ ا
کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں
صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً
تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں او
کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ ا
پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا ج

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے

Regd No D(SE) 243
Regd R N No 28822/76

May 1986
Number 114

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

دوسروں کی شکایت کرنا اکثر حالات میں —
صرف اپنی نااہلی کا اعتراف ہوتا ہے

جون ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۵ | جون ۱۹۸۶

فہرست

روزہ اور کردار

مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ (رواہ البخاری)

جس روزہ دار نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور اپنا پینا چھوڑ دے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کی عبادت کی قیمت اس وقت ہے جب کہ اسی کے ساتھ وہ جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا چھوڑے ہوئے ہو۔ جو شخص اس طرح عبادت کرے کہ عبادت گزاری کے ساتھ وہ جھوٹ بولتا ہو اور جھوٹ پر عمل کرتا ہو تو اس کی عبادت گزاری اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں ٹھہرے گی۔ اللہ کو بے جھوٹ کا عمل مطلوب ہے نہ کہ وہ عمل جس کے ساتھ جھوٹ شامل ہو۔

اس حدیث میں دو لفظ آئے ہیں۔ ایک ہے جھوٹ بولنا۔ دوسرے جھوٹ پر عمل کرنا۔ جھوٹ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی گفتگو میں اِس کی پابندی نہ کرتا ہو کہ وہ ہمیشہ مطابق واقعہ بات کہے۔ اور جو بات واقعہ کے مطابق نہ ہو اس کو اپنی زبان سے نہ نکالے۔ تاہم صرف وہی شخص جھوٹا نہیں ہے جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہو، جو پہلے سے طے کیے ہوئے ذہن کے مطابق جھوٹی بات کہے۔ حدیث کے مطابق وہ شخص بھی جھوٹا ہے جو خود ارادہ کرکے جھوٹ نہ بولے، مگر وہ ایسی بات کہے جو عملاً ایک جھوٹی بات ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سنی ہوئی بات کو بلاتحقیق دہرانا بھی جھوٹ ہے:

كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اس کو بیان کرنے لگے۔

جھوٹ پر عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی جھوٹ کو اپنے عمل کی بنیاد بنائے۔ وہ جھوٹا نعرہ کھڑا کرکے قوم کے اوپر لیڈری حاصل کرے۔ وہ ایک بے بنیاد قصہ گھڑ کر اس کے ذریعہ کسی بندۂ خدا کو بدنام کرے۔ وہ جھوٹی دستاویز تیار کرکے کسی کی جائداد کو اپنی جائداد بنائے۔ وہ فرضی تقریریں کرکے عوام کے درمیان مقبولیت حاصل کرے۔ وہ موجودہ دنیا میں جھوٹ کی بنیاد پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے نہ کہ سچ کی بنیاد پر۔

شہد کا سبق

شہد کی مکھیاں پھولوں کا جو رس جمع کرتی ہیں وہ سب کا سب شہد نہیں ہوتا۔ اس کا صرف ایک تہائی حصہ شہد بنتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کو ایک پونڈ شہد کے لیے ۲۰ لاکھ پھولوں کا رس حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے مکھیاں تقریباً ۲۰ لاکھ اڑانیں کرتی ہیں۔ اور اس دوران میں وہ مجموعی طور پر ۵۰ ہزار میل تک کی مسافت طے کرتی ہیں۔ رس جب مطلوبہ مقدار میں جمع ہوجاتا ہے تو اس کے بعد شہد سازی کا عمل شروع ہوتا ہے۔

شہد اپنے ابتدائی مرحلہ میں پانی کی طرح رقیق ہوتا ہے۔ شہد تیار کرنے والی مکھیاں اپنے پروں کو پنکھے کی طرح استعمال کرکے فاضل پانی کو بھاپ کی مانند اڑا دیتی ہیں۔ جب یہ پانی اڑجاتا ہے تو اس کے بعد ایک میٹھا سیال باقی رہ جاتا ہے جس کو مکھیاں چوس لیتی ہیں۔ مکھیوں کے منھ میں ایسے غدود ہوتے ہیں جو اپنے عمل سے اس میٹھے سیال مادہ کو شہد میں تبدیل کردیتے ہیں۔ اب مکھیاں اس تیار شہد کو چھتے کے مخصوص طور پر بنے ہوئے سوراخوں میں بھر دیتی ہیں۔ یہ سوراخ دوسری مکھیاں موم کے ذریعہ حد درجہ کاریگری کے ساتھ بناتی ہیں۔ مکھیاں شہد کو ان سوراخوں میں بھر کر اس کو "ڈبہ بند" غذا کی طرح اہتمام کے ساتھ محفوظ کردیتی ہیں تاکہ آئندہ وہ انسان کے کام آسکے۔

اس طرح کے بے شمار اہتمام ہیں جو شہد کی تیاری میں کیے جاتے ہیں۔ خدا ایسا کر سکتا تھا کہ طلسماتی طور پر اچانک شہد پیدا کردے یا پانی کی طرح شہد کا چشمہ زمین پر بہا دے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ خدا ہر قسم کی قدرت کے باوجود شہد کو اسباب کے ایک حد درجہ کامل نظام کے تحت تیار کرتا ہے۔ تاکہ انسان کو سبق ہو۔ وہ جانے کہ خدا نے دنیا کا نظام کس ڈھنگ پر بنایا ہے اور کن قوانین و آداب کی پیروی کرکے خدا کی اس دنیا میں کوئی شخص کامیاب ہوسکتا ہے۔

شہد کی مکھی جس طرح عمل کرتی ہے اس کو ایک لفظ میں، منصوبہ بند عمل کہہ سکتے ہیں۔ یہی اصول انسان کے لیے بھی ہے۔ انسان بھی صرف اس وقت کوئی بامعنی کامیابی حاصل کرسکتا ہے جب کہ وہ منصوبہ بند عمل کے ذریعہ اپنے مقصد تک پہونچنے کی کوشش کرے۔ منظم اور منصوبہ بند عمل ہی اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا واحد یقینی طریقہ ہے، شہد کی مکھی کے لیے بھی اور انسان کے لیے بھی۔

درخت

درخت کا ایک حصہ تنہ ہوتا ہے اور دوسرا حصہ اس کی جڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ درخت کا جتنا حصہ اوپر ہوتا ہے تقریباً اتنا ہی حصہ زمین کے نیچے جڑ کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ درخت اپنے وجود کے نصف حصہ کو سرسبز و شاداب حقیقت کے طور پر اس وقت کھڑا کر پاتا ہے جب کہ وہ اپنے وجود کے بقیہ نصف حصہ کو زمین کے نیچے دفن کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ درخت کا یہ نمونہ انسانی زندگی کے لیے خدا کا سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی تعمیر اور استحکام کے لیے لوگوں کو کیا کرنا چاہیے۔ ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے :

Root downward — fruit upward. That is the divine protocol. The rose comes to perfect combination of colour, line and aroma atop a tall stem. Its perfection is achieved, however, because first a root went down into the homely matrix of the common earth. Those who till the soil or garden understand the analogy. Our interests have so centred on gathering the fruit that it has been easy to forget the cultivation of the root. We cannot really prosper and have plenty without first rooting in a life of sharing. The horn of plenty does not stay full unless first there is rooting in sharing.

جڑ نیچے کی طرف، پھل اوپر کی طرف۔ یہ خدائی اصول ہے۔ گلاب کا پھول رنگ اور خوشبو کا ایک معیاری مجموعہ ہے جو ایک تنہ کے اوپر ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اس کا معیار اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ پہلے ایک جڑ نیچے مٹی کے اندر گئی۔ وہ لوگ جو زمین میں کھیتی کرتے ہیں یا باغ لگاتے ہیں وہ اس اصول کو جانتے ہیں۔ مگر ہم کو پھل حاصل کرنے سے اتنی زیادہ دل چسپی ہے کہ ہم جڑ جمانے کی بات آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ ہم حقیقۃً ترقی اور خوش حالی حاصل نہیں کرسکتے جب تک ہم مشترک زندگی میں اپنی جڑیں داخل نہ کریں۔ مکمل خوش حالی مشترک زندگی میں جڑیں قائم کیے بغیر ممکن نہیں۔

درخت زمین کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ مگر وہ زمین کے اندر اپنی جڑیں جماتا ہے۔ وہ نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتا ہے نہ کہ اوپر سے نیچے کی طرف۔ درخت گویا قدرت کا معلّم ہے جو انسان کو یہ سبق دے رہا ہے : اس دنیا میں داخلی استحکام کے بغیر خارجی ترقی ممکن نہیں۔

قدرت کا نظام

اگر آپ اپنا کمرہ بند کرکے باہر چلے جائیں اور چند مہینہ کے بعد واپس آکر اسے کھولیں تو ہر طرف اتنی گرد پڑی ہوئی ہوگی کہ جب تک آپ اسے صاف نہ کرلیں آپ اس کمرہ میں بیٹھنا پسند نہ کریں گے۔ تیز ہوا کے ساتھ جب گرد اٹھتی ہے تو آدمی سخت پریشان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ کب یہ گرد کی آفت اس سے دور ہوجائے۔

لیکن گرد کیا ہے۔ یہ زمین کی اوپری سطح کی وہ زرخیز مٹی ہے جس سے ہر قسم کی سبزیاں، پھل اور غلے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر زمین کی سطح پر یہ مٹی نہ ہو تو زمین پر زندگی گزارنا آدمی کے لیے ناممکن ہوجائے۔

پھر یہی گرد ہے جو فضا میں کثافت پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے پانی کے بخارات بادل کی صورت اختیار کرتے ہیں اور بوند بوند کرکے زمین پر برستے ہیں۔ زمین کی اوپری فضا میں گرد نہ ہو تو بارش کا عمل ختم ہوجائے۔

سورج نکلنے اور ڈوبنے کے وقت جو رنگین شفق آسمان کے کناروں پر دکھائی دیتی ہے وہ بھی فضا میں اسی گرد کی موجودگی کی وجہ سے ہے۔ گرد ہمارے لیے ایک مفید مادہ بھی ہے اور ہماری دنیا کو خوش منظر بنانے کا ذریعہ بھی۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں کس طرح خدا نے ناخوش گوار چیزوں کے ساتھ خوش گوار چیزیں رکھ دی ہیں۔ جس طرح پھول کے ساتھ کانٹا ہوتا ہے اسی طرح زندگی میں پسندیدہ چیزوں کے ساتھ ناپسندیدہ چیزوں کا جوڑا بھی لگا ہوا ہے۔

اب جب کہ خود قدرت نے پھول اور کانٹے کو ایک ساتھ پیدا کیا ہے تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم اس کے ساتھ نباہ کی صورت پیدا کریں۔ موجودہ دنیا میں اس کے سوا کچھ اور ہونا ممکن نہیں۔

دوسروں کی شکایت کرنا صرف اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ یہ دنیا اس ڈھنگ پر بنائی گئی ہے کہ یہاں لازماً شکایت کے مواقع آئیں گے۔ عقل مند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو بھول جائے۔ وہ شکایت کو نظر انداز کرکے اپنے مقصد کی طرف اپنا سفر جاری رکھے۔

دعوتی امکان

فرانس کے ڈاکٹر جرینیہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ میں ان کے بارہ میں حسب ذیل رپورٹ شائع ہوئی ہے:

انني تتبعت كل الآيات القرآنية التي لها ارتباط بالعلوم الطبية والصحية والطبيعية التي درستها من صغري واعرفها جيدا فوجدت هذه الآيات منطبقة كل الانطباق على معارفنا الحديثة .. لقد اسلمت لانني تيقنت ان محمدا صلى الله عليه وسلم اتى بالحق الصراح من قبل الف سنة دون معلم او مدرس من البشر ولو ان كل صاحب فن من الفنون او علم من العلوم قارن كل الآيات القرآنية المرتبطة بما يعلم كما فعلت انا لاسلم بلا شك ان كان عاقلا خاليا من الاغراض۔ (الدعوۃ، الریاض ۹ دسمبر ۸۵ء)

میں نے قرآن کی ان تمام آیات کا تتبع کیا جن کا تعلق مختلف طبیعیاتی علوم سے ہے، جن کو میں نے کم عمری سے پڑھا ہے اور جن کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے پایا کہ قرآن کی یہ آیتیں ہماری جدید معلومات سے کلی مطابقت رکھتی ہیں۔ میں نے اسلام قبول کر لیا کیوں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق لے کر آئے۔ وہ ہزار سال پہلے پیدا ہوئے انھوں نے کسی استاد سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ پھر بھی ان کی ہر بات بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اور اگر علوم کے ماہرین یہ کریں کہ وہ قرآن کی آیتوں کا اپنی معلومات سے مقابلہ کریں جیسا کہ میں نے کیا ہے تو یقیناً وہ سب اسلام قبول کریں گے، بشرطیکہ وہ اغراض سے خالی ہو کر اسے دیکھیں۔

قرآن کو جب ایک شخص کھلے ذہن کے ساتھ پڑھتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک ایسے مصنف کی کتاب ہے جو "ساتویں صدی" میں بھی "بیسویں صدی" کی باتوں کو جانتا تھا۔ قرآن کا یہ امتیاز واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدائے عالم الغیب کی کتاب ہے۔ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب نہیں۔ قرآن کی یہ استثنائی صفت قرآن کا زندہ معجزہ ہے۔ قرآن کی دعوت کو اگر آج کے انسان کے سامنے پیش کیا جائے تو قرآن کی یہ صفت اس کے حق میں بہت بڑی معجزاتی تائید ثابت ہو گی۔ لوگ مجبور ہوں گے کہ اس کو مانیں اور اس پر ایمان لائیں۔

تصویر ملّت

گاؤں کے چند لڑکے بے فکری کے ساتھ بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک لڑکے نے کہا کہ آو، جھوٹ موٹ کی کھچڑی پکائیں۔ دوسرا لڑکا بولا: جب جھوٹ موٹ ہی پکانا ہے تو کھچڑی کیوں پکائیں، پھر تو پلاؤ پکائیں۔

یہی حال موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین کا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹے پکوان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک قائد اٹھتا ہے اور پہلے سے زیادہ بڑا لفظ بول کر عوام کی ایک بھیڑ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ایک شخص اگر جھوٹی کھچڑی پکار رہا تھا تو دوسرا شخص جھوٹا پلاؤ اور جھوٹی بریانی پکانا شروع کر دیتا ہے۔

ایک قائد نے کہا : ہمارا مقصد ملک کے اندر اسلامی قانون نافذ کرنا ہے۔

دوسرا قائد بولا : ہم تو پورے کرۂ ارض پر اسلام کے کامل نظام عدل و قسط کو غالب و قائم کرنا چاہتے ہیں۔

تیسرے قائد نے کہا : ہمارے دین کی حقیقت احتسابِ کائنات ہے۔ ہم کو ستاروں سے بھی آگے جانا چاہیے۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ ——— عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں۔

آدمی عمل سے جتنا زیادہ خالی ہو اتنا ہی زیادہ بڑے الفاظ وہ بولتا ہے۔ ان قائدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے قدموں کے نیچے بھی اسلام کو قائم کرنے میں ناکام ہیں، اس کے باوجود وہ تقریروں میں ساری انسانیت کو خطاب کر رہے ہیں اور سارے عالم میں نظام عدل قائم کرنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ بولنے والے صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ مردہ لوگ ہیں، وہ زندہ لوگ نہیں۔ مردہ لوگ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں اور زندہ لوگ بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔

اس عموم میں صرف تبلیغی جماعت کا ایک استثنار ہے۔ وہ احتساب خویش کے لیے اٹھی ہے نہ کہ دوسروں کی طرح احتسابِ عالم کے لیے۔ اور یقیناً احتساب خویش ہی وہ کام ہے جو کرنے والوں کو کرنا چاہیے، اور جس کے لیے اٹھنے والوں کو اٹھنا چاہیے۔

غصہ اور کبر

قال یحییٰ علیہ السلام ان الغضب من الکبر۔ فقیل لہ کیف یکون الغضب من الکبر یا نبی اللہ۔ قال الا ترون ان الذی یغضب انما یغضب علیٰ من دونہ من الناس مرتبۃ ولیس علیٰ من ھو اعلیٰ منہ

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ غصہ تکبر سے ہوتا ہے۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، غصہ کا تعلق تکبر سے کیوں کر ہے۔ فرمایا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو شخص غصہ کرتا ہے وہ اس پر غصہ کرتا ہے جو درجہ میں اس سے کم ہو۔ وہ اس پر غصہ نہیں کرتا جو اس سے برتر ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غصہ ہمیشہ کبر کی نفسیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر آدمی کے اندر تواضع کی نفسیات پیدا ہو جائے تو وہ غصہ کرنا بھی چھوڑ دے۔

متواضع آدمی کو بھی کبھی غصہ آتا ہے۔ مگر اس کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔ اسی لیے وقتی ظہور کے بعد وہ ختم بھی ہوجاتا ہے۔ متواضع آدمی وقتی غصہ کے بعد دوبارہ ویسا ہی ہوجاتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔

لیکن کبر اور برتری کی نفسیات سے جو غصہ پیدا ہوتا ہے وہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے فریق کو ذلیل نہ کرلے۔ جو شخص اپنے کو بڑا سمجھ لے وہ اس وقت آپے سے باہر ہوجاتا ہے جب اس کو محسوس ہو کہ کسی نے اس کی بڑائی کو چھو دیا ہے۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ بے قابو ہو کر اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے قول اور عمل کی تمام طاقتیں اس کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو اس وقت تک تسکین نہیں ملتی جب تک وہ فریق مخالف کو چھوٹا کر کے اپنی بڑائی کے احساس کو دوبارہ بحال نہ کرلے۔

مگر غصہ اور انتقام کی تمام کارروائی اپنے سے چھوٹے کے خلاف ہوتی ہے۔ جس کو آدمی اپنے سے برتر پائے اس کے مقابلہ میں وہ جوش نہیں دکھاتا، اس کے مقابلہ میں اس کے غصہ کی آگ سرد پڑی رہتی ہے ——— کبھی غصہ بھی کبر ہوتا ہے، اور جو غصہ کبر ہو اس سے بڑا جرم اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

اقدام سے پہلے

عن ابن عباس ان عبد الرحمٰن بن عوف و اصحابا لہ اتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ فقالوا یانبی اللہ، کنا فی عزۃ ونحن مشرکون فلما اٰمنا صرنا اذلۃ قال: انی اُمرتُ بالعفو فلا تقاتلوا القوم

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۵۲۶)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی مکہ میں رسول اللہؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، جب ہم مشرک تھے تو ہم عزت کے ساتھ رہ رہے تھے۔ پھر جب ہم ایمان لائے تو ہم ذلیل ہو گیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو تم قوم سے جنگ نہ کرو۔

اسی واقعہ کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو (الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ، النساء ۷۷)

قدیم مفسرین نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

فیہ تنبیہ علی ان الجہاد مع النفس لاصلاح قلبہ ونفسہ مقدم علی الجہاد مع الکفار

(التفسیر المظہری، المجلد الثانی، صفحہ ۱۶۵)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منکروں سے جہاد کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اپنے قلب اور نفس کی اصلاح کے لیے اپنے آپ سے جہاد کیا جائے۔

یہاں "ہاتھ کو روکو اور نماز قائم کرو" کے فقرہ میں جو حکم دیا گیا ہے اس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگا ——— "خارجی اقدام سے رکو اور داخلی تیاری کرو" نماز کی اصل حقیقت اگرچہ اللہ کی یاد ہے (اقم الصلوٰۃ لذکری) مگر اس کا نظام اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کی پوری زندگی کی اصلاح کے لیے ایک مکمل کورس بن گیا ہے۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے نماز کو ضائع کیا وہ بقیہ چیزوں کو بھی یقینی طور پر ضائع کر دے گا (من ضیّعھا فھو لما سواھا اضیع)

اسلام میں جنگ صرف بطور دفاع ہے۔ اسلام میں اصل چیز دعوت ہے۔ یعنی لوگوں کو پُرامن طور پر اور حکیمانہ انداز میں حق کی طرف بلانا۔ یہی اسلامی عمل کا آغاز ہے اور یہی اس کا اختتام بھی۔ تاہم فریق ثانی اگر جارحیت سے باز نہ آئے تو اس سے دفاعی جنگ کی جائے گی۔

مگر دفاعی جنگ کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اس سے پہلے مسلمان نماز کو قائم کرنے والے بن چکے ہوں۔ نماز کیا ہے۔ نماز ایک مکمل دینی تربیت ہے۔ نماز میں یہ ہوتا ہے کہ موذن پکارتا ہے "آؤ فلاح کی طرف" اور تمام مسلمان اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ اپنے کو پاک صاف کرکے نماز میں داخل ہوتے ہیں۔ نماز میں وہ بار بار اللہ اکبر کہہ کر اللہ کے بڑے ہونے اور اس کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ تمام مسلمان صف بستہ ہو کر صرف ایک امام کے پیچھے نماز ادا کرتے ہیں۔ کوئی ایک شخص بھی اِدھر اُدھر منتشر نہیں ہوتا۔ نماز ختم ہونے کے بعد تمام نمازی دائیں بائیں رُخ کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہیں۔ اس طرح وہ ظاہر کرتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کے لیے ان کے اندر خیر خواہی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ان کے لیے اللہ سے دعا کرنے والے بن گیے ہیں۔

یہی وہ نماز ہے جس کی اقامت کو جہاد سے پہلے لازم قرار دیا گیا ہے۔ مسلمان جب تک ان معنوں میں نماز کو قائم کرنے والے نہ بن چکے ہوں ان کے لیے جہاد و مقابلہ کے لیے نکلنا جائز نہیں۔ اس تربیتی کورس سے پوری طرح گزرنے سے پہلے صرف صبر کرنا ہے۔ فریق ثانی خواہ کتنا ہی ظلم کرے انھیں یک طرفہ طور پر صرف صبر اور برداشت کے رویہ پر قائم رہنا ہے۔ مسلمان اگر اس نماز پر اپنے آپ کو پوری طرح قائم کر لینے سے پہلے جہاد کی باتیں کریں تو وہ سراسر باطل ہوگا۔ اس کا خدا اور رسول کے طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔

خدا نے جہاد کا جو طریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے پہلے پورے اہتمام کے ساتھ نماز قائم کی جائے۔ ایسی حالت میں جو لوگ نماز کی اقامت کے بغیر جہاد کی اقامت کا نعرہ لگائیں وہ بلاشبہ غلطی پر ہیں۔ وہ لوگوں کو ایک ایسے دین کی طرف بلا رہے ہیں جس کو انھوں نے خود گھڑا ہے۔ اور جو دین خود گھڑا جائے وہ یقینی طور پر صرف آدمی کی بربادی میں اضافہ کرے گا، وہ کسی حال میں آدمی کی کامیابی اور ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

ایک تجربہ

۱۹۶۶ کی بات ہے۔ اس وقت میں ندوہ (لکھنؤ) میں تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ پولیس کی گاڑی ندوہ کے احاطہ میں آکر رکی۔ اس میں سے کئی پولیس کے لوگ برآمد ہوئے۔ ان کو ندوہ کے ذمہ داروں نے ٹیلی فون کرکے بلایا تھا تاکہ وہ ان کے ایک سنگین مسئلہ کو حل کریں۔

مسئلہ یہ تھا کہ ندوہ اور لکھنؤ یونیورسٹی دونوں بالکل پاس پاس ہیں۔ یونیورسٹی کا ایک ہاسٹل ندوہ کی دیوار سے ملا ہوا ہے۔ اس ہاسٹل کے لڑکے جو سب کے سب غیر مسلم تھے ندوہ والوں کو مسلسل پریشان کر رہے تھے۔ وہ گالی دیتے، پتھر پھینکتے، مذاق اڑاتے اور طرح طرح کی نازیبا حرکتیں کرتے۔ ان کا مقصد غالباً یہ تھا کہ ندوہ کے لوگ مشتعل ہو کر کوئی جارحانہ کارروائی کریں اور پھر یونیورسٹی کے لڑکوں کو ندوہ کے خلاف بھرپور فساد کرنے کا بہانہ ہاتھ آجائے۔

یہ مسئلہ برسوں سے جاری تھا۔ ندوہ والوں نے پریشان ہو کر پولیس بلائی اور ان سے فریاد کی۔ پولیس والے حسب دستور رسمی کارروائی کرکے واپس چلے گئے۔ اور اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔

یہ مسئلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۷۴ میں ندوہ کے ذمہ داروں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ مسئلہ نہ پولیس کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے اور نہ براہ راست ٹکراؤ کے ذریعہ اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو تالیف قلب کے اسلامی اصول کو استعمال کرکے حل کیا جائے۔ اس فیصلہ کے تحت مولانا علی میاں کے رفیق خاص مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم اس کے ذمہ دار بنائے گئے۔

منصوبہ کے مطابق مولانا اسحاق جلیس ندوی نے پہلے یہ پتہ لگایا کہ ہاسٹل کے لڑکوں میں لیڈر کون کون ہے۔ انھوں نے ان لیڈروں سے ملاقات کی۔ ان کو ندوہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ چائے پر بلایا گیا۔ ندوہ والوں نے ان "ظالم" لڑکوں سے ان کے ظلم اور بدتمیزی کے بارہ میں ایک لفظ نہیں کہا۔ ان سے ساری ملاقات اور گفتگو اس طرح کی گئی جیسے کہ ندوہ والوں کو ان سے کوئی شکایت ہی نہیں۔ پوری مدت میں ندوہ کے لوگ ان سے اس طرح معتدل انداز میں ملتے رہے جیسے کہ ان کی طرف سے ظلم و زیادتی کا کوئی واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔

ان گفتگوؤں اور ملاقاتوں کے نتیجہ میں، عین پیشگی منصوبہ کے مطابق، یہ ہوا کہ ندوہ کی ٹیم اور

یونیورسٹی کی ٹیم کے درمیان ہاکی میچ رکھا گیا۔ ندوہ کے لڑکے ہاکی کھیلنے میں مشہور ہیں۔ مگر انھیں پیشگی طور پر یہ سمجھا دیا گیا کہ تمہیں اس میچ میں جیتنا نہیں ہے۔ تم کو جان بوجھ کر خراب کھیل کھیلنا ہے تاکہ تم ہار جاؤ۔ منصوبہ یہ تھا کہ جان بوجھ کر یونیورسٹی کے لڑکوں کو کھیل میں جتایا جائے اور پھر انھیں ہیرو بنا کر ان کے دل کو جیتنے کی کوشش کی جائے۔

مقررہ تاریخ کو دونوں کے درمیان ہاکی میچ ہوا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ندوہ کے نوجوان خراب کھیل کھیلے اور یونیورسٹی کے لڑکوں کو بالقصد یہ موقع دیا کہ وہ بہتر کھیل کھیل کر میچ جیتیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ کے طلبہ کے مقابلہ میں "شاندار طور پر" کامیاب ہوگئے۔ اب طے شدہ منصوبہ کے مطابق یونیورسٹی کے لڑکوں کو خوب اچھالا گیا۔ مختلف طریقوں سے ان کی تالیف قلب کی گئی۔ ان کو دل کھول کر انعامات دیے گئے۔ ان کا ہیروانہ استقبال کیا گیا۔ وغیرہ

یونیورسٹی کے طلبہ ندوہ والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی چاہتے تھے اور ندوہ والوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جھکا کر ان کی بڑائی کا اعتراف کر لیا۔ ندوہ کے لوگوں نے اپنے مذکورہ عمل سے یونیورسٹی کے طلبہ کے جذباتِ برتری کو پوری طرح تسکین دے دی۔ اب مسئلہ اپنے آپ حل تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے اس کے بعد پھر کبھی ندوہ والوں کو پریشان نہیں کیا۔

یہ ایک عظیم الشان مثال ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا حل کیا ہے وہ حل یہ ہے کہ مسلمان یک طرفہ اقدام کے ذریعہ ہندو مسلم تناؤ کو ختم کر دیں۔ وہ خود "چھوٹے بھائی" بن کر فریق ثانی کو "بڑے بھائی" کا درجہ دینے پر راضی ہو جائیں اور اس کے بعد ان کے تمام مسئلے یقینی طور پر حل ہو جائیں گے۔

ندوہ کا مذکورہ واقعہ مزید اس جھوٹے اندیشہ کو غلط ثابت کرتا ہے کہ اگر ہم جھکیں گے تو وہ اور زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ مذکورہ واقعہ میں ندوہ والوں نے واضح طور پر یک طرفہ جھکاؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے غیر مسلم طلبہ کی ہمتیں اور زیادہ بڑھ جائیں۔ وہ پہلے سے زیادہ جری ہو کر ندوہ والوں کو ستانے لگیں۔ ندوہ والوں کا نرم رویہ ان کو اور زیادہ سخت رویہ والا بنا دے۔ مگر ایسا قطعاً نہیں ہوا بلکہ ندوہ والوں کے جھکاؤ نے انھیں بھی جھکا دیا۔ ایک فریق کی نرمی دوسرے فریق کو نرم کرنے کا سبب بن گئی۔ جو مسئلہ دس سال سے ناقابلِ حل بنا ہوا تھا،

وہ ایک دن کے اندر لٹے بھڑے بغیر حل ہو گیا۔ ۱۹۷۴ کے بعد وہ دوبارہ کبھی پیش نہیں آیا۔

ندوہ کے اس چھوٹے سے واقعہ میں اس عظیم تر مسئلہ کے بارہ میں رہنمائی موجود ہے جس کو عام طور پر ملی مسئلہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ عملی تجربہ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ ملک کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ندوہ والوں نے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اپنے محدود دائرہ میں جو تدبیر کی وہی تدبیر وسیع تر دائرہ میں ملت کے مسائل کا بھی واحد یقینی حل ہے۔ اگر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت دیں، جس کا ثبوت ندوہ والوں نے دیا تو یقینی طور پر ان کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ امن اور یکسوئی کے ماحول میں اپنی تعمیر و ترقی کا کام کر سکیں۔ اس کے بعد وہ تعمیر کے کام کے لیے بھی مواقع پالیں گے اور اسلام کی اشاعت کے کام کے لیے بھی۔

مسئلہ کے حل کا جو تجربہ دس سال پہلے ندوہ میں کامیاب طور پر کیا گیا تھا، وہ ندوہ کے باہر ملت کے وسیع تر دائرہ میں کیوں اب تک اختیار نہ کیا جا سکا۔ اس کا سبب متناقض طور پر Paradoxically خود ندوہ کے ذمہ دار اور ان کے جیسے دوسرے قائدین ہیں۔ اس المیہ کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ان قائدین ملت نے اس حدیث رسول پر عمل نہیں کیا جس میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم دوسروں کے لیے بھی وہی چیز پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو (احبّ للنّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ) ؎

ان قائدین نے جس تدبیر سے اپنا ذاتی مسئلہ کامیاب طور پر حل کیا، ان پر لازم تھا کہ دوسروں کو بھی وہ وہی تدبیر بتائیں۔ وہ ساری مسلم قوم کو اسی آزمودہ طریق کار کا سبق دیں۔ مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کیا بلکہ وہ ملت کو اس کے برعکس تدبیر اختیار کرنے پر ابھارتے رہے۔ اپنا مسئلہ انھوں نے خاموش تدبیر سے حل کیا تھا اور قوم کو وہ پر شور تدبیر اختیار کرنے کا سبق دیتے رہے۔ اپنا مسئلہ انھوں نے مفاہمت کے ذریعہ حل کیا تھا اور ملت کو انھوں نے مقابلہ آرائی کا پیغام دیا۔ اپنے لیے انھوں نے شکست کو مان کر جینے کا راز دریافت کیا تھا اور دوسروں کو وہ اپنی تقریروں میں للکارتے رہے کہ

؎ یہ ایک مشہور حدیث ہے جو مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:
لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ، رواہ البخاری و مسلم

ہرگز شکست نہ ملنا، چاہے تم سب کے سب ہلاک ہو جاؤ۔ اپنے ذاتی حریف کو پیش کرنے کے لیے ان کے پاس تالیف قلب کا گلدستہ تھا۔ مگر جب وہ قوم کے سامنے آئے تو اس کو یہ کہہ کر ابھارا کہ تم سیف اللہ اور صمصام الاسلام بن کر اپنے حریف کا مقابلہ کرو۔ تقریر و خطابت کے لیے ان کے پاس دوسرا اسلام تھا اور عمل کے لیے بالکل دوسرا اسلام۔

قائدین کا یہی تضاد ملت کے تمام مسائل کا واحد سبب ہے۔ ہمارے قائدین اپنے ذاتی مسائل کو مفاہمت اور خوش تدبیری کے ذریعہ حل کر رہے ہیں: اور ملت کے نوجوانوں کو اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ لامتناہی طور پر اپنے حریفوں سے لڑتے رہیں۔ اسی تضاد کا یہ کرشمہ ہے کہ ہمارے قائدین خود تو ہر قسم کے جانی اور مالی نقصان سے بچے ہوئے ہیں، ان میں سے کسی کو کبھی کوئی زخم نہیں لگتا۔ اور ملت کا حال یہ ہے کہ وہ بے فائدہ طور پر اپنا جان بھی برباد کر رہی ہے اور اپنا مال بھی۔ اگر اسلام کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ مجنونانہ اقدام کر کے اپنے مکانوں اور دکانوں کو نذر آتش کرایا جائے تو محترم قائدین کے مکان اور دکان کیوں نذر آتش نہیں ہوتے۔ اگر اسلام کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی مشتعل ہو کر لڑے اور شہید ہو جائے تو خود قائدین اپنے آپ کو اس فضل شہادت سے کیوں محروم کیے ہوئے ہیں۔

ندوہ سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا ہے جس کا نام ہے 'تعمیر حیات'۔ اس کی اشاعت ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ میں ندوہ کے ذمہ دار اعلیٰ کا ایک خصوصی انٹرویو چھپا ہے۔ اس کا جلی عنوان یہ ہے:

مسلمانوں کو اس ملک میں اپنا وزن ثابت کرنا ہوگا۔

اس انٹرویو میں ندوہ کے مذکورہ ذمہ دار نے فرمایا کہ "کسی قوم یا فرقہ کا وزن اس وقت محسوس کیا جاتا ہے جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ نفع کے علاوہ نقصان بھی پہونچا سکتا ہے۔"

ندوہ کے مذکورہ ذمہ دار پچھلے بیس سال سے ہندستان کے "مظلوم" مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنے مسئلہ کے حل کے لیے نقصان رسانی کی اہلیت کا ثبوت دو۔ یہی مشورہ انھوں نے ۱۹۶۶ کے ہندستانی الکشن میں مسلمانوں کو دیا تھا۔ مذکورہ انٹرویو کے مطابق اب بھی وہ قوم کو یہی مشورہ دے رہے ہیں۔ "مفکر اسلام" کا یہ قیمتی مشورہ نعوذ باللہ خود پیغمبر اسلام کو بھی معلوم نہ تھا۔ ورنہ وہ مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو حبش یا یثرب کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ نہ دیتے بلکہ یہ کہتے کہ قریش مکہ کو نقصان پہونچا کر تم اپنے لیے مکہ میں زندگی کا حق وصول کرو۔

عجیب بات یہ ہے کہ مذکورہ بزرگ نے خود اپنے ادارہ کے مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ ادارہ کے لوگ اپنے حریف کے مقابلہ میں بالکل بے ضرر بن جائیں۔ وہ یک طرفہ طور پر جھک کر فریق ثانی کی برتری تسلیم کریں مگر ملت کو وہ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ تم میدانِ مقابلہ میں ڈٹ جاؤ۔ تم اپنے حریف کو ضرر پہونچاؤ تم فریقِ ثانی کو جھکنے پر مجبور کر دو۔ یہ تضاد بھی کیسا عجیب ہے کہ ایک انسان اپنے ذاتی معاملہ میں یک طرفہ طور پر فریق ثانی کے آگے جھک کر اپنے مسئلہ کو حل کرتا ہے اور ملت کو وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ تم اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود فریقِ ثانی کو جھکاؤ اور اس کو نقصان پہونچا کر اپنے مسئلہ کو حل کرو۔

مسئلہ کے حقیقی حل کے لیے اکثر آدمی کو اپنی بڑائی کے بت کو توڑنا پڑتا ہے۔ مذکورہ مثال میں ندوہ والوں نے یونیورسٹی والوں کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کو توڑا، اسی وقت یہ ممکن ہوا کہ مسئلہ کے حل کی راہیں کھلیں۔ ذاتی معاملہ میں چوں کہ آدمی سنجیدہ ہوتا ہے، وہ فوراً اپنی ذاتی بڑائی کے بت کو توڑنے پر راضی ہوجاتا ہے۔ وہ مسئلہ کے حل کو اصل قرار دیتا ہے نہ کہ اپنی ذات کی بڑائی کو۔ مگر ملت کے معاملہ میں لوگ اتنا سنجیدہ نہیں جتنا وہ ذاتی مفاد کے معاملہ میں سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں وہ اپنی بڑائی کے بت کو نہیں توڑتے۔ ذاتی مفاد کے معاملہ میں ہر شخص اپنی بڑائی کو توڑے ہوئے ہے مگر ملت کے مفاد کے معاملہ میں کوئی شخص اپنی بڑائی کو توڑنے پر راضی نہیں۔

مذکورہ انٹرویو میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "اخلاقی قیادت کر کے مسلمان ہندستان کی ناگزیر ضرورت بن سکتے ہیں" یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ سراسر ناکافی ہے۔ ندوہ کے مذکورہ بزرگ کو اپنے اس مشورہ کے ساتھ اپنا ۱۹۷۴ کا تجربہ بھی بتانا چاہیے۔ انھیں اسی کے ساتھ اس کا بھی اعلان کرنا چاہیے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے غیر مسلم طلبہ کے مقابلہ میں انھوں نے کس تدبیر کے ذریعہ اخلاقی فتح حاصل کی تھی۔

وہ تدبیر ایک لفظ میں یک طرفہ جھکاؤ تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے طلبہ کے مقابلہ میں یک طرفہ طور پر ہار قبول کی۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو چھوٹا بنایا۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو نرم رویہ کا پابند کیا۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ اپنے آپ کو مقابلہ آرائی کے مقام سے ہٹائیں۔ ندوہ والوں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو اخلاقی قیادت کا درس دینے کے ساتھ یہ بھی ضرور بتائیں کہ اس کا راز یک طرفہ جھکاؤ ہے اور اس کا کامیاب تجربہ وہ خود ۱۹۷۴ میں کر چکے ہیں۔

مستقبل پکار رہا ہے

درخت کیا ہے۔ درخت خدا کا ایک جادو ہے۔ وہ ایک معجزاتی واقعہ ہے جو خدا اپنی خصوصی قدرت سے زمین پر ظاہر کرتا ہے۔ درخت اس بات کا اعلان ہے کہ کوئی ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اس کے لئے زندگی اور ہریالی کا ایک نیا امکان کھول دے، کوئی ہے جو خدا کے ساتھ ایک امید قائم کرے تاکہ خدا اس کی امید کو اس کے قیاس و گمان سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں اس کے حق میں پورا کردے۔

جب برسات کا موسم آتا ہے اور پانی سے لدے ہوئے بادل آسمان میں تیرنا شروع کرتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک فضاؤں میں ایک تبدیلی کا اعلان کرتی ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بارش کا پیغام لے کر ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں تو یہ سب دراصل خدا کے ایک مطلوب کا اظہار ہوتا ہے، یہ مطلوب کہ خدا اپنی زمین میں کچھ ہرے بھرے درخت اگانا چاہتا ہے۔ اس وقت جو کسان خدا کے اعلان کو سمجھ لے اور ایک بیج لے کر زمین میں ڈال دے تو اس کے فوراً بعد خدا کا جادو ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں خالی زمین تھی وہاں معجزاتی طور پر ایک سرسبز و شاداب کائنات نکل کر کھڑی ہو جاتی ہے جس کے سائے کے نیچے لوگ پناہ لیں۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جو لوگوں کے لئے رنگت اور خوشبو اور لذت کا ایک عظیم خدائی دستر خوان بن جائے۔

دنیا کا معاملہ بھی آج کچھ ایسا ہی ہے۔ موجودہ دنیا کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حد پر پہونچ کر کسی نئے انقلاب کا انتظار کر رہی ہے ــــ خدا کا نام آج لوگوں کے لیے ذاتی کاروبار کا

عنوان بن چکا ہے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کو صرف فساد اور بگاڑ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں لوگوں کے لئے لوٹ کا میدان بنی ہوئی ہیں۔ خدا کی دنیا میں انسان نے خود اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر بٹھا رکھا ہے۔ ظلم اور فساد اتنا بڑھ چکا ہے کہ انسانی نسل پر دوبارہ وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو حضرت نوح نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے بارہ میں کہے تھے: انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولايلدوا الا فاجرا كفارا (نوح ۲۷)

بگاڑ کی یہ انتہا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہو۔ وہ وقت آگیا ہے کہ دوبارہ زمین پر ایک طوفان نوح برپا ہو، تاکہ تمام برے لوگ اس میں غرق کر دئے جائیں اور تمام اچھے لوگ اس سے بچا کر خدا کی زمین کے وارث بنا دیے جائیں اور پھر وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کریں جو موجودہ دنیا سے زیادہ بہتر ہوگی اور زیادہ بابرکت۔

مگر طوفان نوح سے پہلے اعلان نوح کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے کچھ بندے اٹھیں اور اپنی صحیح ترین اور کامل ترین صورت میں حق کا اعلان کردیں۔ خدائی موسم اب آخری طور پر آچکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ کوئی کسان اپنا بیج لے کر زمین میں ڈال دے۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن خدا کا معجزاتی کرشمہ بھی ظاہر ہوجائے گا۔ خدا کی نصرتیں اس بندہ کے اوپر آسمان کے دروازے پھاڑ کر ٹوٹ پڑیں گی تاکہ جو کچھ بندے کو کرنا ہے بندہ اسے انجام دیدے۔ اور تاکہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے خدا اس کو ظہور میں لے آئے۔

اعلان حق کا مطلب حق کو آخری حد تک مبرہن کر دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کل خدائی کی سطح پر کھولا جانے والا ہے اس کو آج بندگی کی سطح پر لوگوں کے لئے کھول دیا جائے۔ اس کے بعد وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اور وہ لوگ دوسری طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو نہیں پہچانا اور اپنے آپ کو اس کی سمت میں کھڑا نہیں کیا۔ جب یہ عمل پورا ہوجاتا ہے تو اس کے فوراً بعد خدا کا آخری فیصلہ آجاتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ پہلا گروہ جنت کے زینہ پر کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گروہ جہنم کے زینہ پر۔

اردو صحافت اور اخلاقیات

اردو صحافت اور اخلاقیات ــــــ باعتبار واقعہ ایک متضاد ترکیب ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ غضبناک آدمی اور خوش اخلاقی، نیم کی پتی اور شیرینی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقیات ایک مثبت رویہ کا نام ہے، اور اردو صحافت بطور واقعہ کبھی مثبت چیز تھی ہی نہیں۔ اردو صحافت تمام تر ردعمل کے طور پر ظہور میں آئی۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ ردعمل ہی کے رویہ کا دوسرا نام منفی رویہ ہے۔

لکھنؤ کے ایک مسلم اخبار (قائد) نے ایک بار اردو صحافت کی پالیسی کو احتجاجی پالیسی کا عنوان دیا تھا۔ اخبار مذکور نے یہ بات بطور فخر کہی تھی، مگر میں اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ صحیح ترین لفظ ہے جو اردو صحافت کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ اردو صحافت بنیادی طور پر ایک احتجاجی صحافت ہے۔ اور احتجاجی صحافت بلاشبہ اخلاقیات کی نفی ہے۔ اردو صحافت مسلم مسائل کو پیش کرنے کے لیے وجود میں آئی نہ کہ حقیقت واقعہ کو بیان کرنے کے لیے۔ گویا کہ موجودہ اردو اخبارات مسلمانوں کے صحافی وکیل ہیں۔ وہ حقیقت کو غیر جانبدارانہ طور پر بیان کرنے والے نقیب نہیں۔

"اخلاقیات" ایک مثبت اصطلاح ہے۔ اگر میں اخباری اخلاقیات کا تعین کروں تو اس کے اجزا سادہ طور پر غالباً حسب ذیل ہوں گے:

۱۔ مثبت نقطۂ نظر کا حامل ہونا، ایسا نقطۂ نظر جو کسی قسم کے مخالفانہ حالات سے بطور ردعمل نہ بنا ہو، بلکہ خود اپنی ایجابی غور و فکر سے وجود میں آیا ہو۔

۲۔ حالات کی مطابق واقعہ رپورٹنگ۔

۳۔ قومی اور بین اقوامی مسائل کا منصفانہ تجزیہ۔

اب میں ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے اردو صحافت پر مختصراً اظہار خیال کروں گا۔

مثبت نقطۂ نظر کا فقدان

اردو صحافت کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ اس کے بانیوں اور معماروں نے انسانی حقیقتوں پر غور کیا۔ انھیں اس قسم کی کوئی ابدی حقیقت دریافت ہوئی جیسی حقیقت ایک سائنس داں دریافت کرتا ہے اور پھر یہ لوگ اس دریافت سے بے چین ہو کر اس کے اظہار کے لیے صحافت

کے میدان میں داخل ہوگیے ۔ اس کے برعکس اردو صحافت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے تقریباً تمام صحافی جس "اسکول آف جرنلزم" میں بنے وہ ان کے وقتی حالات تھے ۔ وہ اپنے وقتی اور قریبی حالات سے متاثر ہوئے اور اس کے بعد وہ اپنی جوابی نفسیات کے اظہار کے لیے صحافت کے میدان میں کود پڑے۔ ان میں سے کسی نے اپنے اخبار کا نام سیدھے طور پر "ندائے ملت" رکھ دیا اور کسی نے بظاہر دوسرا نام رکھا۔ مگر ہمارا ہر اخبار حقیقۃً ندائے ملت ہوتا ہے نہ کہ ندائے حقیقت ۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ اردو صحافت ، وہ اردو صحافت جس کی نمائندگی اس ملک میں مسلمانوں نے کی ہے، وہ اپنے آغاز ہی سے ردعمل کی پیداوار رہی ہے۔ مسلمانوں کے تمام اردو اخبارات کسی نہ کسی "دشمن اسلام" کے خلاف ردِّ عمل کے طور پر وجود میں آئے ۔ دہلی کے ایک اخبار نے اپنے صفحۂ اوّل کی ایک جلی سرخی ان الفاظ میں قائم کی تھی :

"آگ اور خون میں نہائے ہوئے مسلمان سوال کرتے ہیں"

یہ سرخی بتاتی ہے کہ اردو اخبارات کس قسم کے ذہن کے تحت چلائے جارہے ہیں۔ وہ ذہن یہی ہے کہ وہ "خون آلود" مسلمانوں کے نمائندہ بن کر ان کی طرف سے ان کے "مفروضہ" دشمنوں کے خلاف مضامین اور خبریں چھاپتے رہیں۔ اردو صحافت ایک قسم کی وکیلانہ صحافت ہے نہ کہ کوئی اخلاقی صحافت۔

وکیلانہ رویہ اور اخلاقی رویہ میں یہ فرق ہے کہ وکیل صرف اپنے مؤکل کو دیکھتا ہے اور اخلاقی رویہ کی نگاہ ہمیشہ وسیع تر حقیقتوں کی طرف ہوتی ہے۔ وکیل محدود مفاد کا نمائندہ ہوتا ہے اور اخلاق آفاقی صداقت کا نمائندہ ۔

یہ بات اردو صحافت میں اتنی زیادہ عام ہے کہ وہی اخبارات سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ وکیلانہ رویہ کا مظاہرہ کریں۔ لکھنؤ کا ایک اخبار جس کی اشاعت ۱۹۶۵ میں بمشکل ایک ہزار تھی وہ ۶۸ - ۱۹۶۷ میں مخالف کانگرس تحریک (Non-Congressism) میں شریک ہوگیا۔ اس نے دھواں دھار طور پر مسلمانوں کی موافقت اور "فرقہ پرست حکومت" کی مخالفت شروع کردی۔ وہ نام نہاد "معاہداتی سیاست" کا نقیب بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اشاعت اچانک ایک ہزار سے بڑھ کر سولہ ہزار تک پہونچ گئی ۔ بعد کو جب معاہداتی سیاست ناکام ہوگئی تو اس اخبار کی اشاعت دوبارہ ایک ہزار سے بھی کم تھی۔

اردو صحافت اپنے اس مزاج کی وجہ سے محض ایک قوم کی صحافت بن کر رہ گئی ہے۔ قومی صحافت کا اصول یہ ہوتا ہے: "میری قوم، صحیح یا غلط"۔ اس کے برعکس اخلاقی صحافت کا اصول یہ ہوتا ہے: "عالمی صداقت، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف"۔ اخلاقی اعتبار سے یہ کسی صحافت کی بنیادی خامی ہے اور اردو صحافت بلاشبہ اس خامی کی بدترین مثال ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد انگریزی حکومت کے خلاف ردعمل کی پیداوار تھا۔ مولانا ثناراللہ امرتسری کا اخبار اہل حدیث قادیانیوں، آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں کے خلاف ایک صحافتی محاذ قائم کرنے کا دوسرا نام تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا صدق مغربی تہذیب کے خلاف نوک جھونک کا صحافتی میدان تھا۔ دہلی کے مشہور اردو صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف تیز و تند مضامین لکھتے تھے جس کی نمائندگی مشہور فرقہ پرست اخبار پرتاپ کرتا رہا ہے۔ وغیرہ

مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمین دار میں ایک بار پُرفخر طور پر یہ شعر چھاپا تھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے

میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

یہی موجودہ زمانہ میں تمام اردو صحافیوں کا حال رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک فرضی "پانی پت" تھا۔ ہر ایک اپنے مفروضہ پانی پت کے میدان میں اپنے خیالی دشمن کو قلمی شکست دے کر فتح کی خوشی مناتا رہا۔

ہندستان کی اردو صحافت کی پوری تاریخ میں، میری معلومات کے مطابق، اس اعتبار سے صرف ایک قابلِ ذکر استثنا رہا ہے اور وہ سرسید کے تہذیب الاخلاق کا ہے۔ تہذیب الاخلاق کو اگرچہ میں مکمل معنوں میں نہیں، تاہم ۵۰ فی صد مثبت صحافت سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ تہذیب الاخلاق کی بنیاد، دوسرے اردو جرائد کی طرح اغیار کے خلاف احتجاج پر نہ تھی۔ بلکہ اپنی قوم کی اصلاح و تعمیر کے مثبت جذبہ پر تھی۔

اردو صحافت میں غالباً سرسید پہلے قابلِ ذکر شخص ہیں جنھوں نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی اپنی غفلت کا مسئلہ ہے نہ کہ دوسروں کے ظلم اور تعصب کا مسئلہ۔ میرے اپنے الفاظ میں سرسید

کے فکر کا خلاصہ یہ تھا کہ ـــــ مسلمان موجودہ زمانہ کے علوم میں پیچھے ہوگیے ہیں، اس لیے وہ زمانی شعور میں بھی پیچھے ہیں۔ جب تک وہ زمانی شعور کے اعتبار سے زمانہ کی سطح پر نہ آجائیں وہ آج کی دنیا میں اپنے لیے باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

میرے نزدیک یہی وہ چیز ہے جہاں سے اخلاقیات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص یا گروہ خود اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ مولانا حالی نے اس آیت کے مفہوم کو اس طرح نظم کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کو بدلنے کا

یہ دنیا کے بارہ میں خدا کا قانون ہے۔ ایسی حالت میں صحیح اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ اپنے مسائل کی ذمہ داری خود قبول کی جائے۔ جو چیز اپنی غفلت سے پیدا ہوئی ہے اس کی ذمہ داری خود قبول کرنے کا نام اخلاق ہے اور اپنی غفلت سے پیدا شدہ نتائج کو دوسروں کے اوپر ڈالنا، یہی وہ چیز ہے جس کو غیر اخلاقی فعل کہتے ہیں۔

بدقسمتی سے اکثر اردو صحافیوں کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ عام صحافیوں نے مسلمانوں کو یا تو اغیار کے ظلم کی مبالغہ آمیز داستانیں سنائیں جس کا نتیجہ صرف نفرت تھا۔ یا انھوں نے ماضی کی عظمت کے قصیدے پڑھے جس کا واحد ممکن انجام صرف یہ تھا کہ مسلمان جھوٹے فخر میں مبتلا ہوجائیں جو چیز اپنی نہیں ہے اس کو "اپنے اسلاف" کی لفظی منطق سے اپنی بنا کر فرضی طور پر خوش ہوتے رہیں۔

مطابق واقعہ رپورٹنگ

صحافتی اخلاقیات کی ایک اہم خصوصیت مطابق واقعہ رپورٹنگ ہے۔ یعنی حالات و واقعات کو ٹھیک ویسا ہی بیان کرنا جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اس معاملہ میں اردو صحافت سب سے زیادہ ناقابل اعتبار صحافت ہے۔ اردو اخبارات کی رپورٹنگ نہ صرف یک طرفہ ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے وکیلانہ مزاج کی وجہ سے وہ اکثر غلط بھی ہوتی ہے۔

اردو صحافت کا بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے ظلم کے خلاف ردعمل کے طور ظہور میں آئی۔ چنانچہ پوری اردو صحافت مستقل طور پر ایک قسم کے احساس مظلو

میں مبتلا رہتی ہے ۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو لوگ احساس (Persecution complex) مظلومی میں مبتلا ہوں وہ کبھی واقعات کو ہو بہو (As it is) پیش نہیں کر سکتے ۔ وہ عین اپنی نفسیات کے تحت ہمیشہ واقعات کو اس طرح پیش کریں گے جس میں دوسرے لوگ ظالم کے روپ میں نظر آئیں اور خود ان کا اپنا وجود ان کی بنائی ہوئی تصویر میں مظلوم دکھائی دیتا ہو ۔

احساس مظلومی میں مبتلا شخص کبھی واقعات کی غیر جانب دارانہ تحقیق نہیں کرتا ۔ وہ واقعات کو جج کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ فریق کی نظر سے دیکھتا ہے ۔ وہ دوطرفہ نقطۂ نظر سے حالات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ یک طرفہ طور پر پیدا ہونے والے جذبات کے تحت رائے قائم کرکے فوراً اس کے مطابق لکھنا شروع کر دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اخبارات کی رپورٹیں یا تو یک طرفہ طور پر مسلم جذبات کو سامنے رکھ کر مرتب کی جاتی ہیں یا پھر ان میں بعض جزئی یا استثنائی واقعات کی تعمیم (Generalisation) ہوتی ہے ۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں دیانت دارانہ رپورٹنگ کے خلاف ہیں ۔

ایک مثال

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک مارکسی پروفیسر عرفان حبیب پر یونیورسٹی کے کچھ مسلمان لڑکوں نے حملہ کیا ۔ اس کے بعد دہلی کے ایک انگریزی اخبار کا رپورٹر علی گڑھ پہونچا ۔ اس نے مذکورہ مارکسی پروفیسر کا انٹرویو لیا جو انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۳ جنوری ۱۹۸۱) میں چھپا ۔ اس انٹرویو کے چھپنے کے بعد یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ اور زیادہ مشتعل ہو گیے ۔ انھوں نے یونیورسٹی کیمپس میں توڑ پھوڑ اور اودھم بازی شروع کر دی ، یہاں تک کہ یونیورسٹی بند ہونے کی نوبت آگئی ۔

انھیں دنوں دلی کے ایک اردو ہفتہ وار کے ایڈیٹر ہمارے دفتر میں آئے ۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ آج شام کو ہمارے اخبار کی کاپی پریس جا رہی ہے اور مجھے فوری طور پر علیگڑھ کے بارہ میں ایک اداریہ لکھنا ہے ۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے پروفیسر حبیب کا وہ انٹرویو پڑھا ہے جس کی بنیاد پر یہ ہنگامے ہو رہے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ نہیں ۔ میں نے کہا کہ جب آپ نے اصل انٹرویو کو نہیں پڑھا تو آپ اس کے بارہ میں اداریہ کیسے لکھیں گے ۔ "ہم چپ رہیں گے تو ہم مسلم عوام سے کٹ جائیں گے " انھوں نے کہا اور باہر چلے گیے ۔ ان کا اخبار میرے پاس آیا تو اس میں علی گڑھ کے بارے میں ایک پر شور اداریہ موجود تھا ۔

اس کے بعد مجھے خود اس موضوع پر لکھنے کی فکر ہوئی ۔ میں نے چاہا کہ سب سے پہلے میں پروفیسر

عرفان حبیب کا مطبوعہ انٹرویو پڑھوں۔ اس سلسلہ میں میں نے متعدد اردو اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان سے معلوم کیا اور انھیں ٹیلی فون کیے۔ مگر نہ تو کسی کے پاس انڈین اکسپریس کا مطبوعہ پرچہ موجود تھا اور نہ ایسے لوگ ملے جو یہ کہیں کہ انھوں نے مذکورہ انٹرویو پورا کا پورا پڑھا ہے۔ حالاں کہ یہ تمام اخبارات وہ تھے جو پروفیسر عرفان حبیب کے خلاف اور علی گڑھ کے مسلم طلبہ کی حمایت میں پر شور مضامین اور خطوط شائع کر رہے تھے۔ اس موضوع پر اس زمانہ میں تقریباً ہر اردو اخبار نے لکھا تھا۔ مگر کسی ایک اخبار نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ پروفیسر عرفان حبیب کے متنازعہ انٹرویو کا مکمل ترجمہ چھاپے تاکہ اردو قارئین اصل انٹرویو کو پڑھ کر کوئی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہو سکیں۔ ہر ایک صرف اپنا تبصرہ چھاپ رہا تھا، متنازعہ انٹرویو کسی نے بھی نہیں چھاپا۔

آخر کار میں اس کی تلاش میں انڈین اکسپریس کے دفتر گیا۔ وہاں اخبار کی فائل نکلوا کر پروفیسر عرفان حبیب کا مذکورہ انٹرویو پڑھا۔ اس کی فوٹو کاپی لی۔ اور پھر اس کے بارے میں دو صفحہ کا ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ الرسالہ (اگست ۱۹۸۱) میں چھپ چکا ہے۔ میرے اس مضمون کا عنوان تھا ——— "آہ یہ بے شعوری"

پروفیسر عرفان حبیب کے اس مطبوعہ انٹرویو کو آپ پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں جس پر مشتعل ہونے کی ضرورت ہو۔ اس انٹرویو کا خلاصہ یہ ہے کہ علی گڑھ کے طلبہ میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو تعلیم سے زیادہ ہنگامہ بازی میں دل چسپی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عین وہی واقعہ تھا جس کی تصدیق خود ان طلبہ نے انٹرویو کے بعد یونیورسٹی میں اپنے پر تشدد ہنگاموں سے عملی طور پر فراہم کر دی۔

ایک مسلمان ایڈیٹر صاحب جنھوں نے اصل انٹرویو کا خلاصہ پڑھا تھا، ان سے میں نے کہا کہ آپ انٹرویو کے خلاف مسلسل مضامین چھاپ رہے ہیں، پھر آپ اصل انٹرویو کو کیوں نہیں چھاپتے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم انٹرویو کو بجنسہ چھاپ دیں تو طلبہ کی مہم کمزور پڑ جائے گی۔ کیوں کہ اصل انٹرویو میں کوئی بہت زیادہ قابل اعتراض بات نہیں۔ گویا معاملہ حق اور ناحق کا نہیں۔ بلکہ اپنی قوم کی یک طرفہ حمایت کرنے کا ہے۔ اور اپنی قوم کی یہ یک طرفہ حمایت وہ لوگ کر رہے ہیں جو مغربی قومیت کے اس تصور کا مذاق اڑاتے ہیں کہ میری قوم، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر:

My country, right or wrong.

کیا اخلاق اسی کا نام ہے۔ اگر یہ اخلاق ہو تو دوسری کون سی چیز دنیا میں ہے جس کو اخلاق کے خلاف کہا جائے۔

جھوٹی شکایت

اردو اخبارات کی رپورٹیں اور مضامین خواہ وہ جس موضوع پر بھی ہوں، ان کا مشترک خلاصہ صرف ایک ہوتا ہے۔ اور وہ ہے جھوٹی شکایت۔ دوسروں کے بارہ میں جھوٹی شکایت ہمارے اخبارات کا سب سے زیادہ محبوب موضوع ہے۔

ان شکایتوں کو میں جھوٹی شکایت کیوں کہتا ہوں، اس کی ایک مثال لیجئے۔ ہمارے تمام اردو اخبارات مشترک طور پر اس بات کے شاکی ہیں کہ ملک کا قومی پریس (بڑے بڑے انگریزی اخبارات) مسلم معاملات کی صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے۔ ہر اردو اخبار بلاناغہ اس شکایت کو کسی نہ کسی شکل میں دہراتا رہتا ہے۔

مگر یہ شکایت سراسر بے معنی ہے۔ پہلی بات یہ کہ قومی پریس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پوری ہندستانی قوم کی مشترک ملکیت ہے۔ وہ قومی پریس صرف اس معنی میں ہے کہ وہ پورے ملک میں پڑھا جاتا ہے۔ وہ اردو اخبارات کی طرح صرف، ایک فرقہ کا اخبار (کمیونٹی پیپر) نہیں۔ پھر ان اخبارات میں جب دوسروں کا پیسہ لگا ہوا ہے، جب دوسروں کے ذہن ان کو چلا رہے ہیں۔ اور دوسرے ہی لوگ ان کے اصل خریدار ہیں تو ایسے اخبارات آخر مسلم جذبات کی نمائندگی کیوں کریں گے۔ اسباب کی اس دنیا میں یہ سراسر غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی کہ جن اخبارات کو تمام تر دوسرے لوگ چلا رہے ہوں ان سے ہم یہ امید رکھیں کہ وہ ہمارے اپنے جذبات کی ترجمانی کریں گے۔

اس مطالبہ کے پیچھے دوسرا زور اخلاقی زور ہو سکتا تھا۔ یعنی ہم اپنے اردو اخبارات میں دوسروں کی باتوں کی صحیح ترجمانی کر رہے ہوں۔ اگر ہم فی الواقع ایسا کریں تو کم از کم اخلاقی طور پر ہمیں یہ امید رکھنے کا حق ہے کہ دوسرے بھی اپنے اخبارات میں ہماری باتوں کی صحیح ترجمانی کریں گے۔

مگر بدقسمتی سے ہمارے مطالبہ کے پیچھے یہ اخلاقی زور بھی موجود نہیں۔ کیوں کہ اس معاملہ میں اردو اخبارات کا حال انگریزی اخبارات سے بھی زیادہ برا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو اخبارات

میں دوسروں کی باتیں نہایت بگڑی ہوئی شکل میں پیش کی جاتی ہیں۔ پھر دوسرے بھی اگر اپنے اخبارات میں ایسا ہی کریں تو ہمیں ان سے شکایت کرنے کا کیا حق۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے یہاں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۴ کو بمبئی میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر اردو اخبارات میں اشتعال انگیز سرخیوں کے ساتھ چھپی۔ اس کے بعد اس علاقہ کے مسلمان بھڑک اٹھے یہاں تک کہ مئی ۱۹۸۴ میں بھیونڈی اور بمبئی کے فسادات ہوئے جس میں مسلمانوں کا زبردست نقصان ہوا۔

مسٹر بال ٹھاکرے کی اس تقریر کے بارے میں ہر اردو اخبار یہ لکھ رہا تھا کہ اس میں پیغمبر اسلام کی توہین کی گئی ہے۔ ایک اردو اخبار نے اس تقریر کے اوپر حسب ذیل سُرخی لگائی:

مسلمانوں کے پیغمبر ہمارا بول و براز صاف کرتے تھے: ٹھاکرے کی دریدہ دہنی

مگر یہ ساری باتیں خود ساختہ رپورٹ کی بنیاد پر ہو رہی تھیں۔ میں نے بہت سے صحافیوں سے پوچھا کہ کیا آپ نے بال ٹھاکرے کی تقریر کا متن پڑھا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے اس تقریر کا ٹیپ سنا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے پوچھا، کیا آپ نے بال ٹھاکرے کا وہ انٹرویو دیکھا ہے جو انگریزی ہفتہ وار (Link) ۳ جون ۱۹۸۴ میں چھپا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ کیسا اسلام ہے کہ آپ بلا تحقیق اس کے خلاف اخباری محاذ قائم کیے ہوئے ہیں۔

میری عادت ہے کہ میں براہ راست تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کہتا۔ چنانچہ میں نے ہفتہ وار لنک کا مذکورہ شمارہ حاصل کیا۔ اس کو مکمل پڑھا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں ایک مضمون لکھا جو ماہنامہ الرسالہ (ستمبر ۱۹۸۴) میں چھپ چکا ہے۔

مذکورہ شائع شدہ انٹرویو کے مطابق بال ٹھاکرے نے کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہی۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے صحیح بخاری کی ایک روایت اپنے الفاظ میں نقل کی۔ اس روایت میں حضرت ابوہریرہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مدینہ کی مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ لوگ اس کی طرف دوڑے۔ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی بہا دو۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، تم مشکل پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

مسٹر بال ٹھاکرے نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا کہ دیکھو مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کا یہ حال تھا، مگر اب مسلمانوں میں اس قسم کی برداشت کہاں ہے :

But where is that kind of tolerance in this community now.

مسٹر بال ٹھاکرے کا یہ مطبوعہ انٹرویو کسی بھی اردو اخبار میں نقل نہیں کیا گیا۔ البتہ اس کے بعد ہر اردو اخبار نے بلا ٹکان مسٹر بال ٹھاکرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اردو اخبارات نے مسٹر بال ٹھاکرے کی بات کو نہایت بگڑی ہوئی صورت میں پیش کیا اور اس پر پرشور تبصرے کیے۔ اردو اخبارات نے بال ٹھاکرے کی بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم کو یہ حق ہے کہ ہم دوسروں کے جاری کردہ اخبارات سے یہ تقاضا کریں کہ وہ ہمارے معاملات کی ترجمانی صحیح انداز سے کریں۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے کہ اردو صحافت اور اخلاقیات دونوں دو متضاد چیزیں ہیں جو کم از کم اب تک ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہوئیں۔

منصفانہ تجزیہ نہیں

صحافتی اخلاقیات کا ایک جزء منصفانہ تجزیہ اور حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے۔ مگر اردو صحافت میں منصفانہ تجزیہ اتنا کمیاب ہے کہ بدرجہ امکان ہی اس کے وجود کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ منفی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ کبھی مسائل کو بے لاگ انداز سے دیکھ نہیں سکتے۔ اور جو لوگ مسائل کو بے لاگ انداز سے نہ دیکھ سکیں ان کے لیے یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ مسائل کا منصفانہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کریں۔ اردو صحافت اس اصول کی بدترین مثال ہے۔

اردو زبان میں آج ہزاروں اخبار نکلتے ہیں اور ہر اخبار اپنی ہر اشاعت میں ایک اداریہ بھی ضرور شائع کرتا ہے۔ مگر یہ اداریے بمشکل ہی اس قابل ہوتے ہیں کہ کوئی پڑھنے والا ان کو پڑھے۔ ان تمام اداریوں کا ایک مشترک عنوان دینا ہو تو وہ " چیخ پکار " ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفروضہ تعصب اور امتیاز کے خلاف چیخ پکار کے سوا اردو اخبارات کے پاس کوئی اور بات ہی نہیں جس کو وہ اپنے تبصروں کا موضوع بنائیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے صرف کچھ سطحی لوگ دلچسپی لے سکتے ہیں، سنجیدہ لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔

مئی ۱۹۸۵ میں یہ واقعہ ہوا کہ چاندمل چوپڑا نامی ایک شخص نے کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے خلاف ایک رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ قرآن تشدد کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے اس ملک میں اس کی اشاعت اور تقسیم کو قانونی طور پر بند کر دیا جائے۔ کلکتہ ہائی کورٹ نے اس پٹیشن کو سماعت کے لیے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو جسٹس بی سی باسک نے وہ تاریخی فیصلہ دیا جو تمام اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

اس کیس کے بارے میں حسب معمول اردو اخبارات میں پرشور مضامین چھپے۔ ان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے اس قسم کی زبان استعمال کی کہ "چوپڑا کا کھوپڑا خراب ہو گیا ہے"۔ اور ایسے بھی تھے جنھوں نے اس سے مختلف زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ تاہم سب کا مشترک خلاصہ ایک تھا ——— اس کے خلاف اندھا دھند احتجاج۔

کلکتہ ہائی کورٹ کے فیصلہ کے کئی ماہ بعد ستمبر ۱۹۸۵ میں ایک اردو جریدہ نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:

"یہ ایک بڑا خوفناک واقعہ ہے جو پچھلے دنوں ہوا۔ عدالت نے اس استغاثہ پر کوئی باقاعدہ فیصلہ دینے کے بجائے معاملہ کو گول مول چھوڑ کر اس کو اپنے ریمارکس کے ساتھ محض روک دیا۔ گویا شرارت کا دروازہ اب بھی بند نہیں ہے"۔

جن لوگوں نے اصل فیصلہ کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو جریدہ کے یہ الفاظ سراسر واقعہ کے خلاف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کلکتہ ہائی کورٹ نے معاملہ کو گول مول نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کو قطعی طور پر خارج کر دیا۔ جسٹس بمل چندر باسک کے ۱۸ صفحات کے فیصلہ کے آخر میں پیراگراف نمبر ۴۰ کو پڑھیے۔ اس میں واضح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں:

For the aforesaid reasons this application stands dismissed.

یعنی مذکورہ حقائق کی بنا پر یہ درخواست ڈسمس کی جاتی ہے۔

یہ اخلاق کی کون سی قسم ہے کہ عدالت کے ایک صحیح فیصلہ کا اعتراف نہ کیا جائے اور اس کے بارہ میں ایسے الفاظ لکھے جائیں جس سے اس کا وقار غیر ضروری طور پر مجروح ہوتا ہو۔ اس قسم کے صحافتی تبصرہ کو صحافتی تبصرہ کے بجائے صحافتی الزام کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

غیر تعمیری ذوق

۱۹۶۸ میں راقم الحروف نے لکھنؤ کے ایک ہفت روزہ میں ایک کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کالم میں میں نے مسلمانوں کے اندر " اپنی تعمیر آپ " کا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس کا ایک نمونہ ماہنامہ الرسالہ کے قارئین الرسالہ میں دیکھتے رہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ چند اشاعتوں کے بعد میرے بھیجے ہوئے مضامین مجھے بذریعہ ڈاک واپس کر دیئے گئے۔ ان مضامین کے ساتھ اخبار کے ایڈیٹر کا ایک خط تھا جس میں لکھا ہوا تھا :

" آپ کے مضامین ہمارے اخبار میں کھپ نہیں رہے ہیں۔"

اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ اخبار اس زمانہ میں پرشور طور پر احتجاجی سیاست چلا رہا تھا۔ احتجاجی سیاست کا مطلب اپنے مسائل کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے کر ان کے خلاف مطالبہ کی مہم چلانا ہے۔ جب کہ میں اپنے مضامین میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ مسلمانوں کا مسئلہ موجودہ زمانہ میں خود اپنی غفلت سے پیدا ہوا ہے، اور مسلمان اپنی تعمیر آپ کر کے ہی اس مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ قسم کی احتجاجی سیاست کے خانہ میں میرے تعمیری مضامین بالکل بے جوڑ تھے، چنانچہ محترم ایڈیٹر صاحب نے ان کو چھاپنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ جو لوگ اس قسم کا غیر حقیقت پسندانہ ذہن رکھتے ہوں وہ کبھی مسائل کا منصفانہ تجزیہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جدید اردو صحافت میں مجھے صرف ایک بزرگ معلوم ہیں جن کا ذکر میں اس اعتبار سے کر سکتا ہوں کہ وہ حقیقت پسندانہ اداریہ لکھنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آصف حسین قدوائی ہیں۔ وہ پندرہ سال پہلے لکھنؤ کے ایک ہفتہ وار اخبار میں پابندی کے ساتھ اداریے اور تبصرے لکھتے تھے۔ اہل علم طبقہ میں ان کے یہ مضامین نہایت اہتمام سے پڑھے جاتے تھے۔ میں خود پابندی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتا تھا۔

ڈاکٹر آصف حسین قدوائی کے مضامین کی نوعیت کو بتانے کے لیے میں ایک چھوٹی سی مثال دوں گا۔ ایک بار انھوں نے ہندستان کی مسلم سیاست پر ایک مفصل اداریہ لکھا۔ اس کا پہلا جملہ تھا :

" سیاست ممکنات کا کھیل ہے "

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جملہ اتنا قیمتی ہے کہ دور جدید کی تمام اردو صحافت پر بھاری ہے۔ مگر ڈاکٹر قدوائی کا بھی وہی انجام ہوا جو میرے تعمیری مضامین کا ہوا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مذکورہ اخبار سے الگ

ہوگیے اور اب لکھنؤ میں تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا تعمیری نقطۂ نظر غالباً اردو کی احتجاجی صحافت میں کھپ نہ سکا اور انھیں اپنے آپ کو اس سے علٰحدہ کرلینا پڑا۔

فرقہ وارانہ فساد کے موضوع پر میرے کچھ مضامین ماہنامہ الرسالہ میں چھپے۔ اردو اخبارات کا عام ذہن یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہمیشہ غیر مسلم طبقہ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ میں نے اس کے برعکس خود مسلمانوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ میں نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ اپنی اندرونی کمزوریوں پر قابو پاکر فسادات کے مسئلہ پر قابو پاسکتے ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت کے بعد ایک اردو صحافی مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ "لوگوں کا خیال ہے کہ آپ حکومت کی طرف سے ڈیپوٹ کیے گیے ہیں تاکہ فسادات کے معاملہ میں مسلمانوں کو قصوروار ثابت کریں۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت کا ذہن کس قدر غیر تعمیری ہوچکا ہے۔ حتیٰ کہ اب اگر کوئی شخص تعمیری بات کہے یا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر پیش کرے تو اس کو لازمی طور پر مذکورہ بالا قسم کا تبصرہ سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

آخری بات

اخلاقیات کے اعتبار سے، اردو صحافت کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ اردو صحافت مسلم مسائل کے ہم معنی بن گئی ہے۔ دونوں ایسا لازم ملزوم ہوگیے ہیں گویا مسلم مسائل کا نام اردو صحافت ہے اور اردو صحافت کا نام مسلم مسائل۔

اب اردو صحافت کو صحیح معنوں میں اخلاقی معیار پر لانے کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ اس کو نام نہاد مسلم مسائل سے جدا کر دیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں اردو صحافت مسلم مسائل کا ضمیمہ بن گئی ہے۔ اسی وابستگی کا یہ نتیجہ ہے کہ اردو صحافت نے ایک قسم کی وکیلانہ صحافت کی شکل اختیار کرلی ہے وہ حقیقت پسندانہ صحافت نہ بن سکی۔ اگر کسی طرح دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے تو اردو صحافت ایک فرقہ کی صحافت سے اوپر اٹھ کر قومی صحافت کا درجہ حاصل کرے گی۔ اس کی وہ کمزوریاں اپنے آپ ختم ہوجائیں گی جو اخلاقی اعتبار سے اس کی ترقی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہفتہ وار بلٹز کا اردو اڈیشن ہے۔ اردو بلٹز کے مالک غیر مسلم لوگ ہیں اور وہ اس کو کسی قدر آزاد انداز میں چلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اردو بلٹز دوسرے

ہفتہ وار اردو اخبـاروں سے کہیں زیادہ پڑھا جاتا ہے ۔

ایک فرقہ وارانہ فساد کے بعد مجھے مختلف اردو اخبارات کو تقابلی طور پر دیکھنے کا موقع ملا ۔ میں نے دیکھا کہ ہر اردو اخبار میں سب سے زیادہ ریلیف کے کاموں کو شائع کیا جا رہا ہے ۔ مگر ہر اردو اخبار میں صرف اپنے حلقہ اور اپنی جماعت کے ریلیف کا کام شائع ہو رہا تھا ۔ اگر کوئی شخص صرف ایک اخبار کو پڑھے تو اس کا تاثر یہ ہوگا کہ بس وہی ایک جماعت ریلیف کا کام کر رہی ہے جو اس اخبار کی مالک ہے ۔ اس کے برعکس اردو بلٹز میں ہر جماعت اور ہر ادارہ کے ریلیف کے کاموں کا ذکر بلا امتیاز شائع ہو رہا تھا ۔ اب ظاہر ہے کہ قارئین ریلیف کے کام کے بارے میں پوری بات کو جاننا چاہیں گے نہ کہ ادھوری بات کو ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو بلٹز کی اشاعت آج ہر دوسرے اردو ہفتہ وار سے بہت زیادہ ہے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو صحافت پر مسلمانوں کے قومی مسائل کا غلبہ ہے ۔ اس غیر ضروری غلبہ نے اردو صحافت کو ایک قسم کی اخلاقی قید میں مبتلا کر رکھا ہے ۔ اردو صحافت کو اگر اس قید سے رہائی دیدی جائے تو اچانک وہ آفاقی وسعت حاصل کرے گی ۔ اردو صحافت کو زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان ہونا چاہیے نہ کہ محدود معنوں میں مسلمانوں کے قومی مسائل کا ترجمان ۔ کسی شاعر کا یہ شعر اردو صحافت کی موجودہ صورت حال پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے :

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

نوٹ : اردو اکادمی دہلی کے تحت منعقد ہونے والے کل ہند سیمینار (غالب اکیڈمی نئی دہلی) میں ۹ فروری ۱۹۸۶ کو پڑھا گیا ۔

ایک سفر

۱۹ مارچ ۱۹۸۶ کی شام کو مجھے دہلی سے پونہ جانا تھا۔ میں "رپورٹنگ ٹائم" پر ایرپورٹ پہونچا۔ ابتداءً انڈین ایرلائنز نے اطلاع دی کہ فلائٹ بالکل وقت پر ہے۔ مگر بعد کو بالکل آخر وقت میں اعلان ہوا کہ جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ اس ملک کا معاملہ عجیب ہے۔ بس سے سفر کیجیے تو بھیڑ کا خطرہ، کار سے سفر کیجیے تو ایکسیڈنٹ کا خطرہ، ٹرین سے سفر کیجیے تو چین پُلنگ کا خطرہ۔ ہوائی جہاز سے سفر کیجیے تو یہ خطرہ کہ اچانک کسی "ٹکنکل سبب" سے جہاز لیٹ ہو جائے گا۔

یہ بلاشبہ وقت کا ضیاع ہے اور ناقابل بیان قومی نقصان ہے۔ تاہم ایمان ایک ایسی نعمت ہے جو آدمی کو ہر نقصان سے بچانے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ ہر چیز اس کے لیے خیر بن جاتی ہے۔ سب کچھ ٹھیک اندازہ کے مطابق ہو تو مومن کے اندر شکر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور اگر اس کا اندازہ بگڑ جائے تو وہ عرفتُ ربي بفسخ العزائم کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ ایمان کسی آدمی کے لیے اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی ناخوش گواریاں بھی خوش گواریوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔

میرا ٹکٹ یکم مارچ کو انڈین ایرلائنز کے دہلی آفس سے خریدا گیا تھا۔ اس وقت اس کی قیمت ۲۱۲۸ روپیہ تھی۔ مگر اس کے بعد اعلان ہوا کہ ۱۸ مارچ سے انڈین ایرلائنز کی تمام پروازوں کے کرائے بڑھا دیئے گیے ہیں۔ میرا سفر ۱۹ مارچ کو شروع ہو رہا تھا۔ چنانچہ ایرپورٹ پر مزید ۱۳۶ روپے ادا کر کے بورڈنگ پاس ملا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں یہ اصرار کروں کہ میرے پاس جو ٹکٹ ہے، اسی ٹکٹ پر مجھے سفر کا اجازت نامہ ملنا چاہیے تو یہ ناممکن ہے۔ یہ دنیا تبدیلیوں کی دنیا ہے۔ یہاں کبھی آدمی کو سابقہ ٹکٹ پر جگہ مل جاتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس ٹکٹ ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کو سواری میں جگہ نہیں دی جاتی جب تک وہ موجودہ ٹکٹ کے علاوہ اپنی اہلیت کا مزید ثبوت نہ دے۔ جو لوگ صرف اتنا جانتے ہوں کہ جب ایک ٹکٹ میری جیب میں ہے تو مجھ کو ضرور جگہ ملے گی، انھیں شکایت نہیں ہونی چاہیے اگر اس بدلتی ہوئی دنیا میں وہ اپنی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

ایک گھنٹہ انتظار کے بعد جہاز کے اندر داخل ہوئے۔ اس کے اندر اس کا میگزین

(سوالگٹ مارچ ۱۹۸۶) تھا۔ میں اس کو لے کر پڑھنے لگا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈین ایرلائنز دنیا کی چند انتہائی وسیع قسم کی ایرلائنز میں سے ہے۔ اس کے پاس مختلف قسم کے جہازوں کا بہت بڑا دستہ ہے۔ وہ روزانہ ۲۰۰ سے زیادہ ہوائی سروس چلاتی ہے جو ملک کے ۷۲ مقامات پر اترتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیپال، پاکستان، افغانستان، سری لنکا، مالدیپ، بنکاک، بنگلہ دیش تک بھی اس کے جہاز جاتے ہیں۔ اس کے معاہدے مختلف انٹرنیشنل ہوائی کمپنیوں سے ہیں۔ اس لیے آپ جہاں کہیں بھی ہوں انڈین ایرلائنز کو آپ ہر جگہ اپنی خدمت کے لیے موجود پائیں گے:

So wherever you are Indian Airlines is always within reach.

جہاز ابھی ہوائی اڈہ پر کھڑا تھا اور میں اس میں داخل ہو کر اس کے میگزین میں یہ سب باتیں پڑھ رہا تھا کہ اچانک اعلان ہوا کہ تمام مسافر اس جہاز سے اتر جائیں۔ آپ لوگوں کو دوسرے جہاز سے پونہ لے جایا جائے گا۔ چنانچہ تمام مسافر جہاز سے اتر کر دوسرے جہاز پر سوار ہوئے۔ اس عمل میں مزید تاخیر ہوئی اور جہاز پورے دو گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔

جہاز کے میگزین میں یہ الفاظ نمایاں طور پر لکھے ہوئے تھے:

We wish you a comfortable journey.

اسی کے ساتھ ہندی رسم الخط میں اس کا ترجمہ ان الفاظ میں درج تھا: ہم آپ کی سکھد یاترا کے لیے کامنا کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ الفاظ بولنا کتنا زیادہ آسان ہے اور الفاظ کو عمل میں ڈھالنا اس کے مقابلہ میں کتنا زیادہ مشکل۔

جہاز کے اندر اپنا بیگ رکھنے کے لیے میں نے اپنی سیٹ کے اوپر لگا ہوا خانہ (Overhead locker) کھولا۔ مگر وہ چھوٹا تھا اور میرا ہینڈ بیگ اس میں نہیں آرہا تھا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ ایک مسافر نے مخالف سمت کے لاکر (خانہ) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں رکھ دیجیے۔ میں نے اس کو کھول کر دیکھا تو وہ بڑا تھا۔ چنانچہ اس میں میرا بیگ آسانی سے آگیا — آدمی ہمیشہ اپنے مسئلہ کا حل اپنے سامنے کے مقام پر تلاش کرتا ہے۔ حالاں کہ اکثر حالات میں مسئلہ کا حل کسی اور مقام پر ہوتا ہے۔

پونہ کے لیے یہ میرا چوتھا سفر تھا۔ تاہم پونا والوں سے میں نے کہا کہ یہ شاید پونا کے لیے میرا آخری سفر ہو۔ میری عمر اگرچہ بہت زیادہ نہیں۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں قبل از وقت بوڑھا ہو گیا۔ اب

میرے اندر سفر کی طاقت نہیں رہی۔ پونا کے لیے میرے اب تک کے سفروں کی تاریخی تفصیل یہ ہے :

پہلا سفر	ستمبر ۱۹۷۱
دوسرا سفر	مارچ ۱۹۸۳
تیسرا سفر	ستمبر ۱۹۸۴
چوتھا سفر	مارچ ۱۹۸۶

پونہ میں مختلف پروگرام تھے۔ پچھلے سفر کے مقابلہ میں موجودہ پروگرام میں شرکار کی تعداد کافی زیادہ تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مدت میں اللہ کے فضل سے الرسالہ کے قارئین کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرے مقررین عوامی رجحان کی رعایت سے بولتے ہیں اس لیے ان کے اجتماع کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ مگر میری تقریر کا موضوع عوامی رجحان سے الگ ہوتا ہے۔ اس لیے میرا اجتماع اس بات کا پیمانہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کی آواز کتنی پھیلی ہے۔ پونہ کے ساتھی سب سے زیادہ زور الرسالہ کے قارئین کا حلقہ بڑھانے پر لگا رہے ہیں۔ ایک ساتھی نے کہا کہ الرسالہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کو صرف لوگوں کو دکھانے کی ضرورت ہے، اور اس کے بعد بیشتر لوگ اپنے آپ اس کے خریدار بن جائیں گے۔

ہمارے مشن میں اس وقت سب سے بڑا پروگرام الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے۔ جو لوگ پروگرام کے طالب ہیں ان کو الرسالہ کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھانے میں لگ جانا چاہیے۔

پونا کی کل آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ اس میں مسلمان تقریباً ایک لاکھ ہیں۔ ایک لاکھ کی تعداد کسی بھی کام کو کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ مگر پونہ کے مسلمانوں کا حال بھی وہی ہے جو دوسرے شہروں کے مسلمانوں کا ہے۔ تعمیری کام سے زیادہ آپس کے اختلافات اور بے فائدہ مظاہروں میں اپنی طاقت ضائع کرنا۔ اسی پونہ میں عیسائی ان سے کم تعداد میں ہو کر ان سے بہت زیادہ تعمیری کام کر رہے ہیں۔ مگر مسلمان عین ان کے پڑوس میں پسماندگی کا نشان بنے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ساری مسلم دنیا میں نہایت زور و شور کے ساتھ بے فائدہ منفی سرگرمیاں جاری ہیں۔ تبلیغی جماعت جیسی بعض انتہائی مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر سب کا یہی حال ہے۔ ہر ایک کے پاس ایک جھوٹا اسلام ہے اور وہ اس کا جھنڈا اٹھا کر اپنے آپ کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔

پونا میں ایک ہندو بلڈر نے ایک اونچی عمارت بنائی جس میں بہت سے فلیٹ تھے۔ اب فوراً

مسلمانوں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ ان کے گھروں کی بے پردگی ہوگی۔ چنانچہ اس کے خلاف مہم شروع ہو گئی۔ بلڈر نے کہا کہ تمہارا فلاں لڑکیوں کا اسکول ہے وہاں خود مسلم اسکول کے مالکوں نے اسی قسم کی اونچی بلڈنگ بنائی ہے اور اس کے فلیٹ لوگوں کو کرایہ پر دیئے ہیں تو کیا اس کے ذریعہ تمہارے گرلز اسکول کی بے پردگی نہیں ہوتی۔ پھر وہاں تم اسی قسم کا ایجی ٹیشن کیوں نہیں چلاتے۔ ایجی ٹیشن ختم ہو گیا اور بلڈنگ بدستور اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی ہے۔

اسی طرح پونا میں ایک مسجد ہے جس کا نام ہے "مسجد منشیان"۔ یہ مسجد سڑک کے کنارے ہے۔ یہاں سڑک کے دوسری طرف کسی قدر فاصلہ پر ایک ہوٹل بنایا گیا ہے جس کا نام سلور ان (Silver Inn) ہے۔ اس ہوٹل میں ایک پرمٹ روم (Permit room) بھی ہے۔ یعنی سرکاری لائسنس کے تحت شراب پینے کا کمرہ۔ اب مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ اس سے مسجد کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ۲۶ جنوری ۱۹۸۵ کو کاڑا دیوس (کالا دن) کے طور پر منائیں گے۔ پوسٹر لگائے گئے۔ نعرے بلند کیے گیے۔ اور ۲۶ جنوری کو بہت سے مسلمان ہوٹل کے سامنے منڈپ ڈال کر بیٹھ گیے کہ ہم اس وقت تک بھوک ہڑتال کریں گے جب تک یہ "شراب خانہ" بند نہ کر دیا جائے۔

کچھ مسلمان یہاں کے مراٹھی اخبار (ترن بھارت) کے دفتر میں گیے تاکہ وہاں اپنے اسلامی احتجاج کی خبر چھپوائیں۔ اس کے ایڈیٹر نے کہا کہ ہوٹل والوں نے تمہاری مسجد سے کافی فاصلہ پر سرکاری اجازت کے تحت شراب خانہ کھولا ہے۔ اور دوسری طرف تمہاری اس مسجد سے قریب ہی دوسری مسجد ہے اس کی عین دیواروں کے نیچے خود مسلمانوں نے بلا اجازت شراب کا دھندا کھول رکھا ہے تو تم اس کو بند کرنے کی مہم کیوں نہیں چلاتے۔ دوبارہ یہی ہوا کہ ہوٹل کا "پرمٹ روم" بدستور موجود ہے اور مسلمانوں کی احتجاجی مہم ایک دن کے شور وشر کے بعد ختم ہو گئی۔

پونا کے پہلے سفر میں میں نے ڈی نابلی کالج دیکھا تھا جو عیسائیوں کا عظیم الشان ادارہ ہے۔ اس بار کے سفر میں "گیان پربودھنی" دیکھا جو ہندو صاحبان کا بہت بڑا ادارہ ہے۔ اس طرح کے درجنوں بڑے بڑے ادارے ہیں جو یہاں دوسری قوموں نے قائم کر رکھے ہیں اور ان کے ذریعہ سے اپنی تعمیر وترقی کے کام میں مسلسل مصروف ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ دیواروں کے اوپر الفاظ

کی لکیریں بنا کر خوش ہو رہے ہیں۔ پونا کی کچھ گندی اور ٹوٹی ہوئی دیواروں پر " اسلامی نعرے " لکھے ہوئے نظر آئے۔ اگرچہ ان کی بدخطی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ مجھ کو نہ پڑھو۔ وہ نعرے یہ تھے :

اٹھو نوجوانو ، اسلام کو تمہاری ضرورت ہے ، شریعت خطرے میں ہے

یکساں سول کوڈ مردہ باد ، شریعت زندہ باد ۔ ہمیں چاہیے شریعت کورٹ

ایک لیڈر صاحب سے میں نے کہا کہ اس قسم کے نعروں اور پوسٹروں سے کیا فائدہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو کچھ نوجوانوں نے کیے ہیں۔ میں نے کہا کہ نوجوانوں نے اس لیے کیا ہے کہ لیڈر صاحبان ان کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ایک سیدھے سادے تاجر اس وقت ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا آپ بالکل درست کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اوپر والے حمایت کرتے ہیں تبھی نیچے والوں کو کرنے کی ہمت ہوتی ہے۔ اوپر والے اگر شوشہ نہ چھوڑیں تو نیچے والے بالکل ٹھیک رہیں گے۔

گیان پربودھنی (پونا) ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ یہ لوگ نہایت خاموش کام میں مصروف ہیں۔ وہ حکومت سے کوئی امداد نہیں لیتے۔ ان کا بہت بڑا بجٹ ہے مگر اس کا کچھ حصہ قومی چندوں سے پورا ہوتا ہے اور کچھ ان کے اپنے صنعتی اور زراعتی شعبوں سے آتا ہے۔

ان کے مختلف کام ہیں۔ مثلاً ایک کام یہ ہے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے ہندو نوجوانوں کو منتخب کر کے انھیں آئی اے ایس (I.A.S.) کے امتحان کے لیے تیار کرتے ہیں۔ یہی لوگ بعد کو حکومت کے کلیدی مناصب پر قبضہ کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ پورے انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ پھر اسی ادارہ سے آر ایس ایس جیسی تنظیموں کو بھی اعلیٰ کارکن مل رہے ہیں۔ وغیرہ

گیان پربودھنی کی کئی منزلہ بلڈنگ میں نیچے کے حصے میں ایک بڑا ہال ہے۔ اس میں ہر صبح کو اس کے تمام اساتذہ اور طلبہ اور کارکن جمع ہوتے ہیں اور پوجا اور پرارتھنا کرتے ہیں۔ ہال کی ایک دیوار پر پورے بھارت (ہندستان) کی ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ اسی کو سامنے رکھ کر وہ اپنے مراسم ادا کرتے ہیں۔ اس تصویر کے نیچے مراٹھی زبان میں لکھا ہوا ہے :

ماتر بھومی ہی خدا ہے۔ اسی کی ہمیں پوجا کرنا ہے۔

یہ گویا آر ایس ایس کا کلمہ ہے۔ اس سے آپ آر ایس ایس کی تحریک کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ یہ حاصل " بھارت " کی برتری کے تصور پر اٹھی ہے۔ حتی کہ انھوں نے " بھارت " کو مقدس معبود کا درجہ دیدیا

ہے۔ آر ایس ایس کے دوسرے تمام مظاہر اسی کے اسی مخصوص عقیدہ کا نتیجہ ہیں۔

پندرہ سال پہلے میں نے گرو گولوالکر کی کتاب گلدستۂ خیال (Bunch of Thought) پڑھی تھی جو گویا آر ایس ایس تحریک کی بائبل ہے۔ اسی وقت میں نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ ترجمہ ابھی تک میرے پاس غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہ تحریک کم از کم اپنی موجودہ حالت میں مسلمانوں کی تقسیم کی تحریک کا ردعمل ہے۔ اس کے نزدیک بھارت ایک مقدس جغرافی وحدت ہے۔ اس کا وہی درجہ ہے جو مذہبی اصطلاح میں معبود کا درجہ ہونا چاہیے۔ ایسی حالت میں اس فکر کے نزدیک یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے کہ اس مقدس وحدت کے ٹکڑے کیے جائیں یہ فکر بلاشبہ ہندستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس نے ہندستانی باشندوں کی ایک بڑی تعداد کے اندر مستقل طور پر منفی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور منفی ذہنیت سے زیادہ تباہ کن اس دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو چیز مقدس بن جائے اس کو آدمی کبھی عقلی معیاروں پر نہیں جانچتا۔ اس لیے ان حضرات کا یہ احساس غالباً اس وقت تک باقی رہے گا جب تک موجودہ صورت حال باقی ہے۔

مسلمان اس معاملہ میں ہمیشہ مذکورہ فکر کو الزام دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں سب سے بڑے ملزم خود مسلمان ہیں۔ اقبال اور دوسرے حضرات نے ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل ملکی تقسیم میں دریافت کیا۔ مگر ہندو مسلم مسئلہ کا یہ حل کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے، موجودہ حالات میں اتنی بڑی نادانی تھی کہ شاید پوری انسانی تاریخ میں اتنی بڑی نادانی کبھی نہیں کی گئی۔ یہ بلا تشبیہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سنی اور شیعہ کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کرے کہ کعبہ کو دو ٹکڑے کر کے دونوں فرقوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ ایسا حل مسئلہ کو صرف شدید تر بناتا ہے ایک ایسا ملک جس کے باشندے اپنے ملک کو خدا سمجھ کر اس کو پوجتے ہوں وہاں مسئلہ کا حل اہلِ ملک کی سوچ کو بدلنا تھا نہ کہ ملک کی جغرافی سرحد کو بدلنا۔ موجودہ صورت حال میں ملک کی تقسیم صرف مسئلہ کی شدت میں اضافہ کرتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اصل مسئلہ کو حل نہیں کرتی۔

کیسے عجیب تھے وہ مفکرین اسلام جن کو اسلام نے صرف یہ بتایا کہ وہ ایسے کانٹے کی فصل بوئیں جس کے کانٹے کبھی ختم نہ ہو سکیں۔

پونہ میں ایک ہندو ادارہ ہے جس کا نام ہے سادھو آسوانی مشن۔ وہ مختلف قسم کے علمی کام کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے ایک منصوبہ کا نام ہے : (Life Beyond Project) یہ پروجکٹ گویا آواگمن کے نظریہ کو عقلی اور سائنسی طور پر ثابت کرنے کی ایک منظم کوشش ہے۔ یہ کام وہ عالمی سطح پر انجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح پونہ میں ایک ادارہ (بسنت وکھیان مالا) ہے جو ہر سال چھٹیوں کے موسم (ماہ مئی) میں ایک مہینہ تک ہر روز مذہبی اور تاریخی موضوعات پر لکچر کراتا ہے۔ اس کے لیے سارے ملک سے اعلیٰ قابلیت کے لوگ بلائے جاتے ہیں۔ اس میں داخلہ کے لیے ٹکٹ ہوتا ہے جس کو ہر آدمی قیمت دے کر خریدتا ہے۔ اس کے باوجود بڑا ہال آخری حد تک بھرا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہندو قوم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر رُخ پر کام کرتی ہے۔ اس کے کچھ افراد اگر ایک کام کرتے ہیں تو اس کے دوسرے افراد دوسرے کام کو سنبھال لیتے ہیں۔ مثلاً گاندھی جی نے سودیشی کپڑے کے بائیکاٹ (۱۹۲۱) کی مہم چلائی تو ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی اس مہم میں پوری طرح شریک تھے۔ مگر ہندوؤں نے اگر ایک طرف لنکاشائر اور مانچسٹر کے کپڑے جلائے تو دوسری طرف سیکڑوں کی تعداد میں ملک کے اندر کپڑے کی ملیں بھی قائم کر دیں۔ جب کہ مسلمان صرف باہر کے کپڑے جلاتے رہے اور انھوں نے کپڑے کی ایک مل بھی قائم نہ کی۔

یہی انداز پوری جدید تاریخ میں مسلمانوں کا نظر آتا ہے حتیٰ کہ اب ان کا مزاج ایسا ہو گیا ہے کہ تخریب کے کام کے لیے انھیں نہایت آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ مگر تعمیر کے کام کے لیے پکارا جائے تو وہ ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔

اسی صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں جو آدمی مقبولیت چاہتا ہے وہ فوراً ایک منفی نعرہ لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ کریڈٹ وصول کرتا ہے کہ اس نے عظیم الشان اسلامی اتحاد قائم کر دیا ہے۔ مثبت پروگرام کے لیے اٹھنا اپنی قیادت کو کھونے کی قیمت پر ممکن ہے جس کا ایک نمونہ موجودہ زمانہ میں فرانس کے چارلس ڈیگال نے پیش کیا ہے۔ مگر ہمارے درمیان کوئی "ڈیگال" نہیں۔ اسی لیے ہمارے درمیان ابھی تک یہ ممکن نہ ہوا کہ کوئی قائد خود مر کر قوم کو نئی زندگی عطا کر دے۔

پونہ کے قیام میں برابر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے علاوہ کئی تقریری پروگرام ہوئے جس کی تفصیل نیچے درج ہے۔

پونہ میں تلک سمارک ہال، یہاں کا سب سے زیادہ بڑا اور مشہور ہال ہے۔ ۲۰ مارچ کی شام کو یہاں عمومی اجتماع ہوا۔ اس میں پونہ کے میئر بھی شریک ہوئے۔ مسلمانوں کے علاوہ تعلیم یافتہ غیر مسلموں کی معقول تعداد بھی ہال میں موجود تھی۔ اس تقریر کا عنوان مقامی منتظمین نے حسب ذیل مقرر کیا تھا:

دورِ جدید کا بانی : پیغمبر اسلام

اس موضوع پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تقریر ہوئی۔ لوگ آخر تک نہایت دلچسپی اور انہماک کے ساتھ سنتے رہے۔ ہندو صاحبان نے کہا کہ " ہم نے اب تک ایسا کوئی مولوی نہیں دیکھا تھا۔ ہم کو معلوم ہی نہ تھا کہ اسلام کا یہ مطلب بھی ہے۔ کئی ہندو صاحبان نے بک اسٹال سے انگریزی کتابیں خریدیں اور پیغمبر انقلاب کا انگریزی ترجمہ بھی خریدا۔ منتظمین نے اس موقع کے لیے الرسالہ کے کچھ اقتباسات کا مرہٹی ترجمہ کر کے ایک پمفلٹ شایع کیا تھا۔ یہ مرہٹی پمفلٹ لوگوں کے درمیان تقسیم کیا گیا۔

پونہ میں پروگرام

۱	۱۹ مارچ ۱۹۸۶	بعد نماز عشاء	قارئین الرسالہ سے خطاب	مکہ مسجد
۲	۲۰ مارچ	بعد نماز فجر	درس قرآن	مکہ مسجد
۳	۲۰ مارچ	۱۲ بجے دن	ملاقات اور معائنہ	گیان پربودھنی (ہندو ادارہ)
۴	۲۰ مارچ	۶ بجے شام	مسلم و غیر مسلم مشترک اجتماع	تلک ساک مندر
۵	۲۰ مارچ	بعد نماز عشاء	تاجر طبقہ سے خطاب	میمن جماعت خانہ
۶	۲۱ مارچ	بعد نماز فجر	درس قرآن	مکہ مسجد
۷	۲۱ مارچ	قبل نماز جمعہ	خطاب عام	مکہ مسجد
۸	۲۱ مارچ	بعد نماز عشاء	خطاب عام	جامع مسجد ایروڈا
۹	۲۲ مارچ	بعد نماز فجر	درس حدیث	مکہ مسجد

تلک سمارک ہال کے قواعد کی وجہ سے اس کا پروگرام مغرب سے کچھ پہلے شروع کیا گیا تھا۔ ابھی میری تقریر جاری تھی کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ اس وقت تقریر کو روک کر ہال کے باہر نماز باجماعت ادا کی گئی۔ مسلم سامعین نماز کے لیے اٹھ گیے۔ غیر مسلم سامعین کے لیے یہ ایک نامانوس واقعہ تھا۔ تاہم وہ سب کے سب اپنی سیٹ پر انتظار میں بیٹھے رہے اور جب ہم لوگ نماز ادا کر کے آئے تو انھوں نے اس کو اصول پرستی قرار دے کر اس کی تحسین کی۔ غیر مسلم حاضرین میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جو اٹھ کر چلا جائے۔

ایک ہندو ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کے لیڈروں نے اسلام کو سیاست بنا دیا۔ اس لیے دوسری قومیں اس سے بھڑک گئیں۔ اگر اسلام کو اس طرح سائنٹفک انداز میں پیش کیا جائے جس طرح آپ نے پیش کیا ہے تو آپ دوسری قوموں میں بہت لوگوں کو اپنا ہمدرد پائیں گے۔

پونا میں الرسالہ اور الرسالہ کی دعوت خدا کے فضل سے تیزی سے پھیل رہی ہے۔ منتظمین اجتماع میں سے ایک شخص نے کہا، آپ کے پچھلے سفر کے مقابلے میں اس بار ہم نے بہت کم پبلسٹی کی۔ مگر اس بار پہلے سے بہت زیادہ آدمی آپ کی ہر تقریر میں شریک ہوئے۔ جمعہ (۲۰ مارچ) کو جمعہ سے پہلے ایک جامع مسجد میں تقریر رکھی گئی تھی۔ وہاں پہونچا تو الرسالہ کا یہ جملہ مسجد کے بورڈ پر نمایاں حروف میں لکھا ہوا تھا:

بلند مقام اپنے آپ کو بلند کرنے سے ملتا ہے نہ کہ نعرے اور جھنڈے بلند کرنے سے

مسجد میں عام جمعہ سے تقریباً دگنا زیادہ آدمی تھے۔ وسیع مسجد بالکل بھری ہوئی تھی۔ یہی ہر پروگرام کا حال رہا۔

ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ الرسالہ کو علاقائی زبانوں میں بھی شائع کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مثلاً مرہٹی یا گجراتی مسلمانوں کی ۵۰ فی صد تعداد صرف مرہٹی یا گجراتی زبان پڑھ سکتی ہے وہ اردو نہیں پڑھ سکتی۔ تاہم وہ آسان اردو جانتے ہیں اور سن کر اسے سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ضرورت ہے کہ الرسالہ کو ان کے اپنے رسم خط میں شائع کیا جائے۔ یعنی الرسالہ کے مضامین کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ اس کے اردو مضامین ہی کو رسم الخط بدل کر شائع کر دیا جائے تو یہ سلسلہ بہت مفید ہوگا۔ اس سے نہ صرف مسلمانوں کو فائدہ ہوگا بلکہ بہت سے غیر مسلموں کے لیے بھی وہ مفید ہوگا۔ کیونکہ غیر مسلموں میں ایسے لوگ بہت ہیں جو اردو سمجھ لیتے ہیں مگر وہ اس کو پڑھ نہیں سکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج کل صرف وہی اخبار یا رسالہ چل پاتا ہے جس کی پشت پر کوئی بڑا ادارہ ہو۔ جس رسالہ کو بھی آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے پیچھے کوئی اور ہے :

The person behind that is someone else.

انھوں نے کہا کہ الرسالہ اتنی شان کے ساتھ دس برس سے برابر نکل رہا ہے تو اس کا اسپانسر کون ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا اسپانسر خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ انھوں نے کہا : پھر تو یہ معجزہ ہے۔

الرسالہ کے ایک قاری سے میں نے ان کا تاثر پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ تو ایسا پرچہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد دل دہلنے لگتا ہے۔ ایک صاحب نے حال میں " اللہ اکبر " پڑھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کو پڑھنے کے بعد مجھے ہر طرف آخرت کا منظر دکھائی دینے لگا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی زمانہ میں میں ٹیلی وزن پر ایک جغرافی فلم دیکھ رہا تھا۔ اس میں آتش فشاں کے پھٹنے کا منظر دکھایا گیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ زمین پھٹی اور اس کے اندر سے آگ ابل پڑی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ آگ خود میرے قدموں کے نیچے سے اُبل رہی ہے۔ اس سے پہلے میرا یہ حال نہ تھا۔

ایک لیڈر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کی عمومی دعوت کی راہ میں مسلمانوں کی بے عملی حائل ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کہہ کر آپ اپنا الزام دوسروں کے اوپر ڈالنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی عمومی دعوت کی راہ میں قومی منافرت حائل ہے نہ کہ مسلمانوں کی بے عملی۔ قومی منافرت کی تمام تر ذمہ داری مسلم لیڈروں پر ہے جو اپنی جھوٹی سیاست کی وجہ سے اس کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کسی طرح اس کو ختم نہیں ہونے دیتے۔ میں نے کہا کہ اگر اس ملک کے باشندوں کے سامنے اسلام کو بحیثیت ایک دعوت کے لے آنا ہے تو ہمیں مطالبات اور احتجاج کی سیاست کو یکسر ختم کر دینا ہوگا۔

لیڈر صاحب نے فرمایا کہ اگر دونوں جاری رہیں تو کیا حرج ہے۔ یعنی ہم اپنے حقوق کی لڑائی بھی لڑیں اور اسلام کی دعوت بھی لوگوں تک پہونچائیں۔ میں نے کہا کہ یہ آپ صرف اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو دعوت کا درد نہیں۔ اگر آپ ایک تاجر سے یہ کہیں کہ تم اپنا سودا بھی بیچو اور گاہکوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا بھی جاری رکھو تو وہ آپ کا مشورہ قبول کرنے کے بجائے خود آپ کو یہ مشورہ دے گا کہ آپ دماغی امراض کے ڈاکٹر سے رجوع فرمائیں۔ کیوں کہ ایسی تجارت اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اسی طرح ایسی اسلامی دعوت ممکن نہیں جس میں دعوت بھی دی جائے اور اسی کے ساتھ داعی اور مدعو کے درمیان جھگڑے کی سیاست

بھی چلائی جاتی رہے۔

ایک اجتماع میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ ہمارے قائدین پر تنقید کرتے ہیں۔ حالاں کہ مسلم پرسنل لا کے مسئلہ پر انھوں نے حال میں جو تحریک چلائی اس نے نہایت شاندار اسلامی اتحاد پیدا کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ ہاں سفر سے پہلے دہلی میں مجھے ایک اخبار (۱۰ مارچ ۱۹۸۶) ملا تھا۔ اس کے اداریہ کی سُرخی تھی " ملّت کا بے نظیر اتحاد " اس کے بعد اس حلقہ کے ایک بزرگ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے مذکورہ اخبار دکھا کر ان سے پوچھا کہ یہ بے نظیر اتحاد کہاں واقع ہے۔ جلسہ جلوس کے مظاہروں میں یا مسلمانوں کی اپنی زندگیوں میں۔ اس سوال پر مذکورہ بزرگ بگڑ گیے۔ میں نے کہا کہ یہ پہلا ثبوت ہے کہ اسلامی اتحاد ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے۔ کیوں کہ اسلامی اتحاد حقیقۃً اپنی بے اتحادی کو ختم کرنے کا نام ہے۔ اسلامی اتحاد ایک شعوری حالت ہے، یہ شعوری حالت کہ قوم کے افراد اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا سیکھ لیں۔ مگر آپ نے ایک سیدھے سے سوال پر خفا ہو کر یہ ثبوت دیا ہے کہ آپ اس شعوری حالت کو ابھی نہیں پہونچے۔

پھر میں نے کہا کہ جو چیز وقوع میں آئی ہے وہ صرف بھیڑ بھاڑ ہے۔ مگر آپ لوگ غلط فہمی سے اس کو اتحاد سمجھ رہے ہیں۔ اگر آپ لوگ یہ جملہ بولیں کہ "بے نظیر بھیڑ بھاڑ" تو مجھے کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ مگر جب آپ اس کو " بے نظیر اتحاد " کا نام دیں تو میں کہوں گا کہ بطور واقعہ یہ بیان صحیح نہیں۔

مختلف نوجوانوں نے آٹوگراف کے لیے کہا۔ ایک صاحب کو میں نے لکھا :

کسی چیز کو پانے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی اس چیز کا طالب ہو۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہے اور آدمی جب تک اس کی مطلوبہ قیمت ادا نہ کرے وہ اس دنیا میں اپنی مطلوبہ چیز کو نہیں پا سکتا۔

ایک صاحب نے نصیحت کے لیے کہا۔ میں نے کہا :

مصیبتیں بااصول زندگی کی قیمت ہیں۔

کچھ نوجوانوں سے میں نے کہا :

جو آپ کے دل میں ہے وہی زبان سے بولیے۔ جو کچھ آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسرے کے لیے پسند کیجیے۔ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے یہ سمجھئے کہ آپ خدا سے معاملہ

کرر ہے ہیں ۔
ایک صاحب نے کسی کا مقولہ بتایا جو قابل نقل ہے :

In everything look before you leap.
But in charity leap before you look.

دوسری ہر چیز میں اقدام سے پہلے سوچو ۔ مگر خیر کے کام میں پہلے اقدام کرو ، اس کے بعد سوچو ۔

ایک صاحب ایران میں کچھ سال رہ کر واپس آئے تھے ۔ انھوں نے بہت سی مثالیں دے کر بتایا کہ جدید فارسی اور قدیم فارسی میں زبان کے اعتبار سے کافی فرق پیدا ہو چکا ہے ۔ مثلاً بلے کو وہ لوگ بابے کہتے ہیں ۔ ہم لوگ کہتے ہیں کہ تکلف نہ کیجئے وہ لوگ کہتے ہیں : تعارف مکن (تکلف نہ کیجئے) تکلف کو وہ لوگ تکلیف کے معنی میں استعمال کرتے ہیں ، وغیرہ ۔

۲۲ مارچ ۱۹۸٦ کی شام کو میں پونہ سے واپس آیا ۔ جہاز کے اندر انڈین اکسپریس کا مدراس اڈیشن پڑھنے کو ملا ۔ اس کے صفحہ ۳ پر ایک دلچسپ خبر یہ تھی کہ ۲۱ مارچ کو مدراس اسمبلی کا اجلاس تھا ۔ بجٹ پر تقریریں ہو رہی تھیں ۔ کانگریس آئی کے ایک ممبر مسٹر اے ارو موگم کھڑے ہوئے تو انھوں نے دوران تقریر ہندی زبان کو ریاست میں ترقی دینے پر زور دیا ۔ وہ انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے :

When Finance Minister Nedunchezhiyan asked the member
if he had any knowledge of Hindi, he replied:
chota chota maloom hai. (I know a little)

جب وزیر مالیات نے مذکورہ ممبر سے پوچھا کہ کیا وہ کچھ ہندی جانتے ہیں ۔ انھوں نے جواب دیا :
چھوٹا چھوٹا معلوم ہے (تھوڑا تھوڑا معلوم ہے)

معزز ممبر کے ذہن میں انگریزی کا لفظ (Little) تھا ۔ اسی کا ہندی ترجمہ کر کے انھوں نے کہدیا کہ ہاں ، چھوٹا چھوٹا معلوم ہے ۔ حالاں کہ ہندی میں اس کے لیے صحیح لفظ تھوڑا ہے نہ کہ چھوٹا ۔ آدمی جو کچھ بولتا ہے ، اکثر وہ اس کے اپنے ذہن کی ترجمانی ہوتی ہے ۔ مگر وہ بطور خود یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ خارجی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے ۔

۱۔ پونہ میں مارچ ۱۹۸۶ کے تیسرے ہفتہ میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں مقامی افراد کے علاوہ قریب کے دوسرے علاقوں کے لوگ بھی شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز کی اس موقع پر کئی تقریریں ہوئیں۔ اس کی تفصیلی رپورٹ سفرنامہ میں شائع کر دی جائے گی۔ انشاء اللہ

۲۔ بعض مقامات پر الرسالہ کے ہمدرد "الرسالہ ٹیلی فون فری لائبریری" کی اسکیم چلا رہے ہیں۔ یعنی قاری ٹیلی فون پر اپنی طلب نوٹ کرا دے اور اس کو اس کے دیئے ہوئے پتہ پر الرسالہ یا اس کی مطلوبہ کتاب پہونچا دی جائے۔ یہ اسکیم بہت مفید ہے اور اس قابل ہے کہ ہر بڑے شہر میں اس کو چلایا جائے۔

۳۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۶ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔ حسب معمول مرکز میں ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے بعض احادیث کی روشنی میں ایمان ویقین کی وضاحت کی۔

۴۔ ۵ اپریل ۱۹۸۶ کو سعودی عرب کے ایک وفد نے اسلامی مرکز کی زیارت کی۔ اس وفد میں ڈاکٹر عبد المحسن الترکی (ریکٹر جامعۃ الامام ریاض) ڈاکٹر عبد الحلیم عویس، ڈاکٹر محمود شوق اور دوسرے اعلیٰ افراد شامل تھے۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے تبادلۂ خیال کیا اور مرکز کے کاموں کو دیکھا۔ وہ مرکز کے علمی اور تعمیری کاموں سے کافی متاثر ہوئے۔

۵۔ خدا کے فضل سے الرسالہ (انگریزی) کا افریقی اڈیشن شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ایک بڑے ادارہ نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ پہلا شمارہ انھوں نے مارچ ۱۹۸۶ کا شائع کیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہر ماہ اسی طرح چھاپتے رہیں گے۔ دہلی سے شائع ہونے والے پرچہ کا عکس لے کر ہوبہو ویسا ہی وہ اُسے شائع کر رہے ہیں۔

۶۔ بھوپال میں اپریل ۱۹۸۶ میں حلقہ الرسالہ کے تحت ایک اجتماع ہوا جس میں مرکز سے صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی۔ تمام پروگرام غیر معمولی طور پر کامیاب رہے۔ اس اجتماع کی تفصیلی رپورٹ سفرنامہ میں شائع کر دی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

۷۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اسلامی مرکز کا مشن تیزی سے ترقی پر ہے۔ وہ دوسرے تمام افکار کو مغلوب کرتا جا رہا ہے۔ حتی کہ اب وہ لوگ بھی انھیں اصطلاحوں میں بولنے لگے ہیں جو پہلے

صرف اسلامی مرکز کی منفرد آواز سمجھی جاتی تھی اور دوسرے لوگ اس کو بزدلی اور انفعالیت سے تعبیر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں برابر مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً لکھنؤ کے تعمیر حیات (۲۵ مارچ ۱۹۸۶) میں ایک مشہور مسلم قائد کی تقریر شائع ہوئی ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے اپنے سابقہ انداز کے خلاف انداز اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "کامیابی کی ضمانت خواہشات نہیں حقائق ہیں" یہ دنیا واقعات اور حقائق کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں بقا اس کے لیے ہے جو نفع بخش ثابت ہو۔ حقیقت کے انکار نہیں بلکہ حقیقت کے اعتراف سے زندگی ملتی ہے۔" یہ واضح طور پر اسلامی مرکز کے موقف کی صداقت کا اعتراف ہے۔ قائد موصوف نے عین اسلامی مرکز کی بات دہرائی ہے، اگرچہ حوصلہ کی کمی کی بنا پر اعلان کے بغیر۔

۸۔ مختلف مقامات پر الرسالہ کے نام سے مقامی تنظیمیں قائم کی گئی ہیں۔ مثلاً کسی مقام پر الرسالہ فرینڈس سرکل اور کہیں الرسالہ ریڈرس ایسوسی ایشن۔ وغیرہ۔ یہ ایک اچھا سلسلہ ہے اور مقامی حالات کے اعتبار سے ہر جگہ اس کا تجربہ کیا جانا چاہیے۔

۹۔ بعض مقامات پر ہمدردانِ الرسالہ ایک مفید اسکیم چلا رہے ہیں۔ وہ اپنے شہر یا آس پاس کے کئی سو آدمیوں کے پتہ کی فہرست بناتے ہیں۔ ان کو اپنے پاس سے الرسالہ چند ماہ تک بھیجتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملاقات کرکے الرسالہ کے بارہ میں ان کا تاثر پوچھتے ہیں اور ان کو الرسالہ کی خریداری پر یا اس کی ایجنسی لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت مفید اسکیم ہے اور ہر جگہ اس کو اپنے حالات کے اعتبار سے اختیار کیا جانا چاہیے۔

۱۰۔ اسلامی مرکز کی مطبوعات خدا کے فضل سے قوم کے اعلیٰ ترین ذہنوں میں خاموش انقلاب پیدا کر رہی ہیں۔ اس کی مثالیں ہر روز سامنے آتی رہتی ہیں۔ یہاں چند خط نقل کیے جاتے ہیں۔ ایک صاحب کتاب "اللہ اکبر" پڑھنے کے بعد اپنے خط (۲۰ مارچ ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں "آپ کا حکم تھا کہ میں اللہ اکبر کے بارہ میں اپنا تاثر دوں۔ میرے پاس اتنے معقول الفاظ نہیں ہیں کہ میں کچھ لکھوں۔ کاش مجھے آنسوؤں کی زبان لکھنا آتی اور کوئی اس کو پڑھ سکتا۔ بس خدا سے دعا کیجیے کہ وہ میرے گناہوں کو بخش دے اور اپنی رحمت میں مجھے رکھے اور جہنم کے عذاب سے بچائے۔ زندگی میں پہلی بار انسان ہونے کا احساس ہوا ہے۔ کتنا خوف ناک ہے

انسان کے ساتھ خدا کا معاملہ کہ میرے ہر عمل کا جواب اسے دینا ہے۔ کاش میں کوئی ایسی چیز ہوتا کہ خدا مجھ سے کچھ نہ پوچھتا۔ بس اس کے بڑے ہونے کا سہارا ہے کہ وہ بخشے گا میرے گناہ کو، اور وہی بچائے گا جہنم کے عذاب سے۔

(حبیب بھائی، حیدرآباد)

۱۱۔ والدین اور استادوں کی رہبری سے محروم ہونے کے بعد بڑی تنہائی محسوس کر رہا تھا اور زندگی ایک تپتے ریگستان و صحرا کا سفر معلوم ہو رہی تھی اور ہر طرف ایک سراب۔ لیکن اس عرصہ میں آپ کی تصنیفات 'الرسالہ' کے مضامین میرے لیے ایک بڑے سایہ دار درخت ثابت ہوئے اور میں اس سفر سے تھکا ہوا آرام سے آپ کی شفیق چھاؤں تلے بیٹھ کر پھر تازہ دم اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ نیا عزم، ایک حوصلہ، ایک سنت، ایک مہربانی، ایک خلوص، ایک سچائی اور رہبری پاتا ہوں۔ جس طرح روزانہ خوراک ضروری ہے اسی طرح الرسالہ ضروری روحانی خوراک بن چکا ہے۔ حوصلہ مند زندگی و توانائی کے لیے۔

۱۲۔ آپ کے یہاں سے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب جنھوں نے آپ کے جلسہ کی صدارت فرمائی تھی ان سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا مجھے میری زندگی میں پہلی بار ایسے مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا جو علم جدید پر بھی گہرائی سے نظر رکھتے ہیں اور جدید اسلوب میں پیغمبر انقلاب جیسی گراں قدر تصنیف امت مسلمہ کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے آپ نے جامع مسجد میں بروز جمعہ بعد نماز عشاء سورہ " الم نشرح " پر اپنے جو زریں خیالات پیش کیے تو لوگوں کی طبیعت بعد تقریر ختم ہونے پر بھی اٹھنے کو نہیں چاہ رہی تھی۔ خود میری بھی یہی حالت تھی حالاں کہ میں آپ کے ساتھ کئی سالوں سے ہوں۔ الرسالہ (اپریل ۱۹۸۶) آج ہی ملا۔ صفحہ نمبر ۱۰ پر عورت کے بارہ میں پڑھا تو میرا دل اچھلنے لگا جسے آپ انگریزی میں تھرل کہتے ہیں۔ بس ایسی ہی کیفیت گزری۔ اگر لوگوں کا مجھے پاگل سمجھنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ضرور دکان بند کرکے ناچنا شروع کر دیتا۔ سچ سچ آج تک ایسی قرآن کی تشریح پڑھنے میں نہیں آئی۔ جس کسی نے بھی یہ مضمون پڑھا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا میں یہ بات محض اپنی عقیدت مندی کی وجہ سے نہیں لکھ رہا ہوں اور نہ ہی آپ کا میںسط

پیری مریدی والا معاملہ ہے کہ صرف آپ کو خوش رکھنے کے لیے کہوں۔ میں نے پایا کہ آپ میں تضاد نہیں ہے۔ جو بات آپ نے مجھ سے اکیلے میں کہی وہی بات ہزاروں لوگوں میں بھی کہی ہے۔ یہی خلوت اور جلوت کی یکسانیت مجھے آپ سے عقیدت اور محبت پر مجبور کرتی ہے جو میرے نزدیک عین اسلامی تقاضہ ہے۔ (۱۲ اپریل ۱۹۸۶)

۱۳۔ محترم! پچھلے چند مہینے قبل آپ کی دو کتابیں ختم کیں۔ ایک "مذہب اور جدید چیلنج" اور دوسری کتاب "پیغمبر انقلاب"۔ دونوں ہی کتابوں نے ذہن و دل پر گہرے نقوش چھوڑے مولانا آپ یقین کریں مذہب اور جدید چیلنج پڑھنے کے بعد معاً یہ خیال بھی میرے دل میں آیا کہ اگر میرے پاس ایک کروڑ روپے ہوتے تو میں اس کتاب کا ہندستان کی ہر زبان میں ترجمہ کرواتا اور ہاتھوں ہاتھ مفت تقسیم کروا دیتا۔ اب اکثر نمازوں میں اور بالخصوص جمعہ کی نماز کے بعد آپ کے حق میں یہ دعا دل سے نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو قائم و دائم رکھے۔ انگریزی کا الرسالہ جب سے نکلنے لگا ہے میری مشکل حل ہو گئی ہے۔ اکثر اپنے غیر مسلم دوستوں کو مطالعہ کے لیے دے دیتا ہوں۔ پچھلے دنوں شاہ بانو کیس کے سلسلے میں ہمارے شہر میں ایک احتجاجی جلوس منتر الیہ لے جایا گیا تھا اور مسلم پرسنل لا پر شہر کے ہر اخبار میں لکھا گیا تھا۔ اس قسم کے ہنگاموں سے غیر مسلموں پر برا اثر پڑتا ہے۔ وہ اور زیادہ مشکوک انداز میں دیکھنے لگتے ہیں۔ میرا ایک قریبی غیر مسلم دوست ایک بار میرے پاس آیا اور پھر پرسنل لا اور اس جلوس کے خلاف اول فول کہنے لگا۔ میں پہلے تو اس کی باتیں سنتا رہا پھر بات سمجھانے کے لیے انگریزی الرسالہ جنوری اسے پڑھنے کے لیے دیا۔ اس کے بعد اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ مسلم پرسنل لا طلاق اور نکاح سے متعلق جو باتیں آپ نے لکھی ہیں وہ کسی اسلامی مفکر، دانش ور، کے یہاں نظر نہیں آئی۔ (۲۲ فروری ۱۹۸۶)

۱۴۔ تذکیر القرآن کی ترتیب خدا کے فضل سے ۲۷ ویں پارہ تک پہونچ گئی ہے۔ ساتھ ساتھ کتابت بھی ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ اس کی دوسری جلد عنقریب شائع ہو جائے گی۔

۱۵۔ "حقیقتِ حج" کا نیا اڈیشن زیر طبع ہے۔ مزید اضافوں کے بعد وہ ایک سو سے زیادہ صفحات کا ہو گیا ہے۔ نئے اڈیشن میں تصاویر بھی شامل ہیں۔

ایک گزارش

اسلامی مرکز کے تحت تعمیر ملّت اور احیار اسلام کا جو کام ہو رہا ہے وہ خدا کے فضل سے کافی پھیل چکا ہے۔ مگر اسلامی مرکز کے پاس آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں۔ اس کا کام اب تک ہمدردوں اور متفقین کے تعاون سے چل رہا ہے۔

آپ سے ہماری گزارش ہے کہ آپ اس دینی تعاون میں اپنا حصہ ادا فرمائیں۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی اشاعت خدا کے فضل سے کافی بڑھ چکی ہے۔ مگر قیمت کم رکھنے کی وجہ سے عملاً وہ خسارہ پر چل رہا ہے۔ اشاعت میں اضافہ صرف اس کے خسارہ میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی تلافی کی واحد صورت یہی ہے کہ اصحاب خیر اپنے تعاون سے اس کے نقصان کو پورا فرمائیں۔ مزید نئی دعوتی اسکیموں کو شروع کرنے کا مسئلہ اس کے علاوہ ہے۔ ان کاموں کے لیے مختلف مد کی رقمیں بھیجی جا سکتی ہیں۔ آپ اپنی رقم بھیجتے ہوئے صراحت فرما دیں کہ وہ کس مد کی رقم ہے۔

وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

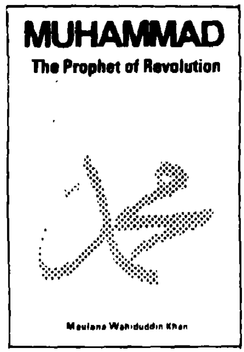
بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

June 1986
Number 115



MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala

C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

غلطی پر سرکشی کا اضافہ نہ کیجیے
کیوں کہ اللہ کے یہاں ______
غلطی قابل معافی ہے مگر سرکشی قابل معافی نہیں۔

جولائی ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۶ جولائی ۱۹۸۶

فہرست

تاخیر نہیں

میڈیکل کالج کا پروفیسر زبانی امتحان لے رہا تھا۔ اس نے طالب علم سے پوچھا "تم ان میں سے کتنی گولیاں اس شخص کو دوگے جس کو دل کا دورہ پڑا ہو"۔ طالب علم نے جواب دیا "چار" ایک منٹ بعد طالب علم نے دوبارہ کہا "پروفیسر، کیا میں اپنا جواب بدل سکتا ہوں"۔ پروفیسر نے کہا "ہاں ضرور"۔ اس کے بعد پروفیسر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "مگر مجھے افسوس ہے کہ تمہارا مریض ۴۰ سکنڈ پہلے مر چکا ہے۔

The Medical-College professor was giving an oral examination. "How many of these pills," he asked, "would you give a man who had a heart attack?" "Four," replied the student. A minute later he piped up. "Professor, can I change my answer?" "You can, by all means," said the professor, looking at his watch. "But, regrettably, your patient has already been dead for 40 seconds."

ایک شخص جس کو دل کا دورہ پڑا ہوا ہو وہ نہایت نازک حالت میں ہوتا ہے۔ اس کو فوری طور پر دوا کی بھرپور خوراک دینا انتہائی ضروری ہے۔ اگر اس کو فوری طور پر بھرپور دوا نہ ملے تو اگلے لمحہ کا تقاضا صرف یہ ہوگا کہ اس آدمی کو ڈاکٹر کے بجائے گورکن کے حوالہ کیا جائے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ بعض معاملات اتنے نازک ہوتے ہیں کہ وہ بلا تاخیر درست کارروائی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایسے معاملات میں آدمی کو فی الفور قطعی فیصلہ لینا پڑتا ہے اگر آدمی فوراً بھرپور فیصلہ نہ لے سکے تو وہ یقینی طور پر ناکام رہے گا۔ اگلا لمحہ جو اس پر آئے گا وہ صرف اس کی حسرت میں اضافہ کرنے کے لیے ہوگا نہ کہ اس کی کامیابی کے باب کو مکمل کرنے کے لیے۔

زندگی کے سفر کی مثال ٹرین کے سفر کی ہے۔ ٹرین ہمیشہ مقرر وقت پر اسٹیشن پر آتی ہے۔ اور چند منٹ رک کر دوبارہ آگے کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں صرف وہی شخص ٹرین میں اپنی جگہ پا سکتا ہے جو ضروری تیاری کے ساتھ ٹھیک وقت پر پلیٹ فارم پر موجود ہو۔ ورنہ ٹرین آئے گی اور اس کو لیے بغیر آگے چلی جائے گی۔ اسی طرح مواقع ہمیشہ اپنے وقت پر آتے ہیں۔ مگر مواقع کسی کے لیے ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں اور کسی کے لیے محرومی کا اعلان۔

مل کر کام کرنا

شہد کی تیاری ایک بے حد محنت طلب کام ہے۔ بہت سی مکھیاں لگاتار رات دن کام کرتی ہیں تب وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو شہد کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی ایک پھول میں اس کی مقدار بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بے شمار پھولوں کا رس جمع کیا جاتا ہے تب کہیں یہ ہوتا ہے کہ شہد کی قابل لحاظ مقدار تیار ہو سکے۔

ایک پونڈ (نصف کیلو) شہد تیار کرنے کے لیے شہد کی مکھیوں کو مجموعی طور پر بعض اوقات تین لاکھ میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایک مکھی کی عمر چند مہینے سے زیادہ نہیں ہوتی اس لیے کوئی ایک مکھی تنہا ایک پونڈ شہد تیار نہیں کر سکتی، خواہ وہ اپنی عمر کا ہر لمحہ پھولوں کا رس جمع کرنے میں لگا دے۔

اس مشکل کا حل شہد کی مکھیوں نے اجتماعی کوشش میں تلاش کیا ہے۔ یعنی جو کام ایک مکھی نہیں کر سکتی اس کو لاکھوں مکھیاں مل کر انجام دیتی ہیں۔ جو کام "ایک" کے لیے ناممکن ہے وہ اس وقت ممکن بن جاتا ہے جب کہ کرنے والے "لاکھوں" ہو گئے ہوں۔

یہ قدرت کا سبق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن تھا کہ شہد کے بڑے بڑے ذخیرے زمین پر رکھ دے جس طرح پٹرول اور پانی کے ذخیرے بہت بڑی مقدار میں زمین پر جگہ جگہ موجود ہیں۔ مگر شہد کی تیاری کو اللہ نے ایک بے حد پیچیدہ نظام سے وابستہ کر دیا۔ اس حیرت انگیز نظام کے اندر انسان کے لیے بے شمار سبق ہیں۔ ان میں سے ایک سبق وہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔

انسانی زندگی میں کچھ کام ایسے ہیں جن کو ہر آدمی کم وقت میں اپنی ذاتی کوشش سے انجام دے سکتا ہے۔ مگر کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کو کوئی شخص تنہا انجام نہیں دے سکتا۔ ایسے کام کو واقعہ بنانے کی واحد ممکن شکل وہی ہے جو شہد کی مکھی کی مثال میں نظر آتی ہے۔ یعنی بہت سے لوگ مل کر اسے انجام دیں۔

تاہم مل کر کام کرنا ہمیشہ ایک قربانی کی قیمت پر ہوتا ہے، اور وہ قیمت صبر ہے۔ فرد کے اندر اٹھنے والے باغیانہ جذبات کو کچلنا ہی وہ چیز ہے جو اجتماعی عمل کو ممکن بناتی ہے۔ اس قربانی کے بغیر کبھی اجتماعی عمل ظہور میں نہیں آتا۔

سڑک کا سبق

شہر کی معروف سڑکوں پر ہر وقت حادثہ کا خطرہ رہتا ہے۔ چنانچہ ٹریفک کی رہنمائی کے لیے سڑکوں پر مختلف ہدایات لکھ دی جاتی ہیں۔ ان ہدایات میں سے ایک یہ ہے کہ پٹری پر چلنا محفوظ چلنا ہے:

Lane driving is sane driving.

یعنی آدمی اگر پٹری کا پابند رہتے ہوئے اپنی سواری چلائے تو وہ اپنے آپ کو حادثات سے بچا سکتا ہے۔ وہ اس خطرہ سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ دوسری گاڑیوں سے اس کا ٹکراؤ ہو اور وہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے کے بجائے قبرستان کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

لندن کے ایک ڈرائیور نے ایک بار ایک مضمون شائع کیا اس میں اس نے ٹریفک کے مختلف اصول بتائے۔ اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں بڑی عجیب عجیب باتیں لکھی تھیں۔ مثلاً اس نے لکھا کہ آپ اپنی گاڑی سڑک پر دوڑاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں کہ اچانک سائڈ کی گلی سے ایک گیند سڑک پر آگئی یہ گیند دیکھ کر آپ کو جاننا پڑتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک بچہ بھی آرہا ہوگا۔ اگر آپ صرف "گیند" کو دیکھیں اور "بچہ" کو نہ دیکھیں تو آپ اچھے ڈرائیور نہیں ہیں۔ اچھا ڈرائیور صرف وہ ہے جو گیند کو دیکھتے ہی بچہ کو بھی دیکھ لے، اگرچہ اس وقت بچہ بظاہر اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ اگر ڈرائیور نے گیند کو دیکھ کر اپنی گاڑی کو بریک نہیں لگایا تو یقینی ہے کہ اگلے لمحہ اس کی گاڑی ایک بچہ کو سڑک پر کچل چکی ہوگی۔

سڑک کا سفر زندگی کے سفر کا معلّم ہے۔ آدمی اگر چاہے تو سڑک کے سفر سے وہ سب کچھ سیکھ سکتا ہے جو اس کو زندگی کے زیادہ بڑے سفر کے لیے درکار ہے۔

اپنی سرگرمیوں کو ہمیشہ اپنے دائرہ میں محدود رکھیے۔ اگر آپ نے دوسرے کے دائرہ میں مداخلت کی تو فوراً اس سے آپ کا ٹکراؤ شروع ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کا جاری سفر رک جائے گا۔ اجتماعی زندگی میں جب خارج سے ایک علامت ظاہر ہو تو یہ جاننے کی کوشش کیجئے کہ اس علامت کے پیچھے اور کیا باتیں ہیں جو اگرچہ موجود ہیں لیکن بروقت وہ دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ اگر آپ نے صرف دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھا اور جو چیزیں دکھائی نہیں دے رہی ہیں ان سے بے خبر رہے تو مقابلہ کی اس دنیا میں آپ کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

دوسروں کا لحاظ

کیپ بیل راجرس پولٹری کے عالمی شہرت یافتہ ماہر ہیں۔ پولٹری (مرغ بانی) پر ان کی ایک مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: بڑے پیمانہ کی کامیاب پولٹری فارمنگ بڑی حد تک ایک مزاجی کیفیت کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص جو چڑیوں اور جانوروں کے لیے شفقت کا جذبہ نہ رکھتا ہو وہ اس کام میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پولٹری فارمنگ کے لیے سخت اور صبر آزما قسم کا روٹین کا کام (Routine work) بے حد ضروری ہے۔ یہ کام ان لوگوں کو بہت اکتا دینے والا معلوم ہوگا جو ایک ہی کام کو ہر روز کرنے کے عادی نہ ہو، اور وہ بھی بغیر اس امید کے کبھی اس میں انقطاع یا تعطیل کا دن آسکتا ہے۔

Success is a matter of cooled decisions, without constant hovering and changing of the mind, acute observation, initiative, and unremitting attention to a vast amount of petty details.

A.C. Campbell Rogers,
Profitable Poultry Keeping in India and the East,
D.B. Taraporevala Sons & Co., Bombay 1959, p. 223

کامیابی ایک ٹھنڈے فیصلوں کا معاملہ ہے، بغیر اس کے کہ آدمی اِدھر اُدھر مڑے یا ذہن کو بدلے۔ گہرائی کے ساتھ مشاہدہ، اقدام، اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی بہت بڑی تعداد پر مسلسل اور غیر منقطع توجہ۔

مرغبانی کے ماہر نے جو بات مرغبانی کے لیے کہی ہے وہی عام زندگی کے لیے بھی صحیح ہے۔ جس طرح مرغیاں پالنے والا شخص صرف اپنی مرضی پر نہیں چلتا بلکہ وہ مرغیوں کی عادات اور ان کی ضروریات کا لحاظ کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں ہمیں دوسرے انسانوں کے مزاج اور ان کے مفادات کی رعایت کرنا ہے۔ دوسروں کی عزت کر کے ہی ہم دوسروں کے درمیان عزت پا سکتے ہیں۔ دوسروں کے لیے مفید بن کر ہی ہم دوسروں کو اپنے لیے مفید بنا سکتے ہیں۔ اس دنیا میں ذاتی کامیابی دراصل دوسروں کی کامیابی میں مددگار بننے کا نام ہے۔ جو لوگ صرف اپنے کو جانیں اور دوسروں کو نہ جانیں وہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

برائی کی جڑ

ولیم لا (۱۷۶۱-۱۶۸۶) ایک مشہور انگریز مصنف ہے۔ اس نے اخلاقیات کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے ——— برائی جب بھی شروع ہوتی ہے غرور سے شروع ہوتی ہے۔ برائی کا جب بھی خاتمہ ہوتا ہے تو انکساری کے ذریعہ ہوتا ہے :

Evil can have no beginning, but from pride,
nor any end but from humility. (William Law)

کہنے والے نے یہ بات اخلاقی اعتبار سے کہی ہے۔ مگر آسمانی شریعت کی بات بھی یہی ہے۔ خدا کے نزدیک کسی آدمی کا سب سے بڑا جرم شرک اور غرور ہے۔ ہر چیز کی معافی ہو سکتی ہے مگر شرک اور غرور کی معافی نہیں۔

ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں جو بھی ظلم یا فساد کرتا ہے ان سب کی جڑ میں کھلا یا چھپا ہوا غرور شامل رہتا ہے۔ غرور کی وجہ سے آدمی حق کا اعتراف نہیں کرتا، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ حق کا اعتراف کرنے سے اس کی بڑائی ختم ہو جائے گی۔ وہ بھول جاتا ہے کہ حق کو نہ مان کر وہ حق کے مقابلہ میں خود اپنی ذات کو برتر قرار دے رہا ہے۔ حالاں کہ اس دنیا میں سب سے بڑی چیز حق ہے نہ کہ کسی کی ذات۔

جس آدمی کے مزاج میں غرور ہو وہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حقیقتِ واقعہ کے مطابق بنائے۔ وہ وہی کرے جو از روئے حقیقت اس کو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرے جو از روئے حقیقت اس کو نہیں کرنا چاہیے۔

مگر مغرور آدمی کا برتری کا مزاج اس کے لیے اس میں مانع بن جاتا ہے کہ وہ اپنے کو حقیقت کے مطابق ڈھالے۔ وہ چاہتا ہے کہ حقیقت خود اُس کے مطابق ڈھل جائے۔ چوں کہ عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں، اس لیے ایسے آدمی کا اس دنیا میں کامیاب ہونا بھی ممکن نہیں۔

اجتماعی عمل

امریکہ کے جہاز ساز کارخانے ۵۰ ہزار ٹن کا ایک ٹینکر ۱۶ مہینے میں بناتے ہیں اور اسپین میں وہ ۲۴ مہینے میں بن کر تیار ہوتا ہے۔ مگر جاپان کے جہاز ساز اسی ٹینکر کو صرف آٹھ مہینے میں بنالیتے ہیں۔

اس جاپانی معجزہ کا راز کیا ہے۔ مغربی ماہرین نے مکمل جائزہ کے بعد بتایا ہے کہ اس کی خاص وجہ متحدہ عمل (Team Work) ہے۔ جاپان کے کاریگر اور منتظمین اور افسران سب حد درجہ اتحاد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ عمل کے دوران کسی بھی مرحلہ میں ان کا اتحاد ٹوٹتا نہیں۔ اس کا نتیجہ انھیں کم وقت میں معیاری سامان کی صورت میں مل رہا ہے۔

جاپانی کلچر اور طریق کار میں اجتماعی ہم آہنگی (Group Harmony) رچی بسی ہوئی ہے۔ خاندان میں، کارخانہ میں، چھوٹے اداروں اور بڑے اداروں کے درمیان ہر جگہ ہم آہنگی جاپانی کیرکٹر کا امتیازی وصف (Distinctive Feature) بن چکا ہے۔ جاپانی امور کے ایک ماہر ولیم اوشی (William Ouchi) کے الفاظ میں:

> Every activity in Japan is group activity, and not a spring-board to individual glory and personal advertisement.
> *The Hindustan Times*, February 16, 1986

جاپان میں ہر سرگرمی اجتماعی سرگرمی ہے۔ وہاں کوئی سرگرمی انفرادی عظمت یا شخصی اشتہار کا ذریعہ نہیں بنائی جاتی۔

جاپانیوں کی یہ خصوصیت ان کی قومی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ زیادہ بڑی ترقی ہمیشہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ زیادہ بڑی تعداد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرے۔ مل کر کام کرنے میں اصل رکاوٹ یہ ہے کہ افراد کی انفرادی شخصیت اس میں نہیں ابھرتی۔ جس قوم کے افراد میں اپنی انفرادی شخصیت بنانے کا مزاج ہو وہ قوم کبھی متحدہ عمل میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اور اسی لیے وہ کوئی بڑی ترقی بھی نہیں کرسکتی۔

بڑی ترقی حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ اتحاد ہے۔ اتحاد ایک کو کئی بنا دیتا ہے، وہ کوشش کی مقدار کو ہزاروں گنا زیادہ کر دیتا ہے۔

کامیاب تدبیر

جیل سے فرار موجودہ زمانہ میں ایک آرٹ بن گیا ہے۔ اخبارات میں اس کی مثالیں آتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک دل چسپ واقعہ وہ ہے جو ۲۶ مئی ۱۹۸۶ کو پیرس میں پیش آیا۔

ترقی یافتہ مغربی ملکوں میں ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر عام استعمال کی چیز بن گئے ہیں۔ وہاں کوئی شخص اسی طرح ایک ہیلی کاپٹر کرایہ پر لے سکتا ہے جس طرح ہندستان جیسے ملکوں میں موٹر کار کرایہ پر حاصل کی جاتی ہے۔ مذکورہ تاریخ کو ایک ۳۰ سالہ عورت نے ایک تجارتی ادارہ ایر کانٹینٹ (Air Continent) سے ایک ہیلی کاپٹر کرایہ پر لیا۔ وہ خود اس کو اڑاتی ہوئی پیریس کے جیل (La Sante prison) کے اوپر پہونچی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک قیدی کو لے کر فرار ہوگئی۔

اس جیل میں ایک ۴۳ سالہ شخص قید تھا۔ اس کا نام مائیکل واجور (Michel Vaujour) بتایا گیا ہے۔ مسلح قزاقی کے جرم میں اس کو ۸ مارچ ۱۹۸۵ کو ۱۸ سال کی سزا ہوئی تھی۔ مذکورہ ہیلی کاپٹر ساڑھے دس بجے دن میں اڑتا ہوا جیل کی فضا میں پہونچا۔ وہ اس کی ایک چھت پر اترا اور مذکورہ قیدی کو لے کر اڑ گیا۔ یہ پوری کارروائی صرف ۵ منٹ کے اندر مکمل ہوگئی۔ جیل میں مسلح پولیس موجود تھی۔ مگر یہ ساری کارروائی اتنی اچانک اور اس قدر غیر متوقع طور پر ہوئی کہ مسلح پولیس اس کے اوپر ایک فائر بھی نہ کر سکی۔ (ٹائمس آف انڈیا، انڈین اکسپریس ۲۷ مئی ۱۹۸۶)

جب دو فریقوں میں مقابلہ ہو تو اس میں وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو مذکورہ قسم کی تدبیر اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ حریف کو بے خبری میں پکڑ لیا جائے۔ اچانک ایسا اقدام کیا جائے جس کے متعلق فریق ثانی فوری طور پر کچھ نہ سوچ سکے۔ اس کو صرف اس وقت ہوش آئے جب کہ اس کے خلاف کارروائی اپنی کامیابی کی آخری حد پر پہونچ چکی ہو۔

مذکورہ مثال میں اس تدبیر کو ایک شخص نے مجرمانہ جارحیت کے لیے استعمال کیا۔ مگر جائز دفاع کے لیے بھی یہی تدبیر سب سے زیادہ موثر تدبیر ہے۔

سمجھ دار کون

ڈیل کارنیگی (Dale Carnegie) نے کہا کہ زندگی میں سب سے زیادہ اہم چیز کامیابیوں سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ ہر بیوقوف آدمی ایسا کر سکتا ہے۔ حقیقی معنوں میں اہم چیز یہ ہے کہ تم اپنے نقصانات سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس دوسرے کام کے لیے ذہانت درکار ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایک سمجھ دار اور ایک بے وقوف کے درمیان فرق کرتی ہے:

The most important thing in life is not to capitalize on your gains. Any fool can do that. The really important thing is to profit from your losses. That requires intelligence; and it makes the diference between a man of sense and a fool.

اس دنیا میں اتفاقاً ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی صرف کامیابیوں کے درمیان ہو، اور اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی کام نہ ہو کہ وہ بس کامیابیوں سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھاتا رہے۔ بیشتر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مشکلوں اور نقصانات کے درمیان پاتا ہے۔ اور اس کو مشکلوں اور نقصانات سے گزرتے ہوئے اپنی منزل تک پہونچنا پڑتا ہے۔

اس دنیا میں صرف وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اس ہوش مندی کا ثبوت دیں کہ وہ ناموافق حالات کی شکایت کرنے کے بجائے ناموافق حالات کا استقبال کرنا جانتے ہیں۔ جو مشکلوں کے خلاف فریاد کرنے کے بجائے مشکلوں کو حل کرنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

"نقصان سے فائدہ اٹھانا" یہی واحد خصوصیت ہے جو اس دنیا میں کسی کو کامیاب کرتی ہے، کوئی فرد ہو یا کوئی قوم۔ دونوں کو اس دنیا میں اسی ایک امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں کامیاب وہ نہیں ہے جس کو مشکلیں پیش نہ آئیں۔ یہاں کامیاب وہی ہے جو مشکلوں کے باوجود کامیاب ہو سکے۔ یہاں منزل پر وہ پہونچتا ہے جو راستہ کی دشواریوں کے باوجود اپنا سفر طے کر سکے۔

بڑا آدمی

مسٹر ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے :

How to Stop Worrying and Start Living

کتاب پہلی بار ۱۹۴۸ میں چھپی۔ مصنف لکھتے ہیں کہ جب میں نے پہلی بار اس کتاب کو مرتب کرنے
اارادہ کیا تو میں نے اعلان کیا کہ جو شخص اس موضوع پر بہترین حقیقی کہانی پیش کرے گا اس کو دو سو
الر انعام دیئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں موصول ہونے والی دو اہم ترین کہانیوں میں سے ایک
بانی وہ تھی جس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے :

مسٹر سی آر برٹن (C.R. Burton) نے لکھا کہ جب میں نو سال کا تھا تو میری ماں کا انتقال
دگیا۔ ۱۲ سال کی عمر میں میں نے اپنے باپ کو بھی کھو دیا۔ اس کے بعد میں بے سہارا ہو کر رہ گیا۔
بھے لوگ یتیم کہنے لگے۔

اس کے بعد مسٹر اور مسز لافٹن (Loftin) نے مجھ کو از راہ ہمدردی اپنے پاس رکھ لیا۔
فوں نے کہا کہ تم جب تک چاہو ہمارے پاس رہ سکتے ہو۔ میں اسکول جانے لگا تو اسکول کے بچے
ری اونچی ناک پر مذاق اڑاتے۔ وہ مجھے تحقیر کے طور پر یتیم بچہ (Orphan brat) کہنے لگے۔ مجھے
ن کی باتوں سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ میں چاہنے لگا کہ ان سے لڑوں۔ مگر جس چیز نے مجھے
ڑائی سے بچایا وہ مسٹر لافٹن کا یہ جملہ تھا :

Always remember that it takes a bigger man to walk away from a fight than it does to stay and fight. (p. 187)

ہیشہ یاد رکھو کہ جنگ ہر آدمی کر سکتا ہے مگر بڑا آدمی وہ ہے جو جنگ سے اعراض کرے۔

گڑھے کے اندر پتھر پھینکیں تو اس کے پانی میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر سمندر کے اندر ایک
بڑا پہاڑ ڈال دیجئے تب بھی وہ ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔ اسی طرح چھوٹے ظرف والا آدمی ایک سخت
بات سن کر بگڑ اٹھتا ہے۔ مگر بڑے ظرف والے آدمی کے اوپر طوفان گزر جاتے ہیں اور پھر بھی اس
کا سکون برہم نہیں ہوتا۔

ڈیگال ازم

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قوم کو زندہ کرنے کے لیے فرد کو اپنے آپ کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فرانس کے چارلس ڈیگال (۱۹۷۰-۱۸۹۰) نے اس کی شاندار مثال پیش کی ہے۔

ڈیگال دسمبر ۱۹۵۸ میں فرانس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت افریقہ میں فرانس کے تقریباً ایک درجن مقبوضات تھے جن میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ خاص طور پر الجیریا میں یہ تحریک بہت شدت اختیار کر چکی تھی۔ فرانس نے اس کو کچلنے کے لیے تقریباً ۲۵ لاکھ آدمی قتل کر دیئے۔ اس کے باوجود الجیریا میں آزادی کی تحریک دبتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ صورت حال چارلس ڈیگال کے لیے سخت تشویشناک بن گئی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں، الجیریا کی جنگ کے مسائل ان کے لیے اس میں روک بن گئے کہ وہ مستقبل کی مثبت پالیسیوں (Positive policies) کے بارہ میں نقشہ بنانے سے زیادہ کچھ کر سکیں (جلد ۷، صفحہ ۹۶۴)

فرانس اپنے افریقی مقبوضات کو فرانس کا صوبہ (Province) کہتا تھا۔ وہ ان کی زبان اور کلچر کو اس حد تک بدل دینا چاہتا تھا کہ وہاں کے باشندے اپنے آپ کو فرانسیسی سمجھنے لگیں۔ مگر یہ منصوبہ فرانس کے لیے بہت مہنگا پڑا۔ عملاً یہ ممالک فرانس کا صوبہ نہ بن سکے اور اس غیر حقیقت پسندانہ کوشش نے خود فرانس کو ایک کمزور ملک بنا دیا۔ فرانس کی تمام بہترین طاقت مقبوضہ ممالک میں آزادی کی تحریکوں کو دبانے اور کچلنے میں استعمال ہونے لگی اور فرانس نے یورپ کی ایک عظیم طاقت (Great power) ہونے کی حیثیت کھو دی۔

سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ افریقہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں فرانس ایٹمی دور میں پیچھے ہو گیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ چارلس ڈیگال نے محسوس کیا کہ نوآبادیاتی جنگ لڑنے کی کوشش فرانس کے لیے اس میں مانع ہو گئی ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیار تیار کرے۔ چنانچہ ڈیگال نے الجیریا کو آزاد کر دیا۔ اور اس کے بعد مضبوط ایٹمی طاقت کو وجود میں لانے کی کوشش شروع کر دی جو فرانس کی عظیم حیثیت کے لیے نئی بنیاد بن سکے (جلد ۴، صفحہ ۹۰۵)

ڈیگال نے معاملہ کو قومی ساکھ یا ذاتی قیادت سے الگ ہو کر دیکھا۔ ٹھنڈے دل سے سوچنے کے

بعد وہ اس رائے پر پہونچے کہ اس مسئلہ کا حقیقت پسندانہ حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا جائے۔ تاہم فرانس کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ فرانس کے قومی وقار (National prestige) کا مسئلہ تھا اور قومی وقار ایسی چیز ہے کہ قومیں لڑکر ہلاک ہوجاتی ہیں مگر وہ اپنے وقار کو کھونا برداشت نہیں کرتیں۔ یہ یقینی تھا کہ جو شخص اس معاملہ میں قومی وقار کے خلاف فیصلہ کرے گا وہ فرانس میں اپنی مقبولیت کو یکسر ختم کر دے گا۔ تاہم ڈیگال نے یہ خطرہ مول لے لیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں: ڈیگال نے الجیریا کے مسئلہ کو اس وقت حل کر دیا جب کہ ان کے سوا کوئی دوسرا شخص اس کو حل نہیں کر سکتا تھا۔ (جلد ۷، صفحہ ۹۶۵)

جنرل ڈیگال نے اس کے بعد الجیریا کے لیڈروں کو گفت وشنید کی دعوت دی۔ اس گفت وشنید کا فیصلہ عین منصوبہ کے تحت الجیریا کے حق میں ہوا۔ یعنی حکومت فرانس اس پر راضی ہوگئی کہ الجیریا میں ریفرنڈم کرایا جائے اور لوگوں سے پوچھا جائے کہ وہ فرانس کی ماتحتی پسند کرتے ہیں یا آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ریفرنڈم ہوا۔ پیشگی اندازے کے مطابق الجیریا کے باشندوں نے آزاد الجیریا کے حق میں اپنی رائیں دیں اور اس کا احترام کرتے ہوئے حکومت فرانس نے جولائی ۱۹۶۲ میں الجیریا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس کے نتیجہ میں چارلس ڈیگال پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔ ان کے اوپر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ اس کے بعد عوام کے دباؤ کے تحت ڈیگال نے فرانس میں ایک ریفرنڈم کرایا جس میں ڈیگال کو شکست ہوئی۔ بالآخر انھوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۹ نومبر ۱۹۷۰ کو ان پر قلب کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈیگال ایک معمولی قبرستان میں اس طرح دفن کر دیئے گئے کہ ان کے جنازے میں ان کے چند رشتہ داروں اور دوستوں کے سوا کوئی اور شریک نہ تھا۔ ڈیگال خود مر گیے۔ مگر انھوں نے مرکر اپنی قوم کو دوبارہ زندگی دے دی۔

ڈیگال کے اس واقعہ سے اگر ڈیگال ازم (Degaullism) کی اصطلاح بنائی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈیگال ازم اپنی قیادت کی قیمت پر قوم کو بچانا ہے۔ برٹانیکا (۱۹۸۴) کے الفاظ میں، ڈیگال تنہا شخص تھے جن میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ ایسے نازک فیصلے لے سکیں جن سے سخت قسم کے سیاسی اور شخصی خطرات (Political and personal risks) وابستہ ہوتے ہیں (7:965)

ڈیگال ازم قومی زندگی کا راز ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کو ایک ڈیگال حاصل ہوجائے۔

ایک تاثر

۲۰ جنوری ۱۹۸۶ کو میں انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۳۹ کے ذریعہ دہلی سے حیدر آباد گیا۔ جہاز کے اندر حسب معمول اعلانات شروع ہوئے تو اناؤنسر نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا :

Captain Mustafa is in command.

(کیپٹن مصطفیٰ اس جہاز کے پائلٹ ہیں) انڈین ایر لائنز میں میں نے بہت سفر کیے ہیں مگر "کیپٹن مصطفیٰ" جیسا لفظ پہلی بار سننے میں آیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اب دیگر اعلیٰ سروسوں کے علاوہ اس ملک کی ہوائی سروسوں میں بھی داخل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے پچھڑے پن کو ختم کرکے تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ہندستان کے مسلم لیڈر ہمیشہ اپنی قوم کے نوجوانوں کے بارے میں "نکالے جانے" کی خبریں دنیا کو سناتے ہیں۔ مگر یہ سراسر ناانصافی ہے۔ ان کو چاہیے کہ اسی کے ساتھ "داخل کیے جانے" کی خبریں بھی وہ دنیا کو سنائیں تاکہ لوگوں کو تصویر کا دوسرا رخ بھی معلوم ہو سکے۔ مسلم قائدین کا یہ عمل یقینی طور پر غیر منصفانہ عمل ہے۔ اور غیر منصفانہ عمل کے لیے اس دنیا میں بربادی کے سوا کچھ اور مقدر نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ اس ملک میں اگر ایسے واقعات ہیں کہ ایک "مصطفیٰ" کو سروس میں لیا گیا ہے تو اسی کے ساتھ ایسا واقعہ بھی موجود ہے کہ کسی "مصطفیٰ" کو سروس میں نہیں لیا گیا۔ مگر مجھے جس چیز سے اختلاف ہے وہ یہ کہ اس کو تعصب اور امتیاز قرار دیا جائے۔ یہ دراصل زندگی کی ایک حقیقت ہے نہ کہ تعصب اور امتیاز۔

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں لازماً یہ ہوتا ہے کہ افراد اور قوموں کے درمیان دوڑ جاری رہے۔ اور پھر کوئی آگے بڑھے اور کوئی پیچھے رہ جائے۔ چڑیا گھر میں جو جانور ہوتے ہیں وہ کچھ دن کے بعد سست پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کٹہرے میں وقتی طور ان کے دشمن جانور ڈالے جاتے ہیں تاکہ ان کے لیے دوڑنے اور بھاگنے کا ماحول پیدا کیا جائے۔ یہ قدرت کا اصول ہے، اور مقابلہ اور مسابقت کے اسی اصول میں زندگی کا راز چھپا ہوا ہے ـــــ ایک واقعہ کو قومی تعصب کہیں تو صرف شکایت کا ذہن بنتا ہے، اسی واقعہ کو قومی مسابقت کہیے تو عمل کا جذبہ بیدار ہونے لگے گا۔

کامیابی کے لیے

ایک تاجر سے پوچھا گیا : کامیابی کیا ہے۔ اس نے جواب دیا :

When you wake up in the morning, jump out of bed and shout: Great, another day. Then you're a success.

صبح کے وقت جب تم جاگو تو کود کر بستر سے نکلو اور چلا کر کہو، عظیم دوسرا دن۔ تب تم کامیاب ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ رات کے بعد ایک نئی صبح کا طلوع ہونا عظیم ترین چیز ہے۔ کیوں کہ وہ ہم کو کام کا ایک اور دن دیتا ہے۔ جس شخص کے اندر کام کا واقعی جذبہ ہو وہ ایسے ایک دن کو پا کر اچھل پڑے گا۔ اور جو شخص کام کا دن پا کر اچھل پڑے وہی اس دنیا میں کوئی بڑا کام کر سکتا ہے۔

زمین پر رات اور دن کا باری باری آنا ساری معلوم کائنات میں ایک انوکھا واقعہ ہے۔ کیوں کہ وسیع کائنات میں یا تو سورج جیسے ستارے ہیں جو آگ کے بہت بڑے الاؤ کی مانند ہیں۔ اور ان میں انسان جیسی زندگی ممکن نہیں۔ اس کے بعد جو سیارے یا سیارچے ہیں۔ مثلاً مریخ یا چاند، ان کی گردش زمین کے برعکس، صرف یک طرفہ ہے۔ یعنی وہ صرف اپنے مدار پر گھومتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ایک حصہ پر مستقل رات اور ان کے دوسرے نصف حصہ پر مستقل دن رہتا ہے۔

زمین وہ استثنائی کرہ ہے جو اپنے مدار پر گھومنے کے علاوہ اپنے محور پر بھی گھومتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس پر رات اور دن باری باری آتے رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حیرت انگیز انتظام ہے۔ اسی طرح اللہ نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ دن کے اوقات میں کام کرے اور رات کو اپنی تکان مٹائے۔

آدمی اگر اس پورے نظام پر غور کرے تو زمین پر رات کے بعد دن کا آنا اس کو اتنا عجیب معلوم ہوگا کہ صبح ہوتے ہی وہ واقعۃً بستر سے کود کر کھڑا ہو جائے گا اور خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس نے اس کو کام کا قیمتی موقع عطا فرمایا۔

خوشی کا راز

مارگریٹ لی رنبک (Margaret Lee Runbeck) کا قول ہے کہ —— خوشی کوئی منزل نہیں جہاں آدمی پہونچے ، بلکہ خوشی سفر کرنے کا ایک طریقہ ہے :

Happiness is not a station you arrive at, but a manner of travelling.

ہر آدمی خوشی کا طالب ہے ۔ مگر موجودہ دنیا میں کسی کو خوشی نہیں ملتی ۔ یہ دنیا اس لیے بنائی ہی نہیں گئی کہ یہاں آدمی اپنی خوشیوں کا گھر تعمیر کر سکے ۔ جو شخص خوشی کو اپنی منزل سمجھے وہ کبھی خوشی کو نہیں پا سکتا ۔ خوشی صرف اس کے لیے ہے جو خوشی کے بغیر خوش رہنا سیکھ جائے ۔

اگر آدمی یہ جان لے کہ اس دنیا میں غم ناگزیر ہے تو وہ غم کے ساتھ رہنا سیکھ جائے گا ۔ اس کو نقصان لاحق ہوگا تو وہ فریاد و ماتم نہیں کرے گا بلکہ اس سے اپنے لیے سبق کی غذا حاصل کرے گا ۔ اس کی امیدیں پوری نہ ہوں گی تو وہ مایوسی میں مبتلا نہیں ہوگا ۔ اس کا یہ شعور اس کے لیے سہارا بن جائے گا کہ اس دنیا میں کسی کی بھی امیدیں پوری نہیں ہوتیں ، چاہے وہ امیر ہو یا غریب ، بادشاہ ہو یا کوئی معمولی آدمی ۔

خوشی اور کامیابی سے اگر آدمی کو کچھ ملتا ہے تو غم اور ناکامی سے بھی آدمی کو بہت کچھ ملتا ہے ۔ غم اور ناکامی کے تجربات آدمی کو سنجیدہ بناتے ہیں ۔ وہ اس کی سوچ میں گہرائی پیدا کر دیتے ہیں ۔ ان کے ذریعہ سے وہ نئے نئے سبق سیکھتا ہے ۔ غم اور ناکامی کے تجربات آدمی کے پورے وجود کو بدل کر ایک نیا آدمی بنا دیتے ہیں ۔ اگر دنیا میں صرف خوشی اور کامیابی ہوتی تو دنیا سطحی اور بے حس انسانوں کا قبرستان بن جاتی ۔ یہ دراصل غم اور ناکامی ہی ہے جس کی وجہ سے دنیا کبھی زندہ انسانوں سے خالی نہیں ہوتی ۔

زندگی کی تلخیاں آدمی کی زندگی کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہیں جو سونے چاندی کے لیے تپانے کی حیثیت ہے ۔ تپانے کا عمل سونے چاندی کو نکھارتا ہے ۔ اسی طرح تلخ تجربات آدمی کی اصلاح کرتے ہیں ۔ وہ بے چمک انسان کو چمک دار انسان بنا دیتے ہیں ۔

تاریخ سازی

بی ٹکمین (B. Tuchman) کا قول ہے کہ تاریخ غلط اندازہ کا ظہور ہے :

History is the unfolding of miscalculation.

اس کا مطلب یہ ہے کہ حال کے اعتبار سے مبصرین تاریخ کے بارہ میں ایک رائے قائم کرتے ہیں۔ مگر حال جب مستقبل بنتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندازے بالکل غلط تھے۔ مستقبل اکثر حالات میں اس سے مختلف صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو ابتدائی طور پر سمجھنے والوں نے اس کے بارے میں سمجھا تھا۔

مثال کے طور پر ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح حدیبیہ ہوئی تھی۔ اس وقت قریش کے تمام لوگوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں نے خود اپنے خاتمہ کے کاغذ پر دستخط کر دیئے ہیں۔ مگر بعد کے سالوں نے بتایا کہ اس بظاہر ہار میں فتح کا عظیم مستقبل چھپا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ۱۹۴۵ میں جب امریکہ کے جنگی جہاز فضا میں چنگھاڑتے ہوئے جاپان پر ایٹم بم گرانے کے لیے روانہ ہوئے تو امریکہ کا اندازہ یہی تھا کہ وہ جاپان کو ہمیشہ کے لیے راکھ کا ڈھیر بنا رہا ہے۔ مگر اس واقعہ کے ۴۰ سال بعد لوگوں نے دیکھا کہ جاپان دنیا کی سب سے بڑی صنعتی طاقت بن کر ابھر آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کو بنانے والا خود انسان نہیں، یہ در اصل خدا ہے جو انسانی تاریخ کو اپنی مرضی کے مطابق کوئی ایک یا دوسری صورت دیتا ہے۔ تاریخ کی صورت گری کا فیصلہ غیب سے ہوتا ہے نہ کہ ظاہری احوال سے۔

تاریخ کے اس مطالعہ میں ان لوگوں کے لیے تسلی کا سامان ہے جن کے متعلق دنیا کے مبصرین سمجھ لیں کہ وہ بجھ چکے ہیں یا ان کو مٹایا جا چکا ہے۔ کیوں کہ واقعات بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں بظاہر بجھی ہوئی راکھ سے شرارے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک مٹی ہوئی شئی دوبارہ زندہ اور اور طاقتور بن کر زمین پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہاں بظاہر ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) از سر نو زندہ طاقت بن جاتی ہے۔

ظاہری حالات سے کبھی مایوس نہ ہوں۔ عین ممکن ہے کہ تاریخ اگلا ورق الٹے تو ایسا انجام سامنے آئے جو ظاہری حالات سے بالکل مختلف ہو۔

حوصلہ مندی

نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبد السلام نے جنوری ۱۹۸۶ میں ہندستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی تقریروں کی رپورٹیں اخبارات میں آتی رہیں۔ ان کی ایک تقریر کی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ شامل تھے :

> Citing the example of South Korea, he said that about 15 years ago, the gross national product per capita there was equal to that of India. However, it was many times more now due to the efforts they had put. Prof. Salam said that a team from South Korea had come to Trieste, Italy, where he stays, and wanted to know how Nobel prizes were won. He said that it was a similar spirit which should be inculcated in the people of the third world.
>
> *The Times of India*, January 16, 1986.

جنوبی کوریا کی مثال دیتے ہوئے پروفیسر عبد السلام نے کہا کہ تقریباً پندرہ سال پہلے اس کی اور ہندستان کی قومی پیداوار فی شخص برابر تھی۔ مگر اب جنوبی کوریا کی کوششوں کے نتیجہ میں اس کی فی شخص قومی پیداوار ہندستان سے کئی گنا زیادہ ہو چکی ہے۔ پروفیسر عبد السلام نے کہا کہ جنوبی کوریا کی ایک ٹیم ٹریسٹ (اٹلی) آئی جہاں وہ رہتے ہیں اور ان سے یہ جاننا چاہا کہ نوبل انعام کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہی وہ روح ہے جو تیسری دنیا کے لوگوں میں پیدا کی جانی چاہیے۔

تلاش کا یہ جذبہ ہی تمام ترقیوں کی بنیاد ہے، خواہ وہ فرد کی ترقی کا معاملہ ہو یا قوم کی ترقی کا معاملہ۔ اور خواہ اس کا تعلق دنیا کی ترقیوں سے ہو یا آخرت کی ترقیوں سے۔ ہر ترقی انھیں لوگوں کے لیے ہے جو اپنے اندر تلاش وجستجو کا کبھی نہ ختم ہونے والا جذبہ رکھتے ہوں۔

تلاش کا جذبہ یہ بتاتا ہے کہ آدمی کے اندر جمود نہیں پیدا ہوا ہے۔ اور جمود تمام ترقیوں کا قاتل ہے۔ جہاں جمود آیا وہاں ترقی کا عمل بھی لازمی طور پر رک جائے گا۔ جمود کی حالت طاری ہونے کے بعد آدمی "مزید" کے شوق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور جس سے مزید کا شوق رخصت ہو جائے وہ جہاں ہے وہاں بھی باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ پیچھے جانا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بالکل آخری صف میں پہنچ جائے گا۔

اسلام اور سائنس

اس مختصر مقالہ میں مجھے اس سوال کی تحقیق کرنی ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں سائنس کی تعلیم میں پیچھے کیوں ہو گئے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمان سائنس کی تعلیم میں اس لیے پیچھے ہیں کہ ان کا مذہب سائنس کی تعلیم کا مخالف ہے، یا کم از کم اس کو پسند نہیں کرتا۔ مگر یہ بات حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن میں کثیر تعداد میں ایسی آیتیں موجود ہیں جن میں مختلف طریقوں سے اس امر پہ زور دیا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی چیزوں پر غور کرو۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ اسلام کے ماننے والے زمین و آسمان کی چیزوں کا مطالعہ نہ کریں جس کا دوسرا نام سائنس ہے۔ اسلام کے نزدیک کائنات کے مطالعہ کا سب سے پہلا فائدہ معرفت ہے۔ یعنی مخلوق کے اندر خالق کا مشاہدہ کرنا۔ تاہم جب لوگ کائنات کو قابل غور سمجھ کر اسے دیکھتے ہیں تو اسی سے وہ چیز بھی برآمد ہوتی ہے جس کو سائنس کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ کیوں کہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے سائنس کے شعبوں میں زبردست ترقی کی۔ حتیٰ کہ جس زمانہ میں یوروپ کی قوموں نے سائنس کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا تھا اس وقت مسلمان سائنس کی راہ میں شاندار ترقیاں حاصل کر چکے تھے۔ برٹرینڈ رسل نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ ۶۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک کے دور کو ہم تاریک دور کہتے ہیں۔ یہ مغربی یوروپ کو غیر واقعی اہمیت دینا ہے۔ اسی زمانہ میں چین میں تنگ کی حکومت تھی جو کہ چینی شاعری کا اہم ترین دور ہے۔ اور کئی دوسرے پہلوؤں سے بہت اہم دور ہے۔ اسی زمانہ میں ہندستان سے لے کر اسپین تک اسلام کی شاندار تہذیب چھائی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جو چیز مسیحیت کے لیے کھوئی ہوئی تھی وہ تہذیب کے لیے کھوئی ہوئی نہ تھی بلکہ اس کے برعکس تھی:

Our use of the phrase 'the Dark Ages' to cover the period, from 600 to 1000 marks our undue concentration on Western Europe. In China, this period includes the time of the Tang dynasty, the greatest age of Chinese poetry, and in many other ways a most remarkable epoch. From India to Spain, the brilliant civilization of Islam flourished. What was lost to Christendom at this time was not lost to civilization, but quite the contrary.

Bertrand Russell, *A History of Western Philosophy*, p. 395

زمانہ سے آگے

قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے طب اور سائنس کے میدان میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ تعجب خیز حد تک عظیم ہیں۔ الرازی (۸۶۵ - ۹۳۲) اور ابن سینا (۹۸۰ - ۱۰۳۷) اپنے وقت کے سب سے بڑے ماہرین طب تھے جن کا کوئی ثانی اس وقت کی دنیا میں موجود نہ تھا۔ ابن سینا کی کتاب القانون فی الطب علم طب پر ایک بنیادی کتاب ہے۔ وہ دنیا کے اکثر طبی اداروں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی رہی ہے۔ حتی کہ فرانس میں وہ ۱۶۵۰ء تک داخل نصاب تھی:

Al-Qanun became a classic and was used at many medical schools, at Montpellier, France, as late as 1650 (11/828).

مسلمانوں کے یہ کارنامے عام طور پر مشہور اور معلوم ہیں۔ ان پر بے شمار کتابیں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک سوال ہے۔ اور یہ سوال اس کی توجیہہ کے بارہ میں ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

The greatest contribution of Arabian medicine was in Chemistry and in the knowledge and preparation of medicines; many drugs now in use are of Arab origin, as also are such processes as distillation and sublimation. Often the chemistry of that time was mainly a search for the philosopher's stone, which supposedly would turn all common metals to gold. Astronomers were astrologers and chemists were alchemists. It is, therefore, surprising that, despite all this, the physicians of the Muslim empire did make a noteworthy contribution to medical progress (11/828).

طب عربی کی سب سے بڑی خدمت کیمسٹری اور دواؤں کے علم اور ان کی تیاری کے بارے میں تھی اکثر دوائیں جو آج استعمال ہوتی ہیں ان کی اصل عرب ہی ہے۔ اسی طرح تقطیر اور تصعید جیسے عمل بھی۔ اس زمانہ کی کیمسٹری اکثر و بیشتر پارس پتھر کی تلاش کا نام تھی، جس کے متعلق یہ

گمان کر لیا گیا تھا کہ وہ تمام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکتا ہے ۔ اس زمانہ کے فلکیات داں محض نجومی ہوتے تھے ۔ اور کیمسٹری کے علماء صرف کیمیاگری کرتے تھے ۔ اس لیے یہ تعجب خیز بات ہے کہ ان سب کے باوجود مسلم عہد کے اطباء نے طب کی ترقی میں قیمتی اضافے کیے ۔

اسلام سائنس کا خالق

یہ باتیں وہ ہیں جن کا عام طور پر مورخین نے اعتراف کیا ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس سے بھی آگے ہے ۔ جدید سائنس خود اسلام کی پیدا کردہ ہے ۔ اسلام بلاشبہ سائنس کے لیے نہیں آیا ۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سائنسی انقلاب خود اسلامی انقلاب کی ضمنی پیداوار ہے ۔ اسلام اور سائنس کے اس تعلق کو بریفالٹ نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ ہماری سائنس پر عربوں کا قرضہ صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے حیران کن نظریات دیے ۔ سائنس اس سے زیادہ عربوں کی مقروض ہے ۔ یہ خود اپنے وجود کے لیے ان کی احسان مند ہے :

The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence. The ancient world was, as we saw, pre-scientific. The Astronomy and Mathematics of the Greeks were a foreign importation never thoroughly acclimatized in Greek culture. The Greeks systematized, generalized, and theorized, but the patient ways of investigation, the accumulation of positive knowledge, the minute method of science, detailed and prolonged observation and experimental inquiry were altogether alien to the Greek temperament. Only in Hellenistic Alexandria was any approach to scientific work conducted in the ancient classical world. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigation, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of Mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.

Briffault, *Making of Humanity*, p. 190

یہ ایک علمی اور تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سائنس کا خالق ہے ۔ سائنس سادہ طور پر مطالعہ فطرت (Study of nature) کا نام ہے ۔ انسان جب سے زمین پر آباد ہے اسی وقت سے فطرت اس کے سامنے موجود ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت کے مطالعہ اور تسخیر میں انسان کو اتنی زیادہ دیر لگی ۔ سائنس کی تمام ترقیاں پچھلے ہزار برس کے اندر ظہور میں آئی ہیں ۔ جب کہ اصولاً انھیں لاکھوں سال پہلے ظاہر ہو جانا چاہیے تھا ۔ اس کی وجہ قدیم زمانہ میں شرک کا غلبہ ہے ۔ شرک اس میں مانع تھا کہ آدمی فطرت کا مطالعہ

کرے اور اس کی قوتوں کو دریافت کرکے انھیں اپنے کام میں لائے۔

شرک کیا ہے۔ شرک نام ہے فطرت کو پوجنے کا۔ قدیم زمانہ میں یہی شرک تمام اقوام کا مذہب تھا:

> For the ancient man. Nature was not just a treasure-trove of natural resources, but a goddess, Mother Earth. And the vegetation that sprang from the earth, the animals that roamed the earth's surface, and the minerals hiding in the earth's bowels, all partook of nature's divinity, so did all natural phenomenon — springs and rivers and the sea: mountains, earthquakes and lightening and thunder.

غرض زمین سے آسمان تک جو چیز بھی انسان کو نمایاں نظر آئی اس کو اس نے اپنا خدا فرض کر لیا اسی کا نام شرک ہے اور یہ شرک اسلام سے پہلے تمام معلوم زمانوں میں دُنیا کا غالب فکر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدیم انسان کے لیے فطرت پرستش کا موضوع (Object of worship) بنی ہوئی تھی۔ پھر عین اسی وقت وہ تحقیق کا موضوع (Object of investigation) کیسے بنتی۔ یہی اصل وجہ ہے جس کی بنا پر قدیم انسان اس طرف راغب نہ ہو سکا کہ وہ فطرت کا مطالعہ کرے۔ تمام قدیم زمانوں میں انسان فطرت کو خدا سمجھ کر اس کے سامنے جھکتا رہا ہے۔ فطرت کو مقدس نظر سے دیکھنا انسان کے لیے اس میں روک بنا رہا کہ وہ فطرت کی تحقیق کرے اور اس کو اپنے تمدن کی تعمیر کے لیے استعمال کرے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ فطرت پرستی (شرک) کے اس دور کو سب سے پہلے جس نے ختم کیا وہ توحید (Monotheism) ہے۔ توحید کے عقیدے نے پہلی بار انسان کو یہ ذہن دیا کہ فطرت خالق نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ وہ پوجنے کی چیز نہیں بلکہ برتنے کی چیز ہے۔ اس کے آگے جھکنا نہیں ہے بلکہ اس کو تسخیر کرنا ہے تاہم جب اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ توحید کے نظریہ کو پہلی بار اسلام نے عملی طور پر رائج کیا تو یہ انقلاب براہ راست اسلام کا کارنامہ قرار پاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کے تمام پیغمبر توحید کا پیغام لے کر آئے۔ ہر دور میں خدا کے جن بندوں نے سچائی کی تبلیغ کی انھوں نے خالص توحید ہی کی تبلیغ کی۔ مگر اسلام سے پہلے کسی بھی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ توحید کے نظریہ کو مان لیں اور توحید کی بنیاد پر انسانی معاشرہ میں وسیع انقلاب برپا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے

انسان کبھی توحید کے حقیقی ثمرات سے آشنا نہ ہو سکا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، خدا کا ہر پیغمبر توحید کا پیغام لے کر آیا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ ان کے پیرو ان کے لائے ہوئے دین کی حفاظت نہ کر سکے۔ انھوں نے توحید میں شرک کی آمیزش کر دی۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح نے خالص توحید کا پیغام دیا مگر ان کے بعد ان کے پیروؤں نے خود حضرت مسیح کو خدا سمجھ لیا۔ ان کا یہ مشرکانہ عقیدہ مختلف پہلوؤں سے سائنس کی ترقی کے لیے رکاوٹ بن گیا۔ مثلاً کچھ علمائے فلکیات نے نظامِ شمسی کی تحقیق کی۔ وہ اس حقیقت تک پہونچے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ مگر عیسائی علمار ایسے لوگوں کے سخت مخالف ہو گیے۔ اس کی وجہ ان کا مذکورہ مشرکانہ عقیدہ تھا۔ انھوں نے زمین کو خداوند کی جنم بھومی فرض کر رکھا تھا اس لیے ان کے لیے ناقابلِ فہم ہو گیا کہ جس زمین پر خدا پیدا ہوا ہو وہ زمین نظامِ شمسی کا مرکز نہ ہو بلکہ اس کی حیثیت محض ایک تابع کی قرار پائے۔ اپنے مشرکانہ عقیدہ کو بچانے کے لیے انھوں نے سائنسی حقیقت کا انکار کر دیا۔

دوسری بات یہ کہ پچھلے تمام پیغمبروں کا مشن صرف اعلان کی حد تک جا سکا وہ عملی انقلاب تک نہیں پہونچا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھی انسانی تاریخ کے پہلے گروہ ہیں جنھوں نے توحید کو ایک زندہ عمل بنایا۔ انھوں نے اولاً عرب میں شرک (مظاہر فطرت کی پرستش) کا مکمل خاتمہ کیا اور توحید کو عملی طور پر انسانی زندگی میں رائج کیا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور قدیم زمانہ کی تقریباً تمام آباد دنیا میں شرک کو مغلوب کر دیا۔ انھوں نے ایشیا اور افریقہ کے تمام بت خانوں کو کھنڈر بنا دیا اور توحید کو ایک عالمی انقلاب کی حیثیت دے دی۔

اہلِ اسلام کے ذریعہ توحید کا جو عالمی انقلاب آیا اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ توہم پرستی کا دور ختم ہو۔ اب مظاہر فطرت کو پرستش کے مقام سے ہٹا دیا گیا۔ ایک خدا انسان کا معبود قرار پایا۔ اس کے علاوہ جو تمام چیزیں ہیں وہ سب صرف مخلوق بن کر رہ گئیں۔

انسانی تاریخ میں اسلام کے ظہور سے جو عظیم تبدیلی آئی اس کا اعتراف ایک امریکی انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رُخ کو موڑ دیا:

Its advent changed the course of human history.

مظاہر فطرت کو پرستش کے مقام سے ہٹانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ فوراً انسان کے لیے تحقیق اور تسخیر

کا موضوع بن گیے۔ مظاہر فطرت کی تحقیق و تسخیر کا آغاز مدینہ میں ہوا۔ پھر دمشق اور بغداد اس کے مرکز بنے
س کے بعد یہ لہر سمندر پار کر کے اسپین اور سسلی میں داخل ہوئی، وہاں سے وہ مزید آگے بڑھ کر
ٹلی اور فرانس تک جا پہونچی۔ یہ تاریخی عمل جاری رہا۔ یہاں تک وہ جدید سائنسی انقلاب تک پہونچ
گیا۔ مغرب کا سائنسی انقلاب اس اعتبار سے اسلامی انقلاب کا انتہائی نقطہ ہے۔ وہ توحید کے
نقلاب کا سکولر نتیجہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو اسلام سائنس کا بانی تھا۔ اور جس کے ماننے والے اپنے ابتدائی دور میں
ساری دنیا کے لیے سائنس کے معلم بنے اسی اسلام کے ماننے والے موجودہ زمانہ میں سائنس کی تعلیم میں دوسروں
سے پیچھے کیوں ہو گیے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ سیاسی ہے۔ مسلمانوں نے ابتداءً جو سائنسی انقلاب برپا کیا تھا
وہ اسپین تک پہونچنے کے بعد مغربی قوموں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد سائنس کی ترقیاں زیادہ تر
اہلِ مغرب کے ہاتھوں ہوئیں۔ اس زمانہ میں بھی اگرچہ دنیا کا بڑا حصہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے قبضہ
میں تھا مگر سائنس کی ترقی کا کام صلیبی جنگوں کے بعد مغربی یوروپ کے ذریعہ انجام پاتا رہا۔

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں سائنس کے میدان میں جو ترقیاں کی تھیں اس کا پہلا سب
سے بڑا فائدہ ان کو دو سو سالہ صلیبی جنگوں (۱۰۹۵-۱۲۷۰) میں ہوا۔ اس جنگ میں تقریباً سارا
یوروپ متحدہ طاقت سے مسلم دنیا پر حملہ آور ہوا تاکہ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں کے قبضہ سے
واپس لے۔ مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ان مہموں میں کروروں جانیں اور بے پناہ دولت قربان
کردی گئی۔ اور جب یہ سب ختم ہوا تو یروشلم بدستور "بد دینوں" کے قبضہ میں تھا:

> Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed in these enterprises. And when all was done, Jerusalem remained in the possession of the "infidels".
>
> *Pears Cyclopaedia*, (1953-1954), p. 539

صلیبی جنگوں کا خاتمہ مسلمانوں کی کامل فتح اور مسیحی یوروپ کی کامل شکست پر ہوا۔ مسلمانوں
کی فتح ان کے لیے الٹی پڑی۔ اس کے برعکس عیسائیوں کو ان کی شکست کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔
مسلمان اپنی سیاسی فتح پر قانع ہو کر رہ گیے۔ کامیابی کے احساس نے ان کی عملی قوتوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

اس کے برعکس مسیحی یوروپ کو اپنی ناکامی کا یہ فائدہ ملا کہ اس کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ اپنی کمزوریوں کو معلوم کر کے ان کی تلافی کرے۔ چنانچہ اس کے اندر ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے زور وشور کے ساتھ یہ تبلیغ کی کہ مسلمانوں کی زبان عربی سیکھو اور ان کی کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کرو۔ یہ رجحان یوروپ میں تیزی سے پھیلا۔ مسلمانوں کی اکثر کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں جو اس وقت یوروپ کی علمی زبان تھی۔ یہ عمل کئی سو سال تک جاری رہا۔ ایک طرف مسلمان اپنی سیاسی کامیابی میں گم تھے، دوسری طرف یوروپ علمی میدان میں مسلسل ترقی کر رہا تھا۔

یوروپ کا یہ علمی سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸ ویں صدی آگئی جب کہ یوروپ واضح طور پر مسلم دنیا سے آگے بڑھ گیا۔

مغربی یوروپ نے سائنس کو جدید ٹکنالوجی تک پہونچا دیا۔ اس نے دستکاری کی جگہ مشینی صنعت ایجاد کی۔ اس نے دستی ہتھیاروں کی جگہ دور مار ہتھیار بنا لیے۔ وہ برّی طاقت سے آگے بڑھا اور ابتداءً بحری طاقت اور اس کے بعد فضائی طاقت پر قابو حاصل کر لیا۔ اس طرح مغرب بالآخر ایسی طاقت بن گیا جس کا مقابلہ مسلمان اپنے موجودہ ساز و سامان کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ مغرب جدید قوتوں سے مسلح ہو کر دوبارہ جب مسلم دنیا کی طرف بڑھا تو مسلمان قومیں ان کو روکنے میں ناکام رہیں۔ مغربی قوموں نے مختصر عرصہ میں تقریباً پوری مسلم دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ کنٹرول حاصل کر لیا۔

صلیبی جنگوں کے بعد مسلمان اپنی سیاسی فتح کے جوش میں سائنس سے دور ہو گئے تھے۔ موجودہ زمانہ میں یہی بات ایک اور شکل میں پیش آئی۔ مغربی قوموں کے مقابلہ میں سیاسی شکست نے موجودہ مسلمانوں کے اندر منفی ردعمل پیدا کیا۔ مغربی قوموں نے ان سے ان کا فخر (Pride) چھینا تھا۔ چنانچہ وہ مغربی قوموں سے سخت متنفر ہو کر رہ گئے۔ اپنی ردعمل کی نفسیات کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف مغربی قوموں کو برا سمجھا بلکہ مغربی قوموں کی زبان اور مغربی قوموں کے ذریعہ آنے والے علوم کو بھی وہ نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔

ایک صدی کی پوری مدت اسی حال میں گزر گئی۔ مسلمان مغربی قوموں سے نفرت کرتے رہے یا ان سے ایسی لڑائیاں لڑتے رہے جو مسلمانوں کی کمتر تیاری کی وجہ سے صرف شکست پر ختم ہونے

ی تھی۔ دوسری طرف دنیا کی دوسری قومیں مغربی زبان اور مغربی علوم کو سیکھ کر تیزی سے آگے
تی رہیں یہاں تک کہ دونوں کے درمیان وہ بعید فاصلہ پیدا ہو گیا جس کی ایک مثال ہم کو
ستان میں نظر آتی ہے۔ مسٹر کلدیپ نیّر نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان تعلیم میں
سو سال پیچھے ہیں۔ اگر اس کو گھٹایا جائے تب بھی یہ فاصلہ ایک سو سال کے بقدر ماننا ہوگا۔

مغربی قومیں جن علوم کو لے کر آگے بڑھیں وہ سادہ معنوں میں محض علوم نہ تھے بلکہ وہ دور
ید میں ہر قسم کی ترقی کی بنیاد تھے۔ چنانچہ جن قوموں نے ان علوم کو سیکھا وہ دنیوی اعتبار سے
سروں سے آگے بڑھ گئیں۔ مغربی قومیں اور ان کے مقلدین تہذیب و تمدن میں مسلمانوں سے
بہا زیادہ فائق ہو گئے۔ یہی وقت ہے جب کہ مسلمانوں میں سرسید (۱۸۹۸-۱۸۱۷) اور اس
کے دوسرے مصلحین پیدا ہوئے۔ مگر یہاں پہونچ کر مسلم مصلحین سے تیسری غلطی
ئی۔ وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو گئے۔ وہ مغربی تہذیب کی جڑوں
زیادہ گہرائی کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ وہ مغرب کی طرف بڑھے۔ مگر ان کا بڑھنا مغرب کی تہذیب
مرعوبیت کی بنا پر تھا نہ کہ مغرب کی قوت کے اصل سرچشمہ (سائنس) کو سمجھ کر اس کو اختیار
نے کے لیے تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مصلحین کی ساری توجہ مغرب کی زبان، مغرب کے لٹریچر،
رب کے تمدنی مظاہر پر رہی۔ یہ مغرب سے قریب ہونے والے بھی مغرب کی سائنس سے اسی طرح محروم
ہے جس طرح مغرب سے دور رہنے والے اس کی سائنس سے محروم تھے۔ سرسید نے انگلستان کا سفر کیا تو
ں کی خاص چیز جو وہ اپنے ساتھ لائے وہ ایک صوفہ سیٹ تھا۔ اس کے بجائے اگر وہ سائنس کی کتابیں
ئی مشین اپنے ساتھ لاتے تو یقیناً وہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر تحفہ ہوتا۔ آخر وقت میں جب
ان مغربی تعلیم کی طرف مائل ہوئے اس وقت بھی ان کے ذہن میں ساری اہمیت مغربی تہذیب کی تھی
ربی سائنس سے وہ بدستور دور پڑے رہے۔

سائنسی شعور

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ اگر مختصر طور پر بتائی ہو تو وہ صرف ایک
ی: مسلمانوں میں سائنسی شعور نہ ہونا۔

ہندستان کا زمین دار طبقہ جدید تجارت میں پیچھے کیوں ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر

تجارتی شعور موجود نہ تھا یہی واقعہ سائنس کے سلسلہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ ایک یا ایک سے زیادہ اسباب کی بنا پر مسلمانوں کے اندر جدید دور میں سائنسی شعور پیدا نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سائنس کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دی اور اگر توجہ دی بھی تو ادھوری شکل میں۔

اس کی ایک واضح مثال وہ فرق ہے جو مسلمانوں کے درمیان دینی تعلیم اور سائنسی تعلیم کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم کی اہمیت کا شعور موجود تھا اس لیے انھوں نے اس کا پورا اہتمام کیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا شعور موجود نہ تھا اس لیے وہ اس کا وہ اہتمام نہ کرسکے جس کے بغیر کسی قوم میں سائنسی تعلیم نہیں آسکتی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم رہنماؤں کو جب جدید علوم کی طرف توجہ ہوئی تو انھوں نے کالج اور یونیورسٹیاں تو بنائیں مگر انھوں نے جدید علوم کی ابتدائی تعلیم کا نظام قائم نہیں کیا جو کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو خوراک فراہم کرتے ہیں۔ جب کہ انھیں مسلمانوں میں دینی مدارس کی مثال اس سے بالکل مختلف نمونہ پیش کرتی ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے دینی مدرسے قائم کیے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ صرف بڑے بڑے مدرسے قائم کرکے بیٹھ جائیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کیا کہ پورے ملک میں ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کا نظام پھیلا دیا۔ آپ جس گاؤں یا جس قصبہ میں جائیں، آپ کو وہاں ابتدائی تعلیم کا مکتب ایک یا ایک سے زیادہ کام کرتا ہوا ملے گا۔ یہی ابتدائی مکاتب دراصل وہ ادارے ہیں جو بڑے بڑے دینی مدرسوں کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ اگر یہ ابتدائی مکاتب نہ ہوں تو تمام بڑے بڑے دینی مدرسے سونے نظر آئیں۔

یہی بات جدید سائنس کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی ملحوظ رکھنے کی تھی۔ مسلم رہنماؤں کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو خوراک پہونچانے والے ابتدائی اسکول نہ ہوں تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کو طلبہ کہاں سے ملیں گے۔ ہندستان میں مثال کے طور پر ہندو اور عیسائی بہت بڑے پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا نظام قائم کر رہے تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس مثال سے کوئی سبق نہیں لیا۔ انھوں نے کالج اور یونیورسٹیاں بنانے کے لیے زبردست کوشش کی مگر ابتدائی اسکول قائم کرنے کی طرف اتنا کم دھیان دیا کہ وہ نہیں کے برابر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ منظر دیکھتے ہیں کہ مسلم کالج اور اسلامی یونیورسٹی تو ہمارے پاس ہیں مگر اس کے اندر مسلم طلبہ موجود نہیں۔ کیوں کہ ان بڑے اداروں کو غذا پہونچانے والے چھوٹے ے نہیں۔ مسلمانوں نے اپنے بچوں کو مذہبی جذبے کے تحت ہندو اور عیسائی یا گورنمنٹ کے ئی اسکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کیا اور خود ان کے اپنے ابتدائی اسکول موجود نہ تھے۔ نتیجہ یہ قوم کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اس انداز پر نہ ہو سکی کہ وہ آگے بڑھ کر سائنس کے شعبوں میں لے سکیں۔ مسلم رہنماؤں کی اس غفلت کی وجہ جو بھی ہو، مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ عملی طور پر ے بڑا سبب ہے جس نے مسلم قوم کو سائنسی تعلیم میں پیچھے کر دیا۔

بنیادی غفلت

سائنس کی تعلیم میں مسلمانوں کے پیچھے ہونے کا سبب ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ مسلمان انگریز اور انگریزی میں فرق نہ کر سکے۔ انھوں نے استعماری قوموں کو اور استعماری قوموں ریعہ آنے والے علوم کو ایک سمجھا۔ اول الذکر سے سیاسی اسباب کے تحت انھیں نفرت پیدا ہوئی۔ اس یہ ہوا کہ وہ ثانی الذکر سے بھی نفرت کرنے لگے۔ اگر وہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے ہی طور پر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سائنسی تاریخ دوسری ہوتی۔

ہر قوم کے کچھ اپنے قومی علوم ہوتے ہیں۔ ان قومی علوم سے دوسری قوموں کو دلچسپی نہ ہونا فطری بات ہے۔ مزید یہ کہ دوسری قومیں اگر ان قومی علوم سے دلچسپی نہ لیں تو اس سے انھیں حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔

مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم ایک علم کو لے کر اٹھتی ہے لیکن حقیقتہً وہ اس کا قومی علم ں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت ایک آفاقی علم کی ہوتی ہے۔ یہ علم اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام دں کے لیے ہوتا ہے نہ کہ کسی ایک قوم کے لیے۔ وہ انسانیت کا مشترک سرمایہ ہوتا ہے نہ کہ کسی قوم نفرادی ورثہ۔

قدیم صلیبی جنگوں کے بعد یہی صورت حال مغربی قوموں کے ساتھ پیش آئی تھی۔ اُس وقت مان سائنسی علوم کے حامل تھے۔ اور اسی بنا پر وہ مغربی قوموں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے وقت مغرب کی حیثیت مفتوح کی تھی اور مسلمانوں کی حیثیت فاتح کی۔ اگرچہ عام طور پر ایسا ہوتا

ہے کہ مفتوح کے دل میں فاتح کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ فاتح کی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ مگر مغربی قوموں نے یہ نادانی نہیں کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے علوم کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا۔ انھوں نے مسلمانوں سے نفرت کی مگر مسلمانوں کے علوم کو انھوں نے آگے بڑھ کر لیا۔ نیز اپنی کوششوں سے اس میں اتنے اضافے کیے کہ بعد کی صدیوں میں وہ ان علوم کے امام بن گئے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ وہ دوبارہ تاریخ کو اپنے حق میں بدلنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہی صورت موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آئی۔ مغربی قومیں ان کے لیے فاتح کی حیثیت رکھتی تھیں اس لیے مغربی قوموں سے بیزاری ان کے لیے ایک فطری بات تھی۔ مگر یہاں مسلمان اس ہوش مندی کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ مغرب اور مغربی علوم کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں۔ مغربی قومیں جن علوم کو لے کر آگے بڑھی تھیں وہ ان کے قومی علوم نہ تھے بلکہ وہ کائناتی علوم تھے۔ ان کی حیثیت قوت وطاقت کی تھی۔ دور جدید کے مسلم رہنما اگر اس راز کو بروقت جان لیتے تو وہ مغربی علوم کو مغرب سے الگ کرکے دیکھتے۔ مغربی علوم کو وہ اپنے لیے طاقت سمجھ کر حاصل کرتے۔ وہ ان کو خود اپنی چیز سمجھتے نہ کہ غیر کی چیز۔ مگر یہاں دور جدید کے مسلم رہنما اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے۔ انھوں نے بیک وقت مغرب سے بھی نفرت کی اور مغربی علوم سے بھی۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے دور جدید میں مسلمانوں کو سائنس میں پیچھے کر دیا۔ مسلم رہنماؤں نے ایک لمحہ کی غلطی کی تھی مگر اس کا نتیجہ مسلم قوم کو صدیوں کی شکل میں بھگتنا پڑا:

یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت شعور کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مسلمانوں نے جب صلیبی جنگوں میں مغربی اقوام پر فتح حاصل کی تو وہ فتح کے جوش میں مبتلا ہو گئے۔ اس جوش نے انھیں سائنس کی تحقیق سے غافل کر دیا۔ اس کے بعد موجودہ زمانہ میں یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ مسلمان مغربی قوموں کے مقابلہ میں مفتوح ہوئے تو ان کے اندر مغربی اقوام کے خلاف نفرت جاگ اٹھی۔ وہ نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہو کر مغربی سائنس کی طرف سے بے رغبت ہو گئے۔ مسلمان اپنی بے شعوری کے نتیجہ میں فاتح کی حیثیت سے بھی نقصان میں رہے اور مفتوح کی حیثیت سے بھی۔

حصہ دوم

جدید انسان ایک عجیب مشکل (Dilemma) سے دوچار ہے۔ اس کے پاس ٹکنالوجی ہے مگر کے پاس فلسفۂ حیات نہیں۔ اس کے پاس جسمانی سفر کے لیے مشین ہے مگر اس کے پاس روحانی سفر کے عقیدہ نہیں۔ یہی جدید انسان کا اصل مسئلہ ہے۔ برٹرینڈرسل (۱۸۷۲ - ۱۹۷۰) نے اس موضوع پر گو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم بجلی کے بارہ میں کیا جاننا چاہتے ہیں۔ صرف یہ کہ اس کو ہم کس طرح لیے کارآمد بنائیں۔ اس سے زیادہ جاننے کی خواہش بے فائدہ مابعد الطبیعیات میں چھلانگ لگانے ہم معنی ہے:

> What do we want to know about electricity? Only how to make it work for us. To want to know more is to plunge into useless metaphysics.
>
> *The Impact of Science on Society*, p. 93

ینڈرسل اور اس کے جیسے دوسرے بے شمار لوگوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ صرف "بجلی کیا ہے" کے سوال ینا چاہتے ہیں اور "بجلی کیوں ہے" کے سوال کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر انسانی فطرت اس ت پر راضی نہیں۔ انسان اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ بجلی کو عملاً استعمال کرنے کے ساتھ کی حقیقت کو بھی جاننا چاہیے۔ یہ ایک ایسا لازمی سوال ہے جس سے اپنے آپ کو خالی کرنا کسی ان کے لیے ممکن نہیں۔

نظریاتی سوالات کا جواب معلوم کیے بغیر بھی بجلی ہمارے کارخانوں کو چلاتی ہے اور ہمارے شہروں روشن کر رہی ہے۔ مگر انسانی فطرت اس سے انکار کرتی ہے کہ وہ یہیں ٹھہر جائے۔ وہ بجلی کو استعمال کرے بجلی کی حقیقت کو جاننا نہ چاہے۔ آدمی عین اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ "بجلی کیا ہے" کے سوال ساتھ "بجلی کیوں ہے" کے سوال پر بھی غور کرے۔

اسی دوسری چیز کا نام عقیدہ ہے اور انسان عقیدہ (Faith) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ید انسان کی اصل کمزوری یہی ہے کہ اس نے عقیدہ کو کھو دیا ہے۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے جائے کہ آج صحیح اور سچا عقیدہ صرف اسلام ہے تو یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ آج کے انسان کو سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اسلام ہے۔

سائنسی معیار

دورِ جدید کا مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جو دورِ جدید کے معیار پر پورا اتر سکے۔ اس لیے اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جس کو دورِ جدید کا مذہب کہنا باعتبار حقیقت درست ہو۔ موجودہ دور سائنسی دور ہے۔ موجودہ دور میں انسان ہر چیز کو سائنسی معیار پر جانچتا ہے۔ جو چیز سائنسی معیار پر پوری اترے اس کو وہ مان لیتا ہے اور جو چیز سائنسی معیار پر پوری نہ اترے اس کو وہ رد کر دیتا ہے۔

ابتداءً ہر مذہب سچا مذہب تھا۔ مگر بعد کو ہونے والی انسانی ملاوٹوں کے نتیجہ میں مذاہب اس قابل نہ رہے کہ وہ سائنس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔ جب کہ اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ اور اس بنا پر وہ سائنسی معیار پر صد فی صد پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام موجودہ زمانہ میں بلامقابلہ کامیابی کی پوزیشن میں ہے، بشرطیکہ اسے جدید انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

سائنسی معیار کیا ہے اور غیر سائنسی معیار کیا، اس کو سمجھنے کے لیے ایک سادہ سی مثال لیجئے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے برٹرینڈرسل نے لکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ حقیقت وہ ہے جو مشاہدہ کے ذریعہ معلوم ہو نہ کہ وہ جس کو محض قدیم سندوں کی بنا پر مان لیا جائے۔ مگر یہ مکمل طور پر ایک جدید تصور ہے جو سترھویں صدی سے پہلے بمشکل اپنا وجود رکھتا تھا۔ ارسطو نے دعویٰ کیا کہ عورتوں کے دانت مردوں سے کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کی شادی دوبار ہوئی تھی، اس کو کبھی یہ خیال نہ آسکا کہ اس بیان کی تصدیق اپنی بیویوں کے منہ کو دیکھ کر کرے:

> To modern educated people, it seems obvious that matters of fact are to be ascertained by observation, not by consulting ancient authorities. But this is an entirely modern conception, which hardly existed before the seventeenth century. Aristotle maintained that women have fewer teeth than men; although he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wives' mouths.
>
> B. Russell, *The Impact of Science on Society* p. 17

مذکورہ مثال کے مطابق سائنسی معیار واقعاتی معیار ہے۔ اور غیر سائنسی معیار قیاسی معیار۔ ارسطو نے محض قیاس کی بنیاد پر یہ مان لیا کہ عورت کے منہ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔ اس نے عورت کو

کم تر درجہ کی مخلوق فرض کیا۔ اس لیے اس نے قیاس کیا کہ عورت جب کم تر درجہ کی مخلوق ہے تو اس کے منہ میں دانت بھی نسبتاً کم ہونے چاہئیں۔ اس کے برعکس برٹرینڈ رسل کا ذہن دور جدید میں بنا ہے جو ہر چیز کا واقعاتی تجزیہ چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے کہا کہ قیاس کی بنیاد پر مت مانو بلکہ عورت اور مرد دونوں کا منہ کھول کر ان کے دانت کو گنو اور پھر دیکھو کہ دونوں کے دانت برابر ہیں یا ایک دوسرے سے کم ہیں۔

قدیم زمانہ قیاسی معیار پر باتوں کو ماننے کا زمانہ تھا۔ اس لیے قدیم زمانہ میں یہ ممکن تھا کہ جو مذہب بھی رائج ہو اس کو قیاسی مفروضات کی بنا پر درست مان لیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں آدمی کسی بات کو صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ اس سے متعلق تمام حقائق کا تجزیہ کر کے وہ اس کی معقولیت کو بالواسطہ یا براہِ راست طور پر جان چکا ہو۔

یہ وہ معیار ہے جس کو منطبق کرنے کے بعد دوسرے تمام مذاہب اپنے آپ رد ہو جاتے ہیں اس کے بعد صرف اسلام باقی رہتا ہے جو سائنسی معیار پر پورا اترے۔

مذہب توحید

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے اس میں مکمل وحدت ہے۔ پوری کائنات یکساں قسم کے قانون کے تحت نظر آتی ہے۔

ایک برطانی سائنس داں پروفیسر آئن راکس برگ (Ian Roxburg) کائنات کیوں اس قدر یکساں ہے (Why is the universe so uniform?) کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزا میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کیے گئے ہیں وہ حکمی اعداد پر مشتمل ہیں، جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے حکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لیے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔ پروفیسر آئن راکس برگ کے اصل الفاظ یہ ہیں:

The universe is astonishingly uniform. No matter which way we look, the universe has the same constituents in the same proportions. The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. But these turn out to be the same in all places at all times. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? Or must these numbers have the particular uniform value we observe for the Universe to exist?"

Sunday Times (London) December 4, 1977

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ کائناتِ وحدت ہے۔ ایسی کائنات میں صرف توحید کا تصور فٹ بیٹھتا ہے۔ شرک کا تصور سائنسی کائنات کے ساتھ کسی طرح ہم آہنگ نہیں۔

اب مختلف مذاہب کو دیکھئے تو تمام مذاہب مشرکانہ عقائد پر مبنی نظر آتے ہیں۔ پارسی کائنات میں دو خدا مانتے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک خدا کی تعداد تین ہے، ہندو ازم میں خداؤں کی تعداد کم سے ۳۲ اور زیادہ سے زیادہ ۳۳ کروڑ بتائی گئی ہے۔ افریقہ کے قبائلی مذاہب میں ہر چیز خدا ہے، صرف ایک انسان ہے جو اس خدائی میں شامل نہیں وغیرہ۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نہایت واضح اور قطعی طور پر اس بات کا مبلغ ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ یہاں ایک اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔

اسلام اور دوسرے مذاہب کے اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جدید سائنسی دنیا میں جو مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے وہ صرف اسلام ہے جو خالص توحید کا مذہب ہے۔ دوسرے تمام مذاہب جدید سائنسی دنیا میں غیر مطابق ہو کر رہ گئے ہیں کیوں کہ وہ شرک کی تعلیم دیتے ہیں اور شرک کا اصول جدید سائنس کی دریافت کردہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔

مشرکانہ مذاہب

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب مشرکانہ مذاہب ہیں۔ مشرکانہ مذاہب میں فطرت کے مظاہر کو خدا کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور ان کو مقدس سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ شرک دراصل مظاہر فطرت کی پرستش ہی کا دوسرا نام ہے۔

موجودہ زمانہ میں فطرت کے ان مظاہر کی نہایت تفصیلی تحقیق کی گئی ہے۔ ان کے بارے میں قطعی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ یہ معلومات ان مظاہر فطرت کی خدائی کو بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندو ازم میں چاند کو دیوتا مانا گیا ہے۔ ہندو عقیدہ رکھنے والے لوگ

قدیم ترین زمانہ سے چاند کو پوجتے چلے آرہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں چاند کی علمی تحقیق کی گئی۔ دوربینوں سے اس کا مشاہدہ کیا گیا۔ چاند کی مٹی کو زمین پر لاکر لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کیا گیا۔ حتی کہ ستمبر ۱۹۵۹ میں روس کا راکٹ چاند پر اتر گیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۶۹ میں امریکی خلاباز نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر اپنے قدم رکھ دیئے۔ اس طرح آخری طور پر معلوم ہو گیا کہ چاند کوئی دیوتائی چیز نہیں ہے۔ وہ محض ریت اور پتھر کا ایک مجموعہ ہے۔

اب ظاہر ہے کہ وہ دین آج کے انسان کا دین قرار پائے گا جو سورج اور چاند کو دیوتا بتا کر اسے پوجنے کے لیے کہتا ہے یا وہ دین جو انسان سے یہ کہہ رہا ہے کہ سورج اور چاند کی پرستش نہ کرو بلکہ تم اس خدا کی پرستش کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے (لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن، حم السجدہ ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی دور میں چاند کی معبودانہ حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ آج کا ایک شخص جو چاند کے بارے میں جدید سائنسی نقطۂ نظر پر یقین رکھتا ہو وہ اسی کے ساتھ ان مذاہب پر یقین نہیں رکھ سکتا جو چاند کو دیوتا بتاتے ہیں۔ مگر اسلام کے ساتھ یہ مشکل نہیں۔ کیوں کہ اسلام چاند کو اور اسی طرح دوسرے اجرام سماوی کو مخلوق بتاتا ہے نہ کہ خالق اور معبود۔

مذہبی سادگی

اسلام کی ایک خصوصیت اس کی فطری سادگی ہے جو جدید سائنسی ذہن کے عین مطابق ہے۔ جدید انسان کا ذہن نیچر کے مطالعہ سے بنا ہے۔ اس لیے نیچر میں جو سادگی ہے وہی سادگی جدید ذہن کے لیے بھی پسندیدہ چیز بن گئی ہے۔ جدید ذہن کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس میں فطری سادگی ہو۔ جو مذہب فطری سادگی سے خالی ہو وہ جدید ذہن کے لیے قابل قبول بھی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب فطری سادگی سے محروم ہو چکے ہیں، نظریاتی سادگی سے بھی اور عملی سادگی سے بھی۔

موجودہ مسیحیت جس فلسفیانہ عقیدہ پر قائم ہے وہ تثلیث ہے یعنی تین میں ایک، ایک میں تین۔ ریاضیاتی طور پر یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ کوئی چیز بیک وقت ایک بھی ہو اور اسی کے ساتھ تین بھی۔ اس سلسلہ میں ایک دل چسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک عیسائی پروفیسر سے

پوچھا گیا کہ تثلیث (Trinity) کا مطلب کیا ہے۔ پروفیسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا :

If you ask me I don't know, if you don't ask I know.

یہودیت ایک اور اعتبار سے غیر سادگی کا منظر پیش کرتی ہے۔ موجودہ بائبل میں عبادت اور قربانی کے مراسم (Rituals) اتنے زیادہ بتائے گیے ہیں کہ عام انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام مراسم کی پابندی کرتے ہوئے عبادت اور قربانی کر سکے۔

بائبل کے باب کے باب اس قسم کے جزئی مراسم کی تفصیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں :

احبار (Leviticus)

گنتی (Numbers)

اس کے مقابلہ میں اسلام کی عبادت ظاہری رسمیات سے بالکل خالی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی عبادت ایک انتہائی سادہ عمل کا نام ہے۔ سر ایڈورڈ ڈینی سن راس (E. Denison Ross) نے اسلام کی فطری سادگی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ اسلامی عقیدہ کی سادگی غالباً اسلام کی اشاعت میں زیادہ بڑا عامل تھی بمقابلہ غازیوں کی تلوار کے :

The simplicity of Islamic creed was probably a more potent factor in the spread of Islam than the sword of Ghazis.
Introduction of George Sale's translation of the Quran p. VII

اسلام کی یہ سادگی جس نے قدیم زمانہ میں بے شمار انسانوں کو اسلام کی طرف راغب کیا اس کی وہی سادگی مزید اضافہ کے ساتھ جدید انسان کے لیے کشش کا باعث ہے۔ جدید انسان کا فطرت پسند ذہن اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں اپنی حقیقی تسکین نہیں پا سکتا۔

درمیانی واسطہ نہیں

جدید انسان کا ایک خاص ذوق یہ ہے کہ وہ حقیقتوں سے براہِ راست طور پر مربوط ہونا چاہتا ہے۔ موجودہ سائنسی دنیا میں وہ تمام چیزوں سے براہِ راست ربط قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس لیے بالکل فطری بات ہے کہ وہ خدا سے بھی براہِ راست مربوط ہونا چاہے۔ آج کا انسان میکرو کاسمک

ورلڈ (ستاروں اور سیاروں کی دنیا) کو اپنی دور بینوں کے ذریعہ براہ راست دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ مائکرو کاسمک ورلڈ (بیکٹیریا اور مالیکیول کی دنیا) کو اپنی خورد بینوں کے ذریعہ براہ راست دیکھ رہا ہے۔ ان تجربات سے اس کا جو ذہن بنتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ حقائق کا براہ راست تجربہ کرے۔

اس اعتبار سے بھی اسلام ہی واحد مذہب ہے جو جدید ذہن کو اپیل کرنے والا ہے۔ دیگر تمام مذاہب میں خدا اور انسان کے درمیان واسطے مقرر ہو گئے ہیں۔ کسی مذہب میں مذہبی پیشواؤں کا واسطہ کسی مذہب میں روحوں کا واسطہ، کسی مذہب میں خدا کے بیٹے اور خدا کے فرشتوں کا واسطہ، وغیرہ۔

جدید انسان خدا سے براہِ راست مربوط ہونا چاہتا ہے لیکن دیگر مذاہب اس کو صرف بالواسطہ انداز سے مربوط ہونے کا راستہ دکھاتے ہیں۔

آج کی دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو خدا سے براہِ راست مربوط ہونے کا طریقہ بتا رہا ہے۔ اسلام کے نزدیک بندے اور خدا کے درمیان ربط قائم ہونے کے لیے کسی تیسرے واسطہ کی ضرورت نہیں۔ آدمی جس وقت چاہے خدا کی طرف متوجہ ہو اور وہ اپنے آپ کو خدا کے ربط (Contact) میں پالے گا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

اور جب میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں تو میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔

تاریخی معیار

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آئے ان میں سے دو پیغمبر حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ تھے۔ ان دونوں پیغمبروں کا تعلق مصر کی تاریخ سے ہے۔ اس بنا پر جب بھی ان دونوں پیغمبروں کا ذکر آتا ہے تو قدرتی طور پر مصر کی تاریخ بھی اس سے وابستہ ہو جاتی ہے۔

ان دونوں پیغمبروں کا ذکر بائبل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی۔ بائبل جب حضرت یوسفؑ کا ذکر کرتی ہے تو ان کے زمانہ کے بادشاہ کا نام وہ فرعون (Pharoah) بتاتی ہے۔ اسی طرح بائبل میں جہاں موسیٰؑ کا ذکر ہے وہاں بھی ان کے ہم عصر بادشاہ کا نام فرعون بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل کے نزدیک حضرت یوسف کے زمانہ میں جو بادشاہ مصر پر حکومت کر رہا تھا وہ بھی فرعون تھا

اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جو بادشاہ مصر پر حکومت کر رہا تھا وہ بھی فرعون تھا۔

یہ بات جدید تحقیقات سے غلط ثابت ہوئی ہے۔ جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں ان لوگوں کی حکومت تھی جن کو چرواہے بادشاہ (Hyksos kings) کہا جاتا ہے یہ لوگ اصلاً مصری نہ تھے بلکہ عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ باہر سے آکر مصر میں اسی طرح حکمران بن گئے جس طرح انگریز ہندستان میں ایک عرصہ تک حکمراں رہے۔ چرواہے بادشاہوں کا یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر پندرھویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر کے اقتدار پر قابض رہا۔ حضرت یوسف کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک یہ خاندان مصر پر حکمران رہا۔ اس کے بعد مصر میں ان کے خلاف بغاوت ہوئی۔ ان کو مصر سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ ایک مصری خاندان کی حکومت قائم ہوئی یہی مصری خاندان ہے جس کے بادشاہوں نے سب سے پہلے فرعون (Pharoah) کا لقب اختیار کیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بائبل کا بیان جدید تاریخی تحقیقات سے ٹکرا رہا ہے، بائبل حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ دونوں پیغمبروں کے ہم عصر بادشاہوں کو فرعون کہتی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فرعون صرف حضرت موسیٰ کے ہم عصر بادشاہ کا لقب تھا نہ کہ حضرت یوسف کے ہم عصر بادشاہ کا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل جدید تاریخی معیار کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایک شخص بائبل کو مانے تو اس کو تاریخ کو رد کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ تاریخ کی تحقیق کو ملنے تو اس کی نظر میں بائبل ناقابل اعتبار قرار پائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید انسان مجبور ہے کہ وہ بائبل کو نہ مانے، الّا یہ کہ وہ اپنے سائنسی ذہن سے دست بردار ہو جائے۔

مگر قرآن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن میں حضرت یوسف کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر ہے اور حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر۔ مگر قرآن انتہائی بامعنی طور پر دونوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس نے حضرت یوسف کے ہم عصر بادشاہ کے لیے عزیز کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی حکمراں یا ذی اقتدار کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن جب حضرت موسیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہاں وہ ان کے ہم عصر بادشاہ کو واضح طور پر فرعون کہتا ہے۔ گویا قرآن کے نزدیک حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ دوسرا تھا اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ دوسرا۔

اس طرح قرآن مکمل طور پر یہ اہلیت رکھتا ہے کہ وہ جدید علم کا سامنا کرسکے۔ کیوں کہ جدید علمی یقات اور قرآن کا بیان دونوں کامل طور پر ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ یہاں آدمی کو یہ ضرورت یں کہ وہ قرآن کو ماننے کے لیے جدید علم کو چھوڑنے پر مجبور ہو۔ یا جدید علم کو ماننا اس کے لیے رف اس وقت ممکن ہو جب کہ وہ قرآن سے دست بردار ہو جائے۔

اسلام کی برتری

مریم جمیلہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ وہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اسلام قبول کرنے ے بعد انھوں نے مسلم ممالک کا سفر کیا۔ بالآخر ایک پاکستانی مسلمان سے شادی کرلی اور اب وہ پاکستان میں مقیم ہیں ن کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اسلام مغرب کے مقابلہ میں (Islam Versus The West) اس کتاب میں ہ اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں میں نے ایک مضمون لیا جو "یہودیت اسلام میں" کہا جاتا تھا۔ میرا ربی پروفیسر پنے طلبہ کو، جو سب کے سب یہودی ہوتے تھے، اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اسلام کا ماخذ یہودیت ہے ماری نصابی کتاب میں قرآن کی ایک ایک آیت کو لے کر دکھایا گیا تھا کہ کس طرح وہ یہودی ذرائع علم پر مبنی ہے۔ پروفیسر ے لکچر کے ساتھ ہم کو ایسے فلم اور سلائڈ بھی دکھائے جاتے تھے جن میں صہیونیت اور یہودی ریاست کی تعریف ہوتی۔ گرچہ پروفیسر کا حقیقی مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اسلام پر یہودیت کی برتری ثابت کرے مگر میرے اوپر اس کا اثر بالکل لٹا پڑا۔

جیسے جیسے میں نے قدیم عہد نامہ اور قرآن کا گہرا مطالعہ کیا، دونوں کا تضاد مجھ پر نمایاں ہوتا چلا گیا۔ ایک معنی میں قدیم عہد نامہ صرف یہودیوں کی تاریخ تھی جو خدا کے چنے ہوئے لوگ تھے۔ قرآن اگرچہ عربی زبان میں ایک رب پیغمبر پر اترا، اس کا پیغام ایک عالمی پیغام ہے جو تمام نسل انسانی کو خطاب کرتا ہے۔ جب میرے پروفیسر نے بتایا کہ فلسطین پر یہودیوں کا خدائی حق ہمیشہ سے یہودی شریعت کا مرکزی جزء رہا ہے تو مجھے خدا کے اس تنگ نظر عقیدہ سے بہت دھکا لگا۔

کیا قرآن یہ نہیں کہتا کہ: پورب پچھم سب خدا کے ہیں، تم جدھر بھی رخ کرو ادھر خدا تمہارے لیے موجود ہوگا۔ کیا پیغمبر اسلام نے نہیں کہا کہ تمام زمین خدا کی مسجد ہے۔ صہیونیت کہتی ہے کہ یہودیوں کا وطن صرف فلسطین ہے، دوسری جگہ وہ جلا وطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے پروفیسر کا دعویٰ کہ یہودی صرف فلسطین میں رہ کر انسانی تہذیب میں اپنا حصہ ادا کرسکتے ہیں بے بنیاد نظر آتا ہے، جب اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ حضرت موسیٰ پر وحی مصر میں آئی۔ تالمود کے انتہائی اہم حصے اس سرزمین میں لکھے گئے جو آج عراق کہا جاتا ہے (صفحہ ۳۴)

اسلام اتنا برحق مذہب ہے کہ دوسرے مذہبوں سے اس کا سادہ تقابل ہی اس کی برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بائبل ایک قوم کی قومی تاریخ معلوم ہوتی ہے جب کہ قرآن میں عالمی انسانی پیغام ملتا ہے۔ یہودیت کے نزدیک سارا تقدس بس فلسطین کی سرزمین میں ہے جب کہ اسلام کہتا ہے کہ ساری زمین خدا کی زمین ہے۔ یہودیت کے مطابق ان کے مذہب اور فلسطین کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا جب کہ خود حضرت موسیٰ کو خدا نے فلسطین سے باہر خطاب کیا اور یہودیوں کی مقدس مذہبی کتاب فلسطین کے باہر مرتب کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اتنا کامل اور اتنا برحق دین ہے کہ دوسروں کے سامنے صرف اس کو سادہ صورت میں پیش کر دینا کافی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کی اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

جدید تقاضا

موجودہ زمانہ کے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ آج کے انسان کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس کی تعلیمات عالمی ہوں اور جس کا فکر عقلیت پر مبنی ہو :

Universal in content and rational in thought

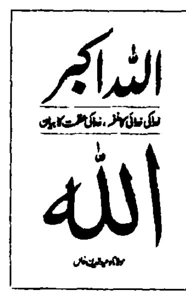
مذکورہ مفکر کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ یہ دونوں صفات آج صرف اسلام کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرا کوئی مذہب نہیں جو دور جدید کے اس معیار پر پورا اترے۔

اسلام اپنی ابتدائی ربانی شکل میں آج بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب کا حال یہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں ان کے اندر انسانی آمیزش ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی آفاقیت بھی کھو دی اور اسی کے ساتھ اپنی عقلیت بھی۔ انسان کی محدودیت نے خدائی مذہب میں شامل ہو کر خدائی مذہب کو بھی محدود کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں انسان اور انسان کے درمیان تفریق پائی جاتی ہے۔ چوں کہ لوگوں کے درمیان تفریق اور امتیاز موجود تھا، انھوں نے اپنی اس عملی حالت کو نظریاتی جواز فراہم کرنے کے لیے اس کو ایک مذہبی چیز بنایا اور پھر اس کو اپنی مذہبی کتابوں میں داخل کر دیا۔ مذاہب میں بادشاہ اور رعایا کی تقسیم، آزاد اور غلام کی تقسیم، کالے اور گورے کی تقسیم، اونچی ذات اور نیچی ذات کی تقسیم، امیر اور غریب کی تقسیم، مذہبی پیشوا اور عام انسان کی تقسیم ـــــ یہ تمام چیزیں اسی تاریخی غلطی کا نتیجہ ہیں۔

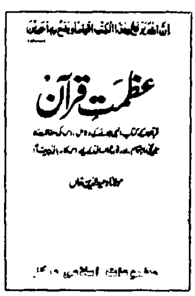
یہی معاملہ عقلیت کا بھی ہے۔ انسان کی عقل محدود ہے۔ وہ حد بندیوں میں رہ کر سوچتی ہے
لام کے سوا ہر مذہب میں ایسا ہوا کہ بعد کے زمانہ میں اس کے ماننے والوں نے اپنی عقل سے اس
ں اضافے کیے۔ ان اضافوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی کلام کے ساتھ انسانی کلام شامل ہو گیا۔ اس
ح اس کی ابدیت ختم ہو گئی۔ جو چیز ماضی میں عقلی نظر آتی تھی وہ بعد کے زمانہ میں غیر عقلی
کر رہ گئی۔

اب مذاہب کی فہرست میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں
وظ رہنے کی وجہ سے ان دونوں صفتوں کو اپنے اندر برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں آفاقیت بھی مکمل
پر ہے اور عقلیت بھی مکمل طور پر۔



خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے۔ کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک ایسی دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو ہلا دیتی ہے۔ وہ ایک ناقابلِ بیان ربانی نور میں نہا اٹھتا ہے، وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا عمل اور اس کی تمام کارروائیاں ایک ایسے انسان کی کارروائیاں بن جاتی ہیں جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

ہدیہ : ۴۰ روپیہ
۳۰ روپیہ (رعایتی اڈیشن)



قرآن اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ وہ اُسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا تھا۔ ان خصوصیات نے قرآن کے پیغام کو اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دُنیا کے سامنے اپنی اصلی شکل میں لایا جائے گا وہ اقوامِ عالم کو مسخر کر لے گا۔

ہدیہ : ۲۵ روپیہ
۱۸ روپیہ (رعایتی اڈیشن)

خط وکتابت

چیف جسٹس کا ریمارک

محمد احمد۔ شاہ بانو کیس (کریمنل اپیل نمبر ۱۰۳۔ ۱۹۸۱۔ مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۸۵) میں فیصلہ دیتے ہوئے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس وائی۔ وی۔ چندرا چوڑ نے ایک خصوصی نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں وہ کہتے ہیں کہ عام دیوانی اور فوجداری قانون کے تحت کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں یہ سماج کے ایک بڑے حصہ کے لیے دوررس اہمیت کے حامل ہیں جو کہ روایتی طور پر غیر منصفانہ سلوک کا شکار رہا ہے۔ عورتیں اسی قسم کا ایک حصہ ہیں۔ قانون ساز منو نے کہا کہ عورت آزادی کی مستحق نہیں۔ اور اسلام پر یہ الزام ہے کہ اس کا ایک تباہ کن پہلو عورت کو کمتر درجہ دینا ہے۔ پیغمبر اسلام کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے، امید افزا طور پر غلطی سے، کہ عورت ایک ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ اس لیے تم اپنی بیویوں سے نرم سلوک کرو:

> Some questions which arise under the ordinary civil and criminal law are of a far-reaching significance to large segments of society which have been traditionally subjected to unjust treatment. Women are one such segment. "Na stree swatantramarhati" said Manu, the law giver: The woman does not deserve independence. And, it is alleged that the 'fatal point in Islam is the degradation of woman'. To the Prophet is ascribed the statement, hopefully wrongly, that 'Woman was made from a crooked rib, and if you try to bend it straight, it will break; therefore treat your wives kindly.

واضح ہو کہ چیف جسٹس صاحب کی مذکورہ عبارت میں "امید افزا طور پر غلطی سے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موصوف کے نزدیک پیغمبر کی طرف اس قول کو منسوب کرنا غلط ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر نے اگرچہ یہ کہا ہے کہ عورت "ٹیڑھی پسلی" سے پیدا کی گئی ہے۔ مگر جو لوگ عورت

ر مرد کے درمیان برابری قائم کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ہمارے لیے امید کا پہلو یہ ہے کہ پیغمبر کا یہ ارشاد بطور واقعہ درست نہیں۔ چیف جسٹس کے اس فقرہ کا مقصد "بیان" کی تردید ہے نہ کہ خود "انتساب" کی تردید۔

ایک چیف جسٹس کا یہ ریمارک خالص قانونی اعتبار سے کس حد تک باموقع ہے۔ اس کے بارہ میں کوئی قانون داں ہی قطعی رائے دے سکتا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ خالص علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

چیف جسٹس صاحب نے پیغمبر اسلام کا یہ قول اس دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے کہ اسلام سماج کے ایک طبقہ (عورت) کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کی حمایت کرتا ہے۔ حالاں کہ مذکورہ قول اس کے برعکس، عورت کے ساتھ منصفانہ سلوک کی تاکید کر رہا ہے۔ محترم چیف جسٹس کا ریمارک منو کے قول کے لیے تو ضرور درست ہے۔ مگر وہ پیغمبر اسلام کے قول پر بالکل صادق نہیں آتا۔

مذکورہ قولِ رسول میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ عورت کے ساتھ نرمی (خیر) کا سلوک کرو۔ پھر اس حدیث کے بارہ میں کس طرح یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک یا کمتر درجہ کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے (جیسا کہ منو کے حوالے میں پایا جاتا ہے)

جہاں تک عورت کے پسلی کی مانند ہونے کا تعلق ہے، وہ عورت کے ساتھ بہتر سلوک کی توجیہہ کے طور پر ہے نہ کہ بہتر سلوک کی تردید کے طور پر۔ اس کے بارہ میں اوپر یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ محض ایک مثال ہے۔ عورت کی مخصوص نفسیات کی بنا پر اس کے معاملہ کو پسلی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس سے نرم سلوک کرو۔ اگر تم عورت کے ساتھ سخت سلوک کرو گے تو یہ عورت کی فطرت کے مطابق نہ ہوگا، اس سے بگاڑ پیدا ہوگا نہ کہ اصلاح۔

خلاصہ

سورہ نساء کی آیت (خلق منہا زوجہا) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس جنس سے آدم کو بنایا، اسی جنس سے اس نے آدم کے جوڑے (حوا) کو بھی بنایا تاکہ دونوں میں موافقت رہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ دونوں دو الگ الگ جنس ہوتے، مثلاً ایک آگ سے بنایا جاتا اور دوسرا مٹی سے، تو دونوں کے درمیان باہمی توافق نہ ہوتا۔ پھر نہ خاندانی زندگی میں سکون پایا جاتا اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ دونوں

مل کر مشترک جدوجہد سے تمدن کی تعمیر کریں۔

حدیث (ضلع) میں عورتوں کے بارے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا مقصد تمثیل کی زبان میں یہ بتانا ہے کہ عورتوں کی مخصوص فطری ساخت کی بنا پر ضروری ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار مختلف انداز سے یہ نصیحت فرمائی ہے اور خود اپنی پوری زندگی میں اس کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں رات کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ نماز کی اقامت کا بہت خاص اہتمام فرماتے تھے، لیکن خواتین کے ساتھ آپ کی رعایت کا یہ حال تھا کہ نماز میں اگر کبھی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ نماز کو جلد ختم کر دیتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

انی لاقوم فی الصلوٰۃ ارید ان اطول فیھا فاسمع بکاء الصبیّ فاتجوز فی صلاتی کراھیۃ ان اشق علیٰ اُمّہ	میں مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ اس کو لمبا کروں، پھر میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اس اندیشہ کی بنا پر کہ میں اس کی ماں کو تکلیف دوں گا۔
(بخاری، کتاب الصلوٰۃ)	

حدیثِ رسول میں عورت کو پسلی (ضلع) سے تشبیہ دینا ایک سادہ سی بات ہے۔ اس معاملہ میں جو شبہات پیدا ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کو بائبل کے بیان سے جوڑ دیا گیا۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا بائبل کے بیان سے کوئی تعلق نہیں۔ حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ ایک فطری حقیقت ہے جس کو دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مثلاً میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا کہ عورتوں پر دل کی دلیل کام کرتی ہے نہ کہ دماغ کی:

With women the heart argues, not the mind.

خط وکتابت

اوپر ہم نے وہ ریمارک نقل کیا ہے جو ہندستانی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر چندر اچوڑ نے اس معاملہ میں محمد احمد۔ شاہ بانو کیس پر فیصلہ صادر کرتے ہوئے دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم نے سابق چیف جسٹس صاحب کو ایک خط روانہ کیا تھا۔ اس خط کا عکس اگلے صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

جیساکہ پچھلی بحث سے واضح ہے ۔ چیف جسٹس صاحب کا یہ ریمارک خالص علمی اعتبار سے سراسر بے بنیاد ہے ۔ مگر اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ موصوف کو جب بذریعہ خط توجہ دلائی گئی تو انھوں نے اس کا جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرلی ۔ پہلی بار یہ خط انھیں ۱۷ اپریل ۱۹۸۶ کو بذریعہ رجسٹری روانہ کیا گیا تھا۔ جب کوئی جواب موصول نہ ہوا تو دوبارہ یہی خط ۱۴ مئی ۱۹۸۶ کو انھیں بھیجا گیا ۔ پھر بھی انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بار بار ٹیلی فون کرنے کے بعد بھی کوئی کامیابی نہ ہوسکی ۔ ٹیلی فون پر ان سے کہا گیا کہ آپ ملاقات کا وقت دیدیں تاکہ ہم خود گفتگو کے لیے آپ کے یہاں حاضر ہوسکیں ۔ مگر انھوں نے ملاقات کا وقت دینے سے معذوری ظاہر کی۔ مجبوراً اب یہ خط اس طرح شائع کیا جارہا ہے کہ اس کے ساتھ جسٹس موصوف کا جواب شامل نہیں ۔

دوسروں پر حکم لگانے کے لیے ہر آدمی باانصاف ہے۔ مگر جب خود اپنے آپ پر حکم لگا ہو تو ہر آدمی بے انصاف بن جاتا ہے ۔

الرسالہ ہندی

لوگوں کی طرف سے مسلسل تقاضا ہوتا رہا ہے کہ الرسالہ کا ہندی اڈیشن نکالا جائے ۔ اللہ کے بھروسہ پر اس کے انتظامات کیے جارہے ہیں ۔ قارئین الرسالہ اور اصحاب ایجنسی اپنی اپنی طلب سے مطلع فرمائیں ۔ الرسالہ ہندی انشاء اللہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہوگا ۔

منیجر الرسالہ

بسم الله الرحمن الرحيم

المركز الإسلامي

THE ISLAMIC CENTRE

Mr. Y. V. Chandrachud
Ex-Chief Justice
A-503, Som Vihar
R. K. Puram
New Delhi - 110 022

May 14, 1986

Dear Mr. Chandrachud,

I am taking the liberty of addressing myself to you because on going through your verdict on the Mohammed Ahmed-Shah Bano case, I find that one of the statements you make casts unfair aspersions on Islam. You allege that women have been 'traditionally' subjected to unjust treatment, and that the 'fatal point in Islam is the degradation of woman'. To support this, you quote Manu as having stated that woman did not "deserve independence", and the Prophet of Islam as having said, "Woman was made from a crooked rib, and, if you try to bend it straight it will break; therefore, treat your wives kindly."

While Manu's statement bears out your statement, I must point out that you have badly misquoted the Prophet. Nowhere in the Hadith is it stated that woman was made from a crooked rib, this being an ancient Biblical version of God's creation of human life. The word 'rib' was used by the Prophet in a purely metaphorical sense and his actual words were : "Woman is like a rib, if you try to straighten her out, it will break, so treat her kindly."

The Encyclopaedia Brittanica states : "With respect to personality traits, men are characterised by greater aggressiveness, dominance and achievement motivation, women by greater dependency, a stronger social orientation and the tendency to be more easily discouraged by failure than men (19/907)."

Presumably the Prophet, with his great understanding of human nature, had a fine intuitive grasp of the fundamental biological and psychological differences between men and women, particularly the latters' fragility and passivity - and, for this reason, found it necessary to admonish lesser men to treat wives kindly.

I fail to see how "the degradation of women" can ensue from such an injunction.

It would only be fitting, to say the least, if you were now to retract, or amend, your statement, now that this point has been clarified.

I remain,

Yours faithfully

Wahiduddin

Wahiduddin Khan
President

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110013 (India) Telephone 611128

تعمیرِ ملت

مکان بنانے کا کام بنیاد سے شروع ہوتا ہے
اور
قوم بنانے کا کام شعور بنانے سے۔
ماہنامہ الرسالہ قوم کی تعمیر کا یہی بنیادی کام کر رہا ہے۔
وہ افرادِ قوم کا شعور بنانے میں مصروف ہے۔
اس مہم میں ساتھ دینا ایک تاریخ ساز مہم میں ساتھ دینا ہے۔
الرسالہ کو پڑھیے
الرسالہ کو پڑھائیے
اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے جس میں آپ کو لگنا چاہیے۔
یہی آج کی سب سے بڑی مہم ہے جس میں آپ کو ساتھ دینا چاہیے۔
قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجیے

خبر نامہ اسلامی مرکز ۔ ۲۱

۱۔ ۵ مئی ۱۹۸۶ کو شیخ عمر بن عبد العزیز العثمان (ریاض، سعودی عرب) اسلامی مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال کیا۔ وہ مرکز کی عربی مطبوعات پڑھ چکے ہیں۔ وہ اسلامی مرکز کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کی ترقی کے لیے دعائیں دیں۔

۲۔ تذکیر القرآن جلد دوم کے بارے میں بار بار استفسار آتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اس کا سخت انتظار ہے۔ اس سلسلہ میں مطلع کیا جاتا ہے کہ تذکیر القرآن جلد دوم کی تحریر اور کتابت دونوں ساتھ ساتھ جاری ہے۔ ایک کاتب مستقل طور پر تذکیر القرآن ہی کا کام کر رہے ہیں۔ تحریر کا کام ۲۸ ویں پارہ تک پہونچ گیا ہے۔ انشاء اللہ ۱۹۸۶ میں دوسری جلد مکمل ہو کر شائع ہو جائے گی۔ پوری تفسیر دو جلدوں میں ہو گی۔

۳۔ اطلاع ملی ہے کہ ایک انگریز نوجوان نے الرسالہ (انگریزی) کو پڑھ کر اسلام قبول کر لیا ہے اس سلسلہ میں ہم کو جو خط ملا ہے اس کا ایک حصہ یہاں دیا جا رہا ہے:

Here is a piece of good news. Malcolm Oates from England who has been staying in Suat, and sometimes with us here in Peshawar, has accepted Islam and his name is now Abdul Malik. Before taking this decision, at the beginning of April 1986, (I do not have the exact date but think it was 7th April, 1986, i.e. 26 Rajab). *Al-Risala* (English) was the only literature he had read on Islam. He started reading it in October 1985. Since then, he has read an article from *Al-Risala* every day. He made a point of never missing a single reading. He found the articles easy reading because they were short, compelling, and to-the-point. His decision to accept Islam came, while I was away. On my return yesterday, I asked him about the factors which had made him make the Islamic way of life his own. His reply was, "A friend of mine gave me *Al-Risala*, which I read with an open mind. I found it very interesting, because I was reading about Islam for the first time. It was well-edited, and well-presented ... It shows that every experience, every bit of knowledge, is useful." One of the most impressive facts he learnt about Islam was that its Holy Book — The Quran — is preserved in its original state. "I like the fact that it hasn't been altered," he said. "The fact that it is original is very important. If someone else wanted to know about Islam, I would give him the same magazines as you gave me (i.e. *Al-Risala*). They are up-to-date, in modern language, and the examples given are relevant to life today." I hope this news has made you as happy and encouraged as it has made me.

۴۔ تذکیر القرآن کو لوگوں نے پڑھ کر سنانے کے لیے بہت موزوں پایا ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ سے اطلاع مل رہی ہے کہ مسجدوں میں روزانہ تذکیر القرآن پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔

۵۔ "تعبیر کی غلطی" کی کتابت مکمل ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہو کر آجائے گا۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۳ میں چھپا تھا۔

۶۔ بمبئی سے اطلاع ملی ہے کہ درج ذیل ادارہ نے یہ انتظام کیا ہے کہ ماہنامہ الرسالہ اور الرسالہ کیسٹ اور مکتبہ الرسالہ کی تمام مطبوعات وہاں سے مل سکتی ہیں۔ کتب فروش اور دیگر حضرات اس پتہ پر رجوع فرمائیں:

کلثوم کتاب گھر، ۹ باندرا جامع مسجد۔ مولانا بابالین۔ (آف ایس وی روڈ) باندرا۔ بمبئی ۵۰۔ ٹیلی فون نمبر ۶۴۲۵۲۰۱۔

۷۔ "انسان اپنے آپ کو پہچان" کا ہندی ترجمہ مکمل ہوگیا ہے اور اس وقت پریس میں ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد چھپ کر آجائے گا۔

۸۔ "سنت رسول" کے موضوع پر کیسٹ زیر تیاری ہے۔ جلد ہی اس کی روانگی شروع ہو جائے گی۔ انشاء اللہ

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے ... کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز



عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحیدالدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ	ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ	سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی	۲۵ ڈالر امریکی	۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں

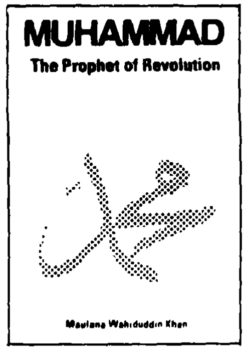
الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

July 1986
Number 116



MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحیدالدین خان
صدر اسلامی مرکز

کسی کو ستانا بہت بڑا جرم ہے اور اس سے بھی
زیادہ بڑا جرم یہ ہے کہ کسی کو ناحق ستایا جائے

اگست ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۷

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمت قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۷ اگست ۱۹۸۶

فہرست

مومن و منافق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں۔ وہ بُری بات کی تعلیم دیتے ہیں اور بھلی بات سے روکتے ہیں (التوبہ ۶۷) دوسری طرف ارشاد ہوا ہے کہ اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں، وہ بھلی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بُری باتوں سے روکتے ہیں (التوبہ ۷۱) اس بات کو لفظ بدل کر کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ منافق کا منافق کے ساتھ جوڑ بیٹھتا ہے اور مومن کا مومن کے ساتھ جوڑ بیٹھتا ہے۔ اِن کا مزاج اِن سے ملتا ہے اور اُن کا مزاج اُن سے ملتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ منافق کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ، جب کہ مومن کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے وہی اس کی زبان پر ہوتا ہے۔ منافق کی دلچسپی دنیا اور دنیا کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اور مومن کی دلچسپی خدا اور آخرت سے۔ منافق اپنے آپ کو کسی اصول کا پابند نہیں سمجھتا، جب کہ مومن پورے معنوں میں ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ منافق اپنے کو نمایاں کرکے خوش ہوتا ہے اور مومن کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ وہ تواضع کا رویہ اختیار کرے۔ منافق اپنے معمولی فائدے کی خاطر حقیقت کا انکار کر دیتا ہے، جب کہ مومن اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ حقیقت کا انکار کرے۔ منافق کی لذت غیر سنجیدہ چیزوں میں ہوتی ہے اور مومن کی لذت صرف سنجیدہ چیزوں میں۔ منافق ہمیشہ مصنوعی باتیں کرتا ہے اور مومن ہمیشہ سچی باتیں۔

سوچ اور مزاج کا یہ فرق مومن اور منافق کے درمیان زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھی نہیں بن پاتے۔ ان کا ایک دوسرے سے نباہ نہیں ہوتا۔ مومن مومن سے یا منافق منافق سے جڑے تو ہم مزاج ہونے کی وجہ سے دونوں کا جوڑ بیٹھ جائے گا۔ مگر جب جڑنے والوں میں ایک مومن ہو اور دوسرا منافق تو ان کا مزاجی اختلاف انھیں ایک دوسرے سے متوحش کر دے گا۔ وقتی ملاقات ہو تب بھی انھیں ایک دوسرے سے خوشی حاصل نہ ہوگی۔ مستقل رشتہ قائم ہو تب بھی دونوں کے درمیان اس کا نبھنا سخت دشوار ہو جائے گا۔

مومن اور منافق بظاہر ایک طرح کے ہوتے ہیں مگر مزاج کا فرق دونوں میں اتنا فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک اگر مشرق کا مسافر بن جاتا ہے تو دوسرا مغرب کا مسافر۔

فریضۂ شہادت

موجودہ دنیا میں امت محمدؐ کا اصل منصبی فریضہ شہادت علی الناس ہے ۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ انتم شہداء اللہ فی الارض (تم لوگ زمین پر اللہ کے گواہ ہو)

قرآن کے مختلف مقامات کو ملا کر دیکھنے سے شہادت کا جو مفہوم متعین ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں انسان کو آزمائش کے لیے رکھا ہے، اس بات کی آزمائش کے لیے کہ وہ حق کا اعتراف کرتا ہے یا نہیں ۔ اور اپنی زندگی کو حق کے مطابق ڈھالتا ہے یا نہیں ۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں ، یہ انتہائی سنگین بات ہے ۔ کیوں کہ اسی کی بنیاد پر آخرت میں انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے ۔ اسی امتحان کی بنیاد پر کچھ لوگ ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے اور کچھ لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے ۔

اس عمل کا دوسرا نام دعوت اور تبلیغ ہے ۔ اس کو شہادت (گواہی) اس لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کے دعاۃ آخرت میں خدا کے شہدار (گواہ) ہوں گے ۔ جن خدا کے بندوں نے دنیا میں خدا کے سچے دین سے لوگوں کو باخبر کیا ہوگا وہی آخرت کی عدالت میں قوموں کے اوپر گواہ بن کر کھڑے ہوں گے اور بتائیں گے کہ دعوتِ حق کا ردعمل کس نے اقرار کی صورت میں پیش کیا اور کس نے انکار کی صورت میں ۔

نصرت اور غلبہ کا وعدہ جو امت مسلمہ سے کیا گیا ہے وہ تمام تر اسی عمل کی ادائیگی پر موقوف ہے ۔ مسلمان کارِ شہادت انجام دیں تو وہ دنیا میں سربلند ہوں گے ۔ اور اگر وہ کارِ شہادت انجام نہ دیں تو کوئی چیز انھیں ذلت اور ناکامی سے بچا نہیں سکتی ۔

کسی آدمی کی زندگی کا جو مقصد ہو اسی کے لحاظ سے اس کا پورا کردار بنتا ہے ۔ مسلمان اگر دل سے یہ سمجھیں کہ ان کا اصل کام قوموں کے اوپر خدا کے دین کی گواہی دینا ہے تو ان کا پورا رویہ بدل جائے گا ۔ اس کے سوا دوسری تمام باتیں انھیں غیر متعلق نظر آنے لگیں گی ۔ دوسری قوموں سے وہ اپنے دنیوی جھگڑے ختم کر دیں گے ۔ وہ چاہیں گے کہ یک طرفہ نقصان اٹھا کر دوسری قوموں سے معتدل تعلقات قائم کریں تاکہ انھیں خدا کے دین پر سنجیدہ غور و فکر کے لیے آمادہ کر سکیں ۔

لگاتار عمل

کمیونسٹ چین کے سابق چیرمین ماؤزے تنگ نے ایک دلچسپ چینی کہانی لکھی ہے۔

پرانے زمانے میں چین کے شمالی علاقہ میں ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا۔ اس کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی۔ اس بوڑھے آدمی کی مشکل یہ تھی کہ اس کے دروازے کے سامنے دو اونچے اونچے پہاڑ کھڑے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے سورج کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہونچتی تھیں ایک دن اس بوڑھے آدمی نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر یہاں سے ہٹا دیں تاکہ سورج کی کرنیں ہمارے گھر میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکیں۔ بوڑھے آدمی کے پڑوسی کو اس کا یہ منصوبہ معلوم ہوا تو وہ اس پر ہنسا۔ اس نے اس بوڑھے آدمی سے کہا: میں یہ جانتا کہ تم ایک بے وقوف آدمی ہو لیکن مجھے یہ گمان نہ تھا کہ تم اتنا زیادہ بے عقل ہو گے۔ آخر یہ کیسے ممکن کہ تم اپنی کھدائی کے ذریعہ ان اونچے پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دو۔

بوڑھے آدمی نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا: تمہارا کہنا درست ہے۔ لیکن اگر میں مر تو اس کے بعد میرے بیٹے اس کو کھودیں گے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے، اور پھر ان کے مر کے بعد ان کے بیٹے۔ اس طرح کھدائی کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ تم جانتے ہو کہ پہاڑ آئندہ او زیادہ بڑے نہیں ہو جائیں گے۔ ہر مزید کھدائی ان کے حجم کو کم کرتی رہے گی۔ اس طرح آج کے دن نہ تو کسی اگلے دن یہ مصیبت ہمارے گھر کے سامنے سے دور ہو چکی ہو گی۔

یہ کہانی بہت خوبصورتی کے ساتھ بتا رہی ہے کہ بڑی کامیابی کے لیے ہمیشہ بڑا منصوبہ درکا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو بڑے منصوبہ کے لیے تیار رہنا چاہیے اور ان تمام تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے جو ایک بڑے منصوبہ کو مسلسل چلانے کے لیے ضروری

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسائل کے مقابلہ میں ان کے حل کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ مسائل محدود ہوتے ہیں اور حل ہمیشہ لامحدود۔ اگر آپ حل کی اسکیم کو نسل در نسل چلا سکیں تو آپ ہر پہاڑ کو کا سکتے ہیں اور ہر دریا کو عبور کر سکتے ہیں۔ جو شخص لگاتار عمل کرنے کے لیے تیار ہو اس کے لیے کوئی پہ پہاڑ نہیں اور کوئی دریا دریا نہیں۔

دور کا راستہ

ترقی یافتہ ملکوں میں ٹیلی فون کا نظام نہایت معیاری ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر ترقی یافتہ ملکوں میں اگرچہ ہر جگہ ٹیلی فون ہے مگر اس کا نظام درست نہیں۔ مثلاً ہندستان میں اگر آپ مقامی ٹیلی فون کریں یا ایک شہر سے دوسرے شہر بات کریں تو طرح طرح کی خرابیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ دہلی سے لندن کے کسی نمبر پر ڈائل کریں تو آپ کو فوراً لائن مل جائے گی اور نہایت صاف طور پر گفتگو ہو سکے گی۔

اس سلسلہ میں افریقہ کا ایک لطیفہ اخبار میں نظر سے گزرا۔ افریقہ کے ایک ملک میں کسی عورت نے گوشت کی مقامی دکان پر ٹیلی فون کرنا چاہا۔ کافی دیر تک کوشش کرنے کے باوجود اس کو نمبر نہیں ملا۔ اس عورت کی ماں لندن میں رہتی تھی۔ اس کے بعد اس نے لندن کے ٹیلی فون پر اپنی ماں کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر اس کو فوراً مل گیا۔ اپنی ماں سے بات کرتے ہوئے مذکورہ عورت نے ضمناً کہا کہ وہ گوشت منگوانے کے لیے ایک گھنٹے سے گوشت کی دکان پر ٹیلی فون ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ربط قائم نہ ہو سکا۔ اس کی ماں نے کہا کہ اچھا میں یہاں سے ملاتی ہوں۔ چنانچہ اس کی ماں نے لندن سے افریقہ کی گوشت کی دکان کا ٹیلی فون نمبر ملایا۔ نمبر بلا تاخیر مل گیا۔ افریقہ کی گوشت کی دکان کو جو پیغام مقامی ٹیلی فون سے نہیں پہونچ سکا تھا۔ وہ لندن کے ٹیلی فون سے پہونچ گیا۔

یہ لطیفہ زندگی کی ایک حقیقت کو بتا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ——— کبھی دور کا راستہ عملاً زیادہ قریب ہوتا ہے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ منزل پر پہونچنے کے لیے مختصر راستہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ اپنے مطلوبہ نتیجہ کو حاصل کرنے کے لیے وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو بظاہر جلد نتیجہ کو سامنے لانے والا ہو۔ مگر منزل تک جلد پہونچنے کے لیے صرف "راستہ" کو دیکھنا کافی نہیں ہے بلکہ "سواری" کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ نتیجہ کو جلد حاصل کرنے کا تعلق صرف ظاہری اسباب سے نہیں ہے بلکہ بہت سے ان دوسرے اسباب سے ہے جو دکھائی نہیں دیتے۔

کبھی دور کا راستہ زیادہ قریب ہوتا ہے اور قریب کا راستہ زیادہ دور بن جاتا ہے۔

اور تالا کھل گیا

اس کی ناکام کوشش اب جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ کافی دیر سے تالے کے سا زور آزمائی کر رہا تھا۔ "کنجی تو بظاہر صحیح ہے۔ یقیناً تالے کے اندر کوئی خرابی ہے جس کی وجہ سے تا کھل نہیں رہا ہے" اس نے سوچا۔ اس کا غصہ اب اس درجہ پر پہونچ چکا تھا کہ اگلا مرحلہ صرف یہ تھ کہ تالا کھولنے کے لیے وہ کنجی کے بجائے ہتھوڑے کا استعمال شروع کر دے۔

اتنے میں اس کے میزبان رفیق احمد صاحب آگیے۔ "کیا تالا نہیں کھل رہا ہے" انھوں نے کنجی اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "اچھا آپ کنجی غلط لگا رہے تھے۔ اصل میں آج ہی میں نے اس کا تالا بدل دیا ہے۔ مگر میں نئی کنجی چھلے میں ڈالنا بھول گیا۔ اس کی کنجی دوسری ہے۔" اس کے بعد انھوں نے جیب سے دوسری کنجی نکالی اور دم بھر میں تالا کھل چکا تھا۔

زمانہ جب بدلتا ہے تو ایسا ہی حال ان لوگوں کا ہو جاتا ہے جو ماضی کی صلاحیت کی بنیاد پر حال کی دنیا میں اپنی قیمت وصول کرنا چاہیں۔ نئے زمانہ میں زندگی کے دروازوں کے تمام تالے بدل چکے ہو ہیں۔ مگر وہ پرانی کنجیوں کا گچھا لیے ہوئے نئے تالوں کے ساتھ زور آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ اور جب ان کی پرانی کنجیوں سے نئے تالے نہیں کھلتے تو کبھی تالا بنانے والے پر اور کبھی سارے ماحول پر خفا ہوتے ہیں۔ حالاں کہ جب تالے بدل چکے ہوں تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ پرانی کنجیوں سے نئے تالے کھل جائیں۔

حقیقت نگاری کے دور میں جذباتی تقریریں اور تحریریں، اہلیت کی بنا پر حقوق حاصل کر کے دور میں رزرویشن کے مطالبے، تعمیری استحکام کے ذریعہ اوپر اٹھنے کے دور میں جلسوں او جلوسوں کے ذریعہ قوم کا مستقبل برآمد کرنے کی کوشش، سماجی بنیادوں کی اہمیت کے زمانہ میں سیاسی سودے بازی کے ذریعہ ترقی کے منصوبے، یہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔ یہ ماضی کے معیاروں حال کی دنیا سے اپنے لیے زندگی کا حق وصول کرنا ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کا انجا موجودہ دنیا میں صرف یہ ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہو کر رہ جائیں۔ جو کچھ ان کو بربنائے حق نہیں ملا ہے اس کو سمجھیں کہ وہ بربنائے ظلم ان کو نہیں مل رہا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے منفی ذہنیت کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

اعتبار پیدا کیجئے

ایک آدمی نے کاروبار شروع کیا۔ اس کے پاس مشکل سے چند سو روپے تھے۔ وہ کپڑے کے ٹکڑے خرید کر لاتا اور پھیری کر کے اس کو فروخت کرتا۔ کچھ کام بڑھا تو اس نے ایک دکان والے سے اجازت لے کر اس کی دکان کے سامنے پٹری پر بیٹھنا شروع کر دیا۔

کپڑے کے جس تھوک فروش سے وہ کپڑا خریدتا تھا اس سے اس نے نہایت اصول کا معاملہ کیا۔ دھیرے دھیرے اس تھوک فروش کو اس آدمی کے اوپر اعتبار ہو گیا۔ وہ اس کو ادھار کپڑا دینے لگا۔ جب آدمی ادھار پر کپڑے لاتا تو اس کی کوشش رہتی کہ وعدہ سے کچھ پہلے ہی اس کی ادائگی کر دے۔

وہ اسی طرح کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تھوک فروش کی نظر میں اس کا اعتبار بہت بڑھ گیا۔ اب وہ اس کو اور زیادہ کپڑے ادھار دینے لگا۔ چند سال میں یہ نوبت آگئی کہ تھوک فروش اس کو پچاس ہزار اور ایک لاکھ روپے کا کپڑا بے تکلف دیدیتا۔ وہ اس کو اس طرح مال دینے لگا جیسے کہ وہ اس کے ہاتھ نقد فروخت کر رہا ہو۔

اب آدمی کا کام اتنا بڑھ چکا تھا کہ اس نے ایک دکان لے لی۔ دکان بھی اس نے نہایت اصول کے ساتھ چلائی۔ وہ تیزی سے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شہر میں کپڑے کے بڑے دکانداروں میں شمار کیا جانے لگا۔

اس دنیا میں سب سے بڑی دولت روپیہ نہیں، اس دنیا میں سب سے بڑی دولت اعتبار ہے۔ اعتبار کی بنیاد پر آپ اسی طرح کوئی چیز لے سکتے ہیں جس طرح نوٹ کی بنیاد پر کوئی شخص بازار سے سامان خریدتا ہے۔ اعتبار ہر چیز کا بدل ہے۔

مگر اعتبار زبانی دعووں سے قائم نہیں ہوتا اور نہ اعتبار ایک دن میں حاصل ہوتا ہے۔ اعتبار قائم ہونے کی صرف ایک ہی بنیاد ہے اور وہ حقیقی عمل ہے۔ خارجی دنیا اس معاملہ میں انتہائی حد تک بے رحم ہے۔ لمبی مدت تک بے داغ عمل پیش کرنے کے بعد ہی وہ وقت آتا ہے کہ لوگ آپ کے اوپر وہ اعتبار قائم کریں جو اعتبار مذکورہ تھوک فروش نے ایک پھیری والے کے اوپر قائم کیا تھا۔

خودکشی نہیں

پاکستان کے (ریٹائرڈ) جنرل عتیق الرحمٰن آج کل پاکستان فیڈرل سروس کمیشن کے صدر ہیں۔ وہ ایک "مہاجر" ہیں اور دوسری جنگِ عظیم میں فیلڈ مارشل مانک شاہ کے ساتھ برما میں کام کر چکے ہیں۔

فروری ۱۹۸۴ میں جنرل رحمان ایک سرکاری دورہ پر نئی دہلی آئے۔ ایک اخباری ملاقات میں انھوں نے کہا کہ برما کے زمانۂ قیام میں ایک بار مانک شاہ شدید طور پر زخمی ہوگئے۔ تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی تو مانک شاہ نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیں۔ انھوں نے جنرل رحمان سے ایک پستول مانگا۔ جنرل عتیق الرحمٰن نے پستول دینے سے انکار کر دیا۔ جنرل رحمان نے قہقہہ کے ساتھ کہا، مانک شاہ نے ۱۹۷۱ کی جنگ میں ہمارے ساتھ جو کچھ کیا، اگر اس کو میں اس وقت جانتا تو یقیناً میں اپنا پستول انھیں دیدیتا (ٹائمس آف انڈیا ۲۰ فروری ۱۹۸۴)

مانک شاہ دوسری عالمی جنگ میں مایوس ہو کر خودکشی کر رہے تھے، حالانکہ اس کے ۲۵ سال بعد ۱۹۷۱ کی جنگ میں وہ فاتح بن کر نمایاں ہونے والے تھے۔

اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ کیوں کہ خودکشی خدا سے کامل مایوسی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ آخرت سے انکار کے ہم معنی ہے۔ اگر آدمی کو یہ یقین ہو کہ مرنے کے بعد وہ ختم نہیں ہوگا بلکہ دوبارہ زندہ ہو کر آخرت کی دنیا میں پہونچ جائے گا تو وہ کبھی خودکشی نہ کرے۔ جس شخص کو آخرت کے مسئلہ کی سنگینی کا احساس ہو اس کے لیے ہر دوسری تکلیف ہیچ بن جائے گی۔

اسی کے ساتھ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ خودکشی کو حرام قرار دینا گویا انسان کو یہ پیغام دینا ہے کہ —— وقتی تکلیف سے گھبرا کر مستقبل کو نہ بھول جاؤ۔

موجودہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر انسان پر غم اور تکلیف کا لمحہ آتا ہے۔ مگر ایسے لمحات ہمیشہ وقتی ہوتے ہیں۔ اگر آدمی اس لمحے کو برداشت کر لے تو اس کو بہت جلد معلوم ہوتا ہے کہ "تاریک حال" میں اس کے لیے ایک "روشن مستقبل" کا امکان چھپا ہوا تھا۔ وہ شکست خوردہ ہو کر اپنے کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ حالاں کہ مستقبل اس انتظار میں تھا کہ اس کا نام فاتح کی حیثیت سے تاریخِ عالم میں درج کرے۔

فرد کی سطح پر

ایک شخص بائیسکل پر سفر کر رہا تھا۔ اچانک اس کا بریک جام ہو گیا۔ وہ اتر کر سائیکل ساز کے پاس گیا۔ مسافر کا خیال تھا کہ جس مقام پر اس کا بریک جام ہوا ہے، سائیکل ساز اسی مقام پر ہاتھ لگا کر اس کو درست کرے گا۔ مگر سائیکل ساز نے ہتھوڑی لی اور بالکل دوسرے مقام پر ٹھونکنا شروع کر دیا۔ مسافر ابھی اپنی حیرت کا اظہار بھی نہیں کر پایا تھا کہ مستری نے کہا "بس ٹھیک ہے، لے جائیے" اگلے لمحہ سائیکل اپنے مسافر کو لیے ہوئے دوبارہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ظاہری اسباب کو دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ خرابی یہاں ہے۔ وہ اسی مقام پر ٹھونک پیٹ شروع کر دیتا ہے۔ مگر خرابی دور نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خرابی کی اصل جڑ کہیں اور ہوتی ہے اور جب تک اصل جڑ کی اصلاح نہ کی جائے، خرابی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

مثلاً قوم کے اندر اتحاد نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ لوگ آپس کے اختلاف میں غیروں سے مل جاتے ہیں۔ ان کی کوئی اجتماعی آواز نہیں ہے، وغیرہ۔ ان مظاہر کو دیکھ کر ایک شخص کے اندر کچھ کرنے کا جذبہ اٹھتا ہے اور وہ فوراً اجتماع اور کنونشن کی اصطلاحات میں سوچنے لگتا ہے۔ اس کو کام یہ نظر آتا ہے کہ قوم کے افراد کو جمع کر کے پُرجوش تقریریں کی جائیں۔ رزولیوشن پاس کیے جائیں۔ وغیرہ۔

مگر یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ یہ گویا علامتوں پر محنت کرنا ہے۔ حالاں کہ اصلی حل یہ ہے کہ سبب پر محنت کی جائے۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسئلہ بظاہر کہیں اور پیدا ہوتا ہے اور اس کے حل کا راز کہیں اور ہوتا ہے۔ مثلاً قوم کے اندر اگر اتحاد نہیں ہے تو اس کا سبب افراد کی بے اتحادی ہوگی۔ ایسی حالت میں آپ "اتحاد کانفرنس" کر کے لوگوں کے اندر اتحاد پیدا نہیں کر سکتے۔ پہلے فرد کی سطح پر اتحاد پیدا کیجیے۔ اس کے بعد قوم کی سطح پر اپنے آپ اتحاد پیدا ہو جائے گا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں "پھل" پر محنت کرنے والے کو پھل نہیں ملتا۔ یہاں پھل صرف وہ شخص پاتا ہے جس نے "بیج" پر محنت کرنے کا ثبوت دیا ہو۔

اُلٹا نتیجہ

سبھاش ایک ڈاکو تھا جو ڈاکہ زنی کے ۲۰ واقعات میں ماخوذ تھا۔ پولس نے اس کو زندہ یا مردہ پکڑنے
ندرہ ہزار روپیہ نقد انعام کا اعلان کیا تھا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۸۳ کا واقعہ ہے۔ دہلی کی ایک پولیس پارٹی اپنے پیٹا ڈور پر انکم ٹیکس آفس کے پاس
ے پر تھی۔ اس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک سفید فیئٹ کار آرہی ہے۔ پولیس کی گاڑی کے قریب آکر اچانک
نے یوٹرن (U-Turn) لیا۔ یعنی گھوم کر پیچھے کی طرف واپس ہوگئی۔ پولیس والوں کو شبہہ ہوا اور
وں نے کار کا پیچھا کیا۔ پولیس کی گاڑی جب بالکل قریب پہونچ گئی تو کار کے مسافروں نے پولیس کی
ی پر فائرنگ شروع کر دی۔

اب پولیس پارٹی کو یقین ہوگیا کہ اس کے اندر کوئی مجرم بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ پولیس والوں نے
جواب میں کار کے اوپر فائر کیے۔ مگر کار آگے کی طرف بھاگتی رہی اور بالآخر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔
م اسی شام کو شاہدرہ اسپتال کے قریب ایک لاش سڑک پر پڑی ہوئی ملی۔ یہ مذکورہ ڈاکو سبھاش
لاش تھی۔ پولیس کی گولیوں سے زخمی ہو کر وہ جلد ہی مرگیا تو اس کے بقیہ چار ساتھیوں نے اس کو
سے نکال کر باہر سڑک پر پھینک دیا اور خود آگے کی طرف روانہ ہوگیے (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس
دسمبر ۱۹۸۳)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی بچاؤ کا اقدام الٹا پڑتا ہے۔ سفید کار والے اگر
ول کے مطابق اپنے راستہ سے گزر گیے ہوتے تو ممکن تھا کہ وہ پولیس کی زد سے بچ جاتے۔ مگر جب انھوں
نے اپنے بچاؤ کے لیے جارحانہ اقدام کیا تو وہ ہلاکت کے منہ میں جا پڑے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کی سوجھ بوجھ کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ جس مخالف
ز کو دیکھیں اس سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں وہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس دنیا میں
میاب ہونے کے لیے کبھی مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور کبھی اعراض کرنا پڑتا ہے۔ کبھی سامنے کی سڑک سے چلنا ہوتا
ہے اور کبھی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی دائیں یا بائیں سے کترا کر آگے بڑھ جائے۔ یہ دنیا ہوش مندی کا امتحان
ہے، یہاں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو اس نازک امتحان میں پورا اترے۔

اسلامی خلافت

تمہید

اسلام میں کچھ چیزیں مقصد ہیں اور کچھ چیزوں کی حیثیت ذمہ داری کی ہے۔ مثلاً خدا کا شکر ایک مقصدی نوعیت کی چیز ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر آدمی سے مقصد کے درجہ میں مطلوب ہے۔ ہر آدمی کو لازمی طور پر شکر گزار بننا ہے۔ اس کے برعکس مال کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مالی احکام اس وقت شروع ہوتے ہیں جب کہ آدمی مال دار ہو چکا ہو۔ جو شخص مال دار نہ ہو اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ ضرور اپنے آپ کو مالدار بنائے اور مال کے بارے میں جو اسلامی احکام ہیں ان کی تعمیل کرے۔

یہی وجہ ہے کہ دونوں کے لیے قرآن میں ایک دوسرے سے مختلف الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ شکر کے لیے قرآن میں یہ لفظ ہے کہ بل اللہ فاعبد وکن من الشاکرین (الزمر ۶۶) جب کہ مال کے لیے یہ نہیں فرمایا کہ مال دار بنو۔ بلکہ یہاں اس قسم کے الفاظ ہیں: ومما رزقناھم ینفقون (البقرہ ۳) یعنی پہلے معاملہ میں فرمایا کہ شکر گزار بنو۔ اور دوسرے معاملہ میں فرمایا کہ ہم نے ان کو جو مال دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ گویا شکر گزار تو آدمی کو ہر حال میں بننا ہے، جب کہ مال کے احکام کی تعمیل اس وقت کرنی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو مال دے دیا گیا ہو۔

سیاست وحکومت کی حیثیت بھی اسلام میں مقصد کی نہیں بلکہ ذمہ داری کی ہے۔ یعنی سیاست وحکومت وہ چیز نہیں کہ ہر آدمی اس کو اپنا نشانہ بنا کر اس کے لیے جدوجہد کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اللہ تعالیٰ خود اپنی مصلحتوں کے تحت کبھی کسی کو زمین میں با اقتدار بنا دیتا ہے اور کبھی کسی کو۔ اور جب کسی شخص یا قوم کو یہ عطیہ ملے تو اس وقت اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اقتدار کو ان احکام کے مطابق استعمال کرے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سیاست وحکومت کے لیے جو الفاظ آئے ہیں وہ اس سے مختلف ہیں جو مقصدی نوعیت کے احکام کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً عبادت کے لیے قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ واعبد ربك حتی یاتیك الیقین (اپنے رب کی عبادت کرو موت کے آنے تک) دوسری طرف سیاست وحکومت کے لیے اس قسم کے الفاظ آئے ہیں: الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا

الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر (وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکواۃ ادا کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے) الحج ۴۱

حکومت کا ذکر "اگر" کے لفظ کے ساتھ ہے اور عبادت کا ذکر "اگر" کے بغیر ہے۔ دونوں کی نوعیت میں یہ فرق نہ ہوتا تو عبادت کے لیے بھی اسی قسم کے الفاظ آتے کہ —— اگر ہم انھیں مسجد دیدیتے ہیں تو وہ ہماری عبادت کرتے ہیں۔

نظریہ سیاست کا ماخذ

سیاست کا ماخذ قرآن میں کیا ہے، اس کا جواب اکثر مسلم مفکرین نے یہ دیا ہے کہ اسلام کے نظریۂ سیاست کا ماخذ قرآن کی وہ آیت ہے جس میں انسانِ اول (آدم) کے "خلیفہ" ہونے کا ذکر ہے۔ یعنی اسلامی سیاست اسلامی خلافت کا دوسرا نام ہے۔ خلافت کی یہ آیت قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے:

واذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خليفة قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انی اعلم مالا تعلمون (البقرہ ۳۰)	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تو زمین میں اس کو بنائے گا جو فساد کرے اور خون بہائے، اور ہم حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ خدا نے کہا کہ میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔

خلیفہ کا لفظ فعیل کے وزن پر ہے۔ فعیل کے معنی وہی ہیں جو فاعلہ کے ہیں۔ ۃ اس میں مبالغہ کے لیے بڑھا دی گئی ہے۔ یہی معاملہ خلیفہ کا بھی ہے (تفسیر النسفی)

خَلَفَ یَخْلُفُ کے معنی عربی زبان میں ہیں: پیچھے آنا، جانشین ہونا، قائم مقام ہونا۔ قرآن میں ہے: فخلف من بعدهم خلف (الاعراف ۱۶۹) یعنی پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے جو .... اسی سے خلیفہ ہے۔ خلیفہ کے معنی ہیں جو کسی کی جگہ پر اس کے بعد آئے (من یخلف غیرہ) خلیفہ کے وہی معنی ہیں جو جانشین (Succressor) کے ہیں۔

خلیفہ کا ترجمہ بعض لوگوں نے نائب (Vicegerent) کیا ہے۔ مگر یہ ترجمہ لغت کے اعتبار

سے صحیح نہیں۔ استعمالِ عرب میں خلیفہ جانشین کے مفہوم میں آتا ہے۔ نائب کے مفہوم کے لیے کلامِ عرب میں کوئی نظیر موجود نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان اگر خلیفہ (جانشین) ہے تو وہ کسی کا خلیفہ ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ (خلیفۃ اللہ) ہے۔ مگر اس کا براہ راست ثبوت قرآن میں موجود نہیں۔ سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت میں جو لفظ ہے وہ "ایک خلیفہ" ہے نہ کہ "خدا کا خلیفہ"۔ اس کے علاوہ قرآن میں دوسری کوئی ایسی آیت موجود نہیں جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ کہا گیا ہو۔ اسی طرح احادیث کے ذخیرہ میں بھی کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ملتی جس میں صراحۃً انسان کے بارے میں خلیفۃ اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ قرآن اور حدیث میں انسان کے لیے عبد اللہ اور عباد اللہ کے الفاظ تو آئے ہیں مگر خلیفۃ اللہ یا خلائفُ اللہ کا لفظ کہیں بھی نہیں آیا۔ انسان اگر خلیفۃ اللہ ہو تو یہ اس کے بارے میں اہم ترین بات ہوگی۔ یہ ناقابلِ تصور بات ہے کہ اتنی اہم بات قرآن و حدیث میں غیر مذکور رہ جائے۔

نیز معنی کے اعتبار سے بھی یہ ایک مضحکہ خیز تاویل ہے۔ کیوں کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ انسان خدا کا جانشین ہو۔ اسی مشکل سے بچنے کے لیے مذکورہ حضرات نے خلیفہ کا ترجمہ جانشین کے بجائے نائب کیا ہے۔ مگر یہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ کلامِ عرب میں خلیفہ کا لفظ نائب کے لیے سرے سے نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان مخلوقات کا خلیفہ (جانشین) ہے نہ کہ خالق کا خلیفہ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی اور اس کے بعد اس پر جنوں کو آباد کیا۔ آدم کی تخلیق سے پہلے یہی جن زمین کے باشندے تھے۔ پھر جنوں نے زمین پر فساد کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کے اقتدار سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد آدم پیدا کیے گیے اور وہ زمین پر جن کی جگہ بسائے گیے۔ اس طرح آدم خلیفۃ الجن تھے نہ کہ خلیفۃ اللہ۔ وہ زمین پر جن کے بعد آئے نہ کہ نعوذ باللہ خدا کے بعد۔

ایک قوم کے بعد دوسری قوم

حضرت آدم کے بعد ان کی جو نسلیں زمین پر ایک کے بعد ایک آباد ہوئیں ان کو بھی قرآن میں خلیفہ یا خلفاء کہا گیا ہے۔ یہ نسلیں یا قومیں بھی خدا کی خلیفہ نہ تھیں بلکہ وہ ان پچھلی قوموں کی خلیفہ تھیں جن کے بعد وہ آئیں۔

سورہ الاعراف (رکوع ۱۰-۹) میں پچھلی قوموں کا ذکر ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے قوم ح کے بعد قوم عاد کو خلفار بنایا۔ اذجعلکم خلفاءَ من بعد قوم نوح) پھر قومِ عاد کے بعد قوم ثمود و خلفار بنایا اور اس کو زمین میں ٹھکانا (اذجعلکم خلفاء من بعد عاد و بوّاکم فی الارض)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومِ نوح کی ہلاکت کے بعد جب قومِ عاد اس کی جگہ آباد کی گئی تو وہ قومِ نوح لی خلیفہ (جانشین) تھی۔ اسی طرح قومِ عاد کو ہٹا کر جب قومِ ثمود کو زمین پر بسنے اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا گیا تو وہ گویا قومِ عاد کی خلیفہ (جانشین) تھی۔ اسی طرح قدیم ماضی سے لے کر اب تک ایک قوم کے بعد دوسری قوم ابھرتی ہے اور ہر اگلی قوم اپنی پچھلی قوم کی خلیفہ (جانشین) ہوتی ہے۔

خلافت ایک کے بعد دوسرے کے آنے کا نام ہے۔ خلافت کا لفظ دراصل خدا کے مقرر کیے ہوئے اصولِ تاریخ کو بتاتا ہے نہ کہ خدا کی نیابت یا خدا کی جانشینی کو۔ خلافت کا یہ سلسلہ زمین پر برابر جاری ہے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم آتی ہے اور وہ اپنا امتحان دے کر ختم ہو جاتی ہے یا پیچھے چلی جاتی ہے۔ اور پھر دوسری قوم پچھلی قوم کی خلیفہ (جانشین) بنائی جاتی ہے۔

اس طرح دنیا میں ایک کے بعد دوسری قوم کو کام کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔ مثلاً ہندستان میں مغل حکمراں سابق دیسی راجاؤں کے خلفار تھے۔ اس کے بعد انگریز مغلوں کے خلفار ہوئے۔ اور اب موجودہ ملکی حکمراں انگریزوں کے خلفار ہیں۔ وقِس علیٰ ھٰذا۔

قرآن میں واضح طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے خلیفہ کا لفظ آیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کس کے خلیفہ تھے۔ اس سلسلہ میں مفسرین نے اس کو پچھلے پیغمبروں کی خلافت کے معنی میں لیا ہے۔ اس اعتبار سے گویا حضرت داؤد خلیفۃ الانبیا تھے نہ کہ خلیفۃ اللہ (تفسیر نسفی) یعنی وہ بنی اسرائیل کے پچھلے نبیوں کے بعد ان کی جگہ آئے اور خدا کی طرف سے عائد کی ہوئی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔

خلیفہ کا لفظ انسان کی منصبی حیثیت کو نہیں بتاتا۔ وہ صرف زمین پر انسان کی آبادکاری کی تاریخی نوعیت کو بتاتا ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان زمین کے اوپر خدا کا نائب ہے اور اسے زمین پر وہ خدائی بادشاہی قائم کرنی ہے جو بقیہ کائنات میں خدا خود براہِ راست قائم کیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ زمین پر مختلف اشخاص اور مختلف قوموں کو ایک کے بعد ایک کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ یہ لفظ مخلوقات کے بارے میں اصولِ جانشینی کو بتاتا ہے نہ کہ خدا کے بارہ میں اصولِ نیابت کو۔

خلافت ایک خدائی عطیہ

قرآن کے مطابق خلافت خدا کا ایک عطیہ ہے۔ قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے کہ کہو کہ اے اللہ ملک کے مالک، تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے ملک لے لے۔ اور تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (آل عمران ۲۶)

خلافت وحکومت جس کو بھی ملتی ہے خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ خلیفہ بننے کا مطلب زمین میں تمکین و اقتدار کا ملنا ہے۔ تمکین و اقتدار سراسر خدا کا عطیہ ہے اور وہ عملاً خدا ہی کا عطیہ ہو سکتا ہے۔ تمکین و اقتدار کسی کو خالی جزیرہ میں نہیں ملتا۔ یہ مختلف قوموں اور گروہوں کے بالمقابل ایک چیز کو پانے کا نام ہے۔

انسان کی قوت اس سے بہت کم ہے کہ وہ دوسروں کو بے دخل کر کے خود اقتدار پر قبضہ کر سکے۔ تمکین و اقتدار کے حصول کے لیے اتنے زیادہ اسباب کی بیک وقت یکجائی درکار ہے کہ وہ تنہا کسی شخص یا قوم کے بس میں نہیں۔ یہ دراصل خدا ہے جو ایسے اسباب پیدا کرتا ہے جو ایک قوم کو تمکین و اقتدار کے مقام سے ہٹائیں اور اس کی جگہ دوسری قوم کو تمکین و اقتدار کا مقام عطا کریں۔

خلافت وحکومت کو عطا کرنے کا یہ فیصلہ خدا کی مختلف مصلحتوں کے تحت ہوتا ہے۔ قرآن میں ان کی بابت اشارات ملتے ہیں۔

مثلاً اس سلسلے میں ایک مصلحت امتحان ہے۔ یعنی ایک قوم کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو اختیار دینا تاکہ خدا دیکھے کہ وہ کس طرح عمل کرتی ہے (ثم جعلنٰکم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون، یونس ۱۴) دوسری مصلحت یہ ہے کہ کسی قوم کی صالحیت کی بنا پر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ احسان کا فیصلہ کرے اور اس بنا پر اس کو زمین کا اقتدار دیدے (ونرید ان نمنّ علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃً ونجعلھم الوارثین، القصص ۵) اسی طرح ایک مصلحت یہ ہے کہ زمین کو فساد سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسا کرے کہ وہ ایک قوم کے ذریعہ دوسری قوم کو میدان عمل سے ہٹا دے (ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض البقرہ ۲۵۱) وغیرہ۔

خلافت کے فرائض

خلیفہ کے فرائض کیا ہیں، اس کے بارہ میں قرآن کی حسب ذیل آیت واضح رہنمائی کرتی ہے:

وُد انا جعلناك خليفة فى الارض
ئكم بين الناس بالحق ولا تتبع
ى فيضلك عن سبيل الله ـ انّ
ـذين يضلون عن سبيل الله لهم
ا ب شديد بما نسوا يوم الحساب
(٢٦ ں

اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ کے راستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ روزِ حساب کو بھولے رہے۔

اس آیت میں تین باتیں کہی گئی ہیں ــــــ انصاف کے مطابق فیصلہ کرنا، خواہشِ نفس کی
وی نہ کرنا، اور حساب کے دن سے ڈرتے رہنا۔

مختصر لفظوں میں یہی وہ معیار ہے جس پر جانچ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون شخص صحیح اسلامی
بفہ ہے اور کون شخص صحیح اسلامی خلیفہ نہیں۔ صحیح اسلامی خلیفہ وہ ہے جس کے دل میں یہ ڈر
یا ہوا ہو کہ اس کو اپنے ہر قول اور فعل کا حساب خدا کو دینا ہے۔ ایسا شخص اپنی رائے اور خواہش
نہیں چلے گا بلکہ ہر معاملے میں وہ خدا کی مرضی کو جاننا چاہے گا اور جیسے ہی اس کو خدا کی ثابت شدہ مرضی
لوم ہوگی وہ فوراً اس کو پکڑ لے گا۔ کیوں کہ اس کا ذہن یہ کہے گا کہ اسی کو اختیار کر کے میں آخرت میں
ئد کی پکڑ سے بچ سکتا ہوں۔

یہی چیز ہے جو کسی حکمراں کو خلیفۂ حق بناتی ہے۔ اس کا ہر فیصلہ انصاف کا فیصلہ ہوتا ہے
راس کا ہر اقدام وہ صحیح اقدام ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا ایک واقعہ اسلامی خلافت کی نوعیت کو خوبی کے ساتھ واضح کرتی ہے:

ن عمر بن الخطاب انه سأل طلحة
ا الزبير وكعبًا وسلمان ما الخليفة
ن الملك فقال طلحة والزبير ما ندرى
فقال سلمان : الخليفة الذى يعدل

حضرت عمر فاروقؓ نے ایک بار حضرات طلحہ اور زبیر اور کعب اور سلمان سے سوال کیا کہ بادشاہ کے مقابلہ میں خلیفہ کون ہے۔ طلحہ اور زبیر نے کہا کہ ہم کو نہیں معلوم۔ حضرت سلمان نے کہا کہ

في الرعية ويقسم بينهم بالسوية ويشفق عليهم شفقة الرجل على اهله ـ ويقضي بكتاب الله ـ فقال كعب ماكنت احسب ان في المجلس احداً يعرف الخليفة من الملك غيري ـ

(التفسير المظہری، المجلد الثامن، صفحہ ۱۷۲)

خلیفہ وہ ہے جو رعایا کے اندر انصاف کرے اور جو ان کے درمیان برابری کے ساتھ تقسیم کرے۔ اور جو ان پر اس طرح مہربان ہو جس طرح آدمی اپنے گھر والوں پر مہربان ہوتا ہے۔ اور جو خدا کی کتاب سے فیصلہ کرے۔ حضرت کعب نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس مجلس میں میرے سوا کوئی اور بھی ہے جو بادشاہ کے مقابلہ میں خلیفہ کے فرق کو جانتا ہے۔

صحابی کی یہ تشریح نہایت واضح طور پر بتاتی ہے کہ خدا کے مطلوب خلیفہ کی خصوصیات کیا ہیں، اور وہ کیا چیز ہے جس سے حقیقی معنوں میں ایک اسلامی خلیفہ کی پہچان ہوتی ہے۔

اعلان

محمد ہاشم قاسمی کو ۱۹۸۳ میں اسلامی مرکز کی شاخ حیدرآباد کا مقامی سکریٹری بنایا گیا تھا۔ ان کو مرکز سے اور مرکز کی حیدرآباد شاخ سے علٰحدہ کر دیا گیا ہے۔ اب مرکز سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کوئی صاحب اسلامی مرکز یا مرکز کی حیدرآباد شاخ کے تعلق سے ان سے کوئی معاملہ نہ کریں۔ ان کے کسی معاملہ کی ذمہ داری اسلامی مرکز کے اوپر نہ ہوگی۔

وحیدالدین خاں
صدر اسلامی مرکز

جھوٹا نظریہ

موجودہ زمانہ کے ایک مفسر قرآن سورۃ محمد (آیت ۳۵) کے تحت اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"یہ ارشاد اس زمانہ میں فرمایا گیا ہے جب صرف مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں چند سو مہاجرین و انصار کی ایک مٹھی بھر جمعیت اسلام کی علم برداری کر رہی تھی اور اس کا مقابلہ محض قریش کے طاقتور قبیلہ ہی سے نہیں، بلکہ پورے ملک عرب کے کفار و مشرکین سے تھا۔ اس حالت میں فرمایا جا رہا ہے کہ ہمت ہار کر ان دشمنوں سے صلح کی درخواست نہ کرنے لگو، بلکہ سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کو کبھی صلح کی بات چیت کرنی ہی نہ چاہیے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں صلح کی سلسلہ جنبانی کرنا درست نہیں ہے جب اس کے معنی اپنی کمزوری کے اظہار کے ہوں اور اس سے دشمن اور زیادہ دلیر ہو جائیں۔ مسلمانوں کو پہلے اپنی طاقت کا لوہا منوا لینا چاہیے، اس کے بعد وہ صلح کی بات چیت کریں تو مضائقہ نہیں"

یہ نظریہ سراسر ناقابلِ عمل ہے اور اسی کے ساتھ غیر اسلامی بھی۔ مسلمان اگر صرف "مٹھی بھر" ہیں اور فریقِ ثانی عظیم طاقت کی حیثیت رکھتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ فریقِ ثانی سے لڑ کر اس سے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیں۔ ایسی حالت میں فریقِ ثانی سے لڑنا اس کو مزید دلیر کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ کیوں کہ اس عالم اسباب میں ایسے غیر متناسب مقابلہ کا نتیجہ لازمی طور پر شکست ہوتا ہے۔ اور شکست کا لازمی نتیجہ دشمن کو پہلے سے زیادہ دلیر بنا دینا۔

مکہ کے زمانۂ قیام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے دشمنوں نے ستایا۔ مگر آپ نے یہ نہیں کیا کہ "سر دھڑ کی بازی لگا کر" ان سے ٹکرا جائیں بلکہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گیے۔ اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپ کے مخالفین نے آپ سے غیر واجبی مطالبات کیے مگر آپ نے ان کے تمام مطالبات کو یک طرفہ طور پر مان کر ان سے صلح کر لی۔ مذکورہ تفسیر کو صحیح مانا جائے تو آپ کا یہ دونوں عمل دشمنوں کو دلیر کرنے کے ہم معنی قرار پائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ سراسر غلط ہے۔ جنگ ہو یا صلح دونوں سوچے سمجھے فیصلہ پر مبنی ہونا چاہیے اور یہ فیصلہ حالات کے تحت کیا جانا چاہیے نہ کہ مذکورہ بالا قسم کے کسی پُرجوش نظریہ کے تحت۔

حج کا عاطفی پہلو

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں (الذاریات ۵۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کا جذبہ انسان کے اندر تخلیقی طور پر شامل ہے۔ انسان کو نہ صرف یہ کہ ازروئے واقعہ خدا کی عبادت کرنا چاہیے بلکہ اس کی فطرت کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ وہ ایسا کرے۔ خدا کی عبادت خود انسان کی اپنی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی عبادت کے سوا کوئی چیز انسان کو حقیقی طور پر مطمئن نہیں کرتی: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)

جس طرح ایک چھوٹا بچہ مین اپنے اندرونی جذبہ کے تحت مجبور ہے کہ وہ اپنی ماں کی طرف لپکے۔ اسی طرح انسان مین اپنی اندرونی پکار کی بنا پر مجبور ہے کہ وہ خدا کی طرف دوڑے۔ انسان اپنی اندرونی شخصیت کو بدل نہیں سکتا۔ اس لیے وہ خدا کو بھی اپنے دل و دماغ سے نکال نہیں سکتا۔

علم الانسان کی شہادت

یہ حقیقت موجودہ زمانہ میں انسانیات (Anthropology) کے ذریعہ علمی طور پر ثابت ہو گئی ہے موجودہ زمانہ میں علم الانسان کے ماہرین نے انسانی معاشرہ کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ تاریخ کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک کے انسانی معاشروں کا مطالعہ کرنے کے بعد جو حقیقتیں سامنے آئی ہیں ان میں سے ایک اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود انسان ہمیشہ خدا کا پرستار رہا ہے۔ خدا اور مذہب کا جذبہ انسان کی فطرت میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں علم الانسان کی تحقیقات کا خلاصہ ہم انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

From the earliest days of the world's history man has been more or less a religious creature. Almost invariably he has had a god, or several of them, to whom he looked for protection. At times these gods have been crude fetishes of whittled wood or roughly hewn stone; at times they have assumed the form of animals or reptiles, or have appeared as cruel monsters eager for the life-blood of those who reverenced them. But, however they may have come, man has worshipped them, because religion, as represented in the worship of a super-natural power, is interwoven with the entire fabric of human nature.

Encyclopedia Americana, 1961, V. XXIII, p 354

دنیا کی تاریخ کے بالکل ابتدائی دنوں سے انسان کم و بیش ایک مذہبی مخلوق رہا ہے۔ تقریباً ہر زمانہ میں وہ ایک خدا رکھتا تھا یا کئی خدا، جس کی طرف وہ بچاؤ کے لیے دیکھ سکے۔ کبھی یہ خدا لکڑی کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ کبھی پتھر کے۔ کبھی جانوروں اور سانپوں کو خدا سمجھ لیا گیا، وغیرہ۔ مگر ہر حال میں وہ تھے اور انسان ضروری سمجھتا تھا کہ وہ ان کی پوجا کرے۔ کیوں کہ مذہب، ایک مافوق طاقت کی پرستش کی صورت میں، انسان کی فطرت کے پورے ڈھانچہ میں گندھا ہوا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا شعور انسان کی فطرت میں تخلیقی طور پر پیوست ہے۔ تاہم یہ شعور مجمل انداز میں ہے۔ اس لیے انسان ایسا کرتا ہے کہ جب وہ حقیقی خدا کو نہیں پاتا تو مصنوعی طور پر وہ خود ساختہ خداؤں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ فطرت کے زور پر اس کے اندر پرستش کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے پیغمبر کی رہنمائی ہو تو اس کا یہ جذبہ خدائے وحدہ لاشریک کی صورت میں اس کا جواب پالے گا۔ اور اگر پیغمبر کی رہنمائی اس کے سامنے نہ ہو تو وہ اپنے جذبہ کی مصنوعی تسکین کے لیے غیر خداؤں کو خدا فرض کر کے ان کو پوجنے لگے گا۔

انسان کا مقصود اصلی صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو اس کا خالق و مالک ہے۔ یہ مقصود اس کی فطرت میں گہرائی کے ساتھ شامل ہے۔ انسان یکسو ہو کر اپنی فطرت پر کان لگائے تو وہ خود اپنے اندر خدا کو پالے گا۔ وہ اس کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں محسوس کرے گا۔ یہ فطرت گویا انسان کا "لاشعور" ہے۔ پیغمبر اسی لاشعور کو شعور کا درجہ عطا کرتا ہے۔

تاہم انسان جیسی ایک مخلوق کے لیے صرف یہ غیبی معرفت کافی نہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ خدا کو محسوس طور پر بھی پائے۔ وہ خدا کا محسوس ادراک کر سکے۔ مگر یہاں یہ رکاوٹ ہے کہ خدا کا

محسوس ادراک حقیقی معنوں میں آخرت سے پہلے ممکن نہیں ۔

آخرت میں بلا شبہ انسان خدا کو دیکھے گا ۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کے دن کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے ، وہ اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے (القیامہ) حدیث سے بھی یہ بات تواتر کی حد تک ثابت ہے صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ تم عنقریب اپنے رب کو کھلے طور پر دیکھو گے (انکم سترون ربکم عیاناً)

وفی الصحیحین عن جریر قال نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی القمر لیلۃ البدر فقال : انکم ترون ربکم کماترون ھذا القمر

بخاری و مسلم میں حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کی رات میں چاند کی طرف دیکھا ، پھر فرمایا کہ تم (آخرت میں) اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو ۔

شعائر اللہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا حقیقی مشاہدہ صرف آخرت میں ہوگا ۔ مگر آخرت کے خدائی مشاہدہ پر یقین رکھتے ہوئے بھی انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کو پائے ۔ وہ کل کے آنے سے پہلے آج کے دن خدا کی قربت حاصل کرے ۔ یہ انسان کی فطرت ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ طلب موجودہ دنیا میں کس طرح پوری ہو ۔

اس کا جواب شعائر اللہ (البقرہ ۱۵۸) کی صورت میں فراہم کیا گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو ان کی مخصوص تاریخی اہمیت کی بنا پر اپنا شعیرہ (علامت) قرار دیا ہے ۔ ان علامتوں یا یادگاروں کے گرد ایسے حالات جمع کیے گیے ہیں کہ ان کو دیکھنا خدا کو دیکھنا بن جائے ۔ جس خدا کو انسان براہِ راست نہیں پا سکتا اس کو وہ بالواسطہ انداز میں پالے ۔ انسان موجودہ دنیا میں اللہ کو نہیں دیکھ سکتا البتہ وہ شعائر اللہ کو دیکھ سکتا ہے ۔ وہ موجودہ دنیا میں اللہ کو اس طرح نہیں پا سکتا کہ وہ اس کو چھوئے اور اس سے محسوس قربت حاصل کرے ۔ البتہ وہ شعائر اللہ کو چھو سکتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قربت خداوندی کا محسوس تجربہ کر سکتا ہے ۔

شعیرہ (جمع شعائر) کے معنی ہیں نشان ، علامت ، یادگار ۔ یعنی وہ چیز جو خود اصل نہ ہو

البتہ وہ کسی نسبت کی بنا پر اصل کی یاد دلائے۔ اس کی ایک مثال صفا اور مروہ پہاڑیاں ہیں جن کو قرآن میں شعائر کہا گیا ہے۔ (ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ، البقرہ ۱۵۸)

صفا اور مروہ مکہ میں بیت اللہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان تقریباً ۔۔۵ قدم کا فاصلہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی اہلیہ ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیل کو لاکر یہاں بسایا تو یہاں نہ کوئی آبادی تھی اور نہ پانی۔ حضرت ہاجرہ کی مشک کا پانی ختم ہوگیا تو وہ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں سات بار دوڑیں۔ اسی کی یاد میں آج بھی تمام حاجی دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات بار سعی کرتے ہیں۔

یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا اور اس نے صفا اور مروہ کو اپنا شعیرہ قرار دیدیا۔ یعنی خدا پرستی کی مستند یادگار۔ صفا اور مروہ کو دیکھ کر وہ پوری تاریخ یاد آجاتی ہے جب کہ اللہ کے ایک بندہ نے صرف اللہ کی رضا کی خاطر اپنے سرسبز وطن (عراق) کو چھوڑا اور اپنے بیوی اور بچہ کو بے آب وگیاہ علاقہ میں لاکر بسادیا۔ یہ اللہ پر یقین اور اس کے اوپر اعتماد کی ایک کامل مثال ہے۔

اسی طرح کعبہ، حجر اسود اور حج سے متعلق دوسری چیزیں سب کی سب شعائر اللہ ہیں۔ یہ موحد کامل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی خدا پرستانہ زندگی کی نشانیاں ہیں۔ ان کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کی موحدانہ تاریخ یاد آتی ہے۔ ان کو دیکھ کر خدا کی عظمت و جلال کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ان شعائر کے ماحول میں پہونچ کر آدمی اپنے آپ کو خدا کے ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

حجر اسود کو حدیث میں یمین اللہ علی الارض (زمین پر اللہ کا ہاتھ) کہا گیا ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ تمثیلی معنوں میں ہے۔ آدمی کے اندر اٹھنے والے ربانی جذبات اپنی محسوس تسکین کے لیے یہ چاہتے تھے کہ وہ اللہ کے ہاتھ کو چھوئیں اور اس کو چھو کر اپنے جذبے کو مطمئن کریں، حجر اسود کو چوم کر آدمی اپنے اسی جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح آدمی چاہتا تھا کہ وہ اللہ کو پاکر اس کے گرد گھومے، کعبہ کے مقدس گھر کا طواف کرکے وہ اپنے اسی جذبہ کو تسکین دیتا ہے۔ آدمی چاہتا تھا کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے دوڑے، وہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتا ہے تو اس کو یہی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح حج کے تمام مراسم کسی نہ کسی اعتبار سے انسان کے چھپے ہوئے جذبات کی تسکین ہیں۔ وہ اپنے رب سے محسوس تعلق قائم کرنے کا ذریعہ ہیں۔

معبود کی پرستش کا جذبہ فطری طور پر انسان کے اندر چھپا ہوا ہے۔ شرک اور بت پرستی اسی فطری جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ توحید کا عقیدہ اس فطری جذبہ کو صحیح رُخ عطا کرتا ہے۔ یہی معاملہ حج کے مراسم کا ہے۔ حج ایک اعتبار سے ایک انسانی غلطی کی اصلاح ہے۔ وہ انسان کی طلب کو غلط رُخ پر جانے سے روکتا ہے اور اس کو صحیح رُخ پر لگا دیتا ہے۔ حج اسی جذبہ کی تسکین کی صحیح صورت ہے جس کو انسان غلط طریقے سے تسکین دینا چاہتا ہے۔

انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کو دیکھے، وہ محسوس طور پر اس کو پاکر اس کے آگے مراسم عبودیت ادا کرے۔ انسان نے اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لیے یہ کیا کہ اس نے غیر مرئی خدا کی مرئی تصویر (Image) بنائی۔ اور اس خودساختہ تصویر کو خدا کی تصویر سمجھ کر اس کو پوجنا شروع کر دیا۔ مگر یہ قرآن کے الفاظ میں الحاد (انحراف) ہے۔ انسان اپنے جس فطری جذبہ کا جواب خدائی بتوں میں تلاش کر رہا ہے اس کا جواب زیادہ صحیح طور پر خدائی یادگاروں (شعائر اللہ) میں موجود ہے۔

خدا کا بت بنانا ایسا ہی ہے جیسے کسی انسان کا مجسمہ بنانا۔ مجسمہ وہ شخص بناتا ہے جس نے صاحب مجسمہ کو یا اس کی تصویر کو دیکھا ہو۔ مگر خدا کے بارے میں کوئی مجسمہ ساز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ایک شخص جب خدا کا بت بناتا ہے تو وہ لامحدود کو محدود کرتا ہے۔ وہ ایک برتر ہستی کو غیر برتر چیزوں میں ڈھالتا ہے۔ اس قسم کا ہر فعل واقعہ کے خلاف ہے۔ اور وہ بلاشبہ سرکشی کے ہم معنی ہے۔

حج ایک اعتبار سے اس انسانی ذہن کی اصلاح ہے۔ حج کا پیغام یہ ہے کہ خدا کو "مجسمہ" کی سطح پر اتارنے کی کوشش نہ کرو۔ خدا کو اس کے "شعائر" کی سطح پر دیکھو۔ موجودہ دنیا میں تم خدا کو اس کی ذات کی سطح پر نہیں پا سکتے۔ البتہ تم اس کو آثار ذات کی سطح پر پا سکتے ہو۔ یہ شعائر وہ ہیں جو خدا کے معیاری پرستاروں کے عمل سے قائم ہوئے ہیں۔ یہ تاریخ کے ان لمحات کی مادی یادگاریں ہیں جب کہ خدا اور بندے کے درمیان براہ راست اتصال قائم ہوا۔ جب بندہ نے خدا کو پایا اور خدا نے اپنے کو بندہ کے لیے بے نقاب کیا۔

تاریخ کے وہ قیمتی افراد جنھوں نے خدا پرستی کو اس کی اعلیٰ اور معیاری شکل میں اختیار کیا۔ ان کے آثار ہی کا نام شعائر اللہ (خدا کی یادگاریں) ہے۔ انھیں شعائر کے درمیان تمام مراسم حج ادا کیے جاتے ہیں۔ ان سے دوری خدا سے دوری ہے اور ان سے وابستگی خدا سے وابستگی۔

ملاقاتِ خداوندی

حج کے بہت سے پہلو ہیں۔ مگر اس کا خاص پہلو یہ ہے کہ حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ آدمی جب سفر کرکے مقاماتِ حج تک پہونچتا ہے تو اس پر خاص طرح کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں پہونچ گیا ہے۔ وہ اپنے رب کو چھورہا ہے وہ اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ وہ اس کی طرف دوڑ رہا ہے۔ وہ اس کی خاطر ادھر سے ادھر جا رہا ہے۔ وہ اس کے حضور قربانی پیش کررہا ہے۔ وہ اس کے دشمن کو کنکریاں مار رہا ہے۔ وہ اس سے مانگ رہا ہے جو کچھ وہ اس سے مانگنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے پا رہا ہے جو کچھ وہ اس سے پانا چاہتا ہے۔

عرفات کا میدان اس سلسلہ میں بڑا عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ خدا کے بندے قافلہ در قافلہ چاروں طرف سے چلے آرہے ہیں، سب کے جسم پر ایک ہی سادہ لباس ہے۔ ہر ایک اپنی امتیازی صفت کو کھوچکا ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی کلام جاری ہے: لبیك اللهم لبيك، لبيك اللهمّ لبيك (حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں، حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں)

یہ منظر دیکھ کر قرآن کی وہ آیت یاد آنے لگتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو اچانک تمام لوگ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑ پڑیں گے (ونفخ فی الصور فاذا هم من الاجداث الی ربهم ینسلون) حقیقت یہ ہے کہ عرفات کا اجتماع حشر کے اجتماع کی پیشگی خبر ہے۔ یہ آج کی دنیا میں آئندہ آنے والی دنیا کی تصویر دکھانا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ الحج عرفة (عرفات کے میدان میں قیام ہی حج ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کا اہم ترین مقصد کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی میدان حشر میں خدا کے سامنے اپنی حاضری کو یاد کرے۔ جو کچھ کل عملاً بیتنے والا ہے اس کو آج ہی ذہنی طور پر اپنے اوپر طاری کرلے۔

کعبہ خدائے واحد کا گھر ہے۔ اس کو دو جلیل القدر پیغمبروں (حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ) نے مل کر بنایا۔ ان پیغمبروں کی اعلیٰ زندگی اور خدا کے لیے ان کی قربانی کے حیرت انگیز واقعات اس گھر سے وابستہ ہیں۔ پھر پیغمبر آخر الزّماں صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پاک اصحاب کی زندگیاں اور ان کی خدا پرستانہ سرگرمیاں اس کی فضاؤں میں بسی ہوئی ہیں۔

خدا پرستی اور خدا کے لیے قربانی کی اس بے مثال تاریخ کو آدمی کتابوں میں پڑھتا ہے۔ وہ

ن سے لے کر سفر حج تک اس کو مسلسل سنتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کے حافظہ کے خانہ کا جزء بن جاتی
ں۔ ایسی حالت میں جب وہ سفر کر کے کعبہ کے سامنے پہونچتا ہے تو حافظہ کی تمام یادیں اچانک اس کے
ہ جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک تاریخ کے سامنے کھڑا ہوا پاتا ہے ـــــــ خدا سے خوف
محبت کی تاریخ، خدا کے لیے قربان ہو جانے کی تاریخ، خدا کو اپنا سب کچھ بنانے کی تاریخ، خدا کو
در مطلق کی حیثیت سے پا لینے کی تاریخ، خدا کی خاطر اپنے آپ کو مٹا دینے کی تاریخ۔

اس قسم کی ایک عظیم ربانی تاریخ آدمی کے سامنے کعبہ کی صورت میں مجسم ہو جاتی ہے۔ وہ حجری
وف میں لکھی ہوئی اس کو نظر آنے لگتی ہے۔ یہ تجربہ اس کے دماغ کو ہلاتا ہے وہ اس کے سینہ کو
ملا دیتا ہے۔ وہ اس کو بدل کر نیا انسان بنا دیتا ہے۔

راقم الحروف نے اپنے حج (۱۹۸۲) کے سفر نامہ میں لکھا تھا:

"ہماری قیام گاہ حرم سے بہت قریب شارع ابراہیم الخلیل پر تھی۔ چنانچہ کھانے اور مختصر سونے
ے علاوہ میرا بیشتر وقت حرم میں گزرتا تھا۔ میرا روزانہ کا معمول تھا کہ میں باب الہجرہ کے پاس زمزم
ے پانی سے وضو کرتا۔ اس کے بعد سیر ہو کر زمزم کو پیتا اور پھر حرم میں داخل ہو جاتا۔ اکثر میں حرم کے
وپر کے حصہ میں جاتا تھا۔ کیوں کہ اوپر کے حصہ میں نسبتاً بھیڑ کم ہونے کی وجہ سے سکون رہتا تھا۔ وہاں
یں نماز پڑھتا، تلاوت کرتا، کعبہ کو دیکھتا، اللہ کو یاد کرتا۔ روزانہ گھنٹوں اس طرح گزر جاتے کہ
مجھے وقت کا کچھ اندازہ نہ ہوتا۔ خواہ کتنی ہی زیادہ دیر ہو چکی ہو، جب میں حرم سے لوٹتا تو محسوس
ہوتا کہ ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر دل کی جو کیفیت ہوتی تھی اس کو لفظوں میں
بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

مصیبت میں راحت

حج کے موقع پر بیک وقت ساری دنیا کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اس بنا پر حج میں بار بار ایک
کو دوسرے سے تکلیف پہونچتی ہے۔ بار بار ایسے مواقع سامنے آتے ہیں جو آدمی کی طبیعت پر بے حد
شاق معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر آدمی اگر اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کرے تو اس کا حال بالکل
دوسرا ہو جائے گا۔ اس کے بعد تلخ تجربہ بھی شیریں تجربہ بن جائے گا۔ اس کے بعد وہی چیز اس کے
لیے رزق ربانی کا سبب بن جائے گی جو عام حالات میں صرف رزق نفسانی کا ذریعہ بنتی ہے۔

مثلاً آپ مسجد حرام میں نماز کے لیے کھڑے ہیں کہ انسانوں کا ہجوم اندر داخل ہوا اور کشادہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے عین آپ کے سامنے صف باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ آپ کے سامنے اتنی جگہ باقی نہ رہی کہ آپ درست طور پر رکوع کریں یا درست طور پر سجدہ کریں۔ ایسے موقع پر اگر آپ صرف سامنے کے انسانوں کو دیکھیں تو آپ کے اندر غصہ اور نفرت پیدا ہوگی۔ اس کے برعکس اگر آپ خود اپنا احتساب کرنے لگیں تو آپ کا حال بالکل دوسرا ہو جائے گا۔ آپ کہہ اٹھیں گے کہ خدایا، تو میری اس ٹوٹی پھوٹی نماز کو قبول کرلے۔ کیوں کہ میری بظاہر صحیح نماز بھی حقیقتاً اتنی ہی ٹوٹی پھوٹی نماز ہے جتنی کہ میری یہ نماز۔ جو شخص اپنے ذہن کو اس طرح موڑے اس کا حال بالکل دوسرا ہو جائے گا۔ جس واقعہ سے اکثر لوگ صرف انسان بیزاری کی غذا لیتے ہیں اس واقعہ سے اس کو خدا کی قربت کا رزق ملنے لگا۔

اسی طرح حج کے سفر میں طرح طرح کے ناخوش گوار تجربات پیش آتے ہیں۔ رمی اور دوسرے مواقع پر انسانوں کی بھیڑ، منی اور عرفات میں گرمی کی شدت، پانی لینے کے لیے ایک کا دوسرے پر ٹوٹنا وغیرہ۔ اس قسم کی جو مختلف صورتیں حج کے سفر میں پیش آتی ہیں۔ ان میں اگر آپ صرف سامنے کے واقعہ کو دیکھیں تو آپ کے اندر غصہ اور جھنجھلاہٹ کا جذبہ بھڑکے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ اس وقت یہ سوچنے لگیں کہ جب دنیا کی چھوٹی مصیبت کا یہ حال ہے تو آخرت کی بڑی مصیبت کا کیا حال ہوگا، تو اچانک آپ یہ محسوس کریں گے کہ جو چیز بظاہر مصیبت نظر آرہی تھی وہ عین راحت بن گئی۔ اس نے خدا کی رحمت بن کر آپ کے اوپر سایہ کرلیا۔

غیر معمولی سفر

حج کے مذکورہ سفرنامہ (۱۹۸۲) میں تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"۱۹۸۲ میں میں بعض ملکوں کے سفر پر نکلا۔ اس سفر میں حج کا پروگرام شامل نہ تھا۔ حتی کہ میرے ذہن میں اس کا تصور بھی نہ تھا کہ میں حجاز پہونچ کر حج کا فریضہ ادا کروں۔ افریقہ پہونچا تو وہاں ایک بزرگ دوست مل گیے اور ان کے ساتھ اچانک سفر حج کے اسباب پیدا ہوگیے۔ اس معاملہ میں میرے ساتھ بالکل وہ صورت حال پیش آئی جو کسی شاعر نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال	کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ میری محرومی تھی کہ میں نے ابھی تک حج کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔ وطن سے میں ایک اور سفر

کے لیے نکلا ۔ مگر اللہ نے عجیب و غریب طور پر ایشیا اور یورپ اور افریقہ کا سفر کراتے ہوئے مجھ کو ارض حرم میں پہونچا دیا تاکہ میں حج کی سعادت حاصل کر سکوں ۔ حج کرنے والا اگرچہ میں تھا مگر حج کرانے والا صرف خدا تھا۔ اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہ تھا۔ آخر کار جب میں حرم میں پہونچا اور کعبہ پر نظر پڑی تو یہ ایک ایسا منظر تھا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کعبہ کو دیکھنا اور کعبہ کے پڑوس میں اپنے آپ کو پانا اتنا پر کیف ربانی تجربہ ہے جس کے اظہار سے میرا قلم عاجز ہے ۔ اس غیر متوقع نعمت کو پاکر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا : خدایا ، میں نے ابھی تک اپنی زندگی میں حج کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔ گویا کہ میں حج کیے بغیر مرجانے پر راضی تھا۔ یہ تیرا کیسا عجیب احسان ہے کہ تو نے مجھ کو اس ناقابل بیان محرومی سے بچالیا ۔"

یہ بظاہر ایک حاجی کے وہ تاثرات ہیں جو مخصوص حالات میں اس پر طاری ہوئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی تاثر ہر حاجی پر طاری ہونا چاہیے ۔ ہر حاجی پر یہ کیفیات طاری ہونی چاہئیں کہ وہ اپنے حج کو خدا کی طرف سے کرایا جانے والا حج سمجھے ۔ وہ جب ارض حرم میں پہونچے تو وہ محسوس کرے کہ یہ دراصل خدا ہے جس نے اس کو اس نوبت تک پہونچایا ہے ۔ وہ ایک عام مسافر کی حیثیت سے اپنے وطن سے نکلا مگر جب وہ منزل پر پہونچا تو وہ خدا کا مہمان تھا ۔ اس نے صرف ایک زمینی راستہ طے کیا تھا مگر اللہ نے اس کو ایک ایسے ماحول میں پہونچا دیا جہاں ہر طرف آسمانی برکتیں بکھری ہوئی ہیں ۔ اس کے پاس صرف محرومی کا اثاثہ تھا مگر اللہ نے اپنی رحمتِ خاص سے اس کے کھونے کو پانا بنا دیا ۔

فیض بقدر استعداد

کعبہ زمین پر خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے تاریخی طور پر یہاں ایسے اسباب فراہم کیے ہیں کہ جو شخص وہاں جائے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بھٹکی ہوئی انسانی روحوں کو خدا کا آغوش دیا جاتا ہے ۔ وہاں پتھرائے ہوئے سینوں میں عبدیت کے چشمے جاری کیے جاتے ہیں ۔ وہاں بے نور آنکھوں کو خدا کی تجلیات دکھائی جاتی ہیں ۔ تاہم اس دنیا میں "فیض بقدر استعداد" کا اصول رائج ہے ۔ بیت اللہ کا فیض صرف اس کو ملتا ہے جو اس کی استعداد لے کر وہاں جائے ۔ بے استعداد لوگوں کے لیے حج کا سفر بس ایک قسم کی سیاحت ہے ۔ وہ وہاں جاتے ہیں تاکہ جیسے گیے تھے ویسے ہی دوبارہ واپس چلے آئیں ۔

مذکورہ سفرنامۂ حج (۱۹۸۲) میں حسب ذیل سطریں درج ہیں :

" وہاں میں نے جو خدائی مناظر دیکھے، جس طرح وہ ناقابل بیان ہیں، اسی طرح وہ انسانی مناظر بھی ناقابل بیان ہیں جو وہاں مجھ کو دیکھنے کو ملے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ یا تو دنیا کی باتیں کرنے میں مشغول ہیں یا دنیا کا سامان خریدنے میں۔ کچھ لوگ دوسروں کو دھکا دے کر اپنی پرجوش مذہبیت کا اظہار کر رہے تھے۔ حالاں کہ اس قسم کی چیزیں مقامات حج میں جائز نہیں۔

جہاں ہر طرف خدا کے جلوے بکھرے ہوئے تھے تاکہ آدمی ان میں محو ہو جائے وہاں لوگ انسانی جلووں میں گم تھے۔ جہاں خدا کے فرشتے اترے ہوئے تھے تاکہ لوگ ان سے باتیں کریں وہاں لوگ انسانوں سے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ جہاں ہر طرف آخرت کا سامان بک رہا تھا وہاں لوگوں کو دنیا کا سامان خریدنے کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ جس جگہ کا یہ حق تھا کہ خدا کا ڈر انھیں پیچھے کر دے وہاں لوگ دوسروں کو دھکا دے کر آگے بڑھ جانے کی مہارت دکھا رہے تھے۔

چند تاثرات

مذکورہ سفرنامہ میں حج کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے :

" ۴ اکتوبر ۱۹۸۲ کی شام کو ہم نے طواف وداع کیا، اور رات کو مکہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ کعبہ کا آخری طواف کرکے جب میں حرم سے نکلا تو میری عجیب کیفیت تھی۔ بار بار مڑ کر حرم کو دیکھتا تھا۔ قدم آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور دل پیچھے کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنے وطن اصلی سے نکل کر وطن غیر کی طرف جا رہا ہوں۔ اس طرح کی کیفیات کے ساتھ ہم مسجد حرام سے رخصت ہو کر ۴ اکتوبر کی شب کو مکہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔

حرم مدینہ میں داخلہ بڑا اثر انگیز تھا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کی ایک پوری تاریخ آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ میری زبان سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، میں تیرے رسول پر صلوٰۃ وسلام بھیجتا ہوں۔ مجھ کو اپنے رسول کی امت میں شامل کرلے۔ مجھ کو ان لوگوں میں لکھ لے جن کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن شفاعت فرمائیں گے۔ اور جن کی شفاعت کو قبول کرکے آپ انھیں جہنم سے بچالیں گے اور جنت میں داخل کریں گے —— کیسا عجیب ہے وہ دن جو آچکا اور کیسا عجیب ہے وہ دن جو آنے والا ہے۔

مدینہ میں ہمارا قیام مسجد نبوی کے بالکل قریب ایک ہوٹل میں تھا۔ اذان اور تکبیر تک کی آواز ہمارے کمرے میں پہونچتی تھی۔ کئی دن تک مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ مگر یہاں نمازیوں کا ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ بہ مشکل کسی کو سکون اور توجہ کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ مکہ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں میرے ساتھ یہی صورت پیش آئی تھی۔ اس کے بعد میں مسجد حرام کی اوپر کی منزل پر نماز پڑھنے لگا۔ وہاں مجھے کافی سکون رہتا تھا۔ مسجد نبوی کو معلوم نہیں کس مصلحت کی بنا پر دو منزلہ نہیں بنایا گیا کہ میرے جیسا کوئی آدمی وہاں پناہ لے سکے۔

مسجد نبوی غیر معمولی طور پر وسیع اور شاندار ہے۔ مگر زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے تمام وسعتوں کے باوجود اس کو ناکافی بنا دیا ہے۔ تاہم میرے جیسے آدمی کے لیے یہ منظر کوئی خوش گوار منظر نہ تھا کہ مسجد نبوی کے اطراف کو دکانوں اور ہوٹلوں نے گھیر رکھا ہے۔ صرف ایک طرف کا حصہ دکانوں اور ہوٹلوں سے خالی ہے جس کے اوپر خیمہ نما تعمیرات نمازیوں کے لیے کھڑی ہوئی ہیں۔ کاش مسجد کے چاروں طرف کھلا ہوا میدان ہوتا تو مسجد کی عظمت زیادہ نمایاں ہوتی۔ تقریباً یہی صورت حال حرم مکہ کی بھی ہے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۲ کو حج کے مناسک کی تکمیل ہوئی۔ اور ہم دوبارہ مکہ واپس آئے۔ مطابع دار الثقافہ (مکہ) کی طرف سے ہر سال حاجیوں کے اعداد و شمار شائع کیے جاتے ہیں۔ اس کے اعلان کے مطابق اس سال (۱۴۰۲ھ) سعودی عرب کو چھوڑ کر دوسرے تمام ممالک سے آنے والے حاجیوں کی کل تعداد ۸۵۳۵۵۵ تھی۔ زیادہ تعداد والے چند ملکوں کے نام یہ ہیں:

۱۔	مصر	۹۸۴۰۸
۲۔	ایران	۸۹۵۰۳
۳۔	نائیجیریا	۸۱۱۲۸
۴۔	پاکستان	۷۲۸۴۴
۵۔	انڈونیشیا	۵۷۴۷۸
۶۔	ترکی	۵۳۷۸۸
۷۔	الجزائر	۴۰۴۰۱

۸۔ شام ۲۷۸۹۰

۹۔ ہندستان ۲۶۲۲۹

سعودی حکومت نے بے شمار اعلیٰ انتظامات کیے ہیں۔ ان انتظامات نے موجودہ زمانہ میں حج کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ تاہم ایک چیز ایسی ہے جس کا اس کے پاس شاید کوئی حل نہیں۔ اور وہ حاجیوں کا ہجوم ہے۔ خاص طور پر شیطان کو پتھر مارنے کے موقع پر لوگ جس طرح ایک دوسرے کے اوپر ٹوٹتے ہیں وہ انتہائی حد تک افسوس ناک ہے۔ بے شمار انسان بیک وقت شیطان کو مارنے کے لیے اس طرح ہجوم کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامتی شیطان کو کنکری مارنے کا انھیں اتنا جوش ہے کہ اس کی خاطر وہ حقیقی انسان کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ خدا کے ایک حکم کی تعمیل کے شوق میں خدا کے دوسرے حکم کو نظر انداز کرنے کی اس سے زیادہ بری مثال اب تک میں نے اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھی تھی۔ کئی آدمی ایسے نظر پڑے جن کے ہاتھ یا پاؤں میں پلاسٹر بندھا ہوا تھا۔ ایک منظر یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ رمی کے وقت ایک حاجی گر پڑا اور حاجیوں کے قدموں کے نیچے کچل کر ختم ہو گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس طرح کے واقعات ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔ کیسا عجیب ہے وہ حج جس میں انسان دشمن کی ایک علامت کو مارنے کے جوش میں خود انسان کو مار ڈالا جائے ‘‘

تجدید ایمان

حج ایک قسم کا تجدید ایمان ہے۔ حج سے پہلے کا ایمان گویا ایک موقّت ایمان ہے۔ اس کے بعد مومن جب مکہ پہونچتا ہے اور لبیک لبیک کہہ کر بیت اللہ کا طواف کرتا ہے تو گویا وہ اپنے ایمان کی تجدید کرتا ہے۔ وہ براہِ راست خدا سے "بیعت" ہوتا ہے۔

حج کے بعد گناہوں کی معافی عین اس قانون کے تحت ہے جو قبولیت اسلام سے متعلق ہے۔ اسلام قبول کرنے بعد آدمی کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ بندے کے ساتھ یہ معاملہ ایمانِ اوّل کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایمان ثانی کے بعد گویا اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایمانِ اوّل اگر بالواسطہ ایمان تھا تو ایمان ثانی براہِ راست ایمان ہے۔ معذوری کی حالت میں ایمان اول ہی خدا کی رحمت سے آدمی کے گناہوں کی معافی کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ مگر صاحب استطاعت کے لیے ایمان ثانی کے بعد اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص استطاعت رکھتا ہو اور پھر

بھی حج ادا کیے بغیر مر جائے تو خدا کو اس کی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر مرا (من ملک زادًا وراحلة تبلغه حج بيت الله الحرام ولم يحج فلا عليه ان يموت يهوديا او نصرانيا ، رواه الترمذی والبیہقی)

اسلام کا خلاصہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنا ہے۔ حج میں یہ چیز اپنی پوری طرح عمل میں آتی ہے۔ عرفات کے میدان میں جب تمام حاجی "حاضر ہوں خدایا میں حاضر ہوں" کہتے ہوئے جمع ہوتے ہیں تو یہ اسی بات کا ایک اجتماعی مظاہرہ ہوتا ہے۔ حج گویا خدا کے سامنے حاضری ہے۔ قیامت میں ہر شخص گرفتار کر کے خدا کے یہاں حاضر کیا جائے گا، حج کے موقع پر عرفات کے میدان میں پہونچنا گویا خود اپنی مرضی سے خدا کے یہاں حاضر ہو جانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج تمام عبادتوں کا سردار ہے۔ کعبہ کا جو درجہ دوسری مسجدوں کے درمیان ہے وہی درجہ حج کا دوسری عبادتوں کے درمیان۔

تذکیر القرآن

تذکیر القرآن جلد دوم (تا سورہ الناس) مکمل ہوگئی ہے۔ ان شاء اللہ جلد شائع ہو جائے گی۔

قیمت میں اضافہ

تمام چیزوں میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے الرسالہ کے اخراجات ناقابل برداشت حد تک بڑھ گیے ہیں۔ چنانچہ یہ تجویز ہے کہ الرسالہ کی قیمت میں اضافہ کر کے فی شمارہ چار روپیہ اور سالانہ ۴۸ روپے کردیا جائے۔ اس سلسلہ میں آخری اعلان آئندہ کیا جائے گا۔

حج اور اتحاد

حج کا ایک پہلو اسلامی اتحاد ہے۔ حج کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمان ایک مقام پر اکٹھا ہوتے ہیں اور ایک ساتھ حج کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ حج مسلمانوں کا عالمی دینی اجتماع ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی چند آیتوں پر غور کیجیے:

وإذ جعلنا البيت مثابة للناس وأمنا۔ (البقرہ ۱۲۵)

اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن کا مقام بنا دیا۔

ان اول بيت وضع للناس للذي ببكة مباركا وهدى للعالمين۔ (آل عمران ۹۶)

بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہاں کے لیے ہدایت کا مرکز۔

جعل الله الكعبة البيت الحرام قياما للناس۔ (المائدہ ۹۷)

اللہ نے کعبہ، حرمت والے گھر، کو لوگوں کے لیے قیام کا باعث بنایا۔

فاجعل افئدة من الناس تهوي اليهم۔ (ابراہیم ۳۷)

پس اے اللہ، تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے۔

وأذن في الناس بالحج يأتوك رجالا وعلى كل ضامر يأتين من كل فج عميق (الحج ۲۷)

اور تم لوگوں میں حج کے لیے پکار دو کہ وہ تمہاری طرف آئیں پیدل چل کر اور سوار ہو کر، وہ دُبلے اونٹوں پر چلے آئیں دور کی راہوں سے۔

توحید کا عالمی مرکز

قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ذریعہ حجاز میں کعبہ کی تعمیر خاص طور پر

اس لیے کی گئی تھی کہ وہ اہل توحید کا مرکز بنے ۔ قریب کے لوگ بھی آئیں اور دور کے لوگ بھی سواریوں کے ذریعہ وہاں پہونچیں۔ کعبہ کے گرد ایسے تاریخی اسباب پیدا کیے گیے کہ لوگوں کے دل اس کی طرف کھنچیں۔ اور ہر طرف سے لوگ امنڈ کر وہاں پہونچیں ۔ بیت اللہ قیامت تک کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا عالمی اسلامی مرکز ہے ۔ وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا بین اقوامی اجتماع گاہ ہے ۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں سے پکار کر کہو کہ وہ سفر کر کے اس گھر کے حج کے لیے آئیں :

قال یارب کیف ابلغ الناس وصوتی لاینفذھم فقال نادِ وعلینا البلاغ ۔ فقام علی الحجر وقال یا ایھا الناس ان ربکم قد اتخذ بیتا فحجوہ ۔ فیقال ان الجبال تواضعت حتی بلغ الصوت ارجاء الارض و سمع من فی الارحام والاصلاب واجابہ کل شیٔ سمعہ من حجر ومدر وشجر ومن کتب اللہ انہ یحج الی یوم القیامۃ ، لبیک اللّٰھم لبیک ۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث ، صفحہ ۲۱۶)

حضرت ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب کیسے میں لوگوں کو پکاروں اور میری آواز ان تک نہیں پہونچے گی ۔ اللہ نے کہا تم پکارو اور ہمارے اوپر ہے پہونچانا ۔ پس حضرت ابراہیم پتھر پر کھڑے ہوئے اور کہا کہ اے لوگو ، تمہارے رب نے ایک گھر مقرر کیا ہے ، تم اس کا حج کرو ۔ پس کہا جاتا ہے کہ پہاڑ جھک گیے یہاں تک کہ آواز زمین کے کناروں تک پہونچ گئی اور انھوں نے بھی سن لیا جو رحم میں تھے ۔ اور پتھر اور خیمہ اور درخت اور جس پر قیامت تک اللہ نے لکھ دیا تھا کہ وہ حج کرے گا سب نے سنا اور یہ کہا : ہم حاضر ہیں خدایا ہم حاضر ہیں ۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابراہیم نے جس وقت پکارا عین اسی وقت حال اور مستقبل کے تمام لوگوں نے آپ کی آواز کو سن لیا ۔ حضرت ابراہیم کی پکار علامتی پکار تھی ۔ بے شک تمام لوگوں نے اس کو سنا ۔ مگر یہ سننا اس وقت بالقوہ طور پر تھا نہ کہ بالفعل طور پر ۔ حضرت ابراہیم کی پکار دراصل ایک مسلسل واقعہ کا آغاز تھا ۔ آپ نے اپنے وقت میں پکارا ۔ آپ کے بعد دوسرے لوگوں نے آپ کی آواز کو لے کر اسے دوسروں کو سنایا ۔ پھر اسی طرح لوگ نسل در نسل پکارتے رہے ۔ پریس اور ریڈیو کا دور

آیا تو پریس اور ریڈیو کے ذریعہ یہ پکار مزید تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہوئی۔ وہ پہاڑوں اور سمندروں کو پار کر کے دور دور تک پہونچ گئی۔ یہاں تک کہ اس کا اندیشہ ختم ہوگیا کہ کوئی شخص بھی اس پیغمبرانہ پکار کو سننے سے خالی رہ جائے۔

عمومی اعلان

حج اجتماعی امور کے اعلان کا فطری مقام ہے۔ چنانچہ اسلام کے اہم ترین امور کا اعلان حج کے موقع پر کیا گیا۔ اس کی ایک مثال اعلان برارت ہے جو سورہ توبہ کے اترنے کے بعد کیا گیا۔

مکہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تین حج پڑے ہیں۔ ابتدائی دو حج میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لے گیے۔ آپ نے صرف ۱۰ھ میں حج ادا فرمایا جو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی۔

۹ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق کو امیر الحجاج مقرر فرمایا اور ان کے ساتھ دوسرے صحابہ حج کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے۔ حضرت ابو بکر کی روانگی کے بعد سورہ توبہ کا ابتدائی حصہ نازل ہوا جس میں یہ حکم تھا کہ اس بات کا اعلان کر دو کہ اللہ اور رسول مشرکین سے بری ہیں۔ اور اب آخری فیصلہ کے لیے انھیں صرف چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں روایات میں آتا ہے:

لما نزلت براءة على رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد كان بعث ابا بكر ليقيم الحج للناس فقيل يا رسول الله، لو بعثت الى ابى بكر فقال: لا يؤدى عنى الا رجل من اهل بيتى۔ ثم دعا عليًا فقال: اذهب بهذه القصة من سورة براءة و اذن فى الناس يوم النحر اذا اجتمعوا بمنى انه لا يدخل الجنة كافر ولا يحج بعد العام مشرك ولا يطوف

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر برارت اتری، اور آپ حضرت ابو بکر کو بھیج چکے تھے کہ وہ لوگوں کو حج ادا کرائیں، اس وقت کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، آپ اس کو ابو بکر کے پاس بھیج دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میری طرف سے صرف میرے گھر کا کوئی آدمی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ پھر آپ نے حضرت علی کو بلایا اور کہا کہ سورہ برارت کے اس معاملہ کو لے کر جاؤ اور یوم النحر کو جب لوگ منی میں جمع ہوں تو ان کے درمیان اعلان

بالبیت عریان

تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۳۴

کر دو کہ کافر جنت میں نہیں جائے گا۔ اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی شخص عریاں ہو کر کعبہ کا طواف نہیں کرنے پائے گا۔

حضرت علی کہتے ہیں کہ میں مکہ گیا اور مجمع عام میں گھوم گھوم کر بآواز بلند اس کا اعلان کرتا رہا یہاںتک کہ میری آواز بیٹھ گئی (قال فکنت انادی حتی صحل صوتی)

مشرکین عرب سے برارت کا حکم مدینہ میں اترا مگر اس کا اعلان مکہ میں موسم حج میں کیا گیا یہ واضح طور پر اس کا ثبوت ہے کہ اسلام کے تمام اہم فیصلوں کے اعلان کا اصل مقام مکہ اور زمانہ حج ہے۔ حج تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماعی مرکز ہے۔ یہیں ان کو جمع ہونا ہے۔ یہیں انھیں اپنے بڑے بڑے فیصلوں کا اعلان کرنا ہے۔ اور یہیں سے وہ عالمی منصوبہ بندی کرنی ہے جو خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ان کے لیے ضروری ہو۔

اس سلسلہ میں دوسری نمایاں مثال حجۃ الوداع کے خطبہ کی ہے۔ یہ آپ کا اہم ترین خطاب ہے۔ آپ اپنی وفات سے پہلے آخری طور پر لوگوں کو بتا دینا چاہتے تھے کہ دین کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ مگر ان کا اعلان آپ نے کہیں اور نہیں کیا بلکہ اس کو موخر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۰ھ میں حج کے موقع پر ان کا اعلان فرمایا۔ چنانچہ خطبہ کے شروع میں یہ الفاظ آئے ہیں :

یا ایہا الناس اسمعوا قولی فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا بھذا الموقف ابدا

اے لوگو، میری بات سنو۔ کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ شاید میں اس سال کے بعد تم سے اس مقام پر کبھی نہ ملوں۔

سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۲۷۵

اس کے بعد آپ نے تمام بنیادی باتیں لوگوں کو بتائیں اور آخر میں فرمایا : الا ھل بلغت الاھل بلغت (کیا میں نے پہونچا دیا، کیا میں نے پہونچا دیا) لوگوں نے گواہی دی کہ ہاں، آپ نے پہونچا دیا۔

فتح مکہ (۸ھ) کے بعد پورا عرب آپ کے لیے مسخر ہو چکا تھا۔ آپ عرب کے کسی بھی مقام پر پہونچ کر

یہ اعلان کر سکتے تھے ۔ اس وقت مدینہ اسلام کا سیاسی مرکز تھا۔ آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ لوگوں کو مدینہ میں بلائیں اور وہاں لوگوں کے سامنے ان باتوں کا اعلان کریں جن کا اعلان آپ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا مگر آپ نے ان میں سے کوئی طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ حج کا انتظار کیا اور حج کے موقع پر مکہ پہونچ کر ان کا اعلان کیا۔ آپ کی یہ سنت اس کا واضح ثبوت ہے کہ حج اسلام کی تمام اہم باتوں کا مقام اعلان ہے ۔

فطری انداز

اس اہتمام کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام ہمیشہ سادہ اور فطری طریقہ کو پسند کرتا ہے ۔ مثلاً حج کے اعمال میں سے ایک عمل یہ ہے کہ صفا اور مروہ (پہاڑیوں) کے درمیان سعی کی جائے ۔ اس سلسلہ میں ایک سوال ترتیب کا تھا۔ یعنی یہ کہ سعی کا عمل صفا کی طرف سے شروع کیا جائے یا مروہ کی طرف سے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر یہ عمل کیا تو فرمایا: ابدأ بما بدأ اللہ بہ (میں اس سے شروع کرتا ہوں جس سے اللہ نے شروع کیا)

اس سے آپ کا اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف تھا: ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ (البقرہ ۱۵۸) یہ وہ آیت ہے جس میں حاجی کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ اس آیت کی ترتیب بیان یہ ہے کہ اس میں صفا کا لفظ پہلے ہے اور مروہ کا لفظ اس کے بعد ہے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ترتیب بیان ہی کو ترتیب عمل بھی بنالو۔ تاکہ ایک ترتیب کا یاد رکھنا دوسری ترتیب کے لیے کافی ہو جائے ۔ دو ترتیب الگ الگ یاد رکھنی نہ پڑے ۔

حج کو مقام اعلان بنانے میں بھی یہی فطری حکمت ہے ۔ حج کی عبادت کو ادا کرنے کے لیے تمام دنیا کے مسلمان ہر سال ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ہمیشہ جمع ہوتے رہیں گے ۔ اس لیے اللہ نے اسی کو اجتماعی اعلان کا مقام بنا دیا۔ تاکہ ایک ہی اجتماع دونوں مقصد کے حصول کے لیے کافی ہو جائے ۔

حج کے موقع پر اجتماعی اعلان کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طرح اس کو ایک مقدس حیثیت حاصل ہو جاتی ہے ۔ حج کا مقام مسلمانوں کا انتہائی مقدس مقام ہے، اس لیے جو اعلان حج کے مقام پر کیا جائے وہ بھی اپنے آپ لوگوں کی نظر میں مقدس اور محترم بن جائے گا۔

حج کی اجتماعیت

حج اسلام کی ایک نہایت اہم سالانہ عبادت ہے۔ وہ قمری کلنڈر کے آخری ماہ ذوالحجہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ حج کی عبادت کے مراسم بیت اللہ (مکہ) میں یا اس کے آس پاس کے مقامات پر ادا کیے جاتے ہیں جو عرب میں واقع ہے۔ اس عبادت کو تمام عبادتوں کا جامع کہا جاتا ہے چنانچہ اس میں ہر قسم کے عبادتی پہلو پائے جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک اجتماعی پہلو بھی ہے حج کی عبادت میں اجتماعیت کا پہلو بہت نمایاں طور پر موجود ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا (۱۹۸۴) میں حج کی تفصیل دیتے ہوئے یہ جملہ لکھا گیا ہے:

> About 2,000,000 persons perform the Hajj each year, and the rite serves as a unifying force in Islam by bringing followers of diverse background together in religious celebration.
>
> *Encyclopedia Britannica,1985, Vol IV, p. 844*

تقریباً دو ملین آدمی ہر سال حج کرتے ہیں اور یہ عبادت مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ایک مذہبی تقریب میں یکجا کرکے اسلام میں اتحادی طاقت کا کام کرتی ہے۔

قرآن میں حج کا حکم دیتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں: واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا (البقرہ ۱۲۵) یعنی خدا نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مثابہ بنایا اور اس کو امن کی جگہ بنا دیا۔ مثابہ کے معنی عربی زبان میں تقریباً وہی ہیں جس کو آج کل کی زبان میں مرکز کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہوں۔ جس کی طرف سب لوگ رجوع کریں جو سب کا مشترک مرجع اور شیرازہ ہو۔

حج کی عبادت کے لیے ساری دنیا سے ہر ہر ملک کے لوگ آتے ہیں، ہر ہر قوم کے لوگ آتے ہیں۔ ان کی تعداد سالانہ تقریباً ۲۵ لاکھ ہو جاتی ہے۔ حج کے موسم میں مکہ اور اس کے آس پاس ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کے حلیے الگ الگ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں آنے کے بعد سب کی سوچ ایک ہو جاتی ہے۔ سب ایک ہی مشترک نشانہ پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ربانی مقناطیس ہے

جو "لوہے" کے تمام ٹکڑوں کو ایک نقطہ پر کھینچے چلا جا رہا ہے۔

مختلف ملکوں کے یہ لوگ جب مقامِ حج کے قریب پہونچتے ہیں تو سب کے سب اپنا قومی لباس اتار دیتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی مشترک لباس پہن لیتے ہیں جس کو احرام کہا جاتا ہے۔ احرام باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ بغیر سلی ہوئی ایک سفید چادر نیچے تہمد کی طرح پہن لی جائے اور اسی طرح ایک سفید چادر اوپر سے جسم پر ڈال لی جائے۔ اس طرح لاکھوں انسان ایک ہی وضع اور ایک ہی رنگ کے لباس میں ملبوس ہو جاتے ہیں۔

یہ سارے لوگ مختلف مراسم ادا کرتے ہوئے بالآخر عرفات کے وسیع میدان میں اکھٹا ہوتے ہیں۔ اس وقت ایک عجیب منظر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسانوں کے تمام فرق اچانک مٹ گیے ہیں۔ انسان اپنے تمام اختلافات کو کھو کر خدائی وحدت میں گم ہو گیے ہیں۔ تمام انسان ایک ہو گیے ہیں جیسے ان کا خدا ایک ہے۔

عرفات کے وسیع میدان میں جب احرام باندھے ہوئے تمام حاجی جمع ہوتے ہیں اس وقت کسی بلندی سے دیکھا جائے تو ایسا نظر آئے گا کہ زبان، رنگ، حیثیت، جنسیت کے فرق کے باوجود سب کے سب انسان بالکل ایک ہو گیے ہیں۔ اس وقت مختلف قومیتیں ایک ہی بڑی قومیت میں ضم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حج اجتماعیت کا اتنا بڑا مظاہرہ ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال غالباً دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔

کعبہ مسلمانوں کا قبلۂ عبادت ہے۔ مسلمان ہر روز پانچ وقت اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ گویا ساری دنیا کے مسلمانوں کا عبادتی قبلہ ایک ہی ہے۔ عام حالت میں وہ ایک تصوراتی حقیقت ہوتا ہے۔ مگر حج کے دنوں میں مکہ پہونچ کر وہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت بن جاتا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان یہاں پہونچ کر جب اس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں تو محسوس طور دکھائی دینے لگتا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا مشترک قبلہ ایک ہی ہے۔

کعبہ ایک چوکور قسم کی اونچی عمارت ہے۔ اس عمارت کے چاروں طرف گول دائرہ میں سارے لوگ گھومتے ہیں جس کو طواف کہا جاتا ہے۔ وہ صف بہ صف ہو کر اس کے گرد گول دائرہ میں عبادت کرتے ہیں۔ حج کے دوران وہ ان کی تمام توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ اس طرح حج ایک ایسی

عبادت بن جاتا ہے جو اپنے تمام اعمال اور تقریبات کے ساتھ انسان کو اجتماعیت اور مرکزیت کا سبق دے رہا ہو۔

حج کی تاریخ

حج کی تاریخ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی زندگی سے وابستہ ہے۔ یہ دونوں ہستیاں وہ ہیں جن کو نہ صرف مسلمان خدا کا پیغمبر مانتے ہیں بلکہ دوسرے بڑے مذاہب کے لوگ بھی ان کو عظیم پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح حج کے عمل کو تاریخی طور پر تقدس اور عظمت کا وہ درجہ مل گیا ہے جو دنیا میں کسی دوسرے عمل کو حاصل نہیں۔

حضرت ابراہیم قدیم عراق میں پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل ان کے صاحبزادے تھے۔ اس وقت عراق ایک شاندار تمدن کا ملک تھا۔ آزر حضرت ابراہیم کے والد اور حضرت اسماعیل کے دادا تھے۔ ان کو عراق کے سرکاری نظام میں اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے لیے عراق میں شاندار ترقی کے اعلیٰ مواقع کھلے ہوئے تھے۔ مگر عراق کے مشرکانہ نظام سے وہ موافقت نہ کر سکے۔ ایک خدا کی پرستش کی خاطر انھوں نے اس علاقہ کو چھوڑ دیا جو کئی خداؤں کی پرستش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ عراق کے سرسبز ملک کو چھوڑ کر عرب کے خشک صحرا میں چلے گئے جہاں کی سنسان دنیا میں خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ تھی۔ یہاں انھوں نے ایک خدا کے گھر کی تعمیر کی۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے اس عمل کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کئی خداؤں کو اپنا مرجع بنانے کے بجائے ایک خدا کو اپنا مرجع بنایا۔ اور اس مقصد کے لیے بیت اللہ (کعبہ) کی تعمیر کی جو خدائے واحد کی عبادت کا عالمی مرکز ہے۔ یہی مرکز توحید حج کے مراسم کی ادائیگی کا مرکز بھی ہے۔

حج کی عبادت میں جو مراسم ادا کیے جاتے ہیں ان کے بعض پہلوؤں کو دیکھیے۔ حج کے دوران حاجی سب سے زیادہ جو کلمہ بولتا ہے وہ یہ ہے:

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر
اللہ اکبر وللہ الحمد

اللہ سب سے بڑا ہے ، اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اور اسی کے لیے ہے ساری تعریف ۔

حاجی کی زبان سے بار بار یہ الفاظ کہلوا کر تمام لوگوں کے اندر یہ نفسیات پیدا کی جاتی ہے کہ بڑائی صرف ایک اللہ کی ہے ۔ اس کے سوا جتنی بڑائیاں ہیں سب اس لیے ہیں کہ اسی ایک عظیم تر بڑائی میں گم ہو جائیں ۔ یہ احساس اجتماعیت کا سب سے بڑا راز ہے ۔ اجتماعیت اور اتحاد ہمیشہ وہاں نہیں ہوتا جہاں ہر آدمی اپنے کو بڑا سمجھ لے ۔ اس کے برعکس جہاں تمام لوگ کسی ایک کے حق میں اپنی انفرادی بڑائی سے دست بردار ہو جائیں وہاں اتحاد اور اجتماعیت کے سوا کوئی اور چیز پائی نہیں جاتی ۔ بے اتحادی بڑائیوں کی تقسیم کا نام ہے اور اتحاد بڑائیوں کی وحدت کا ۔

اسی طرح حج کا ایک اہم رکن طواف ہے ۔ دنیا بھر کے لوگ جو حج کے موسم میں مکہ میں جمع ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے کعبہ کا طواف کرتے ہیں ۔ یہ اس بات کا عملی اقرار ہے کہ آدمی اپنی کوششوں کا مرکز و محور صرف ایک نقطہ کو بنائے گا ۔ وہ ایک ہی دائرہ میں حرکت کرے گا ۔ یہ عین وہی مرکزیت ہے جو مادی سطح پر نظامِ شمسی میں نظر آتی ہے ۔ نظامِ شمسی کے تمام سیارے ایک ہی سورج کو مرکزی نقطہ بنا کر اس کے گرد گھومتے ہیں ۔ اسی طرح حج یہ سبق دیتا ہے کہ انسان ایک خدا کو اپنا مرجع بنا کر اس کے دائرے میں گھومے ۔

اس کے بعد حاجی صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے ۔ وہ صفا سے مروہ کی طرف جاتا ہے اور پھر مروہ سے صفا کی طرف لوٹتا ہے ۔ اس طرح وہ سات چکر لگاتا ہے ۔ یہ عمل کی زبان میں اس بات کا سبق ہے کہ آدمی کی دوڑ دھوپ ایک حد کے اندر بندھی ہوئی ہونی چاہیے اگر آدمی کی دوڑ دھوپ کی کوئی حد نہ ہو تو کوئی ایک طرف بھاگ کر نکل جائے گا اور کوئی دوسری طرف ۔ مگر جہاں دوڑ دھوپ کی حد بندی کر دی گئی ہو وہاں ہر آدمی بندھا رہتا ہے ۔ وہ بار بار وہیں لوٹ کر آتا ہے جہاں اس کے دوسرے بھائی اپنی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے ہوں یہی حج کے دوسرے تمام مراسم کا حال ہے ۔ حج کے تمام مراسم مختلف پہلوؤں سے

لوگوں کو ایک ہونے اور مل کر کام کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ وہ ایک آواز پر حرکت کرنے کا عملی مظاہرہ ہیں۔

مرکز اتحاد

حج اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا کی طرف سفر ہے۔ عام انسان موت کے بعد خدا کے دربار میں حاضر ہوں گے، مومن موت سے پہلے ہی اپنے آپ کو خدا کے دربار میں حاضر کر دیتا ہے۔ دوسروں کی خدا کے یہاں حاضری مجبورانہ حاضری ہے۔ اور مومن کی خدا کے یہاں حاضری اختیارانہ حاضری۔ عرفات کے میدان میں بیک وقت ساری دنیا کے حاجیوں کا اجتماع یہی منظر پیش کرتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے: الحج عرفة (عرفہ ہی حج ہے)

تاہم حج ایک جامع عبادت ہے۔ اس میں دوسرے تمام پہلو بھی براہ راست یا بالواسطہ انداز میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ انھیں مزید فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ حج عالمی اسلامی اتحاد کا ذریعہ ہے کعبہ گویا وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد دنیا بھر کے خدا پرستوں کا عبادتی دائرہ قائم ہوتا ہے۔

عرفات کی حاضری کا اصل پہلو وہی ہے جو اخروی ہے۔ تاہم اس میں اہل اسلام کے اتحاد کا بھی گہرا راز چھپا ہوا ہے۔ کیوں کہ اتحاد ایک مرکز پر جمع ہونے کا نام ہے۔ مسلمان جب حج کے موقع پر اپنے رب کے گرد اکٹھا ہوتے ہیں تو اس عمل کے دوران وہ اس مرکزی نقطہ کو بھی دریافت کر لیتے ہیں جو ان کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کر سکے۔ وہ اپنی آخرت کا راز پانے کے ساتھ اپنی دنیا کا راز بھی پا لیتے ہیں۔

میرے سامنے دیوار پر بیت اللہ کی تصویر ہے۔ وسیع مسجد کے درمیان کعبہ کی جانی پہچانی عمارت ہے اور اس کے چاروں طرف لاکھوں انسان گول دائرہ میں اپنے رب کے آگے جھکے ہوئے عبادت کر رہے ہیں۔ یہ سالانہ اجتماعی نماز ہے جو ہر بار حج کے مہینہ میں ادا کی جاتی ہے۔ اس میں دنیا بھر کے ۲۵ لاکھ سے زیادہ مسلمان شرکت کرتے ہیں۔ یہ پوری طرح ایک مرئی واقعہ ہے اور اس کا فوٹو لیا جا سکتا ہے۔

مگر کعبہ کو قبلہ بنا کر اس کے گرد نماز پڑھنے والے صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو حرم کعبہ میں دکھائی دیتے ہیں، حرم کعبہ کے باہر کے مسلمانوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ تمام عرب کے لوگ

اسی طرح روزانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح سارے ایشیا اور افریقہ کے مسلمان بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ دائرہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سارے کرۂ ارض پر پھیل جاتا ہے۔

تصور کی آنکھوں سے دیکھئے تو جو واقعہ صحن کعبہ میں ہوتا ہے وہی واقعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر ہر روز ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ساری دنیا کے لوگ روزانہ پانچ بار کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔

وہ ساری دنیا میں کعبہ کے چاروں طرف کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا ہر روز پانچ بار روئے زمین پر مسلمانوں کا گول دائرہ بنتا ہے۔ درمیان میں کعبہ ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کے گرد دائرہ بنائے ہوئے مسلمان نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عظیم اور مکمل اجتماعیت ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے مذہبی یا غیر مذہبی گروہ کے یہاں نہیں ملتی۔

یہ ایک عظیم الشان نظام ہے جو ہزاروں سال کی تاریخ کے ذریعہ قائم ہوا ہے۔ مسلمانوں کے

اندر اگر اس کا حقیقی شعور ہو اور وہ اس سے وہ سبق لے سکیں جس کے لیے یہ عظیم الشان نظام بنایا گیا ہے تو مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب آجائے ۔ ان کا ہر فرد ایک عالم گیر مقدس اجتماعیت کے ساتھ متحد ہو جائے ۔

حقیقت یہ ہے کہ کعبہ زمین پر خدا کا نشان ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اتحاد اور اجتماعیت کا نشان بھی ۔

ایکتا کے اس عظیم تربیتی نظام ہی کا یہ بھی ایک ظاہری پہلو ہے کہ تمام لوگوں سے ان کے انفرادی لباس اُتروا کر سب کو ایک ہی سادہ لباس پہنا دیا جاتا ہے ۔ یہاں بادشاہ اور رعایا کا فرق مٹ جاتا ہے ۔ یہاں مشرقی لباس اور مغربی لباس کے امتیازات فضا میں گم ہو جاتے ہیں ۔ احرام کے مشترک لباس میں تمام لوگ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کہ تمام لوگوں کی صرف ایک حیثیت ہے ۔ تمام لوگ صرف ایک خدا کے بندے ہیں ۔ اس کے سوا کسی کو کوئی اور حیثیت حاصل نہیں ۔

حج کے مقررہ مراسم اگرچہ مکہ میں ختم ہو جاتے ہیں مگر بیشتر حاجی حج سے فارغ ہو کر مدینہ بھی جاتے ہیں ۔ مدینہ کا قدیم نام یثرب تھا ۔ مگر پیغمبر اسلام نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں اس کو اپنا مرکز بنایا ۔ اس وقت سے اس کا نام مدینۃ النبی (نبی کا شہر) پڑ گیا ۔ مدینہ اسی کا اختصار ہے ۔ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی مسجد ہے ۔ یہاں آپ کی قبر ہے ۔ یہاں آپ کی پیغمبرانہ زندگی کے نشانات بکھرے ہوئے ہیں ۔

ان حالات میں حاجی جب مدینہ پہونچتے ہیں تو یہ ان کے لیے مزید اتحاد اور اجتماعیت کا عظیم سبق بن جاتا ہے ۔ یہاں کی مسجد نبوی میں وہ اس یاد کو تازہ کرتے ہیں کہ ان کا رہنما صرف ایک ہے ۔ وہ یہاں سے یہ احساس لے کر لوٹتے ہیں کہ ان کے اندر خواہ کتنے ہی جغرافی اور قومی فرق پائے جاتے ہوں ، انھیں ایک ہی پیغمبر کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے ۔ انھیں ایک ہی مقدس ہستی کو اپنی زندگی کا رہنما بنانا ہے ۔ وہ خواہ کتنے ہی زیادہ اور کتنے ہی مختلف ہوں مگر ان کا خدا بھی ایک ہے اور ان کا پیغمبر بھی ایک ۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — ۲۲

۱۔ ماہ رمضان (۱۴۰۶) میں مرکز کا ماہانہ اجتماع نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے بعد ۲۹ جون ۱۹۸۶ کو حسب معمول ماہانہ اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز دہلی میں موجود نہ تھے اس لیے حاضرین کو ان کی ایک تقریر کا ٹیپ سنایا گیا۔

۲۔ ۲۶ — ۳۰ جون ۱۹۸۶ کو ایک عالمی مذاہب کانفرنس بنگلور میں ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز بھی اس میں شریک ہوئے اور وہاں اپنا مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا ــــــ داعی کا اخلاق :
Missionary Ethics

اس سفر کی روداد آئندہ انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳۔ "الرسالہ کیسٹ" پر اخبار بلٹز، جون ۱۹۸۶ نے تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

انسانی ذہن کے ساتھ آدمی کے عقیدے اور مذہبی لگاؤ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ عوام کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے اکثر لوگوں نے مذہب کا بیوپار شروع کر دیا ہے اور روحانیت کی تلاش کو توہم پرستی میں بدلنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ اس منفی ماحول میں کچھ حضرات انسان کی روحانی ضرورت کو معقول طریقے سے پورا کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں تاکہ قلب کی پاکی کے ساتھ ذہن بھی روشن ہو جائے۔ اس سلسلہ میں مولانا وحید الدین خاں کا نام سرفہرست ہے۔ وہ اپنے تیز مشاہدہ اور سلیس تحریر کے ذریعہ مذہب کی تبلیغ اس طرح کرتے ہیں کہ دنیا دار سے دنیا دار آدمی بھی ان کی باتوں اور دلائل کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ ہر چند وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ خوشگوار فرض انجام دیتے ہیں مگر ان کی بات ان کے دل کو بھی لگتی ہے جو روایتی طور پر اسلام کے پیروکار نہیں ہیں۔ اسی نیک کام کو آگے بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانے کے لیے وحید الدین خاں صاحب اپنی مستقل تصنیفات کے علاوہ انگریزی اور اردو میں ماہوار الرسالہ تو پیش کرتے ہی رہے ہیں، انھوں نے کیسٹ کے ذریعہ بھی یہ کام شروع کیا ہے۔ یہ کیسٹ جو ۲۵ روپے میں آتا

ہر مہینہ آتا ہے۔ اس کی ششماہی اور سالانہ خریداری کا انتظام بھی ہے۔ سارے کیسٹ مولانا کی پُرتاثیر آواز میں اور کسی تکلف اور تصنع کے بغیر اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ ایک بار سن لیجئے تو پورا سنے بغیر چارہ نہیں۔ مارشل مک لوہان نے پتہ نہیں کس ترنگ میں یہ کہدیا تھا کہ الیکٹرونک کی ترقی کے ساتھ چھپا ہوا لفظ مر جائے گا۔ مگر مولانا کے تبلیغی کیسٹ کو سننے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ سائنسی ایجادات سے ترسیل و ابلاغ کا زیادہ سے زیادہ مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کا انحصار استعمال کرنے والے کے حوصلہ اور نیت پر ہے۔ ظاہر ہے مولانا تحریر یا کیسٹ کے ذریعہ جو خدمت بھی کر رہے ہیں خلوص اور انسانیت کے جذبہ سے کر رہے ہیں۔ اس لیے جو لوگ اپنے دل میں انسانیت کی شمع جلائے رکھنا یا جلانا چاہتے ہیں انھیں مولانا کی تحریر اور تقریر (کیسٹ) سے فی الفور استفادہ کرنا چاہیے۔

۴۔ الرسالہ کے مضامین کثرت سے لوگوں کی زبانوں پر آکر بالواسطہ طور پر پھیل رہے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے مدرسہ کے شیخ الحدیث اپنی تقریروں میں آپ کی تصانیف کے اقتباسات پورے حوالے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ میں نے ان سے آپ کی تازہ تصنیف "عظمتِ قرآن" کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ فوراً یہ کتاب منگوا کر مجھے دو۔ مجھے لیلۃ القدر کے موضوع پر ۲۶ رمضان کو مسجد میں تقریر کرنا ہے۔ اس سے پہلے میں اس کتاب کو پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اس موضوع پر کوئی نیا علمی مواد اسی کتاب میں مل سکتا ہے۔ (۱۷ مئی ۱۹۸۶)

۵۔ دوسرے متعدد اخبارات کی طرح بمبئی کے کثیر الاشاعت اخبار "انقلاب" نے بھی الرسالہ کے مضامین چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ مضمون "اوروں کی زبانی" کے عنوان کے تحت نقل کیا جاتا ہے اور بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

۶۔ جناب خالد بن عمر (دبئی) الرسالہ انگریزی پابندی کے ساتھ منگا کر پڑھتے ہیں۔ ان کا خط مورخہ ۷ مئی ۱۹۸۶ موصول ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"AL-RISALA" is worth reading even for non-Muslims"
I always say the above to my selected friends

۷۔ جناب ضیار الدین باباخانوف کا خط تاشقند (روس) سے موصول ہوا ہے۔ اس خط پر

۱۱ مئی ۱۹۸۶ کی تاریخ درج ہے اور اس میں ادارہ الرسالہ کو رمضان کے مہینہ کی مبارکباد دی گئی ہے۔ یہ خط "النظارۃ الدینیہ لمسلمی آسیا الوسطی وقازاقستان" کے پیڈ پر ہے جس کا صدر دفتر تاشقند میں ہے۔ ہمارے یہاں سے ان کو الرسالہ نہیں بھیجا جا رہا ہے مگر خط پر نہایت صحت کے ساتھ وہ پتہ درج ہے جو انگریزی الرسالہ میں ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی الرسالہ کو اللہ تعالیٰ روس کے حدود کے اندر بھی پہونچا رہے ہیں۔

۸۔ اسلامی مرکز کی کتابیں خدا کے فضل سے ہر طبقہ میں مقبول ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط یہاں نقل کیا جاتا ہے: "آپ کی لکھی کتاب 'اللہ اکبر' پڑھی۔ دنیا کے عجائبات دیکھ کر اس میں کھو جانے والے سب ہی ہیں لیکن عجائبات کو دیکھ کر ان میں نہ کھوتے ہوئے خدا میں کھو جانا خدا کو پا لینا ہے۔ شکایت انسان سے ہے جو بڑا کاریگر ہے۔ وہ گنے کی گنڈیریوں کو چوستا ہے اور گانٹھوں کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ ساہتیہ اور وگیان میں دھیرے دھیرے چھپی نافرمانیاں شروع ہو چکی تھیں جو آگے چل کر شاید ناستکتا کی شکل لے لیتی۔ آپ کی تیکھی نظر سے وہ نہ چھپ سکی۔ ایسی سب گانٹھوں کو آپ نے اس کتاب میں اکٹھا کر کے ان کو سب سے زیادہ رسیلا بنا دیا۔ گنے کے کھانے والوں کو لطف آگیا اور منہ سے نکل پڑا: اللہ اکبر کیا ذائقہ ہے ان گنڈیریوں میں جن کو ہم پھینکے چلے جا رہے تھے۔ اس طرح کی اللہ کی تعریف میں ریت سے تیل نکالنے والی یہ پہلی بے مثال کتاب ہے۔ اس کی ہر سطر اور ہر سطر کا ہر لفظ تسبیح کے چھوٹے بڑے موتی ہیں۔ مالا پھیرنے والا خود کی آخرت پر نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ مالا ہے جس نے دنیا کو آخرت سے جوڑ دیا۔ ہرے درختوں میں سے پکے کونپل پتے پھول پھل سب نے نکلتے دیکھا ہے۔ سوکھے درخت لہلہا اٹھیں یہ اس کتاب کا کمال ہے۔ ہر دین والا سب سے پہلے اللہ والا ہے۔ اللہ والا ہری ڈال ہے۔ ہری ڈال مڑنا جانتی ہے۔ لچیلی ہوتی ہے۔ اس کو پڑھ کر بے دین بادین ہو گئے۔ اگر یہ کتاب ہندی میں آجائے تو ہزاروں بھولے بھٹکوں کو خدا کے انکار سے بچایا جا سکتا ہے۔

(پریم نارائن گپتا ایڈووکیٹ، بھوپال)

۹۔ الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے باہر کے ملکوں میں پھیل رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف علاقوں سے خطوط آتے رہتے ہیں۔ ایک خط (۱۲ رجب ۱۴۰۶ھ) نائجیریا سے موصول ہوا ہے۔ یہ پورا خط اگلے صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

Sa'adatu D Aiyu
Nigerian Television Authority
P.M.B. 3343
KANO

12 Rajab 1406 AH

The Editor
AL-RISALA
C-29 Nizamuddin West
New Delhi 110 013
India

Dear Brother,

I have had the unmistakably golden opportunity of coming across an issue of your publication AL-RISALA, March 1986, No 26 and I am highly well impressed. It was quite a rare experience to see such correct thought and belief in such Islamically profound, yet appealingly modern garb. It is indeed a decisive step in the cause of making Islam what is meant to be a universal religion. I prey to Allah for our continued enlightenment and guidance on His way.

I would please like to know the full details: its history, base, distribution, scope, programmes, plans and names of any other publications you might have besides the "Introduction to Islam Series". I would indeed like to join hands in the noble cause with you there but I would first of all like to know how I could subscribe to obtain copies for I know they will help me in my own efforts which I am currently making on some muslim and non-muslim brothers and sisters who are currently in the process of experiencing the light through my humble self. Your publications—AL-RISALA and the "Introduction to Islam series" would go a long way in complementing my own various efforts. Please acquaint me with all necessary and relevant information without delay.

Yours in God,

(Mrs) Sa'adatu D. Aliyu (NYSC)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

Regd No D(SE) 243
Regd R N No 28822/76

August 1986
Number 117

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ
آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے

ستمبر ۱۹۸۶
شمارہ ۱۱۸

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراطِ مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad The Prophet of Revolution	50 -
The Way to Find God	4 -
The Teachings of Islam	5 -
The Good Life	5 -
The Garden of Paradise	5 -
The Fire of Hell	5 -
Muhammad The Ideal Character	4
Man Know Thyself	4

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۸ — ستمبر ۱۹۸۶

فہرست

رسول اللہؐ کا کردار

طائف کی وہ شام بھی کس قدر بھیانک تھی جب شہر کے لڑکے پیغمبر اسلام کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر لے جا رہے تھے۔ آپ مکہ سے پچاس میل کا سفر طے کر کے حجاز کے رئیسوں کے گرمائی صدر مقام پہنچے تھے تاکہ انھیں دین اسلام کی دعوت دیں۔ مگر طائف کے رئیسوں نے آپ کے خیر خواہانہ پیغام کو سننے کے بجائے شہر کے اوباش لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ لڑکے اس وقت تک آپ کا پیچھا کرتے رہے جب تک سورج نے غروب ہو کر آپ کے اور ان لڑکوں کے درمیان تاریکی کا پردہ نہ ڈال دیا۔

آپ کا جسم زخموں سے چور تھا۔ سر سے پیر تک آپ خون میں نہائے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے تھک کر انگور کے ایک باغ میں پناہ لی۔

غور کیجئے یہ کسی آدمی کے لئے کتنا نازک وقت ہوتا ہے۔ آپ نے خود ایک بار حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا کہ طائف کی یہ شام میری زندگی کی سخت ترین شام تھی۔ مگر آپ کی زبان سے اس انتہائی سنگین موقع پر بھی اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی برا کلمہ نہیں نکلا۔ بلکہ آپ نے فرمایا ــــ" خدایا انھیں صحیح راستہ دکھا۔ کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

رسول اللہؐ کا یہی اخلاق تھا جس نے آپ کے دشمنوں کو اس طرح زیر کیا کہ سارے عرب نے آپ کے پیغام کو قبول کر لیا۔ آپ کے اعلیٰ کردار کے آگے کوئی تعصب، کوئی دشمنی اور کوئی ہٹ دھرمی ٹھہر نہ سکی۔ آپ کی بلند سیرت لوگوں کو جادو کی طرح مسخر کرتی چلی گئی۔

آپ نے ایک بار فرمایا " صلۂ رحمی یہ نہیں ہے کہ صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔ بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو (بخاری۔ کتاب الادب) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار اسلام کے کچھ دشمنوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ پر زنا کی تہمت لگائی جو قطعاً جھوٹ اور بے بنیاد تھی۔ اس فرضی داستان کو گھڑنے اور اس کو پھیلانے میں ایک شخص مسطح نامی بھی شریک تھا جو حضرت ابو بکر رضؓ کا رشتہ دار تھا۔ اس شخص کو ضرورت مند سمجھ کر حضرت ابو بکر اس کو کچھ ماہانہ رقم دیا کرتے تھے۔ جب حضرت ابو بکر کو معلوم ہوا کہ ان کی صاحبزادی پر جھوٹی تہمت لگانے میں مسطح بھی شریک رہا ہے، تو آپ نے اس کی امدادی رقم بند کر دی۔ اس پر اللہ کے رسول کے اوپر یہ آیت اتری کہ اگر کوئی شخص معاشی حیثیت سے ضرورت مند ہے تو اس کے اخلاقی جرم

کی وجہ سے اس کی مالی امداد بند نہ کرو۔ بلکہ اس کے جرم سے درگذر کرتے ہوئے اس کی معاشی امداد جاری رکھو۔

اسی طرح حضرت ابو بکر ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بار وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر آپ کو گالی دی۔ حضرت ابو بکر پہلی بار گالی سن کر چپ رہے دوسری بار اس نے گالی دی تو اس وقت بھی آپ چپ رہے۔ مگر اس نے جب تیسری بار بدزبانی کی تو آپ خاموش نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہؐ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابو بکر نے عرض کیا۔ یارسول اللہ کیا آپ مجھ سے خفا ہو گئے۔ فرمایا" ابو بکر جب تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا۔ جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا"۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الانتصار)۔

گویا برائی کے جواب میں جب آدمی اپنی طرف سے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتا تو وہاں خدا اس کی طرف سے انتقام لینے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ مگر جب آدمی خود انتقام لینے پر اتر آئے تو خدا اس کے معاملہ کو اس کے حوالے کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی انسان خدا سے بہتر انتقام نہیں لے سکتا۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم سے کچھ اشرفیاں قرض لیں۔ اس کے بعد ایک روز وہ تقاضے کے لئے پہنچا۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس تمہارا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ یہودی نے جواب دیا " جب تک تو میرا قرض ادا نہ کرے گا میں تجھ کو نہیں چھوڑوں گا"۔ چنانچہ ظہر کے وقت سے لے کر وہ اگلی صبح تک آپ کا دھرنا دیے بیٹھا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مدینہ میں آپ کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے اس کو ڈانٹ کر بھگانا چاہا مگر آپ نے سب کو منع کر دیا۔ لوگوں نے کہا" حضور ایک یہودی آپ کو قید کئے ہوئے ہے"۔ آپ نے فرمایا کہ" ہاں۔ مگر مجھے ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے"۔ جب دوسرا دن شروع ہوا تو یہودی کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ کے اس عمل سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔ یہ یہودی مدینہ کا ایک بہت مالدار شخص تھا۔ کل تک اس نے چند اشرفیوں کے لئے آپ کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اور اب آپ کے اعلیٰ کردار سے اتنا متاثر ہوا کہ ساری دولت آپ کے سامنے حاضر کر دی اور کہا کہ اس کو آپ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ (بیہقی)

عبداللہ ابن ابی الحماد بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار میں نے خرید وفروخت کا کوئی معاملہ کیا۔ ابھی معاملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ مجھے کچھ ضرورت پیش آگئی۔ میں نے کہا کہ آپ ٹھہریئے۔ میں گھر سے واپس آتا ہوں تو بقیہ معاملہ کو مکمل کرتا ہوں۔ مگر واپس آنے کے بعد میں ایسا

مشغول ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین روز بعد مجھ کو اپنا وعدہ یاد آیا تو میں اس مقام پر پہنچا، دیکھا کہ وہاں رسول اللہ موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا " تم نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ میں تین روز سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں " (ابوداؤد)

اس طرح کے عمل میں اتنی کشش ہے کہ کٹر سے کٹر آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہودیوں کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا السام علیکم (تباہی ہو تم پر) حضرت عائشہؓ سے نہیں رہا گیا۔ انھوں نے کہا " بلکہ تم لوگ غارت ہو جاؤ اور تم پر خدا کی لعنت ہو " آپ نے سنا تو منع فرمایا۔ آپ نے کہا " خدا مہربان ہے اور وہ ہر کام میں مہربانی کو پسند کرتا ہے " حقیقت یہ ہے کہ دشمن کا دل جیتنے کے لئے اس سے بڑا کوئی حربہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی بدزبانی کا جواب نرم باتوں سے دیا جائے۔ ہتھیار کے حملے کی تاب لانا تو ممکن ہے مگر کردار کے حملے کے مقابلے میں کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ یہاں ہر شخص کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر تین شرطوں کے ساتھ قریش سے معاہدہ کیا تھا جن میں سے ایک شرط یہ تھی :

جو غیر مسلم اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے یہاں چلا جائے اس کو وہ واپس کر دیں گے مگر جو مسلمان ہمارے پاس آجائے گا ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔

یہ معاہدہ ہو رہا تھا کہ مکہ سے ایک مسلم نوجوان ابو جندلؓ حدیبیہ پہنچے۔ ان کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں مکہ والوں نے قید کر رکھا تھا اور وہ بیڑیاں پہنے ہوئے گرتے پڑتے اس حال میں یہاں پہنچے تھے کہ ان کا جسم بیڑیوں کی رگڑ سے زخمی ہو رہا تھا۔ وہ فریاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے دشمنوں کے چنگل سے بچائیے۔

یہ بے حد نازک موقع تھا۔ تمام صحابہ کی تلواریں کھنچ گئیں۔ ابو جندل کے جذباتی واقعہ کے بعد ہر شخص کا رجحان یہ ہو گیا کہ معاہدہ کو کالعدم کر کے ابو جندل کی زندگی کو بچایا جائے۔ دوسری طرف مکہ والوں نے کہا " محمد ! یہ معاہدہ کی تعمیل کا پہلا موقع ہے " خدا کے رسول نے فیصلہ کیا کہ جو معاہدہ ہو چکا ہے اب اس سے ہم پھر نہیں سکتے۔ چنانچہ انھیں دوبارہ مکہ والوں کے حوالے کر دیا گیا۔

بظاہر اس واقعہ کے معنی صرف یہ تھے کہ مظلوم کو دوبارہ ظالم کے چنگل میں دے دیا جائے۔ مگر اس واقعہ میں وعدہ پورا کرنے کا جو شاندار مظاہرہ ہوا اس نے ظالموں کو اندر سے پچھاڑ دیا۔ اگرچہ وہ ابو جندل کو اپنے ساتھ لے گئے اور انھیں اپنے یہاں قید میں رکھا۔ مگر ایفائے عہد

کی اس بلند ترین علامت کو دیکھ کر مکہ کے لوگ اتنی کثرت سے مسلمان ہونے شروع ہوئے کہ قید و بند کی حالت میں بھی ابوجندل انھیں ایک زبردست خطرہ معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس میں عافیت سمجھی کہ ان کو رہا کر کے مکہ کے باہر بھیج دیا جائے۔ (صحیحین)

حضرت ابوہریرہؓ مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نجد کے دشمنوں کی طرف چند سوار بھیجے۔ وہ شہر یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال کو راستہ میں پا گئے اور اسے گرفتار کر لائے۔ اور مدینہ لاکر مسجد کے ایک ستون سے اسے باندھ دیا۔ رسول اللہ اس کے پاس آئے اور حال دریافت کیا۔ ثمامہ نے جواب دیا "اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو میری قوم تم سے میرے خون کا بدلہ لے گی، اور اگر مجھ پر احسان کر کے چھوڑ دو گے تو عمر بھر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ اور اگر مال کی خواہش ہے تو جتنا مال چاہو میں پیش کرنے کو تیار ہوں" رسول اللہؐ نے اس کی رہائی کا حکم دیدیا۔

یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں بہت عجیب تھا۔ کیوں کہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن کے ہاتھ آجانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ نے اس کے جسم کو تو قتل نہیں کیا مگر اپنے اخلاقی عمل سے اس کی روح کو قتل کر دیا۔ چنانچہ قید سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد نبوی میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کس لئے دوبارہ یہاں آیا ہے۔ مگر جب اس نے بلند آواز سے کلمہ شہادت ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے اسے رہا کر کے در اصل ہمیشہ کے لیے گرفتار کر لیا تھا۔

اس کے بعد ثمامہ عمرہ کرنے کے لئے مکہ گیا جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے کہا "تم بے دین ہو گئے"۔ ثمامہ نے جواب دیا "بے دین نہیں ہوا۔ البتہ محمد کے دین کو قبول کر لیا ہے"۔

اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی، ان میں یمامہ ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ انھوں نے مکہ والوں سے کہا کہ سن لو! محمد کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی تمہارے یہاں نہیں آئے گا۔" (صحیح مسلم)

کردار بظاہر ایک بے قیمت چیز ہے۔ مگر اس کو دے کر آدمی کیسی کیسی قیمتی چیزوں کو خرید لیتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۹ جون ۱۹۶۸ کو نشر کیا گیا۔

جھوٹی بڑائی

ایک صاحب کا قصہ ہے۔ ان کے دادا کامیاب تاجر تھے۔ مگر بعد کو ان کی تجارت ختم ہوگئی۔ والد اور والدہ کا بچپن میں انتقال ہوگیا۔ مذکورہ صاحب کے حصہ میں باپ دادا کا مال تو نہ آیا البتہ یہ احساس انھیں وراثت میں ملا کہ "میرے باپ دادا بڑے آدمی تھے"۔

وہ ابھی نوجوان تھے کہ انھیں معلوم ہوا کہ قصبہ کے ڈاک خانہ میں پوسٹ مین کی جگہ خالی ہے۔ وہ درخواست دے کر پوسٹ مین ہوگئے۔ لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ تمہاری تعلیم صرف آٹھویں کلاس تک ہوئی ہے، تم کوشش کرکے ہائی اسکول کرڈالو۔ اس کے بعد تم آسانی سے مقامی ڈاک خانہ میں پوسٹ ماسٹر ہوجاؤگے۔ اسی کے ساتھ کچھ گھر کی کھیتی ہے۔ دونوں کو ملاکر آسانی سے تمہاری ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔ مگر ان کے جھوٹے فخر کی نفسیات اس میں رکاوٹ بن گئی کہ وہ کسی کا مشورہ مانیں۔ مزید یہ ہوا کہ جھوٹی بڑائی کے احساس کی بنا پر اکثر وہ ڈاک خانہ کے کارکنوں سے لڑجاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک روز انھوں نے پوسٹ ماسٹر سے جھگڑا کرلیا اور کام چھوڑ کر چلے آئے۔

پوسٹ آفس کی ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ بے کار پڑے رہے۔ نہ کوئی دوسرا کام کیا اور نہ تعلیم حاصل کی۔ ان کا مشغلہ صرف یہ رہ گیا کہ اپنی فرضی بڑائی کے تذکرے کریں اور اس کے ذریعہ جھوٹی تسکین حاصل کرتے رہیں۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد کھیتی سے کام چلتا رہا جس کو وہ بٹائی پر دیئے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے چھ بچے ہوگئے۔ اب مسائل نے پریشان کرنا شروع کیا۔ تاہم ان کی جھوٹی بڑائی کا احساس دوبارہ اس میں رکاوٹ بنا رہا کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کریں۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان سے لڑنے لگے۔ مگر اس غیر حقیقت پسندانہ رویہ نے صرف ان کی بربادی میں اضافہ کیا یہاں تک کہ ان کا ذہنی توازن خراب ہوگیا۔

موجودہ دنیا حقیقتوں کی دنیا ہے۔ یہاں حقیقت سے مطابقت کرکے آپ سب کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ اور اگر آپ حقیقت سے مطابقت نہ کریں تو آپ کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ خدا کی اس دنیا میں جھوٹی بڑائی سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔ یہاں جھوٹی بڑائی سے زیادہ تباہ کن کوئی ذہنیت نہیں۔

سب کا فائدہ

ایک لطیفہ ہے کہ شہنشاہ اکبر نے ایک روز اپنے خاص درباری بیربل سے کہا : بیربل، اگر ایک بادشاہ کی بادشاہت ہمیشہ رہتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ بیربل نے جواب دیا : عالی جاہ، آپ نے بجا فرمایا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو آج آپ بادشاہ کیوں کر ہوتے۔

اکبر نے بادشاہت کو اپنی ذات سے شروع کیا۔ اس نے سوچا کہ اگر دنیا میں یہ اصول رائج ہو کہ ایک بادشاہ ہمیشہ باقی رہے تو میں ہمیشہ اسی طرح بادشاہ بنا رہوں گا۔ اکبر بھول گیا کہ بادشاہت کا سلسلہ تو دنیا میں اس وقت سے ہے جب کہ وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ ایسی حالت میں اگر اکبر کا پسندیدہ اصول دنیا میں رائج ہوتا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی کہ اکبر بادشاہ بن کر تخت پر بیٹھے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذات کو سامنے رکھ کر سوچتا ہے۔ وہ صرف ذاتی مفاد کے تحت اپنے گرد ایک نقشہ بنا لیتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس دنیا میں وہ اکیلا نہیں ہے۔ چنانچہ بہت جلد خارجی حقیقتیں اس سے ٹکراتی ہیں اور اس کے نقشہ کو توڑ ڈالتی ہیں۔ اس وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذاتی مفاد بھی اسی میں تھا کہ وہ مجموعی مفاد کا لحاظ کرتا۔

اگر آپ اپنی ذات کا فائدہ چاہتے ہوں تب بھی آپ کو سب کا فائدہ چاہنا چاہیے۔ سب کے فائدے میں آپ کا اپنا فائدہ بھی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی ایک اجتماعی کشتی میں سوار ہے۔ کشتی کے بچاؤ میں اس کی اپنی ذات کا بچاؤ بھی اپنے آپ شامل ہے۔

جن لوگوں کو اس دنیا میں کچھ مواقع ملتے ہیں وہ اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنی ذات کے لحاظ سے اصول اور قاعدے بنانے لگتے ہیں۔ وہ جس طریقے میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اس کو رائج کرنے لگتے ہیں مگر یہ طریقہ اکثر الٹا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں کوئی شخص ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا۔ مواقع کبھی ایک شخص کے ہاتھ میں آتے ہیں اور کبھی وہ دوسرے کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں محض اپنی ذات کو سامنے رکھ کر قواعد بنانا عقل مندی نہیں۔ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ حالات بدلیں اور جو چیز پہلے آپ کو اپنے موافق نظر آتی تھی وہ بعد کو آپ کے مخالف بن جائے۔ اپنی ذات کو مرکز بنا کر سوچنا باعتبار حقیقت نہ اپنی ذات کے لیے مفید ہے اور نہ بقیہ انسانیت کے لیے۔

بڑا کام کرنے والے

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ انسان جس کا حال یہ ہو کہ وہ جو کچھ کرے اس کی قیمت مع اضافہ کے وصول کرنا چاہے۔ دوسرا انسان وہ ہے کہ وہ جو کچھ کرے اسے بھول جائے۔ اسے اپنے کیے کا کوئی معاوضہ نہ ملے تب بھی وہ کوئی شکایت اپنے دل میں نہ لائے۔ اس کی تسکین کا سامان یہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو مقصد میں لگائے ہوئے ہے نہ یہ کہ اس کو اس کے عمل کا فوری معاوضہ مل رہا ہے۔

پہلی قسم کے لوگ بھی انسان ہیں اور دوسری قسم کے لوگ بھی انسان۔ مگر دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ظاہری صورت کے سوا دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ پہلی قسم کے لوگ صرف بازار چلاتے ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کے لوگ تاریخ بناتے ہیں۔

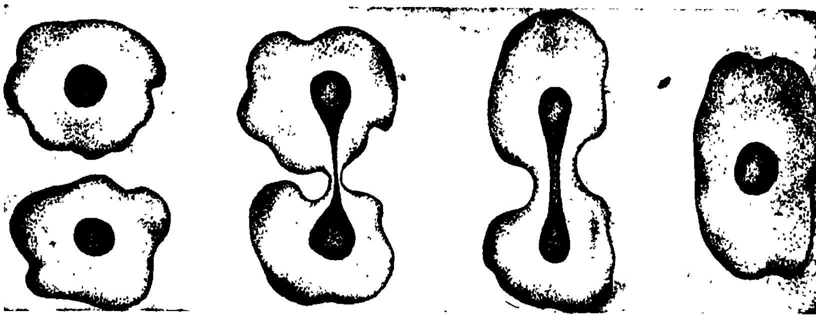
یہی دوسری قسم کے لوگ انسانیت کا اصل سرمایہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے ہمیشہ اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ مل کر کام کریں۔ جب اس طرح لوگ ملتے ہیں تو کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کوئی کریڈٹ پاتا ہے اور کوئی بے کریڈٹ رہ جاتا ہے۔ کسی کا استقبال ہوتا ہے اور کوئی دیکھتا ہے کہ وہ نظر انداز کیا جارہا ہے۔ یہ صورتِ حال بالکل فطری ہے۔ یہ فرق ہمیشہ پیش آتا ہے۔ خواہ وہ کوئی عام تحریک ہو۔ یا کسی پیغمبر کی تحریک ہو۔ ایسی حالت میں متحدہ کوشش کو باقی رکھنے کی واحد قابلِ عمل صورت صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے حقوق کو بھول جائیں اور صرف اپنی ذمہ داری کو یاد رکھیں۔

اس مزاج کی ضرورت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اجتماعی جدوجہد میں کچھ لوگ بے معاوضہ رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اس لیے بھی ہے کہ ملنے والا معاوضہ اکثر آدمی کے اپنے اندازہ سے کم ہوتا ہے۔ چنانچہ معاوضہ ملنے پر بھی وہی تمام شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ سرے سے کوئی معاوضہ نہ ملا ہو۔

بڑا کام کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کا حال یہ ہو کہ ان کا عمل ہی ان کا معاوضہ بن جائے۔ اپنی ذمہ داری کو بھرپور طور پر ادا کر کے ان کو وہ خوشی حاصل ہو جو کسی شخص کو اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کے کام کے نتیجہ میں اس کو کوئی بہت بڑا انعام حاصل ہو جائے۔

ٹوٹنے کے بعد

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ اس کا ٹوٹنا ہمیشہ کے لیے ٹوٹنا بن جائے گا۔ لکڑی اپنے وجود کو دوبارہ پہلے کی طرح ایک نہیں بنا سکتی۔ مگر زندہ چیزوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ زندہ چیز ٹوٹنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ ایک زندہ امیبا جب ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ امیبا بن جاتا ہے۔



ہماری دنیا میں اس طرح کے واقعات خدا کی عظیم نشانی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک زندہ انسان کے لیے خدا نے اس دنیا میں کتنا بڑا امکان چھپا رکھا ہے۔ یہ امکان کہ اس کی کوئی بھی شکست آخری شکست نہ بنے۔ کوئی بھی حادثہ اس کو آخری طور پر ختم نہ کرنے پائے۔ ایک زندہ چیز یا ایک زندہ انسان کو کبھی توڑا نہیں جا سکتا۔ زندہ چیز اگر ٹوٹتی ہے تو اس کا ہر حصہ ایک نئے زندہ وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور نتیجۃً پہلے سے بھی زیادہ عظیم بن جاتا ہے۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے کہ ناکامی اس کو فکری گہرائی عطا کرتی ہے۔ رکاوٹیں اس کے ذہن کے بند دروازے کو کھولتی ہیں۔ حالات اگر اس کے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو اس کا ہر ٹکڑا دوبارہ نئی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔

اس امکان نے اس دنیا میں کسی انسان کو ابدی طور پر ناقابل تسخیر بنا دیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ زندہ ہو، وہ ٹوٹنے کے بعد دوبارہ اپنی قوتوں کو متحد کرنا جانتا ہو۔ بازی کھونے کے بعد وہ اپنا حوصلہ نہ کھوئے۔ ایک کشتی ٹوٹنے کے بعد وہ دوبارہ نئی کشتی کے ذریعہ اپنا سفر شروع کر سکے۔

قومی روایات

مسٹر سرجیت سنگھ برنالہ پنجاب کے چیف منسٹر ہیں۔ ان کے حکم سے ۳۰ اپریل ۱۹۸۶ کو مسلح پولیس امرتسر کے گردوارہ میں داخل ہوئی تاکہ وہاں سے دہشت پسندوں کو نکالے۔ یہ واقعہ سکھ روایات کے خلاف تھا۔ اس سے گردوارہ کا تقدس مجروح ہوا۔ چنانچہ اکال تخت نے مسٹر برنالا کو ۷ مئی ۱۹۸۶ کو اپنے یہاں بلایا اور ان کے کفارے کے لیے چند سزاؤں کا اعلان کیا۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ مسٹر برنالا کسی گردوارہ میں ایک ہفتہ تک لوگوں کے جوتے صاف کریں۔ مسٹر برنالا نے اس فیصلے کو قبول کرلیا اور اکال تخت کے فیصلہ کے مطابق ایک ہفتہ تک گردوارہ کے جوتے صاف کرتے رہے۔ اس واقعہ پر اخباروں میں سخت تبصرے کیے گئے۔ ٹائمس آف انڈیا نے لکھا کہ برنالا اپنے آپ کو بے عزت کر رہے ہیں:

Barnala humiliates himself. (May 19, 1986)

اس سلسلہ میں مسٹر برنالا کی ایک گفتگو اخبارات میں آئی ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے:

The Chief Minister said he accepted the verdict of the Akal Takht in all humility as a devout Sikh for the glory of the Panth and to maintain the highest Sikh traditions.

چیف منسٹر نے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اکال تخت کے فیصلہ کو ایک سچے سکھ کی طرح پوری انکساری کے ساتھ پنتھ کی عظمت کے لیے قبول کیا ہے۔ اور اس لیے تاکہ اعلیٰ سکھ روایات برقرار رہ سکیں۔

قومی زندگی ہمیشہ روایات پر چلتی ہے۔ یہ روایتیں قوم کے بڑے لوگ بناتے ہیں اور وہی اس کو توڑتے بھی ہیں۔ اعلیٰ روایات کے بغیر کوئی قوم اعلیٰ ترقی نہیں کرسکتی۔ وہ قوم خوش قسمت ہے جس کے بڑے لوگ اعلیٰ روایات کو باقی رکھنے والے ہوں خواہ اس کی خاطر انھیں اپنی ذات کو نیچے گرادینا پڑے۔ اس کے برعکس وہ قوم بدقسمت ہے جس کے بڑے لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اپنی قومی اور اخلاقی روایات کو توڑ ڈالیں۔ وہ اپنی ذات کو اونچا رکھنے کے لیے اپنی قوم کو نیچا کریں۔

مرد اور عورت کا فرق

انگریز مستشرق ایڈورڈ ولیم لین (۱۸۷۶ - ۱۸۰۱) نے قرآن کے منتخب حصوں کا انگریزی ترجمہ تیار کیا تھا۔ یہ ترجمہ پہلی بار لندن سے ۱۸۴۳ میں چھپا۔ اس ترجمہ کے ساتھ ایک دیباچہ شامل تھا۔ اس دیباچہ میں فاضل مترجم نے اسلامی تعلیمات کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کا تباہ کن پہلو عورت کو حقیر درجہ دینا ہے :

> The fatal point in Islam is the degradation of women
> Edward William Lane,
> *Selections from Kuran,*
> London 1982, p. XC (Introduction)

یہ بات اتنی عام ہوئی کہ ہر شخص بے تکلف اس کو دہرانے لگا۔ اس بیان پر اب تقریباً ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں مگر ابھی تک لوگوں کے یقین میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہندستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر چندر راچوڑ نے محمد احمد۔ شاہ بانو کیس میں ۱۹۸۵ میں جو فیصلہ دیا ہے اس میں بھی اس بیان کو اس طرح بے تکلف دہرایا گیا ہے جیسے کہ وہ کوئی مسلّمہ حقیقت ہو۔

عورت کے بارہ میں اسلام کے نقطہ نظر کو تنزیل رتبہ (Degradation) سے تعبیر کرنا اصل بات کو بگاڑ کر پیش کرنا ہے۔ عورت کے بارہ میں اسلام کا کہنا یہ نہیں ہے کہ وہ مرد سے کم ہے۔ اسلام کا کہنا صرف یہ ہے کہ عورت مرد سے مختلف ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں فرق کا معاملہ ہے نہ کہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کے بہتر ہونے کا :

Not better, but different.

ایک ڈاکٹر اپنے مریض سے کہتا ہے کہ ـــــ "آنکھ تمہارے جسم کا نہایت نازک حصہ ہے تم اپنی آنکھ کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کر سکتے جو، مثال کے طور پر، تم اپنے ناخن کے ساتھ کرتے ہو۔ اپنی آنکھ کے معاملہ میں تم کو زیادہ محتاط رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔" ڈاکٹر کی اس ہدایت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ناخن کے مقابلہ میں آنکھ کو کم تر درجہ دے رہا ہے۔ بلکہ وہ ناخن کے مقابلہ میں آنکھ کے فرق کو بتا رہا ہے۔

عورت اور مرد کے بارہ میں اسلام میں جو قوانین ہیں وہ سب اسی اصولی حقیقت پر مبنی ہیں کہ عورت اور مرد دو الگ الگ صنفیں ہیں۔ تخلیقی اعتبار سے دونوں کے اندر قطعی فرق پائے جاتے ہیں۔ اس لیے خاندانی اور سماجی زندگی میں دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہو سکتا۔ جب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی بناوٹ کے اعتبار سے فرق ہے تو ان کے درمیان عمل کے اعتبار سے بھی لازماً فرق ہونا چاہیے۔

عورت کے بارہ میں یہی تمام آسمانی مذاہب کا نقطہ نظر رہا ہے۔ پچھلی ہزاروں برس کی تاریخ میں کبھی اس پر شبہ نہیں کیا گیا۔ دور جدید میں آزادی نسواں کی تحریک (Women's Liberation Movement) نے پہلی بار دنیا میں یہ ذہن پیدا کیا کہ عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں اور دونوں کو ہر میدان میں بالکل یکساں کام کے مواقع ملنے چاہئیں۔

یہ تحریک سب سے پہلے برطانیہ میں اٹھارھویں صدی میں اٹھی۔ اور اس کے بعد پورے یورپ اور امریکہ میں پھیل گئی۔ میری وولسٹون کرافٹ (Mary Wollstonecraft) نے ۱۷۹۲ میں ایک کتاب چھاپی جس کا نام تھا:

A Vindication of the Rights of Women

اس کتاب کا خلاصہ یہ تھا:

> Women should receive the same treatment as men in education, work opportunities, and politics and that the same moral standards should be applied to both sexes (X/733).

تعلیم، روزگار اور سیاست کے میدان میں عورتوں کو وہی مواقع ملنے چاہئیں جو مردوں کو حاصل ہیں۔ ایک ہی اخلاقی معیار ہونا چاہیے جو دونوں صنفوں پر منطبق کیا جائے۔

اس بات کو اتنے زور و شور کے ساتھ اٹھایا گیا کہ ہر طرف اس کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ مرد اور عورت دونوں اس میں یکساں طور پر شریک تھے۔ حتیٰ کہ عورت اور مرد کے درمیان نابرابری کی بات کرنا پسماندگی کی علامت قرار پایا۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ فکر ساری دنیا میں چھا چکا تھا۔ اب اسی کے مطابق قوانین بنائے گئے۔ اسی کے مطابق ہر شعبہ مردوں کی طرح عورتوں کے لیے کھول دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

مگر عملاً یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ تقریباً دو سو سالہ جدوجہد کے بعد بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ عورت آج بھی تمام شعبہ حیات میں اسی طرح پیچھے ہے جس طرح وہ آزادی نسواں کی تحریک سے پہلے پیچھے تھی۔ اس تحریک کا عملی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ عورت گھر سے باہر آگئی۔ وہ ہر جگہ مردوں کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ عورت نے اپنی نسوانیت کھو دی مگر اس کی قیمت میں اس کو وہ چیز نہیں ملی جس کے لیے اس نے اپنی نسوانیت کھوئی تھی ــــــ یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے برابر مقام۔

آزادی نسواں کی تحریک کی اس مکمل ناکامی نے دوبارہ لوگوں کو اس مسئلہ کی تحقیق پر آمادہ کیا۔ ساری دنیا میں خالص سائنسی انداز میں اس کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ آخر کار یہ ثابت ہوا کہ عورت اور مرد کے درمیان تخلیقی فرق ہے۔ یہی تخلیقی فرق وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر عورت کو زندگی کے شعبوں میں مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا ــــــ عورت کے بارہ میں دینی نقطۂ نظر کو جھوٹے فلسفوں نے مشتبہ بنا یا تھا، سائنس کے حقائق نے دوبارہ اس کو ثابت شدہ بنا دیا۔

اب سوال یہ ہے جب یہ ثابت ہو گیا کہ عورت اور مرد کے بارہ میں دینی نقطۂ نظر ہی صحیح نقطۂ نظر ہے، اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ آج بھی لوگ اسی پرانی بات کو دہراتے ہیں۔ آج بھی اسلام پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ اس نے عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔

ہندستان میں حکومت کے خرچ پر یہ اسکیم شروع کی گئی ہے کہ مجاہدین آزادی (Freedom fighters) کی آوازوں کو ریکارڈ کر لیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں ان کے خیالات کو ان کی اپنی آواز میں سن سکیں۔ اس سلسلہ میں مسٹر ایس ایم جوشی کے انٹرویو کا خلاصہ اخبارات میں آیا ہے جن کی عمر ریکارڈنگ کے وقت ۸۲ سال ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک اخبار (ٹائمس آف انڈیا ۶ اپریل ۱۹۸۶) کے الفاظ میں یہ تھی:

> The Shariat of the Muslims and the Manusmruti of the Hindus — followed by both the communities for centuries — were equally and socially reactionary.

مسلمانوں کی شریعت اور ہندوؤں کی منوسمرتی جس کو دونوں فرقے صدیوں سے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یکساں طور پر اور سماجی طور پر رجعت پسند ہیں۔

اس طرح کی باتیں جو آج بھی بڑے پیمانہ پر کہی جارہی ہیں، اس پر جھنجھلانے کے بجائے ہمیں اس کے سبب پر غور کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ عورت اور مرد کے فرق کے بارہ میں جدید نظریہ ابھی تک صرف علمی تحقیق ہے، وہ ابھی تک فکری انقلاب نہ بن سکا۔ اس دنیا کا قاعدہ ہے کہ کوئی نقطۂ نظر خواہ وہ کتنا ہی مدلل ہو، وہ لوگوں کے درمیان اس وقت تک عمومی قبولیت حاصل نہیں کرتا جب تک اس کو فکری انقلاب کا درجہ نہ دے دیا جائے۔

پچھلے زمانہ میں جو انبیاء آئے، ان میں سے ہر نبی توحید کو دلائل کے اعتبار سے ثابت شدہ بناتا رہا۔ اس کے باوجود یہ ممکن نہیں ہوا کہ شرک کا خاتمہ ہو اور توحید کو عمومی غلبہ حاصل ہو جائے۔ یہ دوسرا کام صرف اس وقت ہوا جب کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب اٹھے اور اللہ کی خصوصی مدد کے ذریعہ توحید کی حقانیت کو فکری انقلاب کے درجہ تک پہونچا دیا۔

اسی طرح موجودہ زمانہ میں بھی ایک فکری انقلاب درکار ہے۔ علم جدید نے اس کے حق میں استدلالی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ اہل دین اس مہم کو آگے بڑھائیں اور اس کے حق میں ضروری جدوجہد کرکے اس کو عالمی فکری انقلاب کے درجہ تک پہونچا دیں۔ اگلی سطروں کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کو اس تاریخی جدوجہد کے لیے اٹھنے پر آمادہ کیا جا سکے۔

قیمت میں اضافہ

تمام چیزوں میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے الرسالہ کے اخراجات ناقابل برداشت حد تک بڑھ گیے ہیں۔ چنانچہ یہ تجویز ہے کہ الرسالہ کی قیمت میں اضافہ کرکے فی شمارہ چار روپیہ اور سالانہ ۴۸ روپیے کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں آخری اعلان آئندہ کیا جائے گا۔

فطرت کا فیصلہ

مغربی تہذیب کے مخصوص نظریات میں سے ایک نظریہ مرد اور عورت کی مساوات تھا۔ مغربی دنیا میں پچھلے سو سال سے اس نظریہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تجربہ سراسر ناکام ثابت ہوا ہے۔ کسی بھی شعبہ میں یہ ممکن نہ ہو سکا کہ مرد اور عورت کو برابر کا درجہ دیا جائے۔ قانون کے اعتبار سے برابر کا درجہ پاتے کے باوجود عملی طور پر دونوں سماج کے اندر برابر کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

اس فرق کے بارہ میں ابتدائً یہ کہا گیا کہ یہ فرق ماحول (Environment) کا پیدا کردہ ہے۔ مگر جدید تحقیقات اس مفروضہ کو سراسر بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مختلف شعبوں میں تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ فرق حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام تر پیدائشی ہے نہ کہ تاریخی۔

نیو یارک کے نیوز ویک (۱۸ مئی ۱۹۸۱) میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں مختلف امریکی محققین کے نتائج تحقیق درج ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ عورت اور مرد کی بناوٹ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرد کا مسائل کو حل کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہونا، عورتوں کا جذباتی طور پر سوچنا، لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ بہادرانہ انداز سے کھیلنا، ریاضیات میں مردوں کا زیادہ برتر رہنا، یہ سب دونوں صنفوں کے درمیان حیاتیاتی فرق کا نتیجہ ہے نہ کہ محض ماحول کا۔

محققین کا خیال ہے کہ قائدانہ خصوصیتیں (Leadership capacities) مردوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید تحقیقات لوگوں کو اس عقیدہ کی طرف لے جا رہی ہیں کہ سابقہ خیال کے برعکس پرورش (Nurture) نہیں بلکہ فطرت (Nature) وہ اصل عامل ہے جس نے مرد اور عورت کے عمل میں فرق پیدا کیا ہے۔ عمومی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑنے بھڑنے کی صلاحیت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر زیادہ ہوتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ دونوں کے ہارمون (Harmone) جدا جدا ہوتے ہیں اور وہی دونوں کے درمیان فرق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ محققین نے نر کے ہارمون Harmone testosterone کو مادہ کے جسم میں داخل کیا تو مادہ کے اندر نر کی خصوصیات محسوس کی جانے لگیں۔ کچھ لڑکیوں میں پیدائش سے پہلے مردانہ ہارمون داخل کر دئے گئے۔ چنانچہ پایا گیا کہ پیدائش کے بعد ان میں گڑیوں سے کھیلنے کا شوق بہت کم تھا۔ ان میں لڑکوں کی طرح جارحیت کا مزاج زیادہ پایا گیا۔

محققین نے پایا ہے کہ ہارمون خود دماغ کے ڈھانچہ کو بدل دیتے ہیں۔ نر اور مادہ کے دماغ (Brain) میں فرق پایا گیا ہے اور اس کا سبب دونوں کے ہارمون کا فرق ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ دونوں صنفوں کے درمیان ناقابل انکار فرق (Undeniable difference) موجود ہے۔

یہ تحقیقات واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ عورت اور مرد کی تخلیق میں فرق ہے اور جب دونوں میں فرق ہے تو دونوں کا دائرۂ عمل الگ الگ ہونا چاہیے۔ مگر جو لوگ لمبی مدت تک پچھلے خیال کے ساتھ وابستہ رہے ہیں وہ ابھی اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ایک مغربی عالم نے کہا:

Whether these physiological differences destine men and women for separate roles in society is another and far more delicate question.

کیا یہ عضویاتی فرق مردوں اور عورتوں کے لئے سماج کے اندر الگ الگ کردار مقرر کرتے ہیں، یہ ایک علٰحدہ اور زیادہ پیچیدہ سوال ہے (ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس سے پہلے امریکہ کے ایک اور ہفتہ وار میگزین ٹائم (۲۰ مارچ ۱۹۷۲) نے اس موضوع پر تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ میگزین کے وسیع ادارتی اسٹاف میں سے ۲۰ تعلیم یافتہ خواتین کو مقرر کیا گیا کہ وہ "جدید امریکہ میں عورتوں کی حالت" کا جائزہ لیں۔ انھوں نے ہر میدان میں اس کا جائزہ لیا اور ہر شعبہ کے ماہرین سے مدد لی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی جو خصوصی نمبر کے طور پر مذکورہ میگزین میں شائع ہوئی۔ راقم الحروف نے اس رپورٹ کا ایک خلاصہ اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی (۱۷ نومبر ۱۹۷۲) میں شائع کیا تھا۔

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ سو سالہ جدوجہد کے باوجود امریکی عورت ابھی تک اسی مقام پر ہے جہاں وہ سو سال پہلے تھی۔ مرد ابھی تک جدید امریکہ میں جنس غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ قدیم نظریہ کے مطابق، سماجی نہیں ہے بلکہ تمام تر حیاتیاتی اور نفسیاتی ہے۔ مغرب میں آزادیٔ نسواں کی تحریک سو سالہ تجربہ کے بعد اب اس رائے پر پہنچی ہے کہ حیاتیاتی حقائق عورت کو مرد کے برابر مقام دینے میں رکاوٹ ہیں۔ یہ قدرت کا ظلم ہے نہ کہ سماج کا ظلم۔ اس لئے اب ان کا مطالبہ یہ ہے کہ سائنس آف ایوجینکس کے ذریعہ رحم مادر میں جینیٹک کوڈ کو بدل دیا جائے اور اس طرح نیا حیاتیاتی نظام وجود میں لایا جائے جس میں نئے قسم کی عورتیں پیدا ہوں اور مردوں کی برتری ختم ہو کر یکساں صنفی صلاحیت کا سماج بن سکے —— یہ تجویز ایسی ہی ہے جیسے کوئی

شخص بطور خود یہ نظریہ قائم کرے کہ مچھلی اور بکری دونوں ایک ہی صنف سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے مچھلی کو بھی دودھ دینا چاہیے جس طرح بکری دودھ دیتی ہے۔ اور جب کوشش کے باوجود مچھلی دودھ نہ دے تو وہ کہے کہ ہم میڈیکل سائنس کے ذریعہ نئی قسم کی مچھلیاں پیدا کریں گے جو بکری کی مانند دودھ دینے لگیں۔

فطرت سے جنگ

کسی ڈاکٹر کو ایک روز خیال آجائے کہ منھ کا مقام چہرہ پر نہیں بلکہ پیٹ پر ہونا چاہیے اور اس کے بعد وہ آپریشن کے ذریعہ منھ کو چہرہ سے ہٹا کر پیٹ پر منتقل کرنا شروع کر دے۔ تو دنیا اس کی بیوقوفی پر ہنسے گی۔ کیوں کہ فطرت نے کسی چیز کا جو مقام متعین کر دیا ہے وہاں سے اس کو ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ہماری کامیابی یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھ کر معاملہ کریں۔ نہ کہ خود ساختہ نظریہ کے تحت اشیاء کی ترتیب بدل کر ایک نیا نقشہ بنانے کی مہم شروع کر دیں۔

اسی تخیل پسندی کی ایک مثال عورت کا مسئلہ ہے۔ جدید تہذیب نے زندگی کا نیا نقشہ بنانا شروع کیا تو اس میں اس کا ایک نعرہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات ہونی چاہیے۔ اس خوش نما تخیل کو وجود میں لانے کے لیے خاندان اور معاشرت کا سارا ڈھانچہ الٹ پلٹ دیا گیا۔ مگر آخر میں جو چیز حاصل ہوئی وہ یہ کہ عورت گھر سے باہر تو آگئی، مگر عملی زندگی میں وہ مرد کی ہم سر نہ ہو سکی۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یہاں فطرت نے انسانی تخیل کا ساتھ نہیں دیا۔

ایک روسی سائنس داں انٹون نملوف جو خواہش کی حد تک خود بھی عورت اور مرد میں کامل مساوات دیکھنا چاہتا ہے، اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ حیاتیات میں ہماری اس خواہش کے لیے بنیاد موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ عملاً یہ چیز اب تک حاصل نہ ہو سکی۔

وہ سائنس کے تجربات اور مشاہدات پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

" آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام تمدن میں محدود حقوق دیئے جائیں تو کم سے کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیے کہ مساواتِ مرد و زن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی، جتنی سوویت روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں

اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گیے ۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے ۔" (صفحہ ٦٧)

" اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل ، نہایت گہرا تخیل ، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں ، بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویت طبقوں میں بھی جما ہوا ہے ۔ اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھیں گی ۔ بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی ۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنس داں ، کسی مصنف ، کسی طالب علم ، کسی تاجر یا کسی صد فیصد کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عورت کو وہ اپنے برابر کا نہیں سمجھتا ۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں ، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو ، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ضرور ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائیں گی ۔ (٩٥-٩٤)

عورت کو مساوات کا درجہ نہ ملنا کوئی وقتی اور عملی خرابی نہیں بلکہ اس کی وجہ حیاتیات تک جاتی ہے ۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے :

"اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکراتا ہے ۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے اور دونوں پر یکساں بار نہیں ڈالا گیا ہے ۔" (٧٧)

Anton Nemilov, *The Biological Tragedy of Woman*, London, 1932

فطرت کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہی نہیں ہوتا کہ وہ چیز عملاً حاصل نہیں ہوتی ۔ بلکہ یقینی طور پر اس کی وجہ سے کئی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ فطرت نے کسی چیز کو جہاں رکھا ہے وہی اس کی اصل جگہ ہے ۔ اور جب کسی چیز کو اس کے واقعی مقام سے ہٹایا جائے تو اس کے نتیجہ میں خرابی کا پیدا ہونا لازمی ہے ۔

یہی چیز عورت کے معاملہ میں ہوئی ۔ عورت کو مرد کے مساوی بنانے کے لیے گھر سے باہر نکالا گیا ۔ اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ عورت فی الواقع مرد کے مساوی ہو جاتی ۔ البتہ اس کو زندگی کے ہر موڑ پر مرد ول

کے ساتھ کھڑا کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ فواحش کا سیلاب امنڈ آیا۔

مذکورہ بالا مصنف لکھتا ہے :

" سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمال (Workers) بین صنفی انتشار (Sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت پرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual licentiousness) نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقہ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے " (۳۔ ۱۰۲) روسی مصنف نے یہ بات پچاس سال پہلے کہی تھی۔ مگر بعد کے سالوں نے اس کی مزید تصدیق کی ہے۔ اس کے الفاظ آج مزید اضافہ کے ساتھ جدید معاشرہ کے لیے صحیح ہیں وہ کسی اعتبار سے غلط ثابت نہیں ہوئے ہیں۔

جدید انسان نے عورت اور مرد کے قدیم تصور کو دقیانوسی قرار دیا۔ اور عورت اور مرد کے درمیان صنفی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ فطرت (Nature) سے جنگ کرنا تھا۔ یہ حقیقتِ واقعہ سے ٹکرانا تھا، اس کا نتیجہ الٹا ہوا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں صنفوں کے درمیان مساوات کا مقصد تو حاصل نہیں ہوا۔ البتہ اس مصنوعی کوشش کا یہ نقصان ہوا کہ معاشرہ کے اندر نئی نئی برائیاں پیدا ہو گئیں۔

چند مثالیں

مغربی تہذیب نے عورت کے معاملہ میں فطرت سے جو انحراف کیا، اس کے بڑے عجیب اور مہلک نتائج پیدا ہوئے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے اس معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑے گی۔

شادی نہ کرنا غلطی

گریٹا گاربو (Greta Garbo) کسی زمانہ میں ہالی وڈ کی مشہور ترین ایکٹریس تھی۔ مگر اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد فلمی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے پرانے دوست بھی سب کے سب اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ کو اس نے اپنی ۷۵ ویں سال گرہ تنہا منائی۔ گریٹا گاربو کے سوانح نگار نے اس سے

پوچھا کہ کیا آپ کو اس بات پر افسوس ہے کہ آپ نے شادی نہیں کی جس کی وجہ سے آج آپ کی تنہائیوں کا کوئی ساتھی نہیں۔ گریٹا گاربو نے غمگین لہجہ میں جواب دیا: میرا خیال ہے کہ میرا شادی نہ کرنا ایک غلطی تھی (ہندستان ٹائمس ۲۱ ستمبر ۱۹۸۰)

(Not getting married was a mistake)

خدا نے انسان کو جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ پھر زندگی کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے کہ اس ملاپ کا مستقل ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے خدا نے نکاح کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ نکاح ایک مرد اور ایک عورت کو مستقل خاندانی تعلق میں جوڑتا ہے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے جڑ کر خود اپنے تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں اور سماج کے تقاضوں کی بھی۔

مغربی زندگی میں آزادی کے غلط تصور کا یہ نتیجہ ہوا کہ شادی کو بندھن خیال کیا جانے لگا۔ اس کے نتیجہ میں جو آزادانہ زندگی پیدا ہوئی اس نے بے شمار خاندانی اور سماجی مسائل پیدا کر دئے۔ انھیں میں سے ایک وہ ہے جس سے گریٹا گاربو جیسی عورتیں دوچار ہوتی ہیں۔ جوانی کی عمر میں جب کہ ان کے اندر مردوں کے لئے کشش ہوتی ہے وہ ہر جگہ رونق محفل بنی رہتی ہیں۔ ان کو روزانہ ایسے تفریحی پروگرام ملتے رہتے ہیں جن میں مصروف رہ کر وہ اپنے صبح و شام گزارتی رہیں۔ مگر جب عمر زیادہ ہوتی ہے اور وہ جنس مخالف کے لئے اپنی نسوانی کشش کھو دیتی ہیں تو اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ماضی کی تمام سرگرمیاں محض مصنوعی سرگرمیاں تھیں۔ دوستیاں اور تعلقات اس طرح چھوٹ جاتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کے پتے۔ اس وقت انھیں معلوم ہوتا ہے کہ مستقل وفاداری کو بندھن سمجھنا ان کی کتنی بڑی غلطی تھی۔

ان پر یہ کھلتا ہے کہ اب تک وہ خوابوں کی دنیا میں جی رہی تھیں۔ ان کی رونقوں سے بھری زندگی اچانک ایک سونے گھر میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہوتی کہ کتے اور بلی پال کر دل بہلاتی رہیں۔ ان کا کوئی رفیق حیات نہیں ہوتا جو خوشی اور غم میں ان کا شریک ہو۔ ان کے سامنے اپنے بچوں کا وہ "باغ" نہیں ہوتا جن کی صورت میں ایک آدمی اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کے تسلسل کو دیکھ کر مطمئن ہوتا ہے۔ ان کے آس پاس کوئی "اپنا" نہیں ہوتا جس کو اپنی زندگی کا اثاثہ سونپ کر وہ سمجھیں کہ انھوں نے دنیا میں بے کار محنت نہیں کی۔ ان کو گوشت پوست کی کوئی ایسی دنیا نظر نہیں آتی جس کو وہ اپنا سمجھیں اور جو انھیں اپنا سمجھے۔ ایسے لوگ بھری ہوئی کائنات میں بالکل تنہا ہو کر رہ جاتے ہیں اور یقیناً کسی آدمی کے لئے تنہائی سے بڑی کوئی سزا نہیں۔

اچھی بیوی بنو

فرینک بورمن Frank Borman ایک امریکی خلاباز ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی خلائی کشتی میں پرواز کیا تھا جس میں ان کے علاوہ ایک خاتون خلاباز بھی سوار کرائی گئی تھی۔ مسٹر بورمن نے ایک بیان میں کہا :

> Having women on space-craft was okay except that it would be upsetting to put a male and a female too close together for a long time.

خلائی کشتی میں عورت کو بٹھانا اچھا ہے۔ البتہ ایک عورت اور ایک مرد کو دیر تک اتنا زیادہ قریب رکھنا ابتری کا باعث ہوگا

مسٹر بورمن کے اس بیان نے مساوات مرد و زن کے بہت سے علم برداروں کو بوکھلا دیا ہے۔ ایک امریکی خاتون نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا :

"مسٹر فرینک بورمن کا وجود کہاں ہوتا اگر ان کے ماں اور باپ اکٹھا نہ ہوتے ہوتے "

سائنسی تحقیقات نیز عملی زندگی کے حقائق نے مساوات مرد و زن کے قدیم تصور کو سخت جھٹکا پہنچایا ہے۔

ایک امریکی خاتون مسز مارگن Marabel Morgan دو بچوں کی ماں ہیں۔ انھوں نے حال ہی ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے : مکمل عورت *(Total Woman)*

اس کتاب میں انھوں نے اپنی امریکی بہنوں کو "خوش گوار ازدواجی زندگی" کے لئے یہ سادہ گر بتایا ہے :

> Be nice to your husband, stop nagging him and understand his needs.

اپنے شوہر کی اچھی رفیق بنو۔ اس کو ملامت کرنا چھوڑ دو، اس کی ضرورتوں کو سمجھو۔

یہ کتاب ایک سال سے بھی کم عرصہ میں تین ملین کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہے۔ موصوفہ کے نزدیک مرد کی رفیق بننا عورت کی تکمیل ہے نہ کہ آزادانہ زندگی کا مالک بننا۔ (ٹائمس آف انڈیا۔ ۸ فروری ۱۹۷۸)

حقیقت یہ ہے کہ مکمل عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کی مکمل رفیق بن سکے۔

ناکامی کا اعتراف

امریکہ کی ایک ایکٹرس جین سیبرگ (Jean Seberg) نے اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ امریکہ کے علاوہ یورپ میں بھی وہ ایک عرصہ تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس نے قدیم انداز میں ایک "گھر" بسانے کے بجائے لاکھوں گھروں کے لئے سامان تفریح بننے کو ترجیح دیا۔ مگر اس کی موت کے بعد جب اس کی ڈائری پڑھی گئی تو اپنی ڈائری کی آخری سطروں میں اس نے لکھا تھا۔

I wish I had stayed home

کاش میں اپنے گھر میں رہی ہوتی (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۸۱)
کیسا عجیب تھا یہ کامیاب سفر جو بالآخر صرف ناکامی پر ختم ہوا۔

خدا نے جس طرح اس دنیا کی مادی چیزوں کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی فطرت پر قائم رہ کر کوئی چیز اپنا صحیح وظیفہ انجام دے پاتی ہے یہی حال انسان کا بھی ہے۔ خدا نے مرد کو خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسی طرح عورت کو بھی خاص فطرت پر پیدا کیا ہے۔ دونوں اسی وقت اپنی زندگی صحیح طور پر گذار سکتے ہیں جبکہ وہ خدا کی فطرت پر قائم رہیں۔ فطرت سے ہٹتے ہی وہ زندگی کے نقشہ میں اپنا مقام کھودیں گے۔

عورت کی صلاحیتیں واضح طور پر مرد سے مختلف ہیں یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کا دائرہ کار اور مرد کا دائرہ کار عمومی اعتبار سے یکساں نہیں۔ مرد کا دائرہ کار اگر "باہر" ہے تو عورت کا دائرہ کار "اندر"۔ مرد اپنے دائرہ کار میں زیادہ مفید بن سکتا ہے اور عورت اپنے دائرہ کار میں۔ اگر دونوں اپنے دائرہ کار کو بدلیں تو دونوں اپنی معنویت کو کھودیں گے۔ دونوں اپنے کو بے جگہ بنالیں گے۔

صرف مسائل پیدا ہوئے

امریکہ سے ایک ناول چھپا ہے جس کا نام ہے "اکیلی خاتون"

Harold Robbins, *The Lonely Lady* New English Library, London, 1976, pp. 448

اس ناول میں امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرہ کی ایک کمزوری کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عورت کی غیر شادی شدہ زندگی بالآخر ایک ناقابل برداشت تنہائی پر ختم ہوتی ہے۔ کہانی کے مطابق، ایک خوبصورت اور نوجوان امریکی خاتون فلمی دنیا کی چمک دمک (Glamour) سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ زندگی کو چھوڑ کر فلم ایکٹرس بن جاتی ہے۔ اس کی باکمال نسوانیت اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ بہت جلد ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ترقی کے آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ دولت، شہرت، عزت اور چاہنے والوں کی بھیڑ، ہر چیز بافراط اس کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ مگر ترقی کی آخری انتہا پر پہنچنا اس کو سکون نہیں دیتا۔ اب وہ ایک تلخ حقیقت (Bitter Truth) کو دریافت کرتی ہے:

That fame has a way of fading, and friends a way of disappearing when they are most needed.

یہ کہ شہرت بالآخر ختم ہوجاتی ہے۔ اور دوست بالآخر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جب کہ ایک عورت کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے یہ امریکی خاتون نہایت حسرت بھرے انداز میں کہتی ہے:

Only a woman knows what loneliness is

حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت ہی اس بات کو جانتی ہے کہ اکیلا پن کیا ہے۔ ناول کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ فلمی دنیا کے ذریعہ بڑی بڑی کمائی کرنا اور اپنے لئے ایک خود مختار زندگی حاصل کرنا بظاہر بڑا پُرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب عورت کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ جب اس کے ساتھیوں میں اس کے لئے کشش باقی نہیں رہتی تو وہ ایک ناقابل برداشت حادثہ سے دوچار ہوتی ہے۔

اس کے پاس دولت اور مادی سازوسامان کا انبار ہوتا ہے۔ مگر وہی چیز نہیں ہوتی جس کی ایک عورت کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی زندگی کا چین۔ اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ انسان نہیں ہوتا جو اس کے صبح و شام میں اس کا ساتھی بن سکے۔ وہ ایک ایسے آباد گھر کی مالک نہیں ہوتی جس کو وہ اپنا گھر سمجھے:

Here is a loneliness born of independence, of honest individualism in a society where only dishonesty brings profit.

یہ ایک تنہائی ہے جو خود مختار زندگی سے برآمد ہوتی ہے، ایک دیانت دارانہ فردیت، ایک ایسے سماج میں جہاں بددیانتی ہی سب سے بڑا نفع بخش سرمایہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا نظام بے حد نازک ترکیب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ اس میں ادنیٰ تبدیلی بھی صرف بربادی پر ختم ہوتی ہے۔ جمادات اور نباتات کی دنیا کے لئے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامیابی کا راز یہ ہے کہ فطرت کے بنائے ہوئے نظام سے انحراف نہ کیا جائے۔ یہاں مطلوب نتیجہ تک پہنچنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ فطرت کے مقررہ ڈھانچہ کو قبول کیا جائے۔ مگر وہی انسان جو جمادات اور نباتات کے معاملہ میں اس حقیقت کی مکمل پابندی کرتا ہے وہ خود اپنی زندگی کے معاملہ میں اس ابدی حقیقت کو بھول جاتا ہے۔

عورت اور مرد کے لیے فطرت کا بنایا ہوا نظام یہ ہے کہ وہ شادی شدہ زندگی گزاریں۔ ان کی جسمانی ساخت، ان کے نفسیاتی اور خاندانی مسائل، ان کے اجتماعی رشتے سب اپنی درستگی کے لیے شادی شدہ زندگی کا تقاضا کرتے ہیں۔ عورت کا آزاد اور خود مختار ہونا، الفاظ کے اعتبار سے بظاہر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے مگر اس

کا عملی تجربہ اتنا ہی زیادہ بھیانک ہے۔

عورت اپنی جوانی کی عمر میں بڑی آسانی سے اس قسم کے خوش کن اور دل فریب نظریات کا شکار ہو جاتی ہے۔ مگر جب اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا راستہ غلط تھا۔ مگر یہ علم اس کو صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ تلافی کا وقت نہیں ہوتا۔ اب اس کے لیے موجودہ دنیا میں جو چیز رہ جاتی ہے وہ صرف یہ کہ کتوں اور خرگوشوں کو پال کر مصنوعی طور پر ان سے دل بہلائے اور بالآخر حسرت اور مایوسی کے قبرستان میں جاکر سو رہے۔

لذّتیت کا انجام

جان کینڈی (۱۹۶۳-۱۹۱۷) امریکہ کا ۳۵ واں صدر تھا۔ اس نے جیکولین کینڈی سے شادی کی۔ اس کے بعد جیکولین کینڈی امریکہ کی خاتون اوّل کی حیثیت سے کافی مشہور ہوئی۔

امریکہ کی ایک خاتون مصنّف کٹی کیلی نے جیکولین کینڈی کے بارے میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے۔ آہ جیکی۔ (Jackie Oh) یہ کتاب جیکولین کینڈی کے نجی حالات کے بارے میں ہے جو کہ کسی وقت امریکہ کی خاتونِ اول (First Lady) تھی۔

جیکولین قدرت سے ایک پُرکشش نسوانی شخصیت لے کر پیدا ہوئی۔ اس کی اس پیدائشی خصوصیت نے جان کینڈی کو متاثر کیا جو امریکہ کی ایک اعلیٰ فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی شادی جان کینڈی سے ہوگئی۔ بعد کو جان کینڈی امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح جیکولین کینڈی کو امریکہ میں وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوگیا جس کے آگے مزید برتری کا کوئی مقام نہیں۔

جان کینڈی ۱۹۶۰ میں امریکہ کے ۳۵ ویں صدر منتخب ہوئے تھے۔ مگر اس کے صرف تیسرے سال ۲۲ نومبر ۱۹۶۳ کو صدر کینڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جیکولین کینڈی جو اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مشہور اور معزز خاتون بن چکی تھی اچانک بے حیثیت ہو کر رہ گئی۔ تاہم اس کی نسوانی کشش نے یونانی ارب پتی ارسٹاٹل اوناسس (۱۹۷۵-۱۹۰۶) کو متاثر کیا۔ اس کی دوسری شادی اوناسس سے ہوگئی۔ اس وقت جیکولین کی عمر تقریباً ۴۰ سال اور اوناسس کی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی۔ یہ شادی دونوں کے لیے خوش گوار ثابت نہ ہو سکی۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہی دونوں الگ الگ رہنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۵ میں طویل بیماری کے بعد اوناسس کا انتقال ہو گیا، جب کہ

جیکولین اس کے پاس موجود بھی نہ تھی۔

جیکولین کو ہر چیز ملی مگر اس کو خوشی نہ مل سکی۔ اس کی سوانح نگار کٹی کیلی کے الفاظ میں جیکولین نے خوشی حاصل کرنے کی بابت اپنی ناقابل علاج خواہش کو خرید کر حاصل کرنا چاہا۔ خواہ اس کی قیمت ۳ ہزار ڈالر فی گھنٹہ دینی پڑے۔ اس کے باوجود وہ خوشی حاصل نہ کر سکی:

-- an incurable desire to buy happiness, even if it meant spending as much in one hour as 3000 dollars.
Jackie Oh: *An Intimate Biography*,
By Kitty Kelley, Vikas, New Delhi, 1979, pp. 336

خودکشی کرلی

میریلین مونرو (Marilyn Monroe) امریکہ کی ایک انتہائی مشہور خاتون ہے۔ اس نے اولاً فوٹوگرافر کے ماڈل کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی غیر معمولی نسوانی کشش کی بنا پر فلم کی دنیا کی ہیرو بن گئی۔ اس کو جنسی دیوی (Sex goddess) کہا جانے لگا۔ اس کی فلموں کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں کہیں اس کا کوئی "شو" ہوتا تو بے شمار تماشائی اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے۔

میریلین مونرو کا آخری فلم بے جوڑ (The Misfits) تھا۔ فلم کا یہ عنوان گویا خود اس کی اپنی زندگی کا بھی عنوان تھا۔ وہ اپنے کو بے جگہ پا رہی تھی۔ انسانی سمندر کے درمیان وہ نفسیاتی طور پر تنہا ہو کر رہ گئی تھی۔ بظاہر اس کی ہنستی ہوئی تصویریں اخباروں اور رسالوں میں چھپتی تھیں۔ مگر اندر سے وہ اپنے آپ کو مستقل طور پر افسردگی (Depression) میں محسوس کرتی تھی۔ آخر کار وہ اس نفسیاتی عذاب کو برداشت نہ کر سکی۔ ۵ اگست ۱۹۶۲ کو اس نے بیک وقت بہت سی گولیاں کھا کر خودکشی کرلی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف ۳۶ سال تھی۔

اس قسم کی عورتوں کا عام حال یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر خوش دکھائی دیتی ہیں مگر ان کا دل مستقل طور پر روتا ہے۔ ان کی زندگی بڑی مظلومی کی زندگی ہوتی ہے۔ وہ سب کی ہوتی ہیں مگر کوئی ان کا نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو خوش کرتی ہیں مگر ان کو یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ کوئی نہیں جس کے ساتھ وہ اپنی خوشی کے لمحات گزار سکیں۔ مجلسی تقریبات میں بظاہر ان کی شخصیت ایک محور شخصیت

دکھائی دیتی ہے مگر اپنی حقیقی دنیا میں وہ اپنے آپ کو بالکل خالی محسوس کرتی ہیں۔ ابتدائی شاندار زندگی آخر کار ایک غیر شاندار زندگی پر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تنہائی کی زندگی عورت کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ عورت تنہائی کا تحمل نہیں کر سکتی۔ مگر مغربی تہذیب کا راستہ عورت کو آخر کار جہاں پہونچاتا ہے وہ یہی تنہائی کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس اسلام عورت کو ایک ایسی زندگی کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ تنہا نہیں ہوتی، بلکہ ایک پورے خاندان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام کا طریقہ فطری طریقہ ہے اور مغربی تہذیب کا طریقہ غیر فطری طریقہ۔

مجھ سے دور رہو

انڈین ایکسپریس (۱۴ مئی ۱۹۸۶) میں صفحہ ۱۴ پر ایک مغربی عورت کی تصویر ہے۔ وہ ایک میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہے اور ایسی پریشان حال دکھائی دے رہی ہے جیسے کہ اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ مگر یہ کوئی عام عورت نہیں۔ یہ دور جدید کی مشہور ترین ایکٹرس الزبتھ ٹیلر ہے۔ تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

ASKING FOR MONEY: Testifying before a Senate sub-committee Capitol Hill in Washington on Thursday actress Elizabeth Taylor pleads for more money to find a cure for the deadly AIDS disease.

Indian Express (New Delhi) May 14, 1986

"ایڈز" کے لیے رقم۔ امریکی سینٹ کی ایک سب کمیٹی کے سامنے واشنگٹن میں ایکٹرس الزبتھ ٹیلر اپنا مسئلہ پیش کرتے ہوئے مزید رقم کا مطالبہ کر رہی ہے تاکہ وہ ایڈز کے مہلک مرض سے نجات حاصل کر سکے۔

"ایڈز" موجودہ زمانہ کا ناقابل علاج مرض ہے جو بے قید جنسی اختلاط کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ اس مرض میں مبتلا شخص نہ صرف خود عجیب وغریب قسم کی تکلیفوں کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ وہ متعدی بھی ہے۔ دوسرے لوگ ایسے شخص سے دور بھاگنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اعلان کیا ہے کہ ایڈز کے مریض سے جو شخص چھو جائے گا اس کو بھی ایڈز کا مرض لاحق ہو جائے گا۔ چنانچہ ٹیلر جیسی خواتین جن سے قریب ہو کر لوگ فخر محسوس کرتے تھے، اب وہ ایسی عورتوں سے دور بھاگ رہے ہیں

کہ کہیں ان کو بھی یہ مہلک مرض لاحق نہ ہو جائے ۔

کیسا عجیب ہے مغربی عورت کا یہ انجام ۔ وہ مساوی درجہ حاصل کرنے کی کوشش میں غیر مساوی درجہ تک پہونچ گئی ۔ آگے بڑھنے کی کوشش میں وہ انسانی قافلہ سے پیچھے چلی گئی ۔

شہرت بوجھ بن گئی

فرانس کی سینما کی تاریخ میں جس خاتون نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ "بی بی" (Brigitte Bardot) ہے ۔ وہ ۱۹۳۴ میں پیدا ہوئی ۔ فلمی دنیا میں بعض اعتبار سے اس نے میریلین مونرو اور مارلین ڈٹرچ سے بھی زیادہ بڑا مقام حاصل کیا ۔ جون آف آرک کے بعد وہ فرانس کی سب سے زیادہ شہرت یافتہ خاتون شمار ہوتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ " بی بی " کے ذریعہ باہر کی جو دولت فرانس میں آئی وہ اس سے بھی زیادہ ہے جو مشہور رینالٹ (Renault) موٹر کمپنی کے ذریعہ فرانس میں آئی ۔ ٹونی کرالی نے ۱۹۵۰ کے آخر میں اندازہ لگایا تھا کہ اس کی تصویریں یورپ اور امریکہ کے جرائد کے صفحہ اول پر ۲۹۳۴۵ بار چھپ چکی ہیں ۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مئی ۱۹۸۶)

" بی بی " کی فلم پر فلم بنتی رہی ۔ اس کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ بعض اوقات وہ اپنے گھر سے نکلنے میں صرف اس لیے کامیاب نہ ہو سکی کہ اس کے گھر کے باہر فوٹو گرافروں کی ناقابل عبور فوج کھڑی ہوئی تھی ۔ اس کے نام روزانہ اتنے زیادہ خطوط آتے تھے کہ ان کی منتخب تعداد کو پڑھنا بھی اس کے لیے ناممکن تھا ۔

ان تمام ظاہری رونقوں کے باوجود اندر سے وہ سخت غیر مطمئن تھی حتیٰ کہ اس کی شہرت اس کے لیے ایک بوجھ بن گئی ۔ اس نے خودکشی کے ارادہ سے ایک رات بہت زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالیں :

Worn out by her own fame, one night Brigitte swallowed an overdose of tranquillizers.

تاہم وہ مر نہ سکی ۔ اس وقت بھی جب کہ وہ نازک حالت میں پیرس کے ایک اسپتال میں لے جائی جارہی تھی ، فوٹو گرافروں نے ایمبولنس کار کو زبردستی راستہ میں روکا تاکہ وہ اس کا

فوٹو لے سکیں۔ "بی بی" کے بارہ میں ایک رپورٹ میں اس کا تاثر بتایا گیا تھا کہ کیمرہ کے سامنے اس نے کبھی سکون محسوس نہیں کیا :

She never really felt at ease in front of the camera.

۳۹ سال کی عمر میں جب کہ وہ تقریباً پچاس کامیاب فلمیں بنا چکی تھی، اس نے اچانک اپنا کیریر ختم کر دیا۔ وہ فلمی دنیا سے بالکل بے تعلق ہو گئی۔ اس نے اپنی شاندار رولس رائس کار فروخت کر دی اور اپنے مکان میں تنہا رہنے لگی جہاں وہ ایک معمولی انسان کی طرح خاموش زندگی گزار سکے :

She sold her Rolls-Royce and went to live alone in her house on the Riviera, "to cease to be considered a beautiful object and become a human being like any other." she said.

حقیقت یہ ہے کہ گھر کے باہر کی دنیا میں ہیرو بننا اور ہر طرف شہرت حاصل کرنا عورت کی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ عورت فطری طور پر حیا پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنوعی میدانوں میں شہرت پانے والی عورتیں اپنے کیریر کے درمیان میں یا اس کے آخر میں خانہ نشیں ہو جاتی ہیں۔ وقتی چمک دمک کے بعد بالآخر ان کو جہاں سکون ملتا ہے وہ ان کا گھر ہے نہ کہ ان کا باہر۔

عورت کے بارہ میں اسلام کا قانون عورت کی اسی فطرت کی رعایت ہے نہ کہ عورت کے اوپر کوئی ظلم۔ وہ مقام جہاں ایک عورت ناکام تجربہ کے بعد پہونچتی ہے، اسلام چاہتا ہے کہ وہ اپنے آزاد ارادہ کے تحت خود اپنے انتخاب کے ذریعہ وہاں پہونچے۔

میدان عمل سے محرومی

مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے قیمت پاتا ہے۔ عورت کو مرد کے مساوی قرار دے کر جب گھر سے باہر لایا گیا تو اس کی قیمت اس میں تھی کہ وہ ان تمام شعبوں کو سنبھال لے جن کو مرد روایتی طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ یعنی وہ پائلٹ، ڈرائیور، انجینیر، پروفیسر، ایڈمنسٹریٹر، پولیس آفیسر، فوجی کمانڈر وغیرہ تمام حیثیتوں میں بالکل مرد کی طرح کام کرنے لگے۔ مگر حیاتیاتی اعتبار سے عورت کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ وہ ان شعبوں کو اس طرح سنبھال نہیں سکتی جس طرح مرد ان کو سنبھالے ہوئے ہے۔

عورت جب مردانہ شعبوں کو سنبھال نہ سکی تو اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ وہ ان شعبوں میں جمع ہونے لگی جن میں وہ اپنی نسوانیت کے اعتبار سے قیمت پاسکتی تھی نہ کہ تمدنی کارکردگی کے اعتبار سے۔ مثلاً فلم، ٹیلی ویژن، تفریحی مجلس، وہ اشتہاری صنعتیں جو عورت کی نسوانیت کو استعمال کرتی ہیں۔ مگر یہاں عورت کی دوسری کمزوری اس کی راہ میں حائل ہوگئی۔ ان شعبوں میں جوان عورت کی قیمت تھی اور عورت کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ جوان رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت باہر نکل کر ایک قسم کی ادھوری شخصیت بن گئی۔ وہ صرف جوانی کے چند سالوں تک اپنے کو باقیمت ثابت کر سکی۔ جوانی کی مدت ختم ہونے کے بعد باہر کی زندگی میں اس کی کوئی قیمت نہیں رہی۔

مغربی ملکوں میں آزادیٔ نسواں کی تحریک نے پردہ کو ختم کر دیا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان کوئی حدبندی باقی نہ رہی۔ تمام عورتیں سڑکوں اور بازاروں میں نکل آئیں۔ اب جن عورتوں میں نسوانی کشش نسبتاً زیادہ ہو وہ فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ تیزی سے لوگوں کے درمیان مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں۔ مگر یہ مقبولیت اس قیمت پر حاصل ہوتی ہے کہ وہ خاندانی زندگی سے دور ہوجاتی ہے۔ وہ شادی کو بندھن سمجھ کر اس سے بے رغبت ہوجاتی ہیں۔ وہ گھر بنا کر اس میں رہنے کے بجائے محفل کی رونق بننا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

مگر یہ پُررونق لمحات بے حد وقتی ہوتے ہیں۔ جوانی کی خاص عمر تک ان عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انھیں نارنگی کے چھلکے کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ مقبول شخصیت بالآخر خود اپنے ماحول میں غیر مقبول شخصیت بن کر رہ جاتی ہے۔

مغربی تہذیب میں صرف "جوان عورت" کے لیے جگہ ہے۔ "بوڑھی عورت" کے لیے مغربی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ مغربی تہذیب میں ایک عورت اپنی نسوانی کشش کی بنیاد پر جگہ حاصل کرتی ہے۔ بڑھاپے میں یہ نسوانی کشش ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے مغربی عورت بوڑھی ہونے کے بعد اپنا مقام بھی کھو دیتی ہے۔ "جو شخص ذمہ داری قبول نہ کرے اس کو حقوق میں بھی حصہ نہیں ملتا" یہ مقولہ اپنی بدترین شکل میں مغربی عورت کے حق میں صادق آیا ہے۔

خاندان سے وابستہ ہو کر جو زندگی بنتی ہے۔ اس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خاندان میں ایک عورت "بیوی" کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کرتی ہے۔ یہاں اس کو اپنے عمل کا بھرپور میدان

مل جاتا ہے۔ اس کا گھر ایک پوری مملکت ہوتا ہے جس کو وہ سنبھالتی ہے اور جس کی وہ تنہا انچارج ہوتی ہے۔ یہاں اس کی کارکردگی سے اس کی تاریخ بنتی ہے جو آخر وقت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہر اگلا دن یہاں اس کے عزت واحترام میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ "ماں" بنتی ہے۔ پھر وہ نانی اور دادی بنتی ہے۔ حتی کہ خود اپنے شوہر کی نظر میں اس کی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ عورت جوانی کی عمر میں بیوی ہوتی ہے اور بڑھاپے کی عمر میں ماں بن جاتی ہے۔

اس طرح عمر بڑھنے کے ساتھ گھر کے اندر اس کا وقار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھر کی مالکہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ خاندان کسی عورت کی وہ دنیا ہے جو اوّل سے آخر تک اس کا ساتھ دیتی ہے۔ جب کہ مغربی تہذیب کا حال یہ ہے کہ وہ زندگی کے چند سالوں میں عورت کی ساتھی ہے، وہ اس کی عمر کے طویل تر حصہ میں عورت کی ساتھی نہیں۔ مغربی زندگی میں عورت اپنی جوانی کے چند سال کے بقدر قیمت پاتی ہے اور خاندانی زندگی میں اپنی پوری عمر تک۔

جاپان کی مثال

جاپان کی عورتوں کے بارہ میں ایک رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جاپان میں اگرچہ ۱۵ ملین کارکن خواتین موجود ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر معمولی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے مرد افسروں (Male superiors) کی مددگار کے طور پر کام کرتی ہیں۔

۳۶ سال کے بعد دو خواتین جاپانی کابینہ میں لی گئی ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر متحدہ اقوام کے موسم خواتین کی رعایت سے جو ۱۹۸۵ میں ختم ہو رہا ہے۔ جاپان میں اس وقت ۶۰۸ ڈپلومیٹ ہیں۔ ان میں خواتین کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔ جاپان آج بھی بنیادی طور پر مردوں کا سماج (Male-dominated society) ہے۔

رپورٹ میں جاپان کی موجودہ خاتون وزیر کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:

> A bill, yet to be passed by the parliament, on ending discrimination against women, is considered by many of its male critics as reverse discriminatory.

عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کرنے والا ایک بل جاپانی پارلیمنٹ میں ہے مگر وہ اب تک پاس نہ ہو سکا۔ اکثر مرد ناقدین اس بل کو برعکس امتیاز پیدا کرنے والا اقدام سمجھتے ہیں (انڈین اکسپریس ۲۴ نومبر ۱۹۸۴)

جو لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کی مساوی شرکت کے بغیر قومی ترقی نہیں ہو سکتی انھیں اس واقعہ سے نصیحت

لینا چاہئے۔ جاپان دور جدید کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر یہ ترقی اس کو اس کے بغیر حاصل ہوئی ہے کہ اس نے اپنی خارجی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں عورتوں کو برابر کے شریک کی حیثیت سے داخل کر دیا ہو۔

قدیم زمانہ میں عورت اور مرد کے کام کا دائرہ الگ الگ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اس حدبندی کو ختم کر دیا گیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اس سے ترقی کی رفتار تیز ہو گی۔ مگر تجربہ نے بتایا کہ تقسیم عمل کے قدیم نظام کو توڑنے کا کوئی فائدہ تمدنی ترقی کے اعتبار سے نہیں ہوا۔ جن ملکوں میں عورت اور مرد دونوں کو زندگی کے ہر میدان میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے وہاں بھی عملاً زندگی کے تمام ترقیاتی کام مردوں ہی کے ہاتھ میں ہیں نہ کہ عورتوں کے ہاتھ میں۔

جاپان کی مذکورہ مثال بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ جاپان پورے معنوں میں دور جدید کا ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ مگر وہاں کا سماج ابھی تک قدیم انداز کے مطابق مردوں کے غلبہ کا سماج ہے۔ جاپان کی مثال ثابت کرتی ہے کہ ترقی کے لئے عورتوں کی مفروضہ مساوی شرکت ضروری نہیں۔

تذکیر القرآن ــ جلد دوم

تذکیر القرآن کی دوسری جلد اللہ کے فضل سے تیار ہو گئی ہے اور اب طباعت کے مرحلہ میں ہے۔ دوسری جلد سورہ الکہف سے سورہ الناس تک ہے اور اس کے صفحات ۹۰۰ سے کچھ زائد ہیں۔

قیمت کا اعلان آئندہ کیا جائے گا

شبلی اور علی گڑھ

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴) کا تعلق علی گڑھ سے ۱۸۸۲ء میں قائم ہوا۔ اور سولہ برس تک جاری رہا۔ شبلی کا تعلق جس خاندان سے تھا، وہ سرسید کی تعلیمی تحریک سے بہت متاثر تھا۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب اس کے زبردست حامی تھے۔ اور اپنے لڑکے مہدی حسن صاحب کو حافظ بنانے کے بعد مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل کرایا تھا۔

۱۸۸۲ء میں کالج کو مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت ہوئی۔ مولانا شبلی نے اس جگہ کے لئے درخواست بھیجی جو سرسید اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کی اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ مولانا کو ایف اے اور بی اے کی کلاسوں کو عربی اور فارسی پڑھانے کا کام سپرد ہوا۔

مولانا کا تقرر اس وقت چالیس روپے ماہوار پر ہوا تھا۔ شروع زمانہ کا واقعہ ہے، کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں استادوں کی کرسیاں تنخواہ کی ترتیب سے بچھائی گئی تھیں۔ اس ترتیب میں مولانا شبلی کی کرسی سب سے پیچھے تھی۔ اپنی یہ حالت دیکھ کر مولانا شبلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر صلاحیت ایسی چیز ہے جو اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔ چنانچہ جلد ہی بعد ایسا ہوا کہ نہ صرف ان کی تنخواہ بڑھ گئی، بلکہ اپنے علم وفضل کی بدولت انھوں نے کالج کی بزم میں صدرنشینی کی حیثیت حاصل کرلی۔

سب سے پہلے تو ان کی وہ مرعوبیت ختم ہوئی جو اس زمانے میں ایک مولوی کو عام طور پر انگریزی دانوں سے ہوتی تھی۔ علی گڑھ جانے کے چند ہی مہینے بعد ایک عزیز کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت (اس زمانے میں بی، اے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے کہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کردیں گے ـــــ لاحول ولا...... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (حیات شبلی ۱۹۴۳، ۱۳۱)

اس کے بعد کالج کی دنیا میں شبلی کو جو مقام ملا، اس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

" محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو، مسلمان، ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے۔ ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشیں عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا، جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے تہذیب و تمدن کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکایک آیا اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بیگانہ نہیں ہونے پایا۔ .... مولانا شبلی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھائے رہتے تھے اور ہر علمی بحث میں ان کا قول فیصل تھا۔ انھوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا اور قدیم علوم و فنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا۔ ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل، اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا" (حیات شبلی — ۱۴۸)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی نے علی گڑھ میں قیام کر کے ایک عظیم سبق دیا ہے۔ یہ سبق کہ عزت اور مقام حاصل کرنے کا راز صرف تنخواہ اور ڈگریاں نہیں ہیں۔ ایک خالص مولوی آدمی بھی ایک بالکل ماڈرن ماحول میں عزت اور مقام حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم اور قابلیت رکھتا ہو۔

شبلی کو علی گڑھ میں یہ مقام ان کی گوناگوں صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہوا۔ اس دور میں خیالات کو شعر کے پیراہن میں ظاہر کرنے کا خاص ذوق تھا۔ مولانا شبلی اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ نہایت اعلیٰ مذاق کے اشعار لکھتے تھے اور نہایت موثر لہجے میں پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ کالج کے ہر جلسہ اور تقریب میں مولانا کی نظم اس کے پروگرام کا ضروری جزء ہوتی تھی۔ اس وقت کے علی گڑھ میں شبلی کو شاعر کی حیثیت سے جو مقام حاصل تھا اس کا نقشہ ان کے دو شعروں میں بڑی اچھی طرح نظر آتا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں مولانا شبلی نے روم اور مصر و شام کا سفر کیا تھا۔ واپس آئے تو علی گڑھ میں بڑا شاندار استقبال ہوا۔ اس سلسلہ میں طلبا کی یونین نے بھی ۲ دسمبر

۱۸۹۲ء کو ایک بزم دعوت ترتیب دی۔ اس موقع پر مولانا نے اپنا ایک قصیدہ پڑھا جس کے دو شعر حسب ذیل تھے :

قاصد خوش خبر امروز نوا ساز آمد
کز سفر یار سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید
یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد

اس زمانہ میں علی گڑھ کی تاریخ دیکھئے تو یہ الفاظ بالکل ایک واقعہ کا بیان معلوم ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے علی گڑھ کو اگر شیراز سے تشبیہہ دی جائے تو شبلی اس شیراز کے بلبل تھے۔

اسی طرح تقریر کا ملکہ بھی مولانا شبلی میں غیر معمولی تھا۔ جس جلسہ میں تقریر کرتے پورے مجمع پر چھا جاتے۔ ۱۹۰۰ء میں رام پور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا۔ اس زمانہ میں کلکتہ یونیورسٹی نے فارسی کو اپنے نصاب سے خارج کرنے کا اعلان کر کے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا تھا۔ فارسی پر یہ اعتراض تھا کہ "فارسی کلاسیکل زبان نہیں اور دوسری زبانوں کی طرح اس میں قوت متخیلہ کو ترتیب دینے کی قابلیت نہیں اور نہ اس کے لٹریچر میں علوم و فنون کا ذخیرہ ہے" (۱۶۶) مولانا شبلی نے اس پر تقریر کی اور اس خوبی سے اعتراضات کو رد کیا کہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ سامعین کا یہ حال تھا کہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس وقت بنگال کے لفٹننٹ گورنر سر ایڈورڈ برن بھی اجلاس میں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں مولانا کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا —— "مجھ میں اتنی قابلیت نہیں کہ مولانا شبلی کی طرح پُر تاثیر تقریر کر سکوں"۔ (حیات شبلی —— ۱۶۷)

نومبر ۱۸۹۴ میں یونین میں اس موضوع پر مباحثہ تھا کہ کیا ہمارا گزشتہ طرز تعلیم موجودہ طرز تعلیم سے بہتر تھا۔ مولانا نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے موافقت کا پہلو اختیار کیا۔ یہ تقریر اتنی موثر ہوئی کہ طالب علموں نے عموماً مقرر کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ سید محمود نے بھی ان کے حق میں رائے دی۔ (۱۶۰)

اسی طرح ایک بار یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر ہے یا شخصی۔ جلسہ میں سرسید بھی موجود تھے۔ مولانا نے جمہوری طرز حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی مدلل تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی (۱۶۱) یہ بات آج کچھ عجیب نہیں معلوم ہوگی لیکن اگر

یہ خیال کیا جائے کہ یہ واقعہ ۱۸۹۲ء میں پیش آیا تھا تو مولانا کی تقریری صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ مولانا شبلی کی یہی سب خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ علی گڑھ کی فضا پر چھا گئے۔

شبلی کا علی گڑھ جانا محض ایک معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ یہ جدید و قدیم کا اتصال تھا۔ شبلی گویا قدیم کے ایک قابل اعتماد نمائندے تھے اور علی گڑھ اپنے وقت میں جدید کی نمایاں ترین علامت تھا —— اس اتحاد و اتصال سے دونوں کو زبردست فائدے ہوئے۔

شبلی کا علی گڑھ سے وابستہ ہونا سرسید کے لئے زبردست تقویت کا باعث بنا۔ سرسید نے کالج کے چندہ کے لئے ۱۸۸۲ میں حیدر آباد کا پہلا سفر کیا تھا۔ یہ سفر ایک وفد کی شکل میں تھا جس میں تحریک کے بہت سے ممتاز لوگ شریک تھے۔ ان میں سے ایک مولانا شبلی بھی تھے۔ مولانا عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی کے اس سفر میں شمولیت سے یہ خیال لوگوں میں پھیل گیا تھا کہ وہ سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ (۱۸۳)

شبلی کی وجہ سے کالج کے حلقہ میں اعلیٰ ترین سطح پر علوم اسلامیہ کی نمائندگی ممکن ہو سکی۔ ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس موقع پر سرسید نے اپنے دائرہ کے مختلف اہل علم کو اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی پہلو پر لکھنے کی فرمائش کی۔ مولانا شبلی نے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" کا عنوان اپنے لئے پسند کیا۔ جب یہ مضمون لکھنؤ کے اجلاس میں پڑھا گیا تو مسلمانوں کے سامنے اپنے اسلاف کے عظیم کارناموں کا نقشہ پھر گیا اور سارے ملک میں اس خطبہ کی دھوم مچ گئی۔ مولانا عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں ——
"لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اس پر دلگداز انداز میں ریویو ہوا ہے تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو" (۱۷۲)

اس زمانہ میں یورپ کی اس "علمی تحقیق" کا غلغلہ تھا کہ مسلمان اتنے وحشی اور جاہل تھے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں انھوں نے مصر اور اسکندریہ فتح کیا تو وہاں کے مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموس کے زمانہ سے قائم تھا جلا کر خاک کر دیا، اور دنیا گزشتہ انسانی دماغوں کے ورثہ سے محروم ہو گئی۔

یہ منجملہ ان واقعات میں سے تھا جس کی وجہ سے مسلمان اپنے کو احساس کمتری میں مبتلا پاتے تھے۔ مولانا شبلی نے ۱۸۹۲ء میں اس کی تردید میں کتب خانہ اسکندریہ پر ایک مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں سے صدیوں پہلے برباد ہو چکا تھا۔ اور مسلمانوں کی فتح مصر کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا۔

مولانا نے بتایا کہ یہ کتب خانہ خود عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں برباد کیا تھا۔ بعد کو چھٹی صدی ہجری کے ایک عیسائی مورخ ابوالفرح ملطی نے عیسائیوں کو اس الزام سے بچانے کے لیے اس واقعہ کو غلط طور پر مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا مولانا کی یہ تحقیق مقبول ہوئی اور بعد کو خود یوربین محققین نے اس کی تائید کی۔ (۲۲۰)

اسی طرح مثال کے طور پر مسلم سلطنتوں کے خلاف ایک نفرت انگیز پروپیگنڈا وہ تھا جو جزیہ کے نام پر کیا جارہا تھا۔ یعنی وہ محصول جو مسلمان بادشاہ صرف اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتے تھے۔ اس کو مخالفین اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ اسلامی سلطنتوں میں غیر مذہب پر ٹیکس تھا۔ گویا کوئی غیر مسلم اس مذہبی ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر کسی اسلامی سلطنت میں اپنی جان و مال کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ مولانا شبلی نے اس سلسلہ میں رسالہ الجزیہ لکھا جس میں تحقیق سے ثابت کیا کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے۔ یعنی اسلامی ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا معاوضہ تھا۔

یہ تحقیق اس وقت ایسی عجیب تھی کہ علمی دنیا پر حیرت چھا گئی۔ سرسید نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اور خود مولانا سے اس کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا۔ بیرونی ملکوں میں بھی اس کے خلاصے اور اقتباسات شائع ہوئے۔ (۲۲۷)

مولانا شبلی کی اس طرح کی تحقیقات سے علی گڑھ میں اسلام کی علمی بلندی کی ایسی فضا قائم ہوئی کہ سرسید کو خیال آیا کہ یورپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نسبت جو تاریخی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کے جواب اور تصحیح کے لئے ایک مجلس بنائی جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں اس کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ مولانا شبلی کے مضامین اس سلسلہ میں داخل کئے گئے اور انھیں اس صیغہ کا سکریٹری بنایا گیا۔ ان کے مضامین کے ترجمے عربی اور انگریزی میں بھی شائع کئے گئے۔ (۱۶۱)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پانچواں اجلاس ۱۸۹۱ء میں الہ آباد میں ہوا اس اجلاس میں بڑے بڑے باکمال جمع تھے۔ مولانا شبلی نے تجویز پیش کی:

"اس مضمون پر ایک رسالہ لکھوایا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو علم یونان و مصر و ہندوستان و فارس سے حاصل کئے تھے ان پر کون سے مسائل اور علوم اضافہ کئے۔"

سرسید نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:

" یہ ایسے عمدہ امر کی تحریک ہے جس کی بہت ضرورت ہے۔ تمام علمی مجلسیں اس امر کے دریافت کرنے کی محتاج ہیں۔ مگر بحث اس میں ہے کہ اس کو لکھے گا کون۔ ہمارے ہاں ایک مثل ہے "جو بولے وہی گھی کو جاوے" پس مولوی شبلی ہی اس کو لکھیں گے۔

" تمام مجمع سے بالاتفاق یہی آواز آئی کہ مولوی شبلی ہی لکھیں گے۔ مولوی شبلی ہی لکھیں گے" روداد کانفرنس الہ آباد ص۹۱ بحوالہ حیات شبلی۔ ۱۶۵

" محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین" نے ۱۸۹۴ء میں ایک علمی رسالہ کی شکل اختیار کی تو اس کے اردو حصے کی ایڈیٹری مولانا شبلی کے سپرد کی گئی۔

بحیثیت استاد مولانا کے سپرد جو مضامین تھے ان میں بھی مولانا نے اپنی قابلیت کا سکہ جما دیا تھا مسعود علی صاحب محوی جو حیدرآباد دکن میں جج تھے اور اس کے بعد دارالترجمہ کے رکن مقرر ہوئے۔ مولانا کے زمانہ میں علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ وہ اپنے مجموعہ کلام کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

" علی گڑھ کالج کے بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے۔ مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے۔ مولانا مرحوم ان نادرالوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے۔ (۱۸۲)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی فرماتے ہیں:

" مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انھیں صحبتوں کے اثر سے۔ تاریخ وادب فارسی کا ذوق یہیں نشوونما پذیر ہوا ہے" (۱۵۲)

مقررہ درس کے علاوہ بھی طلبہ کے لئے کچھ کرتے رہتے تھے۔ مثلاً کالج میں عربی زبان کی ترقی اور طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کا شوق دلانے کے لئے انھوں نے ایک لجنۃ الادب کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرح اخوان الصفا کے نام سے ایک انجمن قائم کی جو اردو تحریر و تقریر کی مشق کے لیے تھی۔ دونوں انجمنوں میں طلبہ دلچسپی سے حصہ لیتے تھے۔ (۶۰-۱۵۹)

۱۸۹۲ میں مولانا شبلی نے ترکی اور مصر و شام کا ایک علمی سفر کیا۔ یہ سفر بھی علی گڑھ کالج کی شان بڑھانے کا سبب بنا۔ کیوں کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی اس وقت ــــ " کالج کے ایک پروفیسر کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفر تھا" (۲۱۸) چنانچہ واپسی کے بعد مولانا کے اعزاز میں مختلف تقریبات

اور جلسے کئے گئے۔

اس سفر میں حکومت ترکی نے آپ کو "تمغہ مجیدی" عطا کیا جو ترکی کا ایک اعلیٰ اعزاز تھا۔ اس کے بعد جنوری ۱۸۹۴ء میں حکومت برطانیہ نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عنایت کیا۔ یہ اس زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص واقعہ تھا۔ نیز یہ پہلا واقعہ تھا جب کہ کالج کے کسی استاد کو علمی خطاب سے نوازا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد کالج میں متعدد جلسے ہوئے اور سرسید اور تمام لوگوں نے زبردست خراج عقیدت مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ (۲۳۸)

مولانا شبلی کی وجہ سے کالج کو جو علمی وقار اور مادی فائدہ حاصل ہوا، اس کا اعتراف سرسید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

" اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اپنی تصانیف سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ المامون، سیرۃ النعمان، کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ بے مثل اور بے نظیر کتابیں ہیں۔ اگر وہ نعوذ باللہ اپنے رسالہ الجزیہ کی نسبت مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہیں کہ فاتوا بسورۃ من مثلہ تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ جزیہ کا ایسا بیجا اور غلط الزام اسلام پر تھا جس کا آج تک کسی نے ایسی عمدگی سے حل نہیں کیا تھا۔ بایں ہمہ انھوں نے مثل علمائے متقدمین باخدا کوئی ذاتی فائدہ ان کتابوں کی تصنیف سے نہیں اٹھانا چاہا بلکہ بالکلیہ مدرستہ العلوم کو دیدیا" (۳۴ - ۲۲۳)

اس زمانہ میں مولانا شبلی کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ تین تین ماہ میں ایک ایڈیشن ختم ہو جاتا تھا۔ مگر مولانا نے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں اپنی تصنیفات سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا اور تمام کتابیں کالج کی نذر کردیں (۵۹ - ۱۵۸)

اس کے علاوہ بعض ریاستوں سے کالج کو امداد دلانے میں مولانا کی ذات معاون بنی۔

علی گڑھ کی تاریخ میں دینی رنگ پیدا کرنے والے سب سے پہلے مولانا شبلی تھے۔ مولانا شبلی دینی اعتبار سے علی گڑھ کو کیا سبق دینا چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا۔ ۱۸۹۲ میں جب وہ ترکی گئے تو وہاں انھیں ایک کالج (مکتبہ ملکیہ) میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اتفاق سے اسی دوران میں ظہر کا وقت آگیا۔ اس وقت کوٹ پتلون میں ملبوس نوجوان ترک فوراً نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ اس واقعہ کا والہانہ انداز میں ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزل ہزار درجہ بہتر ہے" (۲۰۲)

اسی طرح مولانا نے ایک تقریر میں فرمایا:

"دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹیں، پیچھے ہٹیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جاکر مل جائیں۔ (۲۹۰)

محمد علی کے اندر اسلام اور قرآن کا ذوق مولانا شبلی کے درسوں سے پیدا ہوا۔ محمد علی اس وقت علی گڑھ کے ایک طالب علم تھے اور اس کا اعتراف انھوں نے اپنی کتاب (My Life: A Fragment) میں کیا ہے یہ مولانا شبلی کی بیدار مغزی کا اہم ثبوت ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ مذہبی طبقہ عام طور پر انگریزی تعلیم کی صرف مخالفت کرنا جانتا تھا انھوں نے اس واقعہ کو محسوس کیا کہ اصل کام لوگوں کو انگریزی تعلیم سے روکنا نہیں بلکہ ان کے اندر اسلامی ذہن پیدا کرنا ہے۔ تاکہ وہ جدید تعلیم کو صحیح طور پر اپنے اندر جذب کر سکیں اس سلسلہ میں انھوں نے علی گڑھ کے سولہ سالہ قیام میں جو کوششیں کیں ان میں سے ایک درس قرآن کا اہتمام بھی تھا۔ جس نے مسٹر محمد علی کو مولانا محمد علی بنایا۔ سجاد حیدر یلدرم کہا کرتے تھے کہ مولانا ایسے اچھوتے انداز سے قرآن پاک کا درس دیتے تھے کہ ہم اس کو سن کر وجد کرتے تھے۔

طلبہ میں سنت نبوی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی سیرت کا ایک مختصر رسالہ بدء الاسلام لکھا جو کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہوا۔ میلاد کی مجالس کو وعظ و تبلیغ کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔

مولانا شبلی اس طرح مختلف سطحوں پر طلبہ میں دینی رنگ پیدا کرنے کی جو مسلسل کوشش کر رہے تھے اس نے کیا نتیجہ دکھایا۔ اس کو خود مولانا کی زبان سے سنئے۔ ایک عزیز کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعہ۔ آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں۔ مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ لجنۃ الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ ایک بی اے سکریٹری ہے۔ اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے۔ الصلوٰۃ خیر من النوم پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ہوتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش

ہے۔ بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز، سبحان اللہ! کیا شان وشوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹ جاتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانۂ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے ..... سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے..... مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔" (۱۵۰)

کالج کے لئے ایک یونیفارم کا تصور سب سے پہلے مولانا شبلی ہی نے دیا تھا۔ قسطنطنیہ کے سفر سے اپنے والد ماجد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی۔ ہر کالج کا ایک خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا۔ سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہے۔"

مولانا حالی کے بیان کے مطابق سرسید نے اس تجویز کو پسند کیا اور اسی کے مطابق کالج میں یونیفارم کا طریقہ رائج ہوا۔

اسی طرح قسطنطنیہ کے سفر نے طلبہ میں معاشرت کی یکسانی پر زور دیا۔ سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

"ہر کالج میں غریب طالب علموں کی متعدد تعداد ہے اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جا کر کوئی شخص تمیز نہیں کر سکتا کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے۔ طلبہ کی یکساں حالت ان میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے۔ اور غرباء کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت حاصل ہونا ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری پیدا کرتا ہے۔ بورڈنگ کا یہ طریقہ دیکھ کر مجھ کو اپنا مدرسۃ العلوم یاد آتا تھا اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلاف مراتب پر افسوس کرتا تھا..... میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر کلیتۂ ایک کر دیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں، بالکل مٹا دی جائیں۔

اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں " (۲۰۲)

جس طرح شبلی نے علی گڑھ کو بہت کچھ دیا، اسی طرح خود شبلی کو بھی علی گڑھ سے بہت کچھ ملا۔ اور انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے۔

مولانا شبلی ایک خالصۃً قدیم طرز کے عالم تھے۔ چنانچہ تعلیم کے بعد ابتدائی زمانہ میں اس قسم کے مشاغل میں دلچسپی لینا شروع کیا جو اس زمانہ میں ان کے جیسے لوگوں کا عام مذاق تھا۔ مثلاً خاص طرح کی منطقی بحثیں اور مناظرہ وغیرہ۔ مولانا کی کتاب اسکات المعتدی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ معاشی مسائل بھی مختلف سمتوں میں کھینچتے رہے۔ کبھی وکالت کا امتحان دیا، کبھی ملازمت کی، کبھی نیل کی تجارت اور زمینداری کا کام دیکھا (۹۶) علی گڑھ سے تعلق نے ایک طرف مولانا کو موقع دیا کہ وہ معاش کے لئے سوچنا چھوڑ دیں۔ دوسری طرف یہاں کے ماحول نے انھیں وقت کی علمی ضروریات کا احساس دلایا اور ان کی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر کام کی طرف موڑ دیا۔

مولانا شبلی نے جس زمانہ میں علی گڑھ میں قدم رکھا یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ مسلمانوں کے اوپر سیاسی غلبہ حاصل کر چکا تھا۔ اس غلبہ کو مزید ذہنی تقویت پہنچانے کے لئے یورپ کے اہل قلم یہ طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے علوم کو بگاڑ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ مسلمان اب تک اپنی تاریخ پر ناز کرتے چلے آرہے تھے۔ اس کے جواب کے لئے مغربی مصنفین نے یہ کیا کہ اسلام، سلاطین اسلام اور علوم اسلامیہ کی طرح طرح کی برائیاں لکھ کر پھیلانا شروع کیا تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل خود اپنی قوم سے نفرت کرنے لگے اور ان کے قومی غرور کو ایسا صدمہ پہنچے کہ ان کے دماغی قویٰ ہمیشہ کے لئے مضمحل ہو جائیں۔

علی گڑھ کی فضا میں مولانا شبلی کو وقت کے اس فتنہ کا احساس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مضامین اور کتابوں نیز گفتگوؤں اور تقریروں میں ایسی اعلیٰ علمی سطح پر اس کا رد پیش کیا کہ مستشرقین کا سارا غبارہ پھٹ گیا۔ ان کا یہ جذبہ یہاں تک بڑھا کہ قدیم کتب اسلامیہ سے استفادہ کے لئے انھوں نے اسلامی ممالک کے سفر کئے تاکہ وہ کتابیں جو ابھی تک چھپ نہیں سکی ہیں ان کے قلمی نسخوں کو دیکھ کر اپنی تصنیفات کے لئے مواد حاصل کریں۔ حالانکہ یہ بھی زمانہ کی نیرنگی ہے کہ جن نادر کتابوں کی خاطر مولانا نے سفر کی محنت اٹھائی تھی وہ بعد کو انھیں کے زمانہ میں خود مخالفین کے ہاتھوں چھپ کر عام ہو گئیں

اور اب ان کی پسندیدہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو چھپ نہ چکی ہو۔

مولانا شبلی نے جو تحریری کام کیا ہے، اس کا مشترک خصوصی موضوع غالباً ان لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے ـــــ اسلامی تاریخ کی عظمت کو نمایاں کرنا۔ اسلامی مسائل کو علمی سطح پر مدلل کرنا، اسلام کی عظمت رفتہ کو یاد دلا کر مستقبل کا حوصلہ پیدا کرنا۔ اور یہ وہی چیزیں ہیں جن کا احساس انہیں علی گڑھ کے ماحول میں ہوا۔ کیونکہ وہیں یہ صدائیں زیادہ گونج رہی تھیں۔

علی گڑھ کے قیام سے شبلی کو دوسرا اہم فائدہ یہ ملا کہ انھیں جدید تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مولانا شبلی نے ایک تقریر میں اپنا یہ واقعہ بیان کیا۔

"جب میں ٹرکی سے واپس آیا تو اتفاق سے گھر میں علالت تھی۔ ایک رات کو ۱۲ بجے تار آیا۔ میں نے اس کو کھولا۔ دل میں دبدھا پیدا ہوا کہ کیا واقعہ ہے۔ خدا جانے کیسا تار ہے۔ خیر میں دوڑا ہوا سرسید مرحوم کے نواسہ کے پاس گیا۔ انھوں نے پڑھ کر سنایا کہ یہ تار نواب علی حسن خاں صاحب نے بھوپال سے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو ٹرکی سے بخیریت واپس آنے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ حال ہم مولویوں کا ہے (۱۳۵)

علی گڑھ میں مولانا کو اندازہ ہوا کہ اسلام پر انگریزی زبان میں جو کتابیں آرہی ہیں وہ نہایت غلط ہیں۔ اس سے انھیں خیال ہوا کہ علمائے دین کو انگریزی اور دوسری یورپین زبانیں جاننی چاہئیں۔ تاکہ وہ مغربی زبانوں میں اسلام کا صحیح لٹریچر فراہم کرسکیں۔ اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک بار ان سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کے لئے آپ انگریزی پڑھنا کیوں ضروری قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ فقیہہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام دے گی۔ فرمایا ـــــ "عجیب بات کہتے ہو۔ اگر آج ہمارے فقہاء انگریزی جانتے اور ہماری فقہ کو انگریزی میں منتقل کرسکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کئے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے۔" (۱۳۵)

مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں غالباً مولانا شبلی کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ اگر وہ انگریزی جانتے ہوتے تو کیا کچھ اسلام کی خدمت کرسکتے تھے۔ اس لئے من نکردم شما حذر بکنید کے اصول پر وہ چاہتے تھے کہ اب علماء ایسے ہوں جو دینی علم کے ساتھ وقت کی زبان بھی جانتے ہوں تاکہ وقت کے ذہنوں پر اسلام کا سکہ بٹھایا جاسکے۔

علی گڑھ میں عمومی طور پر مولانا شبلی کو جو کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک چیز خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہ شبلی اور آرنلڈ کے تعلقات ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ایک نہایت لائق انگریز عالم تھے۔ دونوں کے علمی ذوق نے ایک دوسرے کو بے حد قریب کر دیا تھا۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی لکھتے ہیں:

"بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی صداقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا۔۔۔۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ دیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف پریچنگ آف اسلام کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ زبان سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے۔ (۱۴۰)

علی گڑھ کے تعلق سے جدید تعلیمی ضرورت کا احساس جس کی طرف مولانا شروانی نے اشارہ کیا ہے وہ اس وقت اور زیادہ پختہ ہو گیا جب مولانا شبلی اسلامی ممالک کے سفر سے واپس آئے۔ یہ سفر آپ نے علی گڑھ کے زمانۂ ملازمت میں کیا تھا۔ اور راستہ میں پورٹ سعید تک آرنلڈ بھی مولانا کے ساتھ تھے۔ اب مولانا کو پختہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے نئے نظام تعلیم کی شدید ضرورت ہے۔

یہاں ہم مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ مستعار لیں گے:

"مولانا شبلی کے نزدیک مسلمانوں کی ترقی کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کا ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس میں ایک طرف یورپ کے تمام جدید علوم و فنون کی تعلیم ہو اور دوسری طرف خالص اسلامی علوم کی۔ اور طریقۂ تربیت اور درس گاہوں کا ماحول تمام تر مذہبی ہو۔ اگر ساری قوم کی تعلیم کا یہ بند و بست نہ ہو تو کم از کم عربی مدرس گاہوں میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یونان کے بوسیدہ علوم کا سارا دفتر ہٹ کر اس کی جگہ نئے علوم کی تعلیم لے لے اور خالص مذہبی علوم اپنی جگہ پر

ر ہیں اور نصاب میں متاخرین کے شروح وحواشی کے بدلے قدماء کی اصل کتابیں جو فن کی جان ہیں پڑھائی جائیں۔ درس گاہیں عالی شان، کمرے صاف ستھرے اور تربیت ایسی ہو کہ طلبہ میں اولوالعزمی وحوصلہ مندی، بلند نظری اور خودداری پیدا ہو۔ لیکن یہ چیز ان کو نہ قسطنطنیہ میں ملی، نہ شام میں اور نہ مصر میں۔ سفرنامہ میں لکھتے ہیں ــــ "اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کردیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی۔" (سفرنامہ روم ومصر وشام)

مولانا شبلی کے اس تجربہ اور مطالعہ نے انھیں ایک نئے تعلیمی تصور تک پہنچایا۔ یہ کہ ایسی درس گاہیں قائم کی جائیں جہاں جدید وقدیم دونوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ مولانا سید سلیمان ندوی آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کا یہی احساس تھا جو ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام ودستور العمل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس نے دارالعلوم کا یہ مرقع (مسودہ) جس کو سیاح روم وشام نے اپنے قلم سے کھینچا ہے، دیکھا ہے۔ اس کو نظر آئے گا کہ روم وشام میں جو کچھ محسوس ہوا ہے اس کی تصویر ہندوستان میں کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (۲۱۷)

علی گڑھ سے مولانا شبلی کا تعلق ۱۸۸۳ء میں قائم ہوا اور صدی کے آخر تک جاری رہا۔ اس مدت میں مولانا کا تجربہ اور مطالعہ ان پر واضح کرچکا تھا کہ قوم کی اصلاح وترقی کے لئے کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف وہ خود ایسی علمی اور تاریخی کتابیں تصنیف کرنا چاہتے تھے جو قوم کے لئے ذہنی انقلاب کی بنیاد بن سکیں۔ دوسری طرف ان کے ذہن میں کم از کم دو ایسے اداروں کا نقشہ آچکا تھا جو اگلی نسل میں شبلی جیسے انسانوں کا تسلسل باقی رکھنے والا ہو۔ ایک ایسی درس گاہ جو جدید وقدیم کی تعلیم کا مرکز ہو۔ اور دوسرے ایک ایسا تصنیفی ادارہ جو اسلامی موضوعات کے لئے اعلیٰ درجہ کے اہل قلم تیار کرے۔ ان کے پہلے خواب کی تعبیر دارالعلوم ندوۃ العلماء تھا اور دوسرے کی تعبیر دارالمصنفین۔ یہ دونوں ادارے آج بھی قائم ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے شبلی کے مطلوب انسان تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

مولانا شبلی اب جو کام کرنا چاہتے تھے اس میں کالج کی ملازمت ایک رکاوٹ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ درس وتدریس کی ذمہ داریوں سے یکسو ہو کر مندرجہ بالا قسم کے کام پر لگ جائیں۔

خوش قسمتی سے حیدر آباد نے ان کے لئے یہ موقع فراہم کر دیا۔ مولوی سید علی بلگرامی اور نواب وقار الملک کی کوششوں سے ریاست نے ان کے لئے ایک مستقل وظیفہ جاری کر دیا تاکہ وہ یکسو ہو کر اپنے مشن کی تکمیل میں لگ جائیں۔ اس سلسلے میں حیدر آباد کی طرف سے جو فرمان جاری ہوا اس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے:

"مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر ہیں، ایک نہایت قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔ اب ان کی تمنا ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں۔ مولوی صاحب موصوف کو تصنیف کے کام میں فارغ البالی کے ساتھ مصروف کرنا ایک قومی کام ہے اور اس وقت کوئی عالم ہندستان میں ایسا نہیں ہے جو پہلانے ذخیروں سے اس طرح کام لے۔"

اس تمہید کے بعد فرمان میں کہا گیا تھا کہ چونکہ سرکار سے ایسے شخص کی اعانت ضروری ہے اس لئے ان کے لئے وظیفہ جاری کرنے کی منظوری دی جاتی ہے۔ یہ وظیفہ ابتداءً سو روپے ماہوار تھا اور آخر میں بڑھ کر تین سو کر دیا گیا۔

شبلی نے علی گڑھ میں جو کام کیا اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایک اور چیز کو شامل کیا جائے۔ اس کے بغیر یہ مطالعہ خالص علمی اعتبار سے ناقص رہے گا۔ اور وہ ہے وہ زمانہ جس میں شبلی کو کام کرنے کا موقع ملا۔

شبلی کا زمانہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ہندستان اس سے بہت مختلف تھا جو آج ہمیں نظر آتا ہے۔ اس وقت مسلم غلبہ کا تسلسل نوابوں اور زمینداروں کی سطح پر بدستور جاری تھا۔ اردو ملک کی زبان تھی، حتیٰ کہ اس وقت کے بیرونی حکمراں (انگریز) بھی عام طور پر اردو کو سمجھتے تھے۔ ماضی کے نتیجہ میں شعر و شاعری کی عظمت ابھی تک لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے اسباب تھے جنھوں نے شبلی کو وہ اعلیٰ مواقع کار دیئے جن کی مثالیں ان کی زندگی میں ملتی ہیں۔

اسی کے ساتھ ایک اہم بات یہ تھی کہ قدیم روایات کے نتیجہ میں ابھی تک قدر دانی کا ماحول موجود تھا۔ ایک شخص کے اندر جوہر دیکھ کر وقت کے بڑے لوگ کھلے طور پر اس کا اعتراف کر سکتے تھے۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو آج کل بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج شبلی جیسی شخصیتیں بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔

مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ شبلی کو علی گڑھ کا بہترین انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شبلی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے سولہ سال جو علی گڑھ میں گزرے وہ ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس طرح دونوں کو وہ چیز ملی جس کی دونوں میں سے ہر ایک کو ضرورت تھی۔ شبلی نے علی گڑھ کے اوپر اسلام کی تاریخی اور علمی عظمت قائم کی جس کا وہ اس وقت بے حد محتاج تھا۔ اسی طرح علی گڑھ نے شبلی کو جدید کا عرفان دیا جس کے نتیجہ میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان وہ اسلامی شخصیت ابھر سکی جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے "عہد جدید کا معلم اول" کا لقب دیا ہے۔ شبلی اور علی گڑھ کے دو مختلف دھاروں کا ملنا اس امتزاج کو وجود میں لا سکا جس نے اسلامی تاریخ پر اعلیٰ ترین کتابیں تخلیق کیں جس نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیا درکھی، جو دارالمصنفین کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر جس نے قوم کی اگلی نسلوں کو وہ ہیجان اور شعور دیا جو آج بھی جدید پر قدیم کو غالب کرنے کی امانت اپنے سینوں میں لئے ہوئے ہے۔ جو زمانہ کی وقتی قدروں پر اسلام کی دائمی قدروں کو بالا کرنے کے لئے بے چین ہے۔ جس طرح علی گڑھ زندہ ہے، اسی طرح شبلی بھی زندہ ہے اور دونوں پھر اسی طرح ایک دوسرے سے ملیں گے جس طرح وہ ماضی میں باہم ملے تھے۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور تاریخ کا فیصلہ بہر حال پورا ہو کر رہتا ہے۔

نوٹ: "شبلی ڈے" کے موقع پر ۳ مارچ ۱۹۶۸ کو یونین ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا۔

رسالہ کے حلقۂ الرسالہ کو پھیلانے کے لیے جو طریقے اختیار کر رہے ہیں ان میں سے ایک ہینڈ بلوں کی تقسیم ہے۔ ایک حلقہ کے شائع کردہ ہینڈ بل کا نمونہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

- اگر آپ کے پاس وقت کم ہے ——————
- اور آپ مختصر وقت میں کسی تعمیری پرچہ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ——————
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ حکمت و نصیحت سے بھرپور سبق آموز واقعات مسلسل آپ کے مطالعہ میں رہیں ——————
- اگر آپ عصری اسلوب میں اسلام کو پڑھنا چاہتے ہیں ——————
- اگر آپ الحاد و لادینیت کی رد میں سائنٹفک مضامین کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ——————
- اگر آپ ایک ایسے رسالہ کے متلاشی ہیں جس میں قیامت کی کڑک، حشر و نشر کی ہولناکیاں، جنت و جہنم کے مناظر، خدائے ذوالجلال کی تجلیاں سیرتِ رسولؐ کی جھلکیاں، صحابۂ کرامؓ کی بے مثال قربانیاں ہوں ——

تو آپ

ہر مقام پر دینی رسالوں میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
مولانا وحید الدین خاں صاحب کا دینی و فکری و علمی ماہنامہ

الرسالہ (اردو ، انگریزی)

کا مطالعہ کیجئے

مینار لائبریری ، ایک مینار مسجد ، رائچور (کرناٹک)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

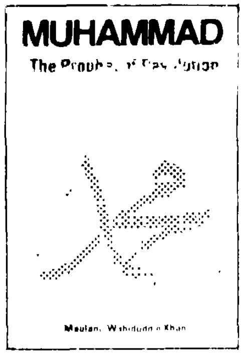
بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D(SE) 243
Regd R N No. 28822/76

September 1986
Number 118



MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala

C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

کوئی کسی کا چراغ نہیں بجھاتا ——
چراغ کے اندر تیل کی کمی اسے بجھا دیتی ہے

اکتوبر ۱۹۸۶

شمارہ ۱۱۹

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۹ اکتوبر ۱۹۸۶

فہرست

یہ انسان

موجودہ زمانہ کا ہر آدمی انتہائی حد تک بینا ہے اور اسی کے ساتھ انتہائی حد تک نابینا بھی۔ آج کے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ دوسرے شخص کی غلطیوں کو انتہائی باریکی کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے لیے وہ بالکل اندھا بنا ہوا ہے۔

آج کی دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ عام ہے وہ احتساب غیر ہے اور جو چیز سب سے زیادہ کم ہو گئی ہے وہ احتساب خویش ہے۔ بظاہر کوئی مذہبی ہے اور کوئی غیر مذہبی۔ کوئی اسلام کا علم بردار ہے اور کوئی غیر اسلام کا علم بردار۔ مگر اس اعتبار سے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کہ لوگوں کو دوسروں کی کوتاہیاں ضرورت سے زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ اور اپنی کوتاہی ان کو بقدر ضرورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔

لوگ دوسروں کی غلطیوں کا تذکرہ کرنے میں کیوں اتنا زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کا تذکرہ کر کے اپنی بڑائی کے جذبے کو تسکین ملتی ہے۔ اس طرح آدمی یہ جھوٹی تسلی حاصل کرتا ہے کہ دوسرے لوگ برے ہیں اور میں اچھا ہوں۔ دوسرے غلطیاں کرتے ہیں اور میں غلطیوں سے پاک ہوں۔

اس جھوٹی تسلی میں آدمی صرف اس لیے پڑا ہوا ہے کہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ اصل مسئلہ دوسروں کا نہیں بلکہ خود اپنا ہے۔ بھوک جب آدمی کو تڑپاتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ سارا مسئلہ اپنی ذات کا ہے۔ اسی طرح جب قیامت آئے گی اور تمام حقیقتیں کھل جائیں گی، اس وقت آدمی جان لے گا کہ سارا مسئلہ اپنی ذات کا تھا نہ کہ دوسروں کا۔

آج آدمی جہنم سے دور ہے اس لیے وہ دوسروں کے بارہ میں الفاظ کے دریا بکھیر رہا ہے۔ مگر قیامت میں جب وہ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سامنے کھڑا ہوگا تو وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ اس وقت وہ صرف ایک مسئلہ کو جانتا ہوگا ... اپنے گناہوں کو کس طرح ہلکا کرے، اپنے آپ کو کس طرح جہنم سے محفوظ رکھے۔

عقل مند آدمی وہ ہے جو آنے والے کل کو آج دیکھ لے۔

داعی کا معاملہ

ایک فن کار اپنی ساری صلاحیت استعمال کر کے آرٹ کا ایک نمونہ تخلیق کرے اور ایک شخص اس کو لے کر آگ میں ڈال دے تو ایسا شخص فن کار کی نظر میں کتنا زیادہ مبغوض ہو گا۔ فن کار کی نظر میں اس کا وجود انتہائی حد تک قابل نفرت ہو جائے گا۔

ایک باغبان برسوں کی محنت سے پھول کا ایک درخت اگائے۔ پھر لمبے انتظار کے بعد اس کی شاخ پر ایک حسین پھول کھلے۔ اس وقت اگر ایک شخص آئے اور اس پھول کو توڑ کر اسے مسل ڈالے تو اس باغبان کی نظر میں وہ سخت ترین مجرم ہو گا۔ باغبان چاہے گا کہ اس کو بھی وہ اسی طرح مسل ڈالے جس طرح اس نے اس کے حسین پھول کو مسلا ہے۔

خدا کے داعی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کا داعی اگرچہ بظاہر ایک انسان ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کائنات کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ زمین و آسمان بے شمار گردشیں کرتے ہیں تب قدرت کا وہ قیمتی آرٹ ظہور میں آتا ہے جس کو خدا کا داعی کہتے ہیں۔ سیکڑوں سال کے اندر بے شمار اسباب جمع ہوتے ہیں تب خدا کی زمین پر معنویت کا وہ پھول کھلتا ہے جس کا دوسرا نام خدا کا داعی ہے۔

ایسی حالت میں جو لوگ خدا کے داعی کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بنائیں وہ پوری کائنات کی ناقدری کرتے ہیں۔ وہ خدا کے خلاف سب سے زیادہ سنگین بغاوت کرتے ہیں۔ وہ اس پھول کو مسلنے کی کوشش کرتے ہیں جس کو خدا نے خود اگایا ہے۔

خدا کی ضمانت ہے کہ ایسے لوگ اپنے منصوبہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خدا کے داعی کو اس کے مشن کی تکمیل سے باز رکھ سکیں۔ خدا کا سچا داعی خدا کی خاص حفاظت کے سایہ میں رہتا ہے۔ اس کے لیے خدا کا ابدی فیصلہ ہے کہ وہ لازمی طور پر کامیاب ہو، اور اس کے دشمن لازمی طور پر ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں۔

خدا کے داعی کو زیر کرنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کو زیر کرنا۔ اور کون ہے جو خدا کو زیر کرنے کی طاقت رکھتا ہو (۱۷ جنوری ۱۹۸۶)

اپنی دلیل آپ

قرآن کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو بظاہر صرف "بیان" معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ان بیانات کے ساتھ ان کی دلیل مذکور نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بیانات اپنی دلیل آپ ہیں۔ کیونکہ یہ الفاظ ماورار انسانیت ہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو ان الفاظ میں کلام کر سکتا ہے، کوئی اور نہیں جو ان الفاظ میں کلام کر سکے۔

" اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا " (ابراہیم ۳۲) یہ ایک ایسا جملہ ہے جو ایک خدا کے سوا کسی اور کے حق میں کبھی بولا نہ جا سکا۔ اور یہی اس کی صداقت کی یقینی دلیل ہے۔ کیوں کہ اتنا بڑا بیان وہی دے سکتا ہے جو واقعۃً خالق کائنات ہو۔ کسی دوسرے کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اتنا بڑا بیان دینے کی جرأت کر سکے۔ چنانچہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے یہ کہنے کی ہمت کی ہو کہ "میں نے زمین و آسمان کو بنایا ہے۔"

" اگر اللہ قیامت تک تمہارے اوپر رات کر دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تم کو روشنی دے۔ اور اگر اللہ قیامت تک تمہارے اوپر مستقل دن کر دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمہارے لیے رات لے آئے۔" (القصص ۷۱) ان الفاظ کا بولنا اللہ کے سوا کسی کے لیے سزاوار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی شخص جرأت نہ کر سکا کہ وہ یہ الفاظ اپنی زبان سے نکالے۔ اور یہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ بے شک اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا ان کو تھامنے والا نہیں (فاطر ۴۱) ان الفاظ پر غور کیجیے۔ کون ہے جو ان الفاظ کو بولنے کی جرأت کر سکے۔ یہ الفاظ وہی بول سکتا ہے جو زمین و آسمان سے بلند ہو، جو فی الواقع یہ طاقت رکھتا ہو کہ وہ زمین و آسمان کو پوری طرح قابو میں رکھ سکے۔ کوئی شخص فرضی طور پر یہ الفاظ نہیں بول سکتا۔ یہ خدائی کلام ہے اور خدائی کلام صرف خدا ہی بول سکتا ہے۔ کوئی انسان خدائی کلام اپنے منہ سے نکالنے پر قادر نہیں۔

اسلامی رواداری

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سائنس کی تاریخ (History of Science) کے موضوع پر تفصیلات پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ جس وقت اسلامی تہذیب عروج پر تھی اس وقت مغربی یورپ میں تہذیب بالکل پست حالت میں تھی۔ پیغمبر اسلام کے پیروؤں کی فتوحات ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں۔ دسویں صدی عیسوی تک یہ حال ہوا کہ ایران سے لے کر اسپین تک تمام قوموں کی علمی زبان عربی بن چکی تھی۔ عرب فاتحین عام طور پر ان ملکوں میں امن اور خوش حالی لے آئے جہاں وہ آباد ہوئے۔ مثال کے طور پر اسپین میں قرطبہ کے کتب خانہ میں اس وقت پانچ لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں تھیں جب کہ پائرینیز کے شمال میں مشکل سے پانچ ہزار کتابیں پائی جاتی تھیں۔ مزید یہ کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بھی روادار تھے۔ چنانچہ مسلم عہد حکومت میں یہودی اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے جب کہ اسی زمانے میں یورپ کا یہ حال تھا کہ وہاں انھیں زندہ رہنے کا حق بھی مشکل سے دیا جاتا تھا:

> The Muslims were tolerant of the other monotheistic faiths. So that Jews rose to high position in Islamic lands at a time when they were scarcely permitted survival in Europe (16/368).

موسیٰ بن میمون (۱۲۰۴ — ۱۱۳۵ء) یہود کے اکابر علماء میں سے تھا۔ وہ کلدانی، یونانی، عبرانی اور عربی زبانیں جانتا تھا۔ یہود کے یہاں اس کی عظمت اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی۔ انھوں نے کہا کہ موسیٰ سے موسیٰ تک موسیٰ جیسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا (من موسیٰ الیٰ موسیٰ لم یظھر واحد کموسیٰ)

موسیٰ بن میمون کی پیدائش اندلس کے شہر قرطبہ میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ مصر پہونچا۔ اس وقت صلاح الدین ایوبی مصر کا حکمراں تھا۔ اس نے موسیٰ بن میمون کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ موسیٰ بن میمون کی یہودیت کے باوجود صلاح الدین ایوبی نے اس کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہ کی۔

نگرانی میں

امریکی صدر کی رہائش گاہ کا نام وہائٹ ہاؤس ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور انسان رہتا ہے۔ وہ ایک بٹن دبا کر ہیلی کاپٹر بلا سکتا ہے۔ دوسرا بٹن دبا کر عالمی جنگ چھیڑ سکتا ہے۔ مگر خود وہ دنیا کا سب سے زیادہ مجبور انسان ہے۔ وہائٹ ہاؤس میں تحفظ (Security) کے لیے اتنے سخت انتظامات ہیں کہ صدر کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ زیرِ حفاظت نہیں ہے بلکہ زیرِ نگرانی ہے:

He is under surveillance rather than under protection.

سابق صدر امریکہ کی ایک نوجوان لڑکی نے اپنی کتاب (سوینیر) میں لکھا ہے کہ وہائٹ ہاؤس میں قیام کے زمانہ میں وہ کسی لڑکے سے محبت کا تعلق قائم نہ کر سکی۔ کیوں کہ وہاں تخلیہ میں اس کے لیے کچھ کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے اپنا یہ ذہن بنایا کہ وہ جب تک وہائٹ ہاؤس میں ہے وہ شادی نہیں کرے گی۔ قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ ذرا ان تاثرات کا اندازہ کیجیے جب کہ ایک دوست لڑکے کو دروازہ پر شب بخیر کہنا ہو، جہاں روشنیوں کا طوفان ہو اور خفیہ پولیس کا آدمی بھی اسی کے ساتھ موجود ہو۔ ایسے موقع پر آپ ہاتھ ملانے سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے، اور وہ نسبت کا معاملہ طے کرنے کے لیے کافی نہیں:

> One of the young daughters of the former President wrote in her book, *Souvenir*, that she could not make any love affair during her stay in the White House as there was nothing she could do in private. She had made up her mind not to marry while she lived in the White House. She asked the reader to consider the effect of saying good night to a boy at the door, in a blaze of floodlights, with a Secret Service man in attendance. There is not much you can do except shake hand, and that's no way to get engaged.
>
> *The Hindustan Times*, May 31, 1986 p. 17

وہائٹ ہاؤس کے آدمی کو صرف یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دیکھا جا رہا ہے، اس کو یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اس کو سزا ملے گی۔ اس کے باوجود وہ اس قدر محتاط ہو جاتا ہے۔ پھر جو شخص اس احساس سے دبا ہوا ہو کہ خدا اس کو ہر لمحہ دیکھ رہا ہے وہ کتنا زیادہ محتاط ہو جائے گا۔

نفسیات جرم

ایک اطالوی ڈاکٹر لومبروسو (Cesare Lombroso) نے انیسویں صدی میں کچھ لوگوں کے سروں کی پیمائش کی۔ اس کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ غیر مجرم لوگوں کے مقابلہ میں مجرم لوگوں کے دماغ (Brain) جسامت میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جو شخص مجرم ہوتا ہے وہ پیدائشی طور پر مجرم ہوتا ہے۔ مگر اب یہ نظریہ نہیں۔ آج یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ تربیت نہ کہ فطرت وہ چیز ہے جو کسی کو مجرم بناتی ہے:

Nurture, not nature, is responsible for criminal behaviour.

حال میں امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جرم اور فطرتِ انسانی:

Crime and Human Nature
by Prof. James Q. Wilson and Prof. Richard Herrnstein
Published by Simon and Schuster, New York

اس کتاب میں جرم اور مجرم کا مطالعہ کرتے ہوئے جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجرم فوری مقصد کو سامنے رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے اس ذہن کی وجہ سے ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچیں یا باقاعدہ منصوبہ بنائیں:

Criminals tend to be now-oriented personalities, which make planning or even thinking about the future difficult.

جرم کی اس نفسیات پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام عین مطابقِ حقیقت نظریہ ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں جدید تہذیب کا نظریہ سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ اسلام آخرت رُخی ذہن بناتا ہے اور جدید تہذیب دنیا رُخی ذہن بناتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی ذہن کی ساری توجہ "تب" پر ہوتی ہے اور جدید تہذیب کی ساری توجہ "اب" پر۔ اس طرح گویا اسلامی فکر مجرمانہ نفسیات کی جڑ کو کاٹ رہا ہے، جب کہ جدید تہذیب کا مادی ذہن مجرمانہ نفسیات کی پرورش کرنے والا ہے۔

آخرت کا سوال

خدا نے انسان کو ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کے عرصۂ حیات (Life span) کے تقریباً سو سال کو موجودہ دنیا میں رکھ کر بقیہ ساری عمر کو موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں ڈال دیا۔ اب بہترین عقل مندی یہ ہے کہ انسان اس آنے والی دائمی زندگی کو سامنے رکھ کر زندگی گزارے۔ اس کی زندگی آخرت رخی (Akhirat oriented) زندگی ہو۔

ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے:

> It is a question for us now to consider whether we have any personal relations towards the Supreme Power; whether there exists another world in which we shall be requited according to our actions. Not only is this a grand problem of philosophy; it is of all questions the most practical for us, the one in which our interests are most vitally concerned. This life is short, and its pleasures are poor; when we have obtained what we desire it is nearly time to die. If it can be shown that by living in a certain manner, eternal happiness may be obtained, then clearly no one except a fool or a mad man will refuse to live in such a manner (p. 414).
>
> Winwood Reade
> *The Martyrdom of Man*
> London, Watts & Co 1948, pp 444

"ہمارے لیے یہ ایک غور طلب سوال ہے کہ کیا خالق کائنات اور ہمارے درمیان کوئی ذاتی رشتہ ہے۔ کیا موجودہ دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے جس میں ہم اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پائیں گے یہ نہ صرف فلسفہ کا بہت بڑا سوال ہے۔ یہ خود ہمارے لیے سب سے زیادہ عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے ہمارے مفادات بہت زیادہ وابستہ ہیں۔ موجودہ زندگی بہت مختصر ہے۔ اس کی خوشیاں نہایت معمولی ہیں۔ جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں تو ہمارے مرنے کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے۔ اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص نہیں ہوگا جو اس طرح زندگی گزارنے سے انکار کرے۔"

آخرت کا مسئلہ کس قدر اہم ہے، مگر انسان کتنی آسانی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

خدا کے نام پر

خدا بڑا ہے۔ اور کوئی بڑا نہیں ـــــ بظاہر سو فی صد خیر کی بات ہے۔ مگر یہ بظاہر خیر کی بات بھی عملاً شر کی بات بن جاتی ہے جب کہ آدمی نے اس کو صرف آدھی شکل میں دریافت کیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا بڑا ہے، اس کے سوا کوئی بڑا نہیں۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان چھوٹا ہے، اس سے زیادہ اور کوئی چھوٹا نہیں۔ آدمی اگر ان دونوں باتوں کو جانے تو اس کے اندر تواضع کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور اگر وہ صرف پہلی بات کو جانے اور دوسری بات کو نہ جانے تو اس سے اس کے اندر جو مزاج پیدا ہوگا اسی کا نام سرکشی ہے۔

شیطان کو معلوم تھا کہ خدا بڑا ہے، مگر اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ میں چھوٹا ہوں۔ چنانچہ وہ ابدی طور پر شر اور فساد کا کارخانہ بن گیا۔ اسی طرح ہٹلر اس بات کو جانتا تھا کہ خدا بڑا ہے، مگر وہ اس بات کو نہیں جانتا تھا کہ میں چھوٹا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تاریخ کا سب سے زیادہ سرکش اور مفسد انسان قرار پایا۔

"خدا بڑا ہے" کہنا ایک خارجی حقیقت کا اقرار کرنا ہے۔ اور "میں چھوٹا ہوں" کہنا اپنے آپ کو اس خارجی حقیقت کے مطابق ڈھالنا ہے۔ کچھ لوگ خدا کو ایک عظیم خارجی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اپنی ذات کو اس کے مطابق نہیں ڈھالتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے نام پر خود خدا بن جاتے ہیں۔ وہ لوگوں سے لڑتے ہیں، حالاں کہ خدا کو بڑا ماننے کا تقاضا تھا کہ ان سے لڑائی کا ہر جذبہ چھن جائے۔ وہ لوگوں پر زبان درازی کرتے ہیں، حالاں کہ خدا کی خدائی کا احساس جس کے دل میں پیدا ہو جائے اس کے الفاظ اس سے گم ہو جاتے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ لوگوں کو اپنی زبان درازی کا نشانہ بنائے۔

ہر حقیقت اس وقت تک آدھی حقیقت ہے جب تک آدمی اس کے مقابلہ میں خود اپنی حیثیت کو دریافت نہ کرے۔ خارجی حقیقت کی دریافت اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ اس کی نسبت سے آدمی اپنے واقعی مقام کو بھی جان لے۔ جس آدمی کو پہلی بات معلوم ہو، اور دوسری بات اس کو معلوم نہ ہو، اس کا سارا رویہ اس دنیا میں غلط ہو کر رہ جائے گا۔

عین وقت پر

امتحان کسی طالب علم کی زندگی کا سب سے زیادہ نازک لمحہ ہوتا ہے۔ مگر یہی نازک لمحہ وہ لمحہ ہے جب کہ کسی طالب علم کی زندگی کا آخری فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو طالب علم امتحان کی نزاکتوں کو سوچ کر امتحان دینے سے رک جائے اس نے اپنے مستقبل کو ہمیشہ کے لیے برباد کر لیا۔ وہ عین اسی وقت فیل ہوگیا جب کہ اس کو پاس ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا چاہیے تھا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ مومن و مسلم کا بھی ہے۔ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کسی شخص کے لیے جنت کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک ایسا نہ ہو کہ اس کو آزمائش میں ڈالا جائے اور وہ آزمائش میں پورا اترے۔ آزمائش کے لمحات آنے پر اپنے آپ کو اس سے بچانا ایسا ہی ہے جیسے کسی طالب علم کے لیے امتحان کا انتظام کیا جائے اور وہ اس کی سختیوں سے گھبرا کر بھاگ کھڑا ہو۔

ایک شخص معمول کے حالات میں حق کا ساتھ دے رہا تھا اور جب کوئی مشکل مرحلہ آیا تو وہ حق کو چھوڑ کر اس سے الگ ہوگیا۔ ایک شخص مزاج کے موافق صورت حال میں اسلامی بنا ہوا تھا اور جب مزاج کے خلاف صورت حال سامنے آئی تو وہ اچانک غیر اسلامی بن گیا۔ ایک شخص معروف نقشہ میں دینداری دکھا رہا تھا مگر جب کوئی غیر معروف نقشہ سامنے آیا تو وہ دین دار بننے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ایک شخص "ساحل" پر اسلام کی باتیں کر رہا تھا اور جب "دریا" کی موجوں سے سابقہ پیش آیا تو وہ اسلامی باتیں بھول کر بالکل مختلف انسان بن گیا۔

ایسی تمام مثالیں آزمائش میں پورا نہ ہونے کی مثالیں ہیں۔ ایسے تمام مواقع وہ مواقع تھے جب کہ اس کا خدا چاہتا تھا کہ اس کی جانچ کرکے اس کو جنت کے باغوں میں داخل کر دے۔ مگر عین وقت پر وہ جانچ میں پورا نہ اترا۔ اس کا رب اس کے پاس آیا مگر وہ پیٹھ پھیر کر اپنے رب سے دور چلا گیا۔

آہ وہ انسان، جس کے سامنے جنت کا دروازہ کھولا گیا۔ مگر عین وقت پر وہ جنت میں داخل ہونے سے باز رہا۔ وہ عین اس وقت ناکام ہوگیا جب کہ اس کو کامیاب ہونے کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔

سرکشی

ایک لطیفہ ہے۔ ایک مسجد کے امام صاحب تھے۔ ان کے گھر پر محلہ کے بنیا کے یہاں سے سامان آیا کرتا تھا۔ گھر والے قرض پر سامان منگاتے رہے یہاں تک کہ رقم زیادہ ہو گئی۔ بنیا نے کہا کہ پہلے پچھلا قرض ادا کرو اس کے بعد اور سامان لے جاؤ۔

امام صاحب بنیا کی اس گستاخی پر خفا ہو گیے۔ جمعہ کے روز جب محلہ کے تمام لوگ مسجد میں جمع تھے، امام صاحب نے کہا کہ بھائیو، میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں اس کو سنو۔ تمہارے محلہ کا بنیا کافر و مشرک ہے۔ آپ میں سے کوئی شخص اس کے یہاں سے سامان نہ خریدے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن و حدیث کے نصوص پیش کیے اور کہا کہ ان آیتوں اور حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص کافر و مشرک ہو اس سے معاشی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا " امام صاحب، بنیا تو ۲۵ برس سے یہاں دکان کر رہا ہے، پھر آج ہی یہ مسئلہ آپ کیوں بیان کر رہے ہیں"۔ امام صاحب نے بگڑ کر کہا: تم کافروں کے ساتھی ہو اس لیے تمہارا بھی بائیکاٹ ہونا چاہیے۔

امام صاحب نے بظاہر قرآن و حدیث کے حوالے دیئے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس خاص معاملہ میں خود امام صاحب غلطی پر تھے نہ کہ بنیا۔ اس معاملہ میں اصلی اور بنیادی بات صرف یہ تھی کہ امام صاحب کے اوپر بنیا کا حق تھا جس کو انھیں ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس کے سوا امام صاحب نے جو باتیں کہیں وہ سب اصل مسئلہ کی نسبت سے غیر متعلق (Irrelevant) تھیں۔

یہی معاملہ آج کل مسلم معاشرہ کا ہو رہا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے شخص کا حق مارے گا۔ اور جب حق دار اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا تو وہ حق دار کو اس کا حق لوٹانے کے بجائے یہ کرے گا کہ وہ اس کو طرح طرح سے بدنام کرنا شروع کر دے گا۔ حالاں کہ یہ سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ مذکورہ مسلمان کو سب سے پہلے غصب شدہ حق لوٹانا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ مزید جو کچھ کہنا چاہتا کہہ سکتا ہے۔ حق غصب کرنا غلطی ہے۔ اور غصب کرنے کے بعد صاحب حق کے خلاف بدنامی کی مہم چلانا غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ آدمی کے جرم کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو کم نہیں کرتا۔

واقفیت ضروری

قرآن میں قیامت کی عدالت کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وہاں وہی شخص گواہی دے گا جو حق کی گواہی دے اور وہ اس کو جانتا ہو (لا یملک الذین یدعون من دونه الشفاعة الا من شهد بالحق وهم یعلمون، الزخرف ۸۶)

یہی چیز دنیا کے معاملات میں بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا۔ اس میں ایک شخص گواہی دینے کے لیے آیا۔ آپ نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اگر تم نے سورج کی طرح دیکھا ہو تو گواہی دو ورنہ اس سے الگ رہو۔ (اذا رأیت مثل الشمس فاشهد والا فدع، احکام القرآن للجصاص)

اسی بنا پر فقہاء نے شہادت کا یہ اصول وضع کیا ہے کہ علم گواہی کے لیے شرط ہے۔ کوئی شخص جس واقعہ کی گواہی دینا چاہتا ہے اس کو اس واقعہ کا ذاتی علم ہونا چاہیے۔ اگر وہ متعلقہ واقعہ کا ذاتی علم نہیں رکھتا تو نہ اس کو گواہی دینا چاہیے اور نہ اس کی گواہی کا شرعی طور پر کوئی اعتبار ہے۔

اس سے معاملات میں شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو معاشرہ میں کس طرح رہنا چاہیے۔ اس کو کیا بات بولنا چاہیے اور کیا بات نہیں بولنا چاہیے۔

ایک شخص کے کسی معاملہ میں آپ رائے دینے جا رہے ہوں تو پہلے سوچ لیجئے کہ کیا آپ اس معاملہ میں ضروری واقفیت رکھتے ہیں۔ کیا اس معاملہ میں آپ کی واقفیت اس درجہ کو پہونچ چکی ہے کہ اس کو ذاتی علم کہا جا سکے۔ اگر آپ مذکورہ معاملہ میں ذاتی علم کی حد تک واقف ہو چکے ہیں تو آپ اس معاملہ میں بولیے ورنہ خاموش رہیے۔

مزید یہ کہ یہ بات کہ آپ مذکورہ معاملہ سے پوری طرح واقف ہیں یہ بھی اس وقت درست قرار پائے گا جب کہ وہ از روئے واقعہ بھی درست ہو۔ ورنہ خدا کی عدالت میں آپ مجرم قرار پائیں گے، خواہ بطور خود اپنے آپ کو واقف کار سمجھ رہے ہوں۔

ایمان وعمل

عن ابی العالیۃ قال کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرون انہ لایضر مع لا الٰہ الا اللہ ذنب کما لاینفع مع الشرک عمل فنزلت (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم) فخافوا ان یبطل الذنب العمل

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع صفحہ ۱۸۱)

حضرت ابوالعالیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یہ خیال کرتے تھے کہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کوئی گناہ نقصان نہ پہونچائے گا جس طرح شرک کے ساتھ کوئی عمل فائدہ نہیں پہونچاتا۔ اس پر یہ آیت اتری: اے ایمان والو تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو (محمد ۳۳) اس کے بعد وہ ڈرنے لگے کہ گناہ عمل کو باطل کر دیتا ہے۔

ایمان ایک قسم کا معاہدہ ہے۔ بندہ جب ایمان کے الفاظ اپنی زبان سے دہراتا ہے تو وہ اللہ سے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ ایک اللہ کو اپنا بڑا جانے گا۔ وہ اپنے قول وعمل میں صرف اس طریقہ کی پیروی کرے گا جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ بتایا ہے۔

اب اگر ایسا ہو کہ ایک شخص معاہدہ کے الفاظ تو بول دے مگر اپنے حقیقی رویہ میں وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کا معاہدہ اللہ کی نظر میں باطل ہو جائے گا۔ وہ اس کو کچھ فائدہ نہ پہونچا سکے گا۔

وہی ایمان قابل اعتبار ایمان ہے جو آدمی کو اپنی پکڑ میں لے لے۔ آدمی بولے تو وہی بولے جو ایمان کے مطابق اسے بولنا چاہیے۔ آدمی کرے تو وہی کرے جو ایمان کے مطابق اسے کرنا چاہیے اس کا ایمان اس کی زندگی کے اوپر حاکم بن جائے۔

دنیا کا ہر معاہدہ اپنے عمل کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔ اگر معاہدہ اور عمل میں مطابقت ہے تو معاہدہ برقرار رہتا ہے۔ ورنہ معاہدہ توڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کے معاہدہ کو بھی عمل کے اعتبار سے جانچا جائے گا۔ اگر آدمی کا عمل اس کے ایمان کے مطابق ہے تو اللہ اس کے معاہدۂ ایمان کو قبول کرے گا۔ ورنہ وہ اس کو رد کر دے گا۔ ایسا ایمان اللہ کے یہاں بے قیمت قرار پائے گا جس کے ساتھ عمل شامل نہ ہو۔

ایمان کی آزمائش

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مومن بننے کے لیے صرف اتنا کافی نہیں کہ آدمی اپنی زبان سے کہہ دے کہ "میں مومن ہوں"۔ اقرار ایمان کے بعد حالات میں ڈال کر آدمی کی آزمائش کی جاتی ہے۔ اور جب آدمی آزمائش کے بعد اپنے ایمان پر قائم رہتا ہے تب اس کا ایمان اللہ کے نزدیک قابل اعتبار قرار پاتا ہے اور وہ حقیقی معنوں میں وہ مومن بنتا ہے جس کے لیے خدا نے جنت کے محل تیار کر رکھے ہیں۔

ایمان لانا دوسرے لفظوں میں اللہ کو اپنا بڑا بنانا ہے۔ آزمائش اسی لیے ہوتی ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آدمی نے فی الواقع اللہ کو اپنا بڑا بنا لیا ہے۔ یا حقیقی طور پر اس کے نزدیک بڑا کوئی اور ہے اور وہ صرف زبان سے خدا کی بڑائی کے الفاظ بول رہا ہے۔ آدمی جب حالات کی آزمائش میں پڑتا ہے اس وقت فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک بڑا (سپریم) کون ہے۔ کس کو وہ سب سے زیادہ لحاظ کے قابل سمجھتا ہے اور کس کو لحاظ کے قابل نہیں سمجھتا۔

حالات بار بار آدمی کو ایسے موڑ پر لاتے ہیں جہاں ایک طرف خدا کے تقاضے ہوتے ہیں اور دوسری طرف دوسری چیزوں کے تقاضے۔ ایک طرف خدا اور اس کا دین ہوتا ہے اور دوسری طرف آدمی کا مادی مفاد، اس کی دنیوی مصلحتیں، اس کے بیوی اور بچے، اس کا نفس اور اس کی انا، ایسے مواقع ہی پر معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

اب ایک انسان وہ ہے جو تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے خدا کو پکڑ لے۔ اس کے مفادات مجروح ہوں، اس کے بچوں کی آرزوئیں ذبح ہو رہی ہوں، اس کی انا کا بت ٹوٹ رہا ہو مگر وہ ان سب کو نظر انداز کر دے اور خدا پر ایمان کا جو تقاضا ہے اس کو پوری طرح اختیار کر لے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو نازک مواقع پر خدا کی پکار کو بھول جائے۔ وہ ایمان کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اپنے مفادات کی طرف اور اپنے بیوی بچوں کی طرف جھک جائے۔ وہ اپنی ذاتی مصلحتوں کو بچانے کی خاطر خدائی مصلحتوں کو فراموش کر دے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ خدا کے یہاں غیر مومن قرار دیے جائیں گے، خواہ زبان سے انھوں نے کتنا ہی زیادہ اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔

تلبیس

قرآن میں یہود کو جن باتوں کا مجرم قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک تلبیس الحق بالباطل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون (البقرہ ۴۲) اور صحیح میں غلط کو نہ ملاؤ اور سچ کو نہ چھپاؤ حالاں کہ تم جانتے ہو۔

لبس الشیٔ بالشیٔ کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ گڈمڈ کرنا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ (لا تخلطوا الحق بالباطل)

قدیم عرب میں یہود کو مذہبی سیادت کا مقام حاصل تھا۔ مذہبی معاملہ میں کسی کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو وہ یہودی علماء کے پاس جاتا تھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا تو عرب لوگ یہودی عالموں کے پاس جاکر پوچھنے لگے کہ ان کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔

پیغمبر اسلام کو ماننے سے یہود کی مذہبی بڑائی ختم ہوتی تھی۔ اس لیے انھوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ غلط غلط باتیں پھیلا کر وہ لوگوں کو آپ سے بدظن کرنے لگے۔ جب کوئی شخص ان کے یہاں جاکر آپ کے بارہ میں پوچھتا تو وہ ایسا کرتے کہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر لوگوں کو آپ کی طرف سے مشتبہ کر دیتے۔ ایک مفسر کے الفاظ میں "ہر سائل کے دل میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے تھے۔ کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں۔"

ایک چیز دلیل سے ثابت ہو جائے، پھر بھی آدمی اس کو ماننا نہ چاہے تو اس کے بعد وہ یہ کرتا ہے کہ غیر متعلق باتیں چھیڑ کر اس کو بدنام کرنے کی مہم چلاتا ہے۔ جس چیز کو وہ دلیل سے غلط ثابت نہ کر سکا اس پر عیب لگا کر وہ اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس قسم کا فعل آدمی کے جرم کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے جرم کو گھٹانے والا نہیں۔

کم بولنا زیادہ سننا

كتب رجل الى حكيم يقول : لِمَ تبخَلُ على الناس بالكلام - فقال الحكيم : إنّ الخالق سبحانه قد خلق لنا أذنين ولساناً واحداً لنسمع اكثر مما نتكلم ، لا أن نتكلم اكثر مما نسمع

ایک آدمی نے ایک دانا شخص کو لکھا کہ آپ لوگوں سے کلام کرنے میں کیوں بخل سے کام لیتے ہیں ۔ دانا نے جواب دیا کہ خالق عزوجل نے ہمارے لیے دو کان پیدا کیے اور ایک زبان بنائی ۔ تاکہ ہم بولنے سے زیادہ سنیں ۔ نہ کہ سننے سے زیادہ بولیں ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے لیے درست طریقہ یہی ہے کہ وہ کم بولے اور زیادہ سنے ۔ یہی کسی انسان کا صحیح ترین مزاج ہے اور اسی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے ۔ زیادہ سننے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زیادہ جاننے کی کوشش کرے ۔ آدمی جتنا زیادہ جانے گا اتنا ہی زیادہ وہ صحیح بول پائے گا ۔ اس کے برعکس زیادہ بولنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کمتر معلومات کے باوجود بولنے لگے ۔ ایسے شخص کا کلام سطحی ہو کر رہ جائے گا ۔

آدمی جب دوسرے کی بات سنتا ہے تو اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے ۔ دوسرے کے نقطۂ نظر کو جاننے کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے نقطہ نظر کو زیادہ طاقت ور اور زیادہ مطابق واقعہ بنا کر پیش کر سکے ۔ سننے سے پہلے بولنے میں یک طرفہ طور پر صرف اپنے ذہن کی رعایت ہوتی ہے ۔ مگر جب آدمی دوسروں کی سن کر بولے تو اس کے کلام میں اپنے ساتھ دوسروں کی رعایت بھی شامل ہو جاتی ہے ۔ اس کا کلام دوطرفہ صداقت کا حامل بن جاتا ہے ۔

زیادہ سننا اور کم بولنا صرف ایک صفت نہیں ، وہ صفات کا مجموعہ ہے ۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کی ایک علامت ہے ۔ اس کا مطلب ہے تواضع ، سنجیدگی ، خوش اخلاقی ، دوسروں کی رعایت اور معاملات کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کا مزاج ۔ اس کے برعکس کم سننا اور زیادہ بولنا ایک ایسی شخصیت کی علامت ہے جس کے اجزا ر ہیں سطحیت ، بے اخلاقی ، ذاتی اظہار ، سرسری معلومات پر رائے قائم کرنا اور احساس ذمہ داری کے بغیر کلام کرنا ۔

معروف و منکر

شریعت میں جو احکام ہیں ان میں سے ہر حکم کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں۔ کسی حکم کے لیے صلوٰۃ کا لفظ ہے اور کسی حکم کے لیے صوم کا۔ کسی حکم کے لیے زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور کسی حکم کے لیے حج کا، وغیرہ۔ اسی طرح ایک حکم وہ ہے جس کے لیے قرآن و حدیث میں الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان کے اوپر لازم ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے، طاقت ہو تو ہاتھ سے۔ ہاتھ سے نہ کر سکے تو زبان سے، اور زبان سے نہ کر سکے تو دل سے۔

یہ حکم دراصل مسلمانوں کی باہمی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے اوپر نگراں بن جائے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس کا حق نہ دے تو قریب کے مسلمان اس پر زور ڈال کر اس کو حق دار کا حق دینے پر مجبور کریں۔ ایک مسلمان ظالمانہ روش اختیار کرے تو اس کے آس پاس جو مسلمان ہیں وہ سب مل کر اس کے پیچھے پڑ جائیں اور اس کو ظلم و سرکشی کا رویہ چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ کام اپنی استطاعت کے بقدر کرنا ہے۔ ہاتھ سے ممکن ہو تو ہاتھ سے، ورنہ زبان سے، اور زبان سے ممکن نہ ہو تو آخری درجہ یہ ہے کہ دل سے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر قرآن میں اس کے لیے مشارکت کے صیغے آئے ہیں، یعنی ایسا صیغہ جس میں آپس میں ایک دوسرے کے اندر کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہو۔ مثلاً ائتمار بالمعروف (وائتمروا بینکم بمعروف، الطلاق ۶) اور تناہی عن المنکر (کانوا لا یتناھون عن المنکر فعلوہ، المائدہ ۷۹)

مسلمانوں کی اصلاح معاشرہ کے لیے یہی اصل کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس حکم کا مطلب یہ کہ مسلمان کے اندر اپنے بھائی کی مدد کرنے کا جذبہ موجود ہو۔ جہاں کوئی مسلمان حق کے خلاف چلتا ہوا نظر آئے فوراً اس علاقہ کے مسلمان ایسے مسلمان سے ملیں، وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کریں۔ وہ ہر شخص کے معاملہ میں دخل دے کر اس کو حق پر قائم رہنے اور ناحق کو چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ حقیقتہً ایک سماجی کام ہے نہ کہ کوئی حکومتی کام۔

احتساب

دنیا میں سب کم جو چیز پائی جاتی ہے وہ احتساب خویش ہے ۔ اور جو چیز دنیا میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے وہ احتساب غیر ہے ۔ آج ہر چھوٹا بڑا آدمی دوسروں کے احتساب میں مشغول ہے ۔ مگر وہ انسان کہیں نظر نہیں آتا جو اپنا احتساب آپ کر رہا ہو ۔

آدمی باطل کلام بولتا ہے مگر اس کو کبھی یہ تڑپ نہیں ہوتی کہ اس نے اپنی زبان سے باطل کلام نکالا ہے ۔ آدمی واضح طور پر بے انصافی کرتا ہے مگر اس کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس سے بے انصافی کا فعل سرزد ہوا ہے ۔ آدمی دوسروں کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے مگر اس کو توفیق نہیں ہوتی کہ پیچھے مڑکر اپنے آپ کو دیکھے ۔

لوگ اپنے ذاتی مفاد کے معاملہ میں حساس ہیں مگر وہ حق کے معاملہ میں بے حس ہوگئے ہیں ۔ ان کی انا پر ضرب لگے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں مگر وہ حق وصداقت پر ضرب لگاتے ہیں اور ان کے اندر اس کے خلاف کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی ۔

لوگوں کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر ان کے درمیان کوئی ایسی تحریک اٹھائیے جس کی زد ان کی اپنی ذات پر پڑتی ہو تو ایسی تحریک کو لوگوں کے درمیان کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہوگی ۔ وہ ایسی تحریک کو اس طرح نظر انداز کردیں گے جیسے کہ وہ کوئی قابل لحاظ چیز ہی نہیں ۔

اس کے برعکس لوگوں کے درمیان ایسی تحریک اٹھائی جائے جس کی زد دوسروں کے اوپر پڑتی ہو تو وہ جوق در جوق اس کو لبیک کہیں گے ۔ دوسروں کو غلط قرار دینا ، دوسروں کے خلاف تقریریں کرنا ، دوسروں کے خلاف ایجی ٹیشن چلانا ، دوسروں کے خلاف ہنگامہ آرائی کرنا لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جن تحریکوں میں اس طرح کی غذا ہو ان کو فوراً مقبولیت مل جاتی ہے ۔ اس کے لیڈر فوراً شہرت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں ۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ احتساب خویش اگر دین ہے تو احتساب غیر سراسر بے دینی ۔ جو لوگ اس طرح کے لایعنی مشغلوں میں مصروف ہیں وہ بہت جلد دیکھ لیں گے کہ وہ صرف بربادی کی خندق کی طرف سفر کر رہے تھے ، اگرچہ بطور خود انھوں نے سمجھا تھا کہ وہ کامیابی کے چمنستان کی طرف چلے جا رہے ہیں ۔

جھوٹی شکایت

انسانی سماج میں جو چیز سب سے زیادہ عام ہے وہ جھوٹی شکایت ہے اور جو چیز اس سے بھی زیادہ عام ہے وہ ہے جھوٹی شکایت کو سن کر فوراً اسے مان لینا۔ مگر یہ دونوں ہی چیزیں سراسر باطل ہیں۔ شکایت کا پیدا ہونا اگر بذات خود کوئی اہمیت رکھتا ہو تو دنیا کا کوئی شخص بھی قابل اعتبار نہیں، حتی کہ نعوذ باللہ پیغمبر بھی نہیں۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کے بارہ میں شکایت کرنے والوں نے شکایتیں نہ کی ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہہ معصوم تھے۔ مگر سیرت اور حدیث کی کتابیں بتاتی ہیں کہ آپ کے زمانہ کے یہود اور منافقین نے آپ کے اوپر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ حتی کہ وہ لوگ جن کو صحابی کہا جاتا ہے ان میں بھی ایسے افراد نکلے جنھیں آپ کے بارہ میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور اس کا اظہار رہوا۔ یہاں صرف ایک واقعہ بطور مثال نقل کیا جاتا ہے۔

غزوۂ حنین کے بعد کافی مالِ غنیمت ملا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اموال کو لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ اس دوران ایک مسلمان کا واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ سیرۃ ابن ہشام میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

خرجتُ انا وتليدُ بن كلاب الليثي حتى أتينا عبد الله بن عمرو بن العاصؓ وهو يطوف بالبيت معلّقاً نعله بيده۔ فقلنا له۔ هل حضرتَ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم حين كلّمه التميمي يوم حُنين۔ قال نعم۔ جاء رجل من بني تميم يُقال له ذوالخُويصِرة۔ فوقف عليه وهو يعطي الناس۔ فقال يامحمد۔ قد رأيتَ ماصنعتَ في هذا اليوم

راوی کہتے ہیں کہ میں اور تلید بن کلاب لیثی نکلے۔ یہاں تک کہ ہم عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے پاس پہونچے۔ اور وہ اپنے ہاتھ میں جوتا لیے ہوئے کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا، کیا آپ اس وقت موجود تھے جب تمیمی نے حنین کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کیا۔ انھوں نے کہا ہاں۔ بنو تمیم کا ایک آدمی آیا۔ اس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا اور آپ لوگوں کو عطیات دے رہے تھے۔

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اجل فکیف رأیتَ۔ فقال لم اَرَكَ عَدلتَ۔ قال فغضب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال ویحَكَ۔ اذا لم یکن العدل عندی فعند من یکون
(الجزء الرابع صفحہ ۱۴۴)

اس نے کہا اے محمدؐ، آج آپ نے جو کیا اس کو میں نے دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے انصاف کیا ہو۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر غضب ناک ہو گیے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارا برا ہو۔ اگر میرے یہاں انصاف نہ ہو تو پھر کس کے یہاں انصاف ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں مذکورہ مسلمان نے جو بات کہی، وہ اپنے نزدیک اس کی مضبوط بنیاد رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے دیکھا کہ جنگ میں انصار اور مہاجرین دونوں نے حصہ لیا۔ دونوں نے یکساں طور پر سرفروشی کی۔ مگر جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کچھ قریش کو اور عرب قبیلوں کو دے دیا۔ مدینہ کے انصار کو آپ نے کچھ نہیں دیا (واعطی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اعطی فی قبائل قریش وقبائل العرب و لم یُعطِ الانصار شیئاً۔ صفحہ ۱۴۵)

اس معاملہ میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ حتی کہ حسان بن ثابت انصاری نے ایک نظم لکھی جس کو ابن ہشام نے نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ تھا:

زادَ الهمومُ فماءُ العینِ مُنْحَدِرُ سَحّاً اذا حَفَلَتْهُ عَبْرَةٌ دِرَرُ

رنج و غم بڑھ گیے، پس آنکھ کا پانی برابر بہہ رہا ہے، جب کہ یہ پانی بہتے ہوئے آنسوؤں نے جمع کیا ہے۔

یہ شکایت بظاہر درست ہونے کے باوجود اپنی حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط تھی۔ شکایت کرنے والے سارے معاملہ کو بس شرکتِ جہاد کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مصلحتِ اسلام کے اعتبار سے دیکھا۔ شرکتِ جہاد عام حالات میں یقیناً قابل اعتبار ہے۔ مگر جب اس کا مقابلہ مصلحت اسلام سے ہو تو مصلحت اسلام کا پہلو قابلِ ترجیح قرار پائے گا ــــ غلط زاویہ نگاہ سے دیکھنے میں ایک چیز نادرست نظر آسکتی ہے۔ مگر صحیح زاویۂ نگاہ سے دیکھیے تو وہی چیز عین درست نظر آنے لگے گی۔

برا نام دینا

یاایها الذین اٰمنوا لایسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیرًا منهم ولانساء من نساء عسیٰ ان یکن خیرا منهن ولاتلمزوا انفسکم ولاتنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولٰئک هم الظالمون (الحجرات ۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، شاید کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو عیب لگاؤ۔ اور نہ ایک دوسرے کو برا لقب دو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو شخص توبہ نہ کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

ولاتنابزوا بالالقاب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز سے منع فرمایا ہے، اس کے سلسلہ میں ہم تفسیر طبری کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

(ولاتنابزوا بالالقاب) نهی ان یدعی الرجل باسم یکرهه اوصفة (بئس الاسم الفسوق بعد الایمان) من سخر من المومنین و نبزهم بالالقاب وخالف امر الله عزوجل فقد استحق اثم الفسق (طبری)

ان الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا ہے کہ کسی آدمی کو ایسے نام سے پکارا جائے جس کو وہ پسند نہ کرے یا ایسی صفت سے جو اس کو پسند نہ ہو۔ جو مسلمان کسی شخص کا مذاق اڑائے اور اس کو برا لقب دے اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو وہ فسق کے گناہ کا مستحق ہوگیا۔

ایک شخص سے آپ کو اختلاف ہو جائے تو ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو اس کے اصل نام سے پکاریں اور اس کی اس صفت پر اظہار خیال کریں جو اس کی معروف صفت ہے، اگر آپ ایسا کریں تو ایسا کرنا آپ کے لیے جائز ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کو ایک نیا نام دیں، مثلاً عبدالوہاب کے بجائے اس کو وہابڑا کہیں تو یہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ اسی طرح اگر آپ اس کے مسلک کو اس کے ظاہر کیے ہوئے لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے کچھ دوسرے الفاظ میں بیان کریں، مثلاً یہ کہیں کہ یہ کافروں کا ایجنٹ ہے، تو یہ سراسر فاسقانہ حرکت ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے۔

اس آیت میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے ، اس کا تلخ تجربہ ہم کو ماہنامہ الرسالہ کے سلسلہ میں ہوا۔ الرسالہ میں اسلام کے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا جا رہا ہے ان میں سے ایک وہ ہے جس کا تعلق تعمیر ملت سے ہے ۔ الرسالہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ قرآن کے حکم کے مطابق ، صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں ۔ اس بات سے برہم ہو کر کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ الرسالہ مسلم دشمنوں کا ایجنٹ ہے ، وہ مسلمانوں کو بزدلی سکھا رہا ہے ، وغیرہ ۔

اس طرح کے تبصرے ، مذکورہ آیت کے مطابق ، بلاشبہ فسق ہیں ۔ یہ ہم کو وہ نام دینا ہے جو ہم نے اپنا نام نہیں رکھا ، اور ہماری طرف وہ الفاظ منسوب کرنا ہے جو ہم نے اپنی زبان سے ادا نہیں کیا۔ لوگوں کو اگر کہنا ہے تو یہ کہیں کہ الرسالہ صبر اور اعراض کی پالیسی پر عمل کرنے کا سبق دیتا ہے اور ہم فلاں شرعی یا علمی دلیل کی بنا پر اس کو رد کرتے ہیں ۔ انھیں جو کچھ بولنا ہے " صبر اور اعراض " پر بولیں نہ کہ " بزدلی " یا کسی اور نام پر جو انھوں نے خود سے گھڑ کر ہمارے اوپر چسپاں کر دیا ہو ۔ ہم نے جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ " مسلمان صبر کریں " ہم نے یہ نہیں کہا کہ " مسلمان بزدل بنیں " ایسی حالت میں جو شخص ہمارے اوپر وہ لفظ چسپاں کرتا ہے جو ہم نے نہیں کہا تو اس کو جاننا چاہیے کہ اس کے اوپر قرآن کی مذکورہ آیت چسپاں ہو رہی ہے ، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے ۔

مذکورہ آیت میں مزید یہ فرمایا گیا ہے کہ دوسرے شخص کو برا کہنے والا اگر توبہ نہ کرے تو اللہ کے یہاں وہ خود ظالم قرار پائے گا ۔ یہی بات حدیث میں مختلف الفاظ میں آئی ہے ۔ یہاں ہم چند روایتیں نقل کرتے ہیں :

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرمی رجل رجلاً بالفسوق ولا یرمیہ بالکفر الا ارتدت علیہ ان لم یکن صاحبہ کذلک (رواہ البخاری) وعن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایما رجل قال لاخیہ کافر فقد باء بہا احدہما (متفق علیہ) وعن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایک شخص دوسرے شخص کو فسق یا کفر کا الزام لگائے تو یہ الزام ضرور کہنے والے پر لوٹے گا اگر اس کا ساتھی ایسا نہ ہو ۔ حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بھی اپنے بھائی کو کافر کہے تو وہ ضرور دونوں میں سے ایک پر پڑے گا ۔ حضرت ابوذر کہتے

علیہ وسلم من دعیٰ رجلاً بالکفر اوقال عدو
اللهِ ولیس ذالك الاحاء علیہ
(متفق علیہ)

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص
دوسرے شخص کو کافر کہہ کر پکارے۔ یا اس کو
خدا کا دشمن کہے اور وہ ایسا نہ ہو تو یہ بات خود
کہنے والے پر لوٹ آئے گی ۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو برا نام دینا بے حد سنگین جرم ہے ۔ اور اس کی سنگینی کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ جس شخص کو برا نام دیا گیا ہے ، اگر وہ ایسا نہیں ہے تو اس برے نام کا سارا وبال خود کہنے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔ شریعت اسلام نے اس سے کسی کو نہیں روکا کہ وہ حقائق و واقعات کی بنیاد پر کسی کے خیالات کا تجزیہ کرے جس کو موجودہ زمانہ میں علمی تنقید کہا جاتا ہے ۔ مگر کسی کو برا نام دینا (کسی کے بارہ میں مخالفانہ ریمارک پاس کرنا) سراسر غیر شرعی فعل ہے ۔ یہ اللہ کو اتنا زیادہ ناپسند ہے کہ اگر مخاطب ویسا نہ ہو تو یہ برا نام خدا کے رجسٹر میں خود قائل کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے ۔ گویا یہ ایک قسم کا بوم رینگ (Boomerang) عمل ہے ۔ یہ ایک ایسا پتھر ہے جو دوسرے پر نہ پڑے تو وہ لوٹ کر خود پھینکنے والے پر پڑتا ہے ۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے : "عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا ۔ بس ایک دوسرے کا تمسخر اور استہزار کرنے لگتا ہے ۔ ذرا سی بات ہاتھ لگ گئی اور ہنسی مذاق اڑانا شروع کر دیا ۔ حالاں کہ اسے معلوم نہیں کہ شاید جس کا مذاق اڑا رہا ہے وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو ۔ بلکہ بسا اوقات یہ خود بھی اختلاف سے پہلے اس کو بہتر سمجھتا ہوتا ہے مگر ضد اور نفسانیت میں دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے ، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا ۔ آیۂ ہذا میں خداوند قدوس نے اس قسم کی باتوں سے منع فرمایا ہے ۔ یعنی ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ نہ مسخراپن کرے نہ ایک دوسرے پر آوازے کسے جائیں ، نہ کھوج لگا کر عیب نکالے جائیں اور نہ برے ناموں اور برے القاب سے فریق مقابل کو یاد کیا جائے ۔ کسی کا برا نام ڈالنے سے آدمی خود گنہ گار ہوتا ہے ۔ اُسے تو واقع میں عیب لگا یا نہ لگا ، لیکن اس کا نام بدتہذیب ، فاسق ، گنہ گار مردم آزار پڑ گیا ۔ جو پہلے ہو چکا اب توبہ کر لو ۔ اگر یہ احکام و ہدایات سننے کے بعد بھی ان جرائم سے توبہ نہ کی تو اللہ کے نزدیک اصلی ظالم یہ ہی ہوں گے ۔"

خواب پورا ہوگیا

قرآن کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کے دوران میں نے تقریباً تمام قابل ذکر تفسیروں سے استفادہ کیا اور اس طرح مجھے ان کی نوعیت سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ قدیم وجدید تفسیروں کو دیکھنے کے بعد میرا احساس یہ تھا کہ قرآن کے اکثر پہلوؤں پر اگرچہ بڑی بڑی تفسیریں لکھی جاچکی ہیں۔ تاہم اس کا ایک پہلو ایسا ہے جو ابھی تک باقی پڑا ہوا ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ یہ عین وہی پہلو ہے جو قرآن کے بیان (القمر ۱۷) کے مطابق اس کا اصل پہلو ہے، اور جس کے لیے اصلاً قرآن اتارا گیا۔ یعنی تذکیر ونصیحت۔ لوگوں نے بے شمار تفسیریں لکھیں، مگر خالص تذکیری انداز میں ابھی تک کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ تذکیری نوعیت کی کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی تو اس سے میری مراد دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آیات کے ان پہلوؤں کو ابھارنا جو اپنے اندر انسان کے لیے کوئی سبق رکھتے ہیں اور جو قلبی اور عقلی اعتبار سے اس کو ازدیاد ایمان کی طرف لے جانے والے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے موجودہ تفسیریں، اپنی ساری عظمت کے باوجود، ایک قسم کا پردہ بن گئی ہیں۔ ایک شخص قرآن کا متن یا اس کا صرف ترجمہ پڑھے تو وہ حسب استعداد اس سے تذکیری غذا لے سکتا ہے۔ مگر جب وہ موجودہ تفسیروں میں سے کوئی تفسیر پڑھتا ہے تو دوسرے دوسرے مباحث میں وہ اتنا گم ہوتا ہے کہ ملنے والی چیز بھی اس کو نہیں ملتی۔

دوسری چیز وہ ہے جس کا تعلق اسلوب بیان سے ہے۔ موجودہ تفسیریں اکثر خاص طرح کے فنی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ یہ فنی اسلوب تذکیر وموعظت کے لیے سراسر غیر موزوں ہے۔ اور جو اسلوب تذکیر وموعظت کے لیے موزوں ہے اس کے مطابق میرے علم کی حد تک کسی نے قرآن کی تفسیر نہیں لکھی۔

یہ بات تفسیروں کے مطالعہ کے دوران میرے علم میں آچکی تھی۔ مگر مجھے ہرگز یہ معلوم نہ تھا کہ قرآن کی خدمت کا یہ کام خود مجھ سے لیا جائے گا۔

۱۹۶۳ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں اعظم گڈھ میں تھا۔ یہ میری زندگی کا خاص وقفہ تھا جب کہ مجھ پر ایک قسم کی حیرانگی کا عالم طاری تھا۔ اس وقت میں ایک ناپیدا کنار صحرا کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ میں خدمت دین کی تڑپ سے جل رہا تھا۔ مگر کام کے عملی مواقع مجھے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ حتی کہ مجھ پر یہ

بھی واضح نہ تھا کہ آئندہ مجھے واقعتہً کوئی کام کرنا ہے یا محض کام کی تڑپ لے کر مر جانا ہے۔ عین اسی نفسیاتی حالت میں یکم فروری ۱۹۶۳ کو اعظم گڈھ کے ایک دیہات میں میں نے خواب دیکھا۔ اٹھا تو پورا خواب یاد نہیں رہ گیا تھا۔ صرف خواب کا ایک جزر ذہن میں باقی تھا۔ اور وہ تھا ——— "۱۹ جولائی" بیداری کے بعد مجھے یہ تاریخ (۱۹ جولائی) تو اچھی طرح یاد تھی، مگر اصل خواب کچھ بھی یاد نہ تھا۔

۱۹۶۳ کے اس خواب کے مطابق میں ہر سال "۱۹ جولائی" کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ یہ بات میرے گھر کے تمام افراد کو معلوم ہے۔ مگر ہر سال یہی ہوا کہ جب ۱۹ جولائی آئی تو اس روز کوئی ایسا قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا جس کو اس خواب کی تعبیر سمجھا جاسکے۔ اسی طرح ۲۳ سال بیت گیے۔ ۱۹۸۶ کی ۱۹ جولائی وہ پہلی تاریخ ہے جب کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کو میں اپنی پوری زندگی کا سب سے زیادہ یادگار واقعہ سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ عین اسی تاریخ کو میری تفسیر کی کتاب مکمل ہوئی۔ اسی روز میں نے تذکیر القرآن کا آخری صفحہ لکھا۔

۱۹۶۳ کے بعد مجھ پر مختلف حالات پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۷ میں میں دہلی منتقل ہوا اور پھر ۱۹۷۶ سے ماہنامہ الرسالہ نکلنا شروع ہوا۔ ماہنامہ کی وجہ سے مزید تحریک ہوئی اور میں نے ۱۹۷۹ سے باقاعدہ طور پر تذکیر القرآن لکھنا شروع کر دیا۔ اس دوران سخت ناموافق حالات کے باوجود تذکیر القرآن کی تحریر کا کام برابر جاری رہا۔ اور پھر مذکورہ خواب کے ۲۳ سال بعد "۱۹ جولائی" کو وہ تکمیل تک پہونچا۔

میں جب اس پورے واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں ہوتا کہ میرے مذکورہ خواب کی تعبیر یہی تذکیر القرآن ہے۔ "۱۹ جولائی" اس کی تکمیل کی وہ تاریخ تھی جو خود اللہ تعالیٰ نے ۲۳ سال پہلے اپنی طرف سے مقرر فرما دی تھی۔ یہاں میں وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو میں نے تفسیر کی تکمیل کے بعد اپنی ڈائری میں لکھے تھے:

"آج جولائی ۱۹۸۶ کی ۱۹ تاریخ ہے۔ اور صبح ۴ بجے کا وقت۔ میں ابھی تذکیر القرآن کا آخری صفحہ (تفسیر سورۃ الناس) لکھ کر فارغ ہوا ہوں۔ تذکیر القرآن لکھنے کا کام ۱۹۷۹ کے وسط میں شروع ہوا تھا۔ اور اس کی پہلی قسط ماہنامہ الرسالہ اگست ۱۹۷۹ میں شائع ہوئی تھی۔ آج ۱۹ جولائی ۱۹۸۶ کو اس کی تحریر کا کام آخری طور پر مکمل ہوا۔ اس طرح اس کے لکھنے میں پورے سات سال لگ گیے۔ آج صبح

۳ بجے اٹھ کر میں تذکیر القرآن (سورۃ الناس) لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کی آخری سطریں عین اس وقت پوری ہوئیں جب کہ نظام الدین کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آرہی تھی۔

تذکیر القرآن کی تکمیل مجھے ایک خدائی معاملہ نظر آتی ہے۔ یہ میرے لیے اتنا زیادہ مشکل کام تھا کہ اس کا ہر صفحہ لکھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب میں اس کا اگلا صفحہ نہ لکھ سکوں گا۔

یکم فروری ۱۹۶۳ کو جب کہ میں اعظم گڈھ میں تھا، میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اٹھا تو پورا خواب یاد نہیں رہ گیا۔ صرف خواب کا ایک جزر "۱۹ جولائی" ذہن میں باقی تھا۔ بیداری کے بعد مجھے یاد نہ رہا کہ یہ کس بات کی تاریخ ہے۔ صرف اتنا یاد تھا کہ میں نے خواب میں ۱۹ جولائی کی تاریخ دیکھی ہے۔

۱۹۶۳ کے اس خواب کے بعد ہر سال میں ۱۹ جولائی کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ مگر ہر سال یہی ہوا کہ جب ۱۹ جولائی آئی تو اس روز کوئی خاص نمایاں واقعہ پیش نہیں آیا۔ اسی طرح ۲۳ سال بیت گیے۔ ۱۹۸۶ کی ۱۹ جولائی وہ پہلی تاریخ ہے جب کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو شاید میری زندگی کا سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ ہے۔ اور وہ یہ کہ عین اسی تاریخ کو میں نے تذکیر القرآن کا آخری صفحہ لکھا۔

"۱۹ جولائی" کو تذکیر القرآن کا مکمل ہونا بڑا عجیب واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام تمام تر خدا کی مدد سے ہوا۔ اور عین خدا کے منصوبہ کے تحت اپنی تکمیل کو پہونچا۔ یہ ایک خدائی منصوبہ تھا اور خدا ہی نے اپنے خصوصی اہتمام سے اس کو پورا کیا۔

تذکیر القرآن ایسے حالات میں مکمل ہوئی جب کہ میرے حالات بے حد خراب ہو چکے تھے۔ حتی کہ کچھ لوگ مجھے ہلاک کرنے کے درپے تھے۔ آج جب میں نے تذکیر القرآن کو مکمل کیا تو میرے دل نے کہا ——— جو کام مجھے کرنا تھا وہ کام آج پورا ہو گیا۔ اب ان شاء اللہ خدا کے دین پر کوئی شخص پردہ نہ ڈال سکے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔"

ایک سفر

اگست ۱۹۸۶ کی بارہ تاریخ تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو آواز آئی "میں بمبئی سے ایس بی کوپے بول رہا ہوں، کلیریٹی کا اڈیٹر۔ ہم ۲۳ اگست کو بمبئی میں کمیونل ہارمنی کے اوپر ایک کانفرنس کر رہے ہیں۔ دہلی کی ملاقات میں میں نے اس کا ذکر کیا تھا۔ یہاں بہت سے لوگ اس ٹاپک پر آپ کے خیالات سننا چاہتے ہیں" مختصر گفتگو کے بعد میں نے رضامندی دے دی۔ اگلے دن دونوں طرف سے "اوکے" ہو کر ٹکٹ آگیا۔ درمیان میں کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے ہر بات کی اطلاع بذریعہ ٹیلی فون ملتی رہی۔ ۲۲ اگست کی شام کو میں انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۵ کے ذریعہ بمبئی پہونچا اور ۲۴ اگست کی صبح کو فلائٹ نمبر ۱۸۱ سے دہلی واپس آگیا۔ واضح ہو کہ دہلی سے بمبئی کا فاصلہ پندرہ سو کیلومیٹر ہے۔

یہ سب کچھ اس طرح ہوا جیسے میں گھر کے ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں جا رہا ہوں۔ اس طرح کے واقعات موجودہ زمانہ میں بے شمار لوگوں کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔ ٹیلی فون، ہوائی جہاز، کمپیوٹر اور اس طرح کے دوسرے جدید آلات نے موجودہ زمانہ میں سفر اور مواصلات کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ مگر مجھے اپنی واقفیت کے دائرہ میں ابھی تک وہ انسان نہیں ملا جو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ کی یاد میں گم ہو جائے۔ ان کو استعمال کرتے ہوئے خدا کے احسانات کا جذبہ اسے سرشار کر دے۔

انڈین ایرلائنز روزانہ ۲۴۰ سے زیادہ جہاز چلاتی ہے۔ یہ جہاز ۷۳ مقامات کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں۔ ان جہازوں پر روزانہ تقریباً ۲۶ ہزار مسافر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ عالمی سطح پر ہوائی مسافروں کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے میں نے اب تک ملک کے اندر اور ملک کے باہر تقریباً چالیس ہوائی سفر کیے ہیں۔ اور اگر آمد و رفت کو الگ الگ شمار کیا جائے تو ان سفروں کی تعداد ۸۰ تک پہونچ جائے گی۔ سفر کے دوران اور سفر کے بعد مجھے بے شمار لوگوں سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ بالواسطہ

طور پر بھی ان بہت سے لوگوں کے بارہ میں معلومات حاصل ہوئی ہیں جو جدید سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ اب تک میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوا ہوں جو حقیقی شعوری معرفت کے تحت ان چیزوں کو خدا کی نعمت سمجھتا ہو۔ رسمی طور پر الحمدللہ یا اس کے ہم معنی لفظ کہنے والے تو بہت ہیں۔ مگر اس انسان سے ابھی تک میں واقف نہ ہو سکا جو ان چیزوں کو دیکھ کر حمد خداوندی کے سمندر میں غرق ہو جائے۔ جو ان سے گزر کر اس طرح نکلے گویا وہ انعامات الٰہی کی بارش سے نہا کر نکلا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز جب بمبئی کے قریب پہونچا تو جھٹکے کے ساتھ وہ اس طرح اوپر سے نیچے آیا جیسے کوئی چیز اچانک بلندی سے گر پڑے۔ اس وقت زندگی اور موت ایک دوسرے سے قریب نظر آئے۔ انسان ہر لمحہ موت سے قریب ہے۔ تاہم خدا مختلف مواقع پر غیر معمولی جھٹکے دیتا رہتا ہے تاکہ جو لوگ شعور کی نگاہ سے نہ دیکھ سکتے ہوں وہ تجربہ کی نگاہ سے دیکھ لیں۔ جو لوگ سوچ کر حقیقتوں کو نہ جان سکتے ہوں وہ ان میں پڑ کر حقیقتوں کو جان لیں۔

بمبئی ہندستان کی تجارتی راجدھانی ہے۔ وہ دنیا کا ساتواں سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی موجودہ آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ وہ ہندستان کے قدیم ترین ساحلی شہروں میں سے ہے۔ یہاں مختلف حکومتیں رہی ہیں۔ ۱۳۴۸ء میں وہ گجرات کی مسلم سلطنت کے تحت آیا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں پرتگالیوں نے اس پر قبضہ کیا۔ ۱۶۶۱ میں ایک معاہدہ کے تحت وہ برطانیہ کو مل گیا جس کا سلسلہ ۱۹۴۷ میں ختم ہوا۔

۱۸۵۷ میں یہاں سب سے پہلی کپڑے کی مل قائم ہوئی۔ بہت جلد بمبئی روئی کا ایک بڑا مارکیٹ بن گیا۔ ۱۸۶۱-۶۵ میں امریکہ میں زبردست خانہ جنگی ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں امریکہ کی روئی کا برطانیہ پہونچنا بند ہو گیا۔ اب انگلینڈ کے کارخانوں نے اپنی ضرورت کی روئی بمبئی سے لینا شروع کیا۔ اس کے نتیجہ میں بمبئی کا روئی کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ ۱۸۶۹ میں نہر سوئز کا بحری راستہ کھلا تو یورپ اور بمبئی کے درمیان تجارت میں مزید ترقی ہوئی۔

بمبئی پورے معنوں میں میٹرو پولیٹن شہر ہے۔ یہاں ہر مذہب کے لوگ موجود ہیں۔ تقریباً آدھی آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ بقیہ میں مسلم، عیسائی، بدھ، جین، سکھ، پارسی اور یہودی

وغیرہ ہیں۔ اسی طرح یہاں ہندستان کی تمام زبانوں کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ نیز غیر ملکی زبانوں کے بھی۔ تاہم مرہٹی زبان کو غلبہ حاصل ہے۔

بمبئی ٹائمز (The Bombay Times) غالباً ہندستان کا پہلا انگریزی اخبار ہے جو بمبئی سے جاری ہوا۔ یہ اخبار ۱۸۳۸ میں بمبئی ٹائمز کے نام سے جاری ہوا تھا، اب یہی اخبار ٹائمز آف انڈیا کے نام سے نکل رہا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے سرورق پر لکھا رہتا ہے: جاری شدہ ۱۸۳۸۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کیوں کہ ۱۸۳۸ میں "ٹائمز آف انڈیا" نام کا اخبار موجود نہ تھا۔

میرا ایک خیال یہ ہے کہ کچھ چیزیں کسی خاص مقام کے لیے مقدر ہوتی ہیں اور وہ ٹھیک اسی مقام پر واقع ہوتی ہیں۔ بمبئی میں میں نے ایک خواب دیکھا۔ یہ بڑا عجیب خواب تھا۔ اور شاید یہی مقدر تھا کہ اس خواب کو میں بمبئی میں دیکھوں۔

بمبئی میں میرا قیام لینڈس اینڈ (Lands End) کے گیسٹ ہاوس میں تھا۔ یہ عمارت مالابار ہل پر واقع ہے۔ یہاں ۲۲ اور ۲۳ اگست کی درمیانی رات کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ خواب بہت صاف تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ مجھے پھانسی دے کر مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے لکڑی کی ایک میز کے اوپر کھڑا کیا۔ اوپر چھت کے ساتھ پھانسی کا پھندا لٹک رہا تھا۔ ان لوگوں نے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈال کر میز میرے قدموں کے نیچے سے ہٹا دی۔ میں پھانسی کی رسی کے ساتھ لٹک گیا اور اسی وقت مر گیا۔ اس عمل کے دوران مجھے ذرا بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نہ اس کو دیکھ کر گھبرایا اور نہ میں نے کوئی مزاحمت کی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ پھانسی لگنے کے فوراً بعد میں وہاں دوبارہ زندہ موجود تھا۔

جب ان لوگوں نے دیکھا کہ میں دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں تو انھوں نے پھر اسی طرح مجھ کو میز کے اوپر کھڑا کیا۔ اور مذکورہ طریقے سے دوبارہ مجھے پھانسی دی۔ اب بھی یہی ہوا کہ میں بلا تکلیف مر گیا۔ اور اس کے فوراً بعد دوبارہ پہلے کی طرح وہاں زندہ موجود تھا۔ اب ان لوگوں نے پھانسی کا یہی عمل میرے ساتھ تیسری بار کیا۔ مگر تیسری بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی رسی میری گردن میں ڈالی گئی میری نیند کھل گئی۔ تیسری بار میں مرنے سے پہلے جاگ اٹھا۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ خواب بُشریٰ من اللہ ہے اور اس کی تعبیر نہایت با معنی ہے ۔ یہ خواب ان معاندانہ کارروائیوں کی تمثیل ہے جو میرے ساتھ پہلے کی گئیں اور اب بھی کی جا رہی ہیں ۔ اس خواب میں مجھے اپنے مشن کے سلسلہ میں ماضی کی تصویر اور مستقبل کی بشارت نظر آتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ میرے دینی اور تعمیری مشن کو " پھانسی " دینا چاہتے ہیں وہ ماضی میں بھی ناکام ہوئے اور مستقبل میں وہ قطعی ناکام رہیں گے ۔ انشاء اللہ العزیز ۔

۲۳ اگست کو صبح ۱۰ بجے کانفرنس شروع ہوئی ۔ کانفرنس کی کارروائی لطیفی ہال (صابو صدیق انجینیرنگ کالج) میں ہوئی ۔ میں وہاں پہونچا تو دیکھا کہ اندر باہر ہر طرف وردی پوش لوگ کھڑے ہوئے ہیں ۔ حتیٰ کہ چھتوں پر بھی مسلح پولس کے لوگ دکھائی دے رہے تھے ۔ اس کانفرنس کا افتتاح چیف منسٹر مہاراشٹر ایس بی چوہان کرنے والے تھے ۔ اس کے علاوہ کئی مرکزی اور ریاستی وزیر ڈائس پر موجود تھے ۔ سکیوریٹی کا غیر معمولی انتظام اسی لیے تھا ۔

ہمارے لیڈر انگریزوں کے دور میں ۱۹۴۷ سے پہلے یہ کہتے تھے کہ " سکیوریٹی " بیرونی حکمرانوں کی ضرورت ہے ۔ آزادی کے بعد جب عوام کے نمائندے ملک کے حکمراں ہوں گے تو ان کو پولس اور فوج کی حفاظت کی ضرورت نہ ہوگی ۔ اس لیے ملک اس قسم کے غیر ضروری اخراجات سے بچ جائے گا ۔ مگر آج سکیوریٹی پر پہلے سے کئی گنا زیادہ خرچ ہو رہا ہے ۔ ایک پولس افسر نے کہا : " آج کل تو سمجھ لیجئے کہ کرائم ڈیٹکشن کا کام بند ہے ۔ ساری طاقت بس سکیوریٹی پر لگ رہی ہے "

کانفرنس میں وزیر اعظم راجیو گاندھی کا پیغام پڑھا گیا ۔ انھوں نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ کمیونلزم (فرقہ پرستی) ہمارے ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ (Greatest danger) ہے ۔ مختلف حضرات نے پرجوش تقریریں کیں ۔ ایک صاحب نے کہا کہ اسی بمبئی سے اسی اگست کے مہینے میں ہم نے انڈیا چھوڑو (Quit India) کا نعرہ دیا تھا ۔ اب اسی بمبئی سے ہم کو فرقہ واریت انڈیا چھوڑے (Communalism Quit India) کا نعرہ دینا ہے ۔ اسی طرح دوسرے حضرات نے فرقہ پرستی اور تشدد کو سختی سے کنڈم کیا ۔ اور کہا کہ موجودہ صورت حال اگر اسی طرح باقی رہتی ہے تو ملک تباہ ہو جائے گا ۔

یہ باتیں کس حد تک سنجیدہ ذہن سے کہی گئیں ، اس سے قطع نظر اہم بات یہ ہے کہ

THE CONFERENCE ON COMMUNALISM AND NATIONAL INTEGRATION

On Saturday, August 23, 1986

DR. ALMA LATIFI HALL,
Saboo Siddik College of Engineering
8, Shepherd Road, Nagpada, Byculla
Bombay - 400008

PROGRAMME:

9-45 a m Introductory remarks by **S.B. KOLPE,** Chairman Steering Committee
A minute's silence in memory of the late Gen A S VAIDYA

9-50 Song "AAO HUM SABHI MILENGE" by **MRS. KAMALINI SHETTY.**

9-55 Conference theme by **DR. RASHMI MAYUR,** Conference Co-ordinator

10-05 Welcome address, by **DR. ISHAQ JAMKHANAWALA,** President, Anjuman-I-Islam
MESSAGES

10-15 Address, **MR. S.B. CHAVAN,** Chief Minister of Maharashtra

10-30 Inaugural Address—Chief Guest **MR. ARJUN SINGH,** Chief Vice-President, AICC(I)
Special Guest **MRS. MOHSINA KIDWAI,** Union Minister of Transport

11-00 Speeches.
MR. H.N. BAHUGUNA, Working President, Lok Dal
MR. MURLI DEORA, President, BRCC(I)
MAULANA WAHIDDUDDIN KHAN, Islamic Scholar & Editor, Monthly *Al-Risala,* New Delhi
DR. SIMON PIMENTA, Archbishop of Bombay
RUSSY KARANJIA, Editor-in-Chief Blitz group of publications

11-45 TEA BREAK

12-00 Recitation "Deewar" by Prof **C.M. WAGH,** Marathwada University

12-05 **RESHAM SINGH,** President, Bombay Guru Singh Sabha
MR. V.S. PAGE, Chairman Gandhi Smarak Nidhi, Bombay
MR. GURMUKH SINGH NAGI, MR. RANJIT BHANU, President, Janata Party (Bombay Unit)
MR. L.S. KARKHANIS, Secretary, CPI (Maharashtra Unit)
MR. PRABHAKAR SANZGIRI, Leader, CPI (Marxist)

13-10 Conclusion of the morning Session, **MR. RANJAN BHATTACHARYA.**

13-15 LUNCH

14-30 to 16-30 PANEL DISCUSSIONS

i) **MASS MEDIA AND COMMUNALISM:**
Chairman Mr **HARI JAISINGH,** Resident Editor, Indian Express
Panelists Mr Achin Vanaik, Mr Iqbal Masud, Mr L S Herdenia, Shri Arun Gandhi, Shri Dinkar Sakrikar, Shri Vijay Tendulkar, Mrs Vimla Patil, Shri S B Kolpe, Shri V Veniyoor, Shri Prakash Kulkarni Shri Binod Rao and Shri Khalish Jafri

ii) **EDUCATION & NATIONAL INTEGRATION:**
Chairman **DR. RASHMI MAYUR**
Panelists. Dr K Jagjit Singh, (Principal, Khalsa College) Mr K Hussain (Principal, Saboo Siddik College), Mr M G Shah, President, ISCUS Mr Madhu Mehta, President, Hindustani Andolan, Dr Anthony Sequira, President, Catholic Association of Bombay, Mr Harshad Bhat, Senior Advocate, Shri K M Aarif and Mr Bal Patil

iii) **POLITICAL PROCESS OF INTEGRATION:**
Chairman **DR. RAFIQ ZAKARIA**
Panelists Dr. Rashpal Malhotra, Director, Centre for Research in Rural and Industrial Development.
Mr. Homi J.H Talyarkhan
Mr Chandrashekhar Prabhu, M L A
Mr Y P Trivedi, Mr S M Zaidi, Dr Zoe Ansari, Mrs Kamala Raman, Prof Nalini Pandit, (Sociologist), Mr Asghar Ali Engineer and Mr. Vijay Kamble

16 45 — **VALEDICTORY SESSION:**
MR. A.R. ANTULAY TO ADDRESS.

18 00 — A Special Meeting under the auspices of Al Risala Friends Circle and Clarity Friends Circle on Saturday August 23, 1986 **MAULANA WAHIDUDDIN KHAN,** editor of monthly *Al-Risala,* will address the meeting

ORGANISERS:

- ☐ **AICC (I)—Minorities Cell**
- ☐ **Anjuman-i-Islam**
- ☐ **Chairman: Gandhi Smarak Nidhi**
- ☐ **Bombay Union of Journalists**
- ☐ **Jamiat-e-Ulema, Maharashtra**
- ☐ **Maharashtra—Punjab Ekta Forum**
- ☐ **Local Urdu Newspapers Association**
- ☐ **Catholic Association of Bombay**
- ☐ **Rama Ranjini Cultural Association**
- ☐ **Al-Risala Friends Circle, Bombay**
- ☐ **Blitz National Forum**
- ☐ **Bohra Youth Association**
- ☐ **International Buddhist Association.**
- ☐ **Jain Youth Association**
- ☐ **Urban Development Institute**
- ☐ **Clarity Friends Circle**

آج ہم ایک ایسے دور میں ہیں جب کہ فرقہ واریت، تشدد، امتیازی سلوک مسلمہ طور پر بری چیزیں بن چکی ہیں۔ آج کوئی ان چیزوں کا وکیل نہیں۔ جب کہ ماضی میں معاملہ اس سے مختلف تھا۔ اگر ہم حکمت اور برداشت سے کام لیں تو یقینی طور پر ہم اس ملک میں باعزت زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔

کانفرنس میں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک کانفرنس کے درمیان۔ اور دوسری کانفرنس کے آخر میں۔ کانفرنس کے دوران ہر آدمی کو پندرہ منٹ دیا گیا۔ مجھے بھی پندرہ منٹ کا موقع ملا۔ مگر اس موضوع پر میرے خیالات سننے کے لیے شام کو ۶ بجے اسی ہال میں ایک خصوصی نشست رکھی گئی۔ یہ ایک گھنٹہ کی نشست تھی اور میں اس میں تنہا مقرر تھا۔ میں نے فرقہ واریت کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عام طور پر لوگوں نے اتفاق اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔ سامعین میں ہندو اور مسلم دونوں صاحبان بڑی تعداد میں موجود تھے۔

کانفرنس کی زیادہ تر کارروائی انگریزی میں ہوئی۔ صرف چند تقریریں اردو میں ہوئیں۔

کانفرنس میں ڈائس پر میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی پر ایک مرکزی وزیر بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے گھر میں بھی الرسالہ پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں اور بہت سے لوگ ملے جن کے بارہ میں میرا گمان نہیں تھا کہ وہ الرسالہ سے باخبر ہوں گے۔ مگر گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کے قاری ہیں۔ بلکہ ان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے کہا کہ "ہم تو الرسالہ کے عاشق ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے الرسالہ کو عجیب مقبولیت عطا فرمائی ہے۔ وہ ایسی ایسی جگہوں پر پہونچ رہا ہے جہاں ہمارا گمان بھی نہیں جا سکتا تھا۔

کانفرنس کے درمیان پندرہ منٹ کی تقریر میں میں نے کہا کہ اگر مجھے جدید ہندستان کی تاریخ لکھنی ہو اور اس میں یہ بتانا ہو کہ جدید ہندستان کا سب سے انوکھا واقعہ کیا ہے، تو میں کہوں گا کہ یہاں کا سب سے زیادہ انوکھا واقعہ یہ ہے کہ جس ملک نے عدم تشدد کے ذریعہ آزادی حاصل کی وہ آزادی کے فوراً بعد تشدد کے راستہ پر چل پڑا۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں آزادی کی تاریخ ۱۸۵۷ سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۱۹ میں مہاتما گاندھی کے سیاست میں داخلہ تک یہ تحریک متشددانہ طریقہ پر چلتی رہی۔ مگر اسے کامیابی نہ

ہو سکی۔ گاندھی جی ہندستان کی سیاست میں داخل ہوئے تو انھوں نے آزادی کی تحریک کو عدم تشدد کے طریقہ پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ کا ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ جب مہاتما گاندھی نے تشدد کا ہتھیار ترک کر کے عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا تو ہندستان کے ایک انگریز کلکٹر نے اپنے سکریٹریٹ کو تار دیا :

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

براہِ کرم بذریعہ تار مطلع فرمائیں کہ ایک شیر کو غیر متشددانہ طریقہ پر کیسے ہلاک کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے تشدد کو ترک کر کے انگریز سے تشدد کا جواز چھین لیا۔ اس سے پہلے انگریز کا مسئلہ آسان تھا۔ وہ تشدد کے جواب میں تشدد کرتا تھا۔ مگر اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عدم تشدد کے جواب میں کیوں کر تشدد کیا جائے۔ چنانچہ اسے ملک کو چھوڑ دینا پڑا۔

میں نے کہا کہ ملک کی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ عدم تشدد کی طاقت تشدد سے زیادہ ہے۔ یہی موجودہ فرقہ واریت کا حل ہے۔ ہم کو چاہیے کہ سارے ملک میں یہ شعور بیدار کریں۔ جس دن لوگ اس راز کو جان لیں گے اسی دن تشدد بھی اس ملک سے ختم ہو جائے گا۔ نئی نسل کو ہندستان کی قدیم تاریخ کا یہ سبق یاد دلانا، یہی اس مسئلہ کا سب سے زیادہ کامیاب حل ہے۔

میں نے کہا کہ اس وقت ہندستان میں اسی قسم کی ایک تحریک کی ضرورت ہے جس کو جاپان نے برعکس عمل (Reverse course) کا نام دیا ہے۔ جاپان دوسری جنگ عظیم تک تشدد کے طریقہ پر چل رہا تھا۔ جنگ میں شکست کے بعد اس نے اپنے رخ کو بدل کر غیر متشددانہ راستہ میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ۴۰ سال میں ملک کی تاریخ بدل گئی۔

چارلس ڈیگال نے یہی ریورس کورس کا طریقہ فرانس میں اختیار کیا۔ فرانس اپنے افریقہ کے مقبوضات میں آزادی کی تحریک کو تشدد سے دبا رہا تھا۔ ڈیگال اقتدار میں آئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ افریقہ میں آزادی کی تحریک کو دبانے میں فرانس اتنی زیادہ طاقت خرچ کر رہا ہے کہ وہ نیوکلیر سائنس میں پیچھے ہو گیا ہے۔ ڈیگال نے یک طرفہ طور پر اپنے افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اس کا نقد نتیجہ اس کو یہ ملا کہ فرانس نے دوبارہ یورپ میں نمبر ایک طاقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ مہاتما گاندھی نے اسی ریورس کورس کو ہندستان کے حالات کے اعتبار سے

اختیار کیا اور برطانیہ کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی۔

میں نے کہا کہ "ریورس کورس" کا یہ کامیاب طریقہ دنیا کو پیغمبر اسلام کی دین ہے۔ معلوم تاریخ میں پیغمبر اسلام پہلی نمایاں شخصیت ہیں جنھوں نے اس طریقہ کو استعمال کر کے دنیا کے لیے کامیابی کا راستہ کھولا۔ صلح حدیبیہ عرب کے حالات کے لحاظ سے عین وہی چیز تھی جس کو جاپانیوں نے موجودہ زمانہ میں ریورس کورس کا نام دیا ہے۔ پیغمبر اسلام اس طریق عمل کے موجد ہیں۔ موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کسی چیز کو دریافت کرنا ہے، اور جب وہ چیز دریافت ہو جائے تو اس کی نقل ہر ایک کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔

آج دوبارہ ہندستان میں ایک ریورس کورس کی ضرورت ہے۔ نفرت کے بجائے محبت، تشدد کے بجائے عدم تشدد، بدگمانی کے بجائے نیک گمان، ٹکراؤ کے بجائے پرامن تعمیر، جس دن ملک میں اس ریورس کورس کا آغاز ہوگا اسی دن یہ ملک دوبارہ کامیابی کی منزل کی طرف چل پڑے گا جو آج راستہ بھول کر منزل سے بہت دور نکل گیا ہے۔ جو فرقہ سب سے پہلے ریورس کورس کا طریقہ اختیار کرے گا وہ دوسرے فرقوں پر بازی لے جائے گا۔

۲۴ اگست کی شام کو جناب ڈاکٹر نائک صاحب کی رہائش گاہ پر کھانا تھا۔ وہاں پہونچا تو اخبار بلٹز کی پارٹی انٹرویو لینے کے لیے موجود تھی۔ پہلے زمانہ میں انٹرویو لینے والے کو یہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ ایک طرف سوال کرے اور دوسری طرف وہ جواب دینے والے شخص کی بات کو جلدی جلدی کاغذ پر لکھتا رہے۔ اب ٹیپ ریکارڈر نے اس کام کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ چنانچہ بلٹز کے نمائندے ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گیے۔ دوسری طرف میں بیٹھا ہوا تھا اور درمیان میں ایک چھوٹی سی میز پر ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ ہم لوگ ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے اور ہماری باتوں کو محفوظ کرنے کا کام ٹیپ ریکارڈر خاموشی کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کی کیسی کیسی نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے کھولی ہیں مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس کا شکر ادا کرتے ہوں۔ شاید اسی لیے قرآن میں آیا ہے: وقلیل من عبادی الشکور۔

انٹرویو کے سلسلہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کو "اسلامی" کہتے ہیں وہ اکثر انٹرویو لیتے ہوئے "غیر اسلامی" بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو سیکولر کہے جاتے ہیں،

ان کا انٹرویو لینے کا طریقہ زیادہ معقول ہوتا ہے۔

ان اسلامی حضرات کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دو الگ الگ خانے میں بانٹے ہوئے ہیں۔ ایک موافق اور دوسرے مخالف۔ یا اپنے گروہ کے لوگ۔ اور اپنے گروہ سے باہر کے لوگ۔ جن لوگوں کو وہ اپنے گروہ کا آدمی سمجھتے ہیں ان کا انٹرویو لینا ہو تو وہ اس کو معتدل انداز میں لیتے ہیں۔ مگر جس کو وہ اپنا مخالف یا اپنے گروہ سے باہر کا سمجھ لیں اس کا انٹرویو لیتے ہوئے وہ اعتدال کو کھو دیتے ہیں۔

مگر "سیکولر" لوگوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کے ذہن میں انسانوں کی مندرجہ بالا تقسیم نہیں ہوتی یا کم از کم یہ کہ اس معاملہ میں وہ شدید نہیں ہوتے۔ اس لیے کسی بھی شخص کا انٹرویو لیتے ہوئے وہ اپنے اعتدال کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ بلٹز اسی دوسری قسم کے اخبارات میں سے ہے۔ چنانچہ اس کے نمائندوں سے انٹرویو نہایت خوش گوار فضا میں ہوا۔ ان لوگوں نے معتدل انداز میں سوالات کیے اور میں بھی آخر تک معتدل انداز میں ان کے سوالات کا جواب دیتا رہا۔

آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ مسلمانوں کے بارہ میں جو رائے رکھتے ہیں اس کا خلاصہ بتائیے۔ میں نے کہا: "مسلمانوں نے برداشت کو کھو دیا ہے، اس لیے وہ ہر چیز کو کھوئے ہوئے ہیں۔ جس دن وہ جان لیں گے کہ برداشت زندگی کا راز ہے اسی دن دوبارہ وہ ان تمام چیزوں کو پالیں گے جس کو انھوں نے موجودہ زمانہ میں کھویا ہے۔"

بمبئی کا قیام اگرچہ بہت مختصر تھا۔ تاہم یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اکثر ملاقاتوں میں گفتگو کا موضوع ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال تھی۔ بعض مجالس میں گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان ہمیشہ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی صرف اپنے کیے کو بھگتتا ہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کی مصیبت بھی حقیقۃً کسی ظالم کا ظلم نہیں، وہ مسلمانوں کے اپنے پچھڑے پن کی قیمت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی ایک مثال مسلمانوں کی موجودہ اردو صحافت ہے۔ یہ صحافت عام طور پر اتنی گھٹیا ہے کہ جدید معیار کے مطابق اس کو صحافت کہنا ہی مشکل ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک

بات یہ ہے کہ اپنے مواد کے اعتبار سے اردو صحافت وہ مریض صحافت بن کر رہ گئی ہے جس کو انگریزی میں ایلو جرنلزم (Yellow journalism) کہا جاتا ہے۔ ایلو جرنلزم کی اصطلاح امریکہ میں انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئی۔ اس سے مراد سنسنی خیزی کی صحافت ہے۔ اس قسم کی صحافت امریکہ وغیرہ میں بہت عرصہ پہلے ختم ہو گئی۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کے پچھڑے پن کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے اکثر اردو اخبارات میں آج بھی وہ اپنی بدترین شکل میں جاری ہے۔

مسلمانوں کے درمیان اس مریض صحافت کے پھیلنے کا راز کیا ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس کا راز مسلمانوں کی تعلیمی اور صنعتی پس ماندگی ہے۔ صحافت کو جو چیز غذا پہونچاتی ہے وہ انڈسٹری ہے اور مسلمان اس ملک کی انڈسٹری میں ایک فی صد بھی حصہ دار نہیں۔ صنعتی کارخانے بڑے پیمانہ پر عوام کی ضرورت کا سامان تیار کرتے ہیں۔ انھیں ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی صنعتی پیداوار سے عوام کو باخبر کریں۔ اس ضرورت نے صنعتی اشتہار کو وجود دیا ہے۔ یہ صنعتی اشتہار ہی دراصل جدید صحافت کی غذا ہیں۔ مسلمانوں کے پاس چوں کہ صنعت نہیں اس لیے ان کے اخبارات کے لیے اس غذا کا سامان بھی نہیں۔

یہی کمی ہے جس کی تلافی کے لیے مسلمانوں میں وہ چیز وجود میں آئی ہے جس کو میں مریض صحافت کہتا ہوں۔ یعنی سنسنی خیز خبریں اور جذباتی مضامین چھاپ کر لوگوں کو بھڑکانا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اخبار خریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صنعتی اشتہار سے محرومی نے اردو صحافت کو ایلو جرنلزم کا نمونہ بنا دیا ہے۔ جو لوگ اپنے جیبوں میں ڈاکٹری اور انجینیرنگ کی اعلیٰ ڈگریاں لیے ہوئے ہوں انھیں داداگیری کی ضرورت نہیں۔ داداگیری کا پیشہ ہمیشہ وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو اپنی غفلت کے نتیجہ میں جاہل رہ گیے ہوں۔ المیہ کی یہی وہ قسم ہے جس نے ہماری اردو صحافت کو موجودہ زمانہ میں مریض صحافت بنا کر رکھ دیا ہے۔

مجھے ایک بار ایک اردو اخبار کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ادارتی اسٹاف سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران ان کی لیاقت کا جو اندازہ ہوا اس سے مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ادارہ کے ایک صاحب سے میں نے کہا کہ جرنلزم کی ایک قسم ہے جس کو ایلو جرنلزم (Yellow journalism) کہا جاتا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ یہ اصطلاح کیسے بنی اور اس کی ابتدائی تاریخ کیا ہے۔ وہ

خاموشی کے ساتھ میرا منہ دیکھتے رہے۔ مزید تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اخبار کے اسٹاف میں سے کوئی ایک شخص بھی باضابطہ طور پر تربیت یافتہ نہیں۔ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے کسی شعبہ فن میں اعلیٰ تعلیمی ڈگری حاصل کی ہو۔

ایک بار میری ملاقات چند حضرات سے ہوئی۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اردو صحافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے ایک نوجوان سے کہا کہ صحافت کی ایک اصطلاح ہے جس کو الٹا اہرام (Inverted pyramid) کہا جاتا ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس کا مطلب کیا ہے اور وہ کیا چیز ہے جس کو الٹا اہرام کا نام دیا گیا ہے۔ مگر وہ اس کی تشریح نہ کرسکے۔

پھر میں نے ایک اور صحافی سے کہا کہ امریکی تاریخ کا ایک واقعہ ہے جو اسپینی امریکی جنگ (Spanish-American war) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ ۱۸۹۸ میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ کے چھڑنے میں ایلو پریس (*Yellow Press*) کا بہت بڑا دخل تھا۔ کیا آپ اس کی کچھ تفصیل بتا سکتے ہیں کہ ایلو پریس نے کس طرح اس جنگ کو بھڑکایا۔ مذکورہ اردو صحافی اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

ایک بار میں ایک اخبار کے دفتر میں گیا۔ یہ ایک مشہور اردو اخبار ہے۔ اس کے اڈیٹر سے ملاقات کے دوران میں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں ریفرنس بکس (Reference books) کے طور پر کون کون سی کتابیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس نوعیت کی کوئی ایک بھی قابل ذکر کتاب اخبار کے دفتر میں موجود نہیں۔

بہت پہلے میں نے ادبی تنقید پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون جناب نیاز فتح پوری کے نگار (جون ۱۹۴۵) میں چھپا تھا۔ نیاز فتح پوری نے مضمون شائع کیا تو انھوں نے اس کا عنوان بدل دیا۔ مجھے ان کا عنوان پسند نہ آیا۔ میں نے انھیں لکھا کہ آپ نے میرے مضمون میں تحریف کردی۔ انھوں نے جواب میں لکھا: "میں نے جو کچھ کیا وہ تحریف نہیں بلکہ تصحیف تھی، جس کا ہر اڈیٹر مجاز ہوتا ہے۔" نیاز فتح پوری نے غالباً صحافت کے لفظ پر قیاس کرتے ہوئے یہاں تصحیف کو اڈیٹنگ (Editing) کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ حالاں کہ عربی داں حضرات یہ جانتے ہیں کہ تصحیف کے یہ معنی نہیں ہیں۔ ایک اردو صحافی سے میں نے کہا کہ آپ یقیناً جانتے

ہوں گے کہ صحافت کو موجودہ زمانہ میں فورتھ اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد میں نے ان کے سامنے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے گزارش کی کہ اس لفظ کو آپ اس کاغذ پر انگریزی میں لکھیں۔ انھوں نے کاغذ پر لکھا :

Fourth State

مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ درست نہیں۔

اگرچہ سب کا نہیں مگر اکثر اخباروں کا معاملہ یہی ہے۔ مسلمانوں کے اکثر اردو اخبارات کا حال یہ ہے کہ اس کا اسٹاف زیادہ تر نیم خواندہ اور غیر تربیت یافتہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ سنسنی خیز صحافت میں بھی وہ زیادہ اعلیٰ اور زیادہ لطیف معیار پیش کرنے پر قادر نہیں۔ بین اقوامی جاسوسی، اعلیٰ سطح کے سیاسی اسکینڈل اور بڑے بڑے صنعت کاروں کے اندرونی راز تک رسائی کے لیے جو اعلیٰ استعداد درکار ہے اس سے وہ خالی ہوتے ہیں۔ اپنی کم تر صلاحیت کی بنا پر وہ صرف سطحی قسم کی سنسنی خیز صحافت وجود میں لا سکتے ہیں اور اسی کو وہ وجود میں لاتے ہیں۔ وہ اپنی بے استعدادی کو اپنی قوم کے اوپر انڈیل دیتے ہیں۔

حال میں میں نے ایک مسلم اخبار کو دیکھا۔ اس کی یہ اشاعت وسط اگست ۱۹۸۶ میں عیدالضحیٰ نمبر کے طور پر شائع کی گئی ہے۔ اس کے ٹائٹل پر انسانی لاشوں کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ لاشیں ان مسلمانوں کی ہیں جو احمد آباد کے فساد (۹ جولائی ۱۹۸۶) میں جلائے یا قتل کیے گیے تھے یہ تصویر بلاشبہ دردناک ہے۔ مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ اخبار کے اندر کے صفحات تو معمولی کاغذ پر صرف کالے حروف میں چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ان جلی اور کٹی ہوئی لاشوں کو آرٹ پیپر پر چار رنگ میں نمایاں کرکے چھاپا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اخبار کے ذمہ داروں کو کوئی بہت دل پسند چیز مل جائے اور اس کو وہ نہایت اہتمام کے ساتھ خوب رنگین بنا کر شائع کریں۔

لاشوں کو اس طرح چھاپنا لاشوں کو تجارت کا مال بنانا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہمارے اکثر اخبارات فرقہ وارانہ فساد کے اوپر زندہ ہیں۔ اگر ہندستان میں فرقہ وارانہ فساد ختم ہو جائیں تو ان اخبارات کی زندگی کا سامان بھی ختم ہو جائے گا۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ انسانی تاجر جن کی غذا جلے ہوئے جسم اور کٹی ہوئی لاشیں ہوں۔

مجھے ایک بار ایک مسلم کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس میں مسلم اخبارات کے ایڈیٹر بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ کانفرنس کا موضوع "تعمیر ملت" تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ جو شخص بھی اسٹیج پر آتا ہے وہ ایک دو منٹ کے بعد ہی "تعمیر" سے ہٹ کر "تخریب" کے موضوع پر بولنا شروع کر دیتا ہے۔ تعمیر ملت کے موضوع پر ہونے والی کانفرنس عملاً "دشمنانِ ملت" کے خلاف احتجاج کے ہم معنی بن گئی۔

یہی ہمارے اکثر اخبار نویسوں کا حال ہے۔ ان سے اگر کسی تعمیری موضوع پر لکھنے کے لیے کہئے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے ان کے پاس تعمیری خیالات کو ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں۔ مگر مسلم دشمنی اور ہندو فرقہ واریت پر لکھنا ہو تو ان کی فہرستِ الفاظ لامحدود حد تک وسیع ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات ہمارے اخبار نویسوں کے لیے موسم بہار کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ ان کی محبوب ترین غذا ہیں۔ ایسی کسی خبر کو سنتے ہی فوراً ان کے ذہن میں مضامین کا فوارہ ابل پڑتا ہے۔ وہ ان فرقہ وارانہ جھگڑوں کی مبالغہ آمیز کہانیاں بناتے ہیں۔ وہ ان کو انتہائی جذباتی سرخیوں کے ساتھ اپنے اخبار میں شائع کرتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کیجئے کہ آج کل کے اردو اخبارات مجھے اتنے زیادہ سطحی معلوم ہوتے ہیں کہ میں کبھی ان کو شوق کے ساتھ نہیں پڑھ پاتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میری سزا کے لیے یہ کافی ہے کہ مجھے کسی ایسے کمرہ میں بند کر دیا جائے جہاں صرف اردو اخبارات ہوں اور مجھ سے کہا جائے کہ تم یہاں رہ کر بس ان اردو اخبارات کو پڑھتے رہو۔ مگر ہمارے اخبار نویسوں کی خوش قسمتی سے عام حالت یہ نہیں ہے۔ ہماری قوم کے بیشتر افراد یا تو جاہل ہیں یا بے شعور۔ قوم کا یہ ذہنی افلاس ان حضرات کی صحافتی فصل کے لیے بہترین مارکٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ بے شعور عوام کی بھیڑ جو باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، وہ ان کو خریدتی ہے اور نہایت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک سطحی کاروبار ہے اور اسی سطحی کاروبار کا دوسرا نام مسلمانوں کی اردو صحافت ہے۔

ایک اردو اخبار کے مسلمان اڈیٹر جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، ان کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ ایک جن سنگھی اردو اخبار کے خلاف دھواں دھار اداریے لکھتے تھے۔ اور جن سنگھی اخبار

اس مسلم اخبار کے خلاف مستقل مضامین شائع کرتا تھا۔ ہندو اڈیٹر اور مسلمان اڈیٹر دونوں شام کو ایک ساتھ چائے پیتے اور صبح کے اخبار میں دونوں کے مضامین ایک دوسرے کے خلاف چھپتے۔

اس کا راز یہ ہے کہ دونوں نے اخبار نکالا۔ مگر دونوں کا اخبار کسی طرح چل نہیں رہا تھا۔ آخر انھوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ تم ہمارے خلاف لکھو اور ہم تمہارے خلاف لکھیں۔ چنانچہ دونوں نے اس پر عمل شروع کیا اور دونوں کا اخبار دھوم کے ساتھ چل نکلا۔ لوگ روزانہ صبح کو دونوں اخبار خریدتے تاکہ یہ جانیں کہ مسلمان اڈیٹر نے ہندو اڈیٹر کے خلاف کیا لکھا اور ہندو اڈیٹر نے مسلمان اڈیٹر کے خلاف کیا شائع کیا۔

مسلمانوں کے موجودہ اردو اخبارات کے متعلق میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کسی سے اس قسم کا سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ ان اڈیٹروں اور فرقہ وارانہ فسادیوں کے درمیان ایک خاموش انڈرسٹینڈنگ ہے ——— تم فساد کرو تاکہ ہم لکھیں۔ تم لکھو تاکہ ہم فساد کریں۔ نصف لی ونصف لك هذا قوم جاهلون۔

راقم الحروف ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک ہفت روزہ الجمعیۃ (دہلی) کا اڈیٹر تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم (۱۸۹۷-۱۹۷۵) روزنامہ الجمعیۃ کے اڈیٹر تھے۔ مرحوم کا خاص ذوق "فرقہ پرستوں" سے نوک جھونک کرنا تھا۔ ان کے اداریے اکثر ایسے ہوتے تھے کہ پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ پر پرشور تبصرہ ہوگا۔ ہفت روزہ الجمعیۃ میں میرا انداز، میرے ذوق کے مطابق، اس سے بالکل مختلف تھا۔ ایک بار مرحوم سے اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مرحوم نے کسی قدر بگڑ کر کہا:

ہم آپ کی طرح مفکر نہیں، ہم تو جھلی والوں کے لیے لکھتے ہیں

مجھے نہیں معلوم کہ یہ الفاظ مولانا فارقلیط پر کس حد تک صادق آتے ہیں۔ مگر آج کل کے اکثر اردو اخبارات کا حال یقیناً یہی ہے۔ ان کے پست معیار کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "جھلی والوں" کے لیے نکالے گئے ہیں۔ چنانچہ عملاً بھی یہی ہے کہ وہ صرف عوامی قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں نظر آتے ہیں۔ وہ کسی سنجیدہ یا تعلیم یافتہ آدمی کی میز پر کبھی دکھائی نہیں دیتے۔

دہلی کی لیبر کورٹ نے ایک بار اردو اخبار کے مقدمہ کا فیصلہ دیتے ہوئے "کاتب"

کو " جرنلسٹ " شمار کیا تھا۔ اس سے اردو اخبار کے اڈیٹر لوگ بہت ناخوش ہوئے۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی جو عدالت کی زبان سے ظاہر ہوئی۔ کسی انگریزی اخبار کے مقدمے میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کمپوزیٹر کو اڈیٹر یا جرنلسٹ کا درجہ دیا جائے۔ مگر اردو اخبار کا معیار خود ہی ایسا ہے کہ اکثر اس میں کاتب اور اڈیٹر کا فرق بہت کم ہوتا ہے ــــــ یہی وہ مقام ہے جہاں اردو صحافت کا حقیقی المیہ چھپا ہوا ہے۔

بمبئی میں وہاں کے ریڈیو اسٹیشن نے میری ایک تقریر ریکارڈ کی جو بعد کی کسی تاریخ کو نشر کی گئی۔ تقریر کا عنوان انھوں نے اپنی طرف سے حسب ذیل تجویز کیا تھا:

اسلام کے آفاقی اصول

اس پروگرام کی اطلاع جناب نسیم علی خاں صاحب نے بذریعہ ٹیلی فون پیشگی طور پر مجھے دیدی تھی۔ چنانچہ روانگی سے قبل دہلی میں میں نے مذکورہ موضوع پر تقریباً پندرہ منٹ کی ایک تقریر تیار کرلی تھی۔ یہ تقریر ۲۲ اگست کو دوپہر کے وقفہ کے وقت ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کی گئی۔ انشاء اللہ آئندہ یہ تقریر الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

بمبئی کی یادوں میں سے ایک یاد ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ ایک بار ہم ایک ٹیکسی پر سفر کررہے تھے۔ مجھے ڈرائیور کے چہرے پر داڑھی دیکھ کر اس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ہیرالال ہے۔ میں نے اس سے اس کے پیشہ کے بارہ میں کئی سوالات کیے۔ اس نے بتایا کہ ایک عام آدمی اگر ایک فیٹ کار خریدے تو اس کو وہ ایک لاکھ میں پڑے گی۔ مگر ہم لوگوں کو وہ رعایتی طور پر ۸۵ ہزار میں مل جاتی ہے۔

ہیرالال اپنی ٹیکسی کا خود مالک ہے۔ میں نے پوچھا کہ گاڑی کی قیمت آپ لوگ کتنے دن میں نکال لیتے ہیں۔ اس نے کہا کہ دو سال میں۔ اس نے بتایا کہ ہم لوگ دو بھائی ہیں۔ دونوں مل کر رات کو بھی چلاتے ہیں اور دن کو بھی۔ ہم نے پہلے ایک گاڑی خریدی تھی۔ اب ہمارے پاس تین گاڑیاں ہیں۔

میں نے کہا کہ گاڑی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ایکسیڈنٹ کا ہوتا ہے۔ ایکسیڈنٹ سارے نفع کو کھا جاتا ہے۔ پھر ایکسیڈنٹ سے آپ کس طرح اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ اس کے جواب

میں اس نے جو کچھ کہا وہ ایک ایسا کلمۂ حکمت تھا جو موجودہ زمانہ کے کسی بھی مفکر اسلام یا حکیم امت کے یہاں مجھ کو سننے یا پڑھنے کو نہیں ملا۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

ہم کو دوسروں کی غلطی کو سنبھالنا پڑتا ہے

اس نے کہا کہ سڑک پر گاڑیاں چلانے والے اکثر اناڑی پن کے ساتھ گاڑیاں چلاتے ہیں۔ وہ غلط طریقہ سے اپنی گاڑی دوڑاتے ہیں۔ اگر ہم بھی انھیں کی طرح کرنے لگیں تو ایکسیڈنٹ یقینی ہے۔ اس لیے جو کام دوسروں کو کرنا چاہیے وہ ہمیں کرنا پڑتا ہے۔ ہم کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ دوسرا شخص جب غلطی کرے تو ہم اپنے آپ کو اس کی غلطی سے بچائیں۔

سڑک پر گاڑی دوڑانے والا آدمی اگر یہ بحث چھیڑے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط، تو وہ خود غلط ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ وہ قانونی اور منطقی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر عملی نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑتا کہ غلطی کس کی ہے۔ وہ صرف یہ سوچتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کی غلطی کی انجام سے کس طرح بچاؤں۔ دوسرا اگر غلطی کر رہا ہو تب بھی وہ اس غلطی کو اپنے خانہ میں ڈال لیتا ہے۔ وہ دوسرے کی غلطی کو یک طرفہ طور پر خود درست کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔

ڈرائیور سے گفتگو کے بعد میں نے سوچا کہ ہیرالال نے جو بات سڑک کے بارہ میں بتائی، وہی بات عام زندگی کے بارہ میں بھی صحیح ہے۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہمیں وہی کرنا ہے جو ایک ٹیکسی ڈرائیور بھری ہوئی سڑک پر چلتے ہوئے کرتا ہے۔ یعنی دوسرے لوگ جب غلطی کریں تو ہم ان کی غلطی کو سنبھالیں۔ دوسروں کی غلطی کے انجام سے اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر کریں۔ مگر حیرت ہے کہ ہمارے لیڈر جو قوم کے ڈرائیور ہیں، وہ اس سادہ سی حقیقت کو نہیں جانتے جو ٹیکسی کا معمولی ڈرائیور بھی جانتا ہے۔ شاید اس لیے کہ قوم کے لیڈر قوم کے بارہ میں اتنے سنجیدہ نہیں جتنا ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنی ٹیکسی کے بارہ میں سنجیدہ ہوتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی ٹیکسی کا درد ہے، یہ درد اس کو بتائے بغیر وہ بات سمجھا دیتا ہے جو درد سے خالی آدمی بتانے کے بعد بھی نہیں سمجھتا۔

کچھ علوم وہ ہیں جو درد کی درس گاہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر آپ درد کی درس گاہ

کے طالب علم نہ ہوں تو آپ ان علوم کو سمجھ بھی نہیں سکتے ۔

حسب پروگرام کانفرنس کے آخر میں میری دوسری تقریر ہوئی ۔ یہ تقریر تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی ۔ میں نے اپنی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا ——— حقیقتِ واقعہ سے مطابقت کا نام کامیابی ہے اور حقیقتِ واقعہ سے مطابقت نہ کرنے کا نام ناکامی :

What is success? To live in accordance with realities.
What is failure? To defy them.

قرآن و حدیث سے اور مختلف مثالوں سے تشریح کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ خدا نے اس دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں ایک اور دوسرے کے درمیان مقابلہ اور مسابقت پیش آئے ۔ پھر کوئی جیتے اور کوئی ہارے ۔ کوئی غالب ہو اور کوئی مغلوب رہے ۔ یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے اور یہ تخلیق الٰہی کے عین مطابق ہے ۔ اس لیے وہ بہر حال باقی رہے گی ۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے ۔ ہمیں چاہیے کہ شکایت اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ کر حکیمانہ تدبیر اور تعمیری استحکام کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کریں ۔ یہ تقریر ان شاء اللہ مرتب کرکے شائع کر دی جائے گی ۔

بمبئی میں لوگوں کا اصرار تھا کہ میں مزید قیام کروں ۔ مگر میرے لیے مزید ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا ۔ اس لیے معذرت کر کے ۲۴ اگست ۱۹۸۶ کی صبح کو میں دہلی واپس آگیا ۔

قیمت میں اضافہ

سابقہ اعلان کے مطابق الرسالہ اردو اور انگریزی کی قیمت میں جنوری ۱۹۸۷ سے اضافہ کا فیصلہ کیا گیا ہے ۔ جنوری ۱۹۸۷ سے الرسالہ کی قیمتیں حسب ذیل ہوں گی ۔

فی شمارہ	چار روپیہ
سالانہ	۴۸ روپیہ

اسی نسبت سے ایجنسی کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا ۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ــ ۲۳

۱. اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی الرسالہ کے مضامین کثرت سے نقل کیے جارہے ہیں۔ مثلاً دہلی کے سہ ماہی انگریزی مجلہ (Amity and Solidarity) نے اپنی اشاعت جون ۱۹۸۶ میں صفحہ ۳۷ پر الرسالہ کا ایک مضمون نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

An incident from the life of Umar Faruq, the Second Caliph.

۲. بمبئی کا انگریزی ویکلی (Clarity) اکثر الرسالہ کے مضامین نقل کرتا ہے۔ مثلاً اس کی اشاعت ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ صفحہ ۶ پر الرسالہ کا ایک مضمون حوالہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

۳. بمبئی کے انگریزی ہفتہ وار (Clarity) کے اڈیٹر مسٹر کوسیلے ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ کو مرکز میں آئے اور اپنے اخبار کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا خاص مقصد ملکی حالات کے بارہ میں صدر اسلامی مرکز کے خیالات کو ریکارڈ کرنا تھا۔ یہ انٹرویو کلیرٹی ۱۰ اگست ۱۹۸۶ میں شائع ہوچکا ہے۔

۴. ایک صاحب کان پور سے اپنے خط (۲ جولائی ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: الرسالہ کیا ہے، ایک تازیانہ ہے جس کو پڑھنے کے بعد ذہن فوراً آخرت کے احوال کی طرف منتقل ہو کر قلب میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ قلب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کا سایہ دیر تک باقی رکھے تاکہ امت مسلمہ کے لیے خصوصاً اور پوری انسانیت کے لیے عموماً تا دیر مستفید ہونے کا موقع ملے۔ (محمد اجمل لاری)

۵. الرسالہ انگریزی خدا کے فضل سے دن بدن اپنی مقبولیت بڑھا رہا ہے۔ ہر طبقہ کے لوگوں کے خطوط ہم کو موصول ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک خط کا مضمون حسب ذیل ہے:

I am getting the '*Al-Risala*' monthly regularly, thanks to the kind gift of Mrs. T.R. Sherwani. It is a wonderful publication, bringing before us the universal truths in simple easily understandable language. It opens windows of inspiration. I request each reader to gift this publication to at least one friend, so that the *message* in '*Al-Risala*' can spread yet further. I therefore, enclose Rs. 36/- by draft and request you to enrol Shri Ak Shobh Singh, Kashipur House, Ayarpata, Nainital 263001 as a subscriber. Thanks, yours faithfully,

Dr (Mrs) Kanak Bhargava MBBS, Ellesmere, Nainital

۶۔ الرسالہ انگریزی کے سلسلہ میں جناب بدرالدین طیب جی کا ایک خط موصول ہوا ہے۔ موصوف نے اپنے اس خط میں اس کے زبان وبیان دونوں کے بارہ میں اپنے گہرے تاثر کا اظہار کیا ہے۔ خط کا اصل مضمون حسب ذیل ہے :

Just a line to thank you for sending me *Al-Risala* so regularly. For one reason or the other I am the recipient of a large number of publications, and cannot really digest them along with my general reading. So I have not been able to pay much attention to *Al-Risala* so far; but I had some time today, and read your July No 30 issue through. I was impressed by its tone and contents and its clear and unostentatious style of writing. Thank you. With kind regards,

Badruddin Tayabji
1/23, Shantiniketan, New Delhi 110021

۷۔ پٹنہ میں ایک اجتماع (۱۲-۱۳ جولائی ۱۹۸۶) ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی۔ اس کی تفصیلی روداد انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

۸۔ مہاراشٹر اسٹیٹ بیورو آف ٹیکسٹ بکس نے ساتویں جماعت کے لیے "اردو بال بھارتی" نام سے ۱۶۶ صفحات کی درسی کتاب شائع کی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۸-۲۳ پر صدر اسلامی مرکز کا ایک سفرنامہ (ملیشیا) الرسالہ سے لے کر شائع کیا گیا ہے۔

۹۔ فرینک فرٹ میں یکم اکتوبر سے ۶ اکتوبر ۱۹۸۶ تک کتابوں کی نمائش (Book Fair) ہوئی اس سلسلہ میں نمائش کے ایک ذمہ دار سلویا کرشس (Silvia Kirsch) نے ایک خط کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ اسلامی مرکز کی کتابیں بھی اس موقع پر بطور نمائش رکھی گئی ہیں جس اسٹال پر یہ کتابیں رکھی گئی ہیں اس کا نام ہے :

Special Exhibition - Printed and Published in India

۱۰۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی طرف سے سرینگر میں کتابوں کی ایک نمائش ۴ اگست سے ۱۴ اگست ۱۹۸۶ تک منعقد کی گئی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز اور مکتبہ الرسالہ کی طرف سے ایک بک اسٹال لگایا گیا۔ تجربہ خدا کے فضل سے کافی کامیاب رہا۔

۱۱۔ الرسالہ اردو اور مطبوعات الرسالہ کے سلسلہ میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے مسلسل خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ایک خط یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ "احوال یہ ہے کہ میں نے

پاکستان میں فضلی سنز والوں اور محمد موسیٰ صاحب کی طرف سے چھاپے گیے آپ کی کتب کا مطالعہ کیا۔ بس مطالعہ کیا کیا، کتابیں پڑھنے کے بعد میں دیوانہ ہوگیا ہوں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی علماء کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن جو بات آپ کے لٹریچر پڑھنے کے بعد دل میں پیدا ہوئی ہے اور روشنی نمودار ہوئی ہے وہ مجھے کہیں اور نہیں ملی۔ آپ کی تحریروں نے میری نیند حرام کر دی ہے اب میں نے آپ کے پاکستان میں موجود تمام کتب خرید کر پڑھ لیے ہیں۔ خاص طور پر الرسالہ اردو کبھی کبھی حافظ موسیٰ صاحب سے لے کر پڑھتا ہوں۔ ابھی انگریزی میں الرسالہ کی ایک کاپی حیدرآباد سندھ سے محترم عبدالہادی صاحب سے حاصل کی اور ایک دم اسے پڑھ لیا۔ بس افسوس اس بات کا ہوا کہ آپ جیسے عظیم آدمی سے تعارف اتنی دیر سے کیوں ہوا۔ کاش آپ پاکستان میں ہوتے ——— کاش ہم آپ سے پہلے واقف ہوتے۔ سچ پوچھیں تو اب تک ہم قومی اسلام سے وابستہ تھے۔ آپ کی تحریروں کے پڑھنے سے ہم خدا کے دین اسلام سے وابستہ ہوگیے ہیں۔ میری ایک گذارش ہے کہ الرسالہ انگریزی کے اور اردو کے پورے سال کے پرانے سٹ اگر آپ کے پاس ہوں تو براہ مہربانی میں خریدنا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ مجھے طریقہ کار بتادیں۔ اور انگریزی میں قرآن کی تفسیر اگر تیار ہوگئی ہو تو وہ بھی مجھے خریدنی ہے۔

Agha Noor Mohammad Pathan, C-163, Block 10, F.B. Area, Karachi

۱۲۔ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں: الرسالہ میں پابندی سے پڑھتا ہوں اور پڑھاتا ہوں۔ اگر میں نے الرسالہ نہ پڑھا ہوتا تو میں بھی کسی نہ کسی طور پر گم راہی میں مبتلا رہتا۔ حتی کہ یہ بھی نہ سمجھ پاتا کہ شرک کیا ہے۔ الرسالہ ہندی میں نہیں ہے۔ اس لیے چند ہندوؤں کو اردو الرسالہ پڑھ کر سنایا کرتا ہوں۔ جن سے میری دوستی ہے۔ وہ لوگ بہت پسند کرتے ہیں اور تڑپتے ہیں کہ کاش وہ ہندی میں ہوتا۔ ہندوؤں کے کانوں نے کبھی ایسی اسلامی دعوت کو نہیں سنا ہے جس میں ان کے لیے نفرت کے علاوہ اور کچھ ہو، اس لیے ان کو زیادہ دلچسپی ہے جو زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں سے اپنے دین کا کام لے (۱۳ جون ۱۹۸۶)

تعمیرِ ملّت

مکان بنانے کا کام بنیاد سے شروع ہوتا ہے

اور

قوم بنانے کا کام شعور بنانے سے ۔

ماہنامہ الرسالہ قوم کی تعمیر کا یہی بنیادی کام کر رہا ہے ۔

وہ افرادِ قوم کا شعور بنانے میں مصروف ہے ۔

اس مہم میں ساتھ دینا ایک تاریخ ساز مہم میں ساتھ دینا ہے ۔

الرسالہ کو پڑھیے

الرسالہ کو پڑھائیے

اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے جس میں آپ کو لگنا چاہیے ۔

یہی آج کی سب سے بڑی مہم ہے جس میں آپ کو ساتھ دینا چاہیے۔

قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجئے

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

GIFTING The Word of God

الرسالہ

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Please tick box where applicable

☐ URDU
☐ ENGLISH
☐ ONE YEAR
☐ TWO YEARS

SUBSCRIPTION RATES:
(Prices include postage)

INLAND	Rs. 36
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Rs. 3.00

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو
مقصد اعلیٰ سے کم تر کسی چیز میں استعمال کیا جائے

نومبر ۱۹۸۶
شمارہ ۱۲۰

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad. The Prophet of Revolution	50.
The Way to Find God	4 -
The Teachings of Islam	5 -
The Good Life	5 -
The Garden of Paradise	5 -
The Fire of Hell	5 -
Muhammad. The Ideal Character	4
Man Know Thyself	4 -

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۰ نومبر ۱۹۸۶

فہرست

دعا

اللّٰھم انی اعوذ بك من الفقر والقلة والذلة واعوذُ بك من اَن اَظلِمَ او اُظلَمَ ۔
(نسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اے اللہ میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں محتاجی سے اور کمی سے اور ذلت سے ۔ اور میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے ۔

دعا آدمی کی تڑپ کا اظہار ہے ۔ دعا یہ ہے کہ آدمی کسی چیز کے لیے بے پناہ خواہش مند ہو ، وہ اپنا پورا وجود اس کے لیے لگائے ہوئے ہو ۔ اور پھر اسی کو وہ اپنے رب سے بھی مانگے ۔ جب آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کسی چیز میں لگا دے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اسی کا وہ چرچا کرتا ہے ، اسی کے لیے دعائیں اس کی زبان سے جاری ہونے لگتی ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا سنجیدگی کی آخری حد پر جا کر نکلتی ہے ۔ اب جو شخص حقیقی معنوں میں محتاجی سے بچنا چاہتا ہو وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ خود ایسا عمل کرے جو اس کو محتاجی کی طرف لے جانے والا ہو ۔ جو شخص ناداری کو ایک نازک امتحان سمجھتا ہو وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو نادار بنانے والا عمل نہیں کرے گا ۔ جو شخص ذلت سے ڈرتا ہو وہ کبھی ایسا اقدام نہیں کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ذلت کی حالت میں جا پڑے ۔ جو آدمی اپنے آپ کو ظالم کے خانہ میں نہ دیکھنا چاہتا ہو وہ کبھی خود سے ظالمانہ کارروائی نہیں کرے گا ۔ جو شخص اپنے آپ کو مظلومی کی حالت میں دیکھنا نہ چاہے وہ ایسے معاملہ میں کبھی نہیں پڑ سکتا جو نتیجۃً اس کو مظلومی کی حالت میں پہونچا دینے والا ہو ۔

جو شخص اپنی دعا میں سنجیدہ ہو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ جس چیز سے بچنے کے لیے خدا سے دعا کرے ، دعا کے بعد وہ خود اسی چیز میں ملوث ہو جائے ۔ خدا سے وہ مشرق کی سمت میں سفر کی توفیق مانگے اور دعا سے فارغ ہوتے ہی اپنی سواری مغرب کی سمت میں دوڑا دے ۔

دعوت کی اہمیت

ان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذالک بانھم قوم لایعلمون (التوبۃ)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پر پہونچا دو۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

عرب کے مشرکین جن سے آخری درجہ میں حالت جنگ قائم ہو چکی ہے، ان کے بارہ میں یہاں حکم دیا گیا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور اسلام کی بابت جاننا چاہے تو اس کو اپنی حفاظت میں رکھ کر موقع دو کہ وہ اسلام کو سمجھے۔ نہ دشمنی کی وجہ سے اس کو قتل کرو اور نہ جاسوس سمجھ کر اس کو بھگا دو۔ وہ پر سکون طور پر تمہارے درمیان رہے اور اسلام کی تعلیمات کو سمجھے۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں:

(ذالک بانھم قوم لایعلمون) ای انما شرعنا امان مثل ھولاء لیعلموا دین اللہ وتنتشر دعوۃ اللہ فی عبادہ

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۳۷)

اس لیے کہ وہ علم نہیں رکھتے، یعنی اس قسم کے لوگوں کے لیے امان کا طریقہ ہم نے اس لیے مقرر کیا تاکہ وہ اللہ کے دین کو جانیں اور اللہ کی دعوت اس کے بندوں میں پھیلے۔

اس سورہ میں ایک طرف مشرکین سے برأت کا اعلان ہے اور ان کے قتل کا حکم ہے۔ گویا ان کی دشمنی اس آخری درجہ پر پہونچ چکی ہے جب کہ برداشت کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس وقت بھی یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر ان میں کا ایک شخص اسلام کی تحقیق کرنا چاہے تو اس کو تحقیق کا پورا موقع دیا جائے۔ ایک شخص کے دل میں اگر قبول حق کا کوئی جذبہ ہے تو اس جذبہ کو بروئے کار آنے کا موقع ملنا چاہیے۔ شدت کے باوجود نرمی، غضب کے باوجود انصاف کی یہی صلاحیت ہے جو کسی شخص کو خدا کے دین کا داعی بناتی ہے۔

کائناتی نشانیاں

کائنات ایک آئینہ ہے جس میں اس کے خالق کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر چیز ایک نشانی ہے۔ ہر چیز ایک حقیقت کا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اگر آدمی کے اندر دیکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ ہر چیز میں ایک معنویت دیکھے گا۔ موجودہ دنیا اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ اس کے لیے معرفت الٰہی کا عظیم خزانہ بن جائے گی۔

ریاضیاتی دنیا

کائنات بظاہر ایک ریاضیاتی کائنات ہے۔ کائنات ریاضی کے اصولوں کی حد تک منظم ہے۔ یہ موجودہ کائنات کا ایک ایسا پہلو ہے جو اس کے ہر حصہ میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

شہد کی مکھی حد درجہ صحت کے ساتھ مسدس اشکال کے چھتے بناتی ہے۔ ایٹم کے ذرات کی کمیت انتہائی یکساں طور پر متعین ہوتی ہے۔ زمین کی محوری گردش اتنی صحت کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہزاروں سال پہلے اور ہزاروں سال آگے تک کے کلنڈر بنائے جا سکتے ہیں۔ یہی کائنات کے تمام اجزاء کا حال ہے۔ کائنات کا ہر جزء اتنے محکم اصولوں کے مطابق عمل کرتا ہے کہ نہایت صحت کے ساتھ [illegible] مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

کائنات کا یہ [illegible] سائنس دانوں کو بے حد متاثر کرتا ہے حتیٰ کہ اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ پوری کائنات [illegible] ریاضی [illegible] ہے۔ [illegible] ریاضیاتی [illegible] سمجھتے ہیں وہ گمان کرتے [illegible] کو سمجھ [illegible] ہیں۔

[illegible] مختلف سائنس [illegible] اپنے شعبوں [illegible] تحقیق [illegible] کا کام کرتے ہیں [illegible] ان کے کام کا اگر ایک [illegible] کائنات [illegible] ریاضیاتی نظم کی نمائش:

[illegible]

تمام سائنس دانوں کا یہ مشترک عقیدہ ہے کہ کائنات میں ریاضیاتی قطعیت کی حد تک نظم و ترتیب ہے۔ ایک سائنس داں اپنی تحقیق پر اس وقت بالکل مطمئن ہو جاتا ہے جب کہ وہ

تحقیق کو ریاضیاتی سانچہ میں ڈھالے۔ ریاضیاتی تصدیق سائنس داں کے نزدیک اس کے
یہ کی صداقت کا آخری ثبوت ہے۔

سائنس دانوں کی جماعت کائنات کے مطالعہ میں ریاضی کو اسی طرح استعمال کرتی ہے
طرح سناروں کی جماعت سونے کے کاروبار میں کسوٹی کو۔ سنار کسوٹی کی تصدیق کے
سونے کا سونا ہونا مان لیتا ہے۔ اسی طرح سائنس داں ریاضی کی تصدیق کے بعد نظریہ کا صحیح
ریہ ہونا تسلیم کر لیتا ہے۔

ریاضیات اور کائناتی نظام کے درمیان یہ مطابقت کیوں ہے۔ بعض سائنس دانوں نے
وال اٹھایا ہے۔ ان کے ایک طبقہ نے اس کا براہِ راست جواب دیئے بغیر اس کو مزید ایک سوال
تم کر دیا ہے ـــــ کیا کائنات ایک ریاضیاتی ذہن کی تخلیق ہے:

Was the universe created by a mathematical mind?

کچھ سائنس دانوں نے اس کا مثبت جواب دیا ہے۔ سر جیمز جینز فلکی طبیعیات کا ایک
ور عالم ہے۔ اس نے ۱۹۳۲ میں کہا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا نقشہ ایک خالص
ضی داں نے تیار کیا تھا:

In 1932, Sir James Jeans, an astrophysicist siad: "the universe appears to have been designed by a pure mathematician."
Encyclopaedia Britannica (1984) V. 15, p. 531

کائنات اور انسان

موجودہ اندازہ کے مطابق کائنات میں کم از کم دس ارب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں تقریباً
کھرب ستارے ہیں۔ ان میں سے اکثر ستارے ہمارے سورج سے بہت زیادہ گرم اور بہت
دہ بڑے ہیں جبکہ ہمارا سورج اتنا بڑا ہے کہ اس سے زمین جیسے بارہ لاکھ کرے بنائے جا سکتے ہیں
ن گنت متحرک ستارے ایک دوسرے سے اتنے زیادہ دوری پر ہیں جیسے بحر الکاہل میں بکھرے
ئے چند سمندری جہاز۔ اس ناقابل قیاس حد تک بڑی دنیا میں زمین کا چھوٹا سا کرہ ایک انتہائی نادر
ثنا ہے جہاں پانی اور ہوا اور وہ دوسری چیزیں ہیں جو انسان جیسی مخلوق کے لیے زندگی کا سامان

بن سکیں ـــــ یہ دنیا اپنی ساری عظمتوں اور حکمتوں کے باوجود انسان کے بغیر بالکل بے معنی ہے۔ مگر خود انسان کی زندگی اتنی زیادہ بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ ساری کائنات میں بظاہر اس سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔

انسان اگر نہ ہو تو یہاں کوئی آنکھ نہ ہوگی جو دنیا کی رنگینیوں کو دیکھے اور کوئی کان نہ ہوگا جو اس کے نغموں کو سنے اور کوئی دماغ نہ ہوگا جو اس کی حکمت اور معنویت کو پائے۔ یہ دنیا ایک عظیم ترین آرٹ ہے مگر انسان کے بغیر وہ ایک ایسا آرٹ ہے جس کا کوئی جاننے والا نہیں۔ جس کی کوئی داد دینے والا نہیں۔

مگر خود انسان کی حقیقت کیا ہے۔ زمین پر جتنے انسان پائے جاتے ہیں، اگر ان میں کا ہر شخص چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو انسان کی پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جاسکتا ہے جو لمبائی چوڑائی اور بلندی میں ایک میل ہو۔ کائنات کی وسعتوں کے مقابلہ میں یہ صندوق کس قدر چھوٹا ہے۔ پھر اگر اس کو کسی سمندر کے کنارے لے جاکر ایک ہلکا سا دھکا دیں تو یہ صندوق پانی کی گہرائی میں اس طرح گم ہو جائے گا جیسے بھری ہوئی بالٹی میں سرسوں کا ایک دانہ۔ صدیاں گزر جائیں گی، نسل انسانی اپنے مادی کفن میں لپٹی ہوئی ہمیشہ کے لیے پڑی رہے گی۔ دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں کبھی انسان جیسی کوئی مخلوق آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح طوفان آتے رہیں گے۔ سورج اسی طرح چمکتا رہے گا، زمین کا کرہ بدستور اپنے محور پر گھومتا رہے گا۔ کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ان گنت دنیائیں اس حادثہ کو بس اتنی ہی اہمیت دیں گی جیسے زمین کے اوپر ایک چیونٹی کا کچل کر مر جانا۔ صدیوں کے بعد سمندر کے کنارے مٹی کا ایک ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک صندوق میں دفن کی گئی تھی۔ انسان باعتبار حقیقت انتہائی بامعنی ہے۔ مگر انسان کائنات کے موجودہ نظام میں اپنی معنویت کو نہیں پاتا۔ یہاں انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں۔ موجودہ دنیا اپنی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا کی طالب ہے۔ موجودہ دنیا اپنی ساری معنویت کے باوجود بے معنی ہے اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ مانا جائے۔

توازن فطرت

قطب جنوبی (انٹارکٹکا) کے بارہ میں روسی جغرافیہ سوسائٹی نے تحقیقات کی ہیں۔ انھوں

نے اندازہ لگایا ہے کہ قطب جنوبی کے اوپر جو برف جمی ہوئی ہے وہ دنیا بھر کے تازہ پانی کا ۸۵ فی صد حصہ ہے ۔ اس کی مقدار ڈھائی کرور مکعب میٹر ہے ۔ قطب جنوبی کی برف اس وقت صرف ڈیڑھ کرور مربع میٹر کے علاقہ میں پھیلی ہوئی ہے ۔

اگر اس برف کو دنیا کے تمام خشک حصہ پر پھیلا دیا جائے تو موجودہ خشک زمین پر ۵۰ میٹر برف جم جائے گی ۔ اور اگر یہ برف اچانک پگھل جائے تو دنیا کے سمندروں کی سطح ۶۰ سے ۷۰ میٹر تک بلند ہو جائے گی ۔ اور زمین کا دس فی صد حصہ زیر آب ہو جائے گا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بھر کے تمام ساحلی شہر پانی کے نیچے ڈوب جائیں گے ۔ حتی کہ بہت سے ملک پورے کے پورے پانی کے نیچے چلے جائیں گے ۔ قطب جنوبی کی تمام برف پگھلنے کی صورت میں سمندر کی اوسط حرارت دو ڈگری کم ہو جائے گی ۔ اس کی وجہ سے زمین پر موسمی تباہی آجائے گی ۔ کیوں کہ سمندر میں ایک ڈگری کے ہزارویں حصہ کی کمی بیشی فضا میں پوری ایک ڈگری کی حرارت کا فرق پیدا کرتی ہے ۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین پر جو نظام ہے وہ کس قدر متوازن نظام ہے ۔ یہاں بیک وقت مختلف تقاضوں کے درمیان اس طرح توازن قائم رکھا گیا ہے کہ ہر چیز صرف اپنا فائدہ دے ، وہ اپنے نقصان سے انسان کو بچائے رکھے ۔

یہ توازن فطرت زمین کے ہر معاملہ میں نمایاں ہے ۔ یہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ اس دنیا کے پیچھے ایک ذہن کارفرما ہے ۔ اگر یہاں ذہن کی کارفرمائی نہ ہو تو موجودہ توازن کسی حال میں برقرار نہیں رہ سکتا ۔

زمین کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جس ہستی نے زمین کے موجودہ حالات کو ایک خاص ڈھنگ پر بنایا ہے اس کو معلوم تھا کہ یہاں جاندار چیزیں (انسان، حیوان ، نباتات) ہیں ۔ چنانچہ یہاں کی ہر چیز جاندار اشیاء کی ضرورت کے عین مطابق بنائی گئی ۔ اگر یہ واقعہ آدمی کو خدا کا یقین نہ دلائے تو آخر وہ کیا چیز ہوگی جو آدمی کو اس کا یقین دلائے گی

نیم کا معجزہ

دوسری انٹرنیشنل نیم کانفرنس دسمبر ۱۹۸۳ میں مغربی جرمنی میں ہوئی ۔ آج کل نیم کا درخت نباتاتی علماء کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیم مضر کیڑوں کو بھگانے والا ایک

قیمتی قدرتی ذریعہ (Natural repellent) ہے۔ انسان نے کیمیائی طور پر جتنی کیڑا مار دوائیں بنائی ہیں وہ سب کیڑے پر اثر انداز ہونے کے ساتھ فضا کو بھی خراب کرتی ہیں اور اس طرح انسان کے لیے مضر بنتی ہیں۔ مگر نیم کے اندر یہ انوکھی صفت ہے کہ وہ کسی فضائی نقصان (Environmental damage) کے بغیر انسان کو اور نباتات کو مضر کیڑوں سے بچاتی ہے۔

مذکورہ کانفرنس میں ۲۱ ملکوں کے ایک سو سے زیادہ سائنس داں جمع ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دائرہ میں نیم کے تجربات بتائے۔ ہالینڈ سے آنے والے ایک عالم ایل ایم اسچون ہیون (Dr L.M. Schoonhoven) نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ نیم کے اندر ایک انوکھا دفاعی نظام (Unique defence system) ہے۔ یہ نظام ایک بے حد نادر قسم کا کیڑا کنٹرول (Insect control) ذریعہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ٹوگو (Togo) میں یہ تجربہ کیا گیا کہ کھیت کی مٹی میں نیم کی پتی ملا دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نباتاتی کیڑوں (Plant parasites) کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ اور ایسے کھیت جن میں یہ عمل کیا گیا تھا، فصل کی پیداوار میں نمایاں اضافہ (Spectacular increase) ہوا۔

ہندستان کے نمائندہ نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ نیشنل کیمیکل لیبارٹری (پونا) نے نیم کا ایک کمپاؤنڈ تیار کیا ہے جس کا نام نیمرچ (Neemrich) ہے۔ مکا، آلو اور بعض دوسری فصلوں میں نیمرچ کے تجربے کیے گیے جس کے نتیجہ میں ان کی پیداوار میں قابل لحاظ اضافہ ہوا۔

موجودہ زمانہ میں دنیا کے تمام ملکوں میں کیڑا مار دواؤں (Pesticides) کا استعمال عام ہے ان دواؤں کے استعمال سے یقیناً زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ مگر ابھی تک انسان یہ دریافت نہ کر سکا کہ ان دواؤں کے استعمال سے فضا پر جو مضر اثرات ہوتے ہیں ان سے کس طرح بچا جائے۔ یہ کیڑا مار دوائیں اگر ایک طرف کیڑے کو مارتی ہیں تو اسی کے ساتھ وہ انسان کو بھی نقصان پہونچاتی ہیں۔

اگر آپ لکڑی اور پتی کو آگ میں ڈالیں تو دونوں جل جائیں گی۔ کیوں کہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح انسان اور کیڑے دونوں زندہ انواع ہیں۔ جو چیز ایک کے لیے نقصان دہ ہے وہی دوسرے کے نقصان کا باعث بھی ہوتی ہے۔

انسان کو مضر بیکٹیریا سے بچانے کے لیے اینٹی بایوٹک دوائیں کھلائی جاتی ہیں۔ یہ دوائیں

بیکٹیریا کی طرح انسان کے جسم کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ مکھی، مچھر، دیمک اور دوسرے کیڑوں کو ختم کرنے کے لیے ڈی ڈی ٹی چھڑکا جاتا ہے۔ اس سے مذکورہ کیڑے بھاگتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ فضا میں ڈی ڈی ٹی کے اجزا شامل ہو جاتے ہیں۔ انسان سانس کے ذریعہ ان کو اپنے اندر داخل کر لیتا ہے اور پھر طرح طرح کے امراض کا شکار ہوتا ہے۔ پھل اور زرعی پیداوار میں مضر کیڑے لگتے ہیں جن سے پیداوار بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کیڑا مار دوائیں بنائی گئی ہیں۔ ان دواؤں کے استعمال سے باغوں اور کھیتوں کی پیداوار میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے مگر یہاں بھی وہی صورت ہے کہ ایک طرف ان کیڑا مار دواؤں سے فضا خراب ہوتی ہے، دوسری طرف خود پیداوار میں مضر کیمیائی مادے شامل ہو جاتے ہیں اور کھانے کے ساتھ انسان کے اندر داخل ہو کر نقصان کا سبب بنتے ہیں۔

ہندستان میں ہر سال تقریباً چالیس ہزار پونڈ کیمیکل دوائیں زرعی کھیتوں میں چھڑکی جاتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں عوام کی صحت کا معیار برابر گر رہا ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی رپورٹ (۱۹۸۲) میں بتایا گیا ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں زرعی کیڑوں کو مارنے کے لیے جو کیمیائی دوائیں استعمال ہوتی ہیں ان کے زہریلے اثرات سے ہر سال تقریباً پچاس ہزار آدمی بیمار پڑتے ہیں اور ان میں سے تقریباً پانچ ہزار آدمی مر جاتے ہیں۔

انسانی سائنس ابھی اس سائنس تک بھی نہیں پہونچی جس کا مظاہرہ قدرت کے اس معجزہ کی سطح پر ہو رہا ہے جس کو نیم کا درخت کہتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ یہ فرض کیے ہوئے ہیں کہ اس دنیا کا کوئی خالق و مالک نہیں۔ اس دنیا کو چلانے والا کوئی ذہن نہیں۔

"ڈی ڈی ٹی" کا ایک پیکٹ ہو تو اس کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ یہ پیکٹ اپنے آپ بن گیا ہے۔ ہر آدمی اس کو ذہن کی تخلیق قرار دے گا۔ مگر ڈی ڈی ٹی کی نوعیت کی اس سے زیادہ اعلیٰ پیداوار کو دیکھ کر آدمی یہ کہہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ وجود میں آگئی ہے۔ نیم کا درخت بلاشبہ ڈی ڈی ٹی سے بہت زیادہ اعلیٰ پیداوار ہے۔ اس کی بناوٹ میں یقینی طور پر غیر معمولی ذہانت پائی جاتی ہے۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو ڈی ڈی ٹی کے بارہ میں یہ مانتے ہیں کہ وہ ذہانت کی پیداوار ہے۔ مگر یہی بات وہ نیم جیسی چیزوں کے بارہ میں نہیں مانتے۔

تخلیق میں ذہانت

شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس کر شہد تیار کرتی ہے ۔ مگر شہد کی مکھی کا صرف اتنا ہی کام نہیں ۔ اسی کے ساتھ وہ اور بھی کئی اہم کام انجام دیتی ہے ۔ انھیں میں سے ایک کام زرخیزی ہے ۔ یعنی نر اور مادہ کے زیرہ کو ایک دوسرے پر پہونچانا تاکہ وہ زرخیز ہو سکیں ۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ شہد کی مکھی کے ایک ماہر نے لکھا ہے کہ پھولوں کا رس وہ معاوضہ ہے جو پودا شہد کی مکھیوں کو زرخیز بنانے کے عمل کے لیے ادا کرتا ہے :

Nectar is the fee paid by the plant for the fertilizing service of the insect (bees)

امریکہ کے مشرقی حصہ میں پھولوں کے رس Nectar کا نوے فی صد حصہ بے کار چلا جاتا ہے ۔ کیوں کہ اس علاقہ میں شہد کی مکھیاں بہت کم پائی جاتی ہیں ۔ اور اسی نسبت سے زرخیزی کا عمل بھی نسبتاً کم انجام پاتا ہے ۔

معلوم کیا گیا ہے کہ شہد کی مکھی جب کسی باغ یا کیاری میں پھولوں کا رس چوس رہی ہو تو وہ بیک وقت ہر قسم کے درختوں کے پھولوں کا رس نہیں چوستی ۔ بلکہ وہ یہ کرتی ہے کہ جس پھول کا رس ایک بار لیا ہے ، اسی کا رس بار بار لیتی ہے ۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی نسل کے پھولوں کے درمیان اڑ کر ایک کے بعد ایک کا رس لیتی رہتی ہے ۔

شہد کی مکھی کا یہ طریقہ زراعت اور باغبانی کے لیے بے حد اہم ہے ۔ اس کی وجہ سے وہ ایک مخصوص پھول کے زیرہ کو اسی مخصوص درخت کے پھولوں تک پہونچاتی رہتی ہے ۔ پھول چوسنے کے دوران پھول کا زیرہ اس کے جسم سے چپک جاتا ہے ۔ جب وہ دوسرے پھول پر جا کر بیٹھتی ہے تو اس کا زیرہ اس پھول پر گر جاتا ہے ۔ اس طرح نر اور مادہ کے درمیان زرخیزی کا عمل انجام پاتا ہے ۔ اور ان میں تزویج کا عمل جاری رہتا ہے ۔ اگر ایسا نہ ہو تو تقریباً ایک لاکھ قسم کے پودے زمین سے بالکل ختم ہو جائیں ۔

یہ واضح طور پر تخلیق کے نظام میں ذہانت ہونے کا ثبوت ہے ۔ اس قسم کا بامعنی واقعہ لازمی طور پر ثابت کرتا ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے ۔ اگر خالق نہ ہو تو تخلیق کے نظام میں اس قسم کی معنویت ممکن نہیں ۔

ذرہ بھی غائب نہیں

ہوابازی کے قانون کے مطابق بارہ ہزار پاونڈ سے زیادہ وزنی ہوائی جہازوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ بلیک باکس رکھیں۔ بلیک باکس دو چھوٹے چھوٹے خاص قسم کے ٹیپ ریکاڈر ہیں۔ جس میں سے ایک کو فلائٹ ریکارڈر اور دوسرے کو وائس ریکارڈر کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اوسطاً ۲۰ انچ لمبا اور ۶ انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کا وزن کم و بیش ۲۵ پاونڈ ہوتا ہے یہ دونوں ریکارڈر ہوائی جہاز کی دم میں رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ حادثہ کے وقت محفوظ رہ سکیں وہ مخصوص نظام کے تحت پائلٹ کی آواز، جہاز کی رفتار اور دوسری ضروری معلومات ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ٹیپ آٹومیٹک طور پر ہر آدھ گھنٹہ میں مٹ جاتا ہے تاکہ جہاز کے آخری لمحات کا حال ان سے معلوم ہو سکے۔

۲۳ جون ۱۹۸۵ کو ایک سخت ہوائی حادثہ ہوا۔ ایرانڈیا کا ایک بڑا جہاز (بوئنگ ۷۴۷) کناڈا سے لندن ہوتا ہوا ہندستان آرہا تھا۔ زمینی کنٹرول جہاز کی لمحہ لمحہ رپورٹ لے رہا تھا۔ اچانک اس کی کمپیوٹر اسکرین پر جہاز کی تصویر غائب ہو گئی۔ جہاز سے پیغامات آنا بالکل بند ہو گیے۔ جہاز ایک حادثہ کا شکار ہو کر اچانک اٹلانٹک سمندر میں گر پڑا تھا۔ جہاز پر ۳۲۹ مسافر تھے جو سب کے سب ہلاک ہو گیے۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا جو حادثہ کی تفصیلات دنیا والوں کو بتا سکے۔

اب حادثہ کی بابت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف وہ بلیک باکس تھا جو اٹلانٹک سمندر میں تہ نشین ہو کر رہ گیا تھا۔ اٹلانٹک سمندر دنیا کا دوسرا سب سے بڑا سمندر ہے۔ اس کا رقبہ چھوٹے چھوٹے ذیلی سمندروں کو ملا کر چار کروڑ گیارہ لاکھ مربع میل ہے۔ اس ناپید اکنار سمندر میں بلیک باکس کی حیثیت صرف ایک چھوٹے سے ذرہ کی تھی جو سمندر کے نیچے دو میل کی گہرائی میں پڑا ہوا تھا۔ بظاہر اس ذرہ کو سمندر سے نکالنا ناممکن تھا۔ مگر یہ ناممکن ممکن ہو گیا اور ۱۰ جولائی ۱۹۸۵ کو وائس ریکارڈر اور ۱۱ جولائی ۱۹۸۵ کو فلائٹ ریکارڈر گہرے سمندر کی تہہ سے نکال لیا گیا۔

یہ معجزہ کیسے پیش آیا۔ وہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ کنٹرول کیے جانے والے مشینی انسان

(Remote-controlled Robot) کے ذریعہ پیش آیا۔ بلیک باکس میں ایسی مشینیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ ریڈیائی سگنل بھیجتا رہتا ہے۔ یہ سگنل اس سے ہر سکنڈ میں نکلتے ہیں اور تیس دن تک جاری رہتے ہیں۔ فرانس اور امریکہ اور برطانیہ کی جدید سامان سے مسلح کشتیوں نے سگنل کے ذریعہ ان کے جائے وقوع کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگالیا۔ اس کے بعد مخصوص کیمرہ کے ذریعہ اس کی تصویریں لی گئیں۔ پھر مشینی انسان (Robot) سمندر کی تہ میں بھیجے گیے۔ جو انسان کی مانند بازو اور ہاتھ اور انگلیاں رکھتے ہیں۔ یہ روبوٹ ریڈیائی لہروں سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ انسان سمندر کے اوپر مشینی اسکرین پر سارا منظر دیکھتا ہے اور ریڈیائی لہروں کے ذریعہ روبوٹ کی رہنمائی کرتا ہے تاکہ وہ متعین مقام پر پہونچ کر بلیک باکس کو اپنے ہاتھوں سے پکڑلیں اور پھر اوپر لاکر انسان کے حوالے کردیں۔

یہ طریقہ تھا جس کو استعمال کرکے اتھاہ سمندر سے ایک چھوٹے سے ذرہ کو نکال لیا گیا اور اس نے جہاز کے حادثہ کی ساری کہانی انسان کو بتادی۔

جب میں نے اخبارات میں ان تفصیلات کو پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اِس واقعہ کی صورت میں اُس عظیم تر واقعہ کا اظہار (Demonstration) دیا جارہا ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

ومایعزب عن ربک من مثقال ذرۃ فی الارض ولا فی السماء ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین (یونس ۶۱)	اور تیرے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی، مگر وہ ایک واضح نوشتہ میں ہے۔

الرسالہ کیسٹ

الرسالہ کیسٹ نمبر ۷ زیر تیاری ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی روانگی شروع ہوجائے گی۔

منیجر

شراب کی حرمت

نئی دہلی کے ایک انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۹ اگست ۱۹۸۶) کے صفحہ اول پر ایک تصویر ہے جس میں بہت سے آدمی افسردہ چہروں کے ساتھ اس حال میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ ان کے پیروں پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے۔ یہ چندی گڑھ کے آگ بجھانے والے محکمہ کے سرکاری ملازمین ہیں۔ ان کے افسر مسٹر آر کے رنگا (ڈپٹی کمشنر اور ڈائرکٹر آف فائر سروسز) نے ان کو بلندی سے کودنے کا حکم دیدیا تھا جس کے نتیجہ میں ان کے پاؤں یا تو ٹوٹ گیے یا شدید طور پر زخمی ہوئے۔

مسٹر رنگا کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ حکم ان ملازمین کی جسمانی صحت (Physical fitness) کی جانچ کے لیے دیا تھا۔ دوسری طرف شائع شدہ رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے ـــــ مسٹر رنگا نے آگ بجھانے والے آدمیوں کو حکم دے دیا کہ وہ دس فٹ اونچے فائر انجن کی چھت سے کود یں۔ ان آدمیوں کا کہنا ہے کہ مسٹر رنگا نے یہ حکم اس لیے دیا کہ وہ اس وقت شراب پی کر مدہوش ہو رہے تھے:

Mr Ranga ordered the firemen to jump from the roof of a 10-feet high fire-engine. The firemen allege that he was drunk.
Indian Express (New Delhi) August 9, 1986 p. 7

یہ ایک حقیقت ہے کہ شراب اور جرم کا بہت گہرا تعلق ہے۔ شراب انسان کی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے۔ شراب پینے کے بعد آدمی کوئی بھی غیر معقول حرکت کر سکتا ہے۔ یہ ثابت ہوا ہے کہ سڑک کے حادثات زیادہ تر شراب نوشی کی وجہ سے واقع ہوتے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں بتایا گیا ہے کہ شراب نوشی پر ایک خاص اعتراض یہ ہے کہ شراب پی کر گاڑیاں چلانے کے سبب سے سڑک کے حادثات بہت بڑھ گیے ہیں، اس کے نتیجہ میں لوگ مرتے ہیں، زخمی ہوتے ہیں اور جائداد کا نقصان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ہر سال ۵۰ ہزار سڑک کے حادثات ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی حادثات کا سبب شراب نوشی ہے۔ ان میں تقریباً پانچ لاکھ آدمی زخمی ہوتے ہیں اور ایک ارب ڈالر سے زیادہ جائداد کو نقصان پہونچتا ہے:

A special offense related to drinking is alcohol-impaired driving of motor vehicles and the resulting high rate of accidents, with fatalities, personal injuries, and property damage. Alcohol, for example, is involved in about one-third of the more than 50,000 annual road traffic fatalities in the United States, in possibly 500,000 injuries to persons, and in more than $ 1,000,000,000 worth of property damage (1/449).

ٹائمس آف انڈیا (۶ نومبر ۱۹۸۵) میں ایک رپورٹ چھپی تھی جس کا عنوان تھا جرم سے پہلے شراب پیو (Drink before crime) اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں جو لوگ جیل خانوں میں ہیں اور جن پر متشددانہ جرم کرنے کا الزام ہے، ان کی آدھی سے زیادہ تعداد وہ ہے جس نے جرم کرنے سے پہلے شراب پیا تھا۔ مجرمانہ افعال کے سلسلہ میں شراب کے رول کا زبردست مطالعہ کرنے کے بعد امریکہ کے محکمہ انصاف کے شعبہ اعداد و شمار نے بتایا ہے کہ ۳۲۱۱۲ سنگین مجرمین میں سے ۵۴ فی صد ایسے افراد پائے گئے جو کہ جرم کے وقت شراب پئے ہوئے تھے:

More than half of jail inmates convicted of violent crimes had been drinking before committing the offences, says an official report. In a grim study of alcohol's role in fueling crimes a report by the U.S. bureau of justice statistics showed that altogether, 54 per cent of 32,112 people convicted of violent crimes had been drinking, reports AP.

یہ ایک حقیقت ہے کہ شراب ام الخبائث ہے۔ یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب آدمی کے سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کو ماؤف کر دیتی ہے۔ آدمی کے اندر ایک احساس چھپا ہوا ہے جو اس کو صحیح اور غلط بتاتا ہے اور انجام اور بد انجامی سے متنبہ کرتا ہے۔ یہ احساس جرم کو روکنے کے لیے سب سے بڑا محرک ہے۔ شرمندگی کا احساس، جرم کے نتیجہ کا خوف، دوسرے انسانوں کے لیے مہربانی۔ اس قسم کے احساسات ہر آدمی کے اندر فطری طور پر موجود ہیں اور وہ جرم کو روکنے میں زبردست عامل کا کام کرتے ہیں۔ مگر شراب آدمی کو نشہ میں مبتلا کرکے اس کو بے حس بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آسمانی شریعت میں شراب کو مطلق حرام قرار دیا گیا ہے۔ حتی کہ اس کی تھوڑی سی مقدار جو بظاہر بے ضرر معلوم ہوتی ہے وہ بھی حرام ہے۔ ایسا اس لیے ہے تاکہ شراب سے مکمل کراہیت پیدا ہو

اقرار و انکار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ کے لوگوں (قریش) کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو وہ ان کے لیے قابل قبول نہ ہو سکی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ محمد بن عبداللہ کا دین صحیح ہو اور وہ دین غلط ہو جن کو وہ اپنے اکابر و اسلاف کی طرف منسوب کرکے اس پر فخر کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا:

یامحمد، فسل لنا ربّك الذی بعثك بما بعثك به، وَلْيبعث لنا مَن مضىٰ من اٰبائنا وليكن فيمن يبعث لنا منهم قصيّ بن كلاب فانه كان شيخَ صدقٍ فنسألهم عما تقول اَحقٌّ هو اَمْ باطل فان صدقوك صدقناك وعرفنا به منزلتك من الله تعالىٰ واَنه بعثك رسولاً كما تقول۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۶)

اے محمد، اپنے رب سے کہو جس نے تم کو بھیجا ہے جس چیز کے ساتھ بھیجا ہے۔ کہ وہ ہمارے گزرے ہوئے آباء کو اٹھائے۔ اور جن لوگوں کو وہ اٹھائے ان میں قصی بن کلاب بھی ہوں۔ کیوں کہ وہ ایک سچے بزرگ تھے۔ پھر ہم ان سے پوچھیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ حق ہے یا باطل ہے۔ اگر وہ لوگ تمہاری تصدیق کریں تو ہم بھی تمہاری تصدیق کریں گے اور اس سے ہم اللہ کے نزدیک تمہارے درجہ کو پہچان لیں گے اور یہ کہ اس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ تم کہتے ہو۔

کیا وجہ ہے کہ "قصی بن کلاب" کی بڑائی قریش کی سمجھ میں آئی مگر محمد بن عبداللہ کی بڑائی ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قصی بن کلاب ایک گزری ہوئی شخصیت تھے۔ اور محمد بن عبداللہؐ ان کے لیے حال کی شخصیت تھے۔

قصی بن کلاب کی بڑائی انھوں نے بچپن سے سنی تھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات مسلّم ہو چکی تھی کہ قصی بن کلاب ایک عظیم شخصیت ہیں۔ اس کے برعکس محمد بن عبداللہ کو انھوں نے پہلی بار ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے دیکھا۔ قصی بن کلاب سے ان کا پہلا تعارف بڑے آدمی کی حیثیت سے ہوا اور محمد بن عبداللہ سے ان کا پہلا تعارف چھوٹے آدمی کی حیثیت سے۔

ہی فرق تھا جس نے ان کی نظر میں ایک کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا بنا دیا۔

ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی اُس شخص کی بڑائی فوراً مان لیتا ہے جو اس کے سن شعور کو پہونچنے سے پہلے بڑا بن چکا ہو۔ اور جو شخص اُس کی نگاہوں کے سامنے بڑا بنا ہو اُس کی بڑائی کو وہ تسلیم نہیں کرتا۔

اسی نفسیات کا ایک پہلو حسد ہے۔ حسد ہمیشہ حال کے اکابر سے ہوتا ہے نہ کہ ماضی کے اکابر سے۔

قرآن میں اہل ایمان کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں (یُؤمِنونَ بِالْغَیْبِ) اس آیت کا تعلق براہ راست طور پر ایمان باللہ سے ہے، مگر بالواسطہ طور پر اس کا تعلق ایمان بالرسول سے بھی ہو جاتا ہے۔ رسول جب آتا ہے تو باعتبار "بشر" وہ ظاہر ہوتا ہے، مگر باعتبار "رسول" وہ غیب میں ہوتا ہے۔ بشر ہونے کی حیثیت سے وہ ہر ایک کو دکھائی دیتا ہے، مگر رسول ہونے کی حیثیت سے اس کو صرف وہ لوگ دیکھ پاتے ہیں جو اُس کو اس کے اندرونی جوہر کے اعتبار سے پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

رسول کا ایک جسم ہوتا ہے۔ وہ چلتا پھرتا ہے اور کھانا کھاتا ہے۔ وہ فتح و شکست سے دوچار ہوتا ہے، اس پر مختلف قسم کے مادی حالات طاری ہوتے ہیں۔ ان حیثیتوں میں رسول ایک نظر آنے والی چیز ہوتا ہے۔ ان حیثیتوں سے ہر آدمی رسول کو دیکھتا ہے۔ رسول کی دوسری حیثیت یہ ہوتی ہے کہ اس پر خدا کا فیضان اترتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے جنت اور جہنم کو دیکھا ہے۔ اس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ جو شخص میرا ساتھ دے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو شخص میرا ساتھ نہیں دے گا، وہ ناکام ہو کر رہ جائے گا۔ اس دوسری حیثیت میں رسول بھی اسی طرح غیر مرئی ہوتا ہے جس طرح خدا۔

رسول کو رسول کی حیثیت سے پہچاننے کے لیے بھی "غیب" کو دیکھنے والی نظر درکار ہے۔ جو لوگ چیزوں کو ان کے جوہر کے اعتبار سے دیکھ سکیں، جو چیزوں کو ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے پہچاننے کی نگاہ رکھتے ہوں، وہی خدا کے رسول کو پہچانیں گے۔ ایسے ہی لوگ اس امتحان میں پورے اتریں گے کہ رسول کو مان کر اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیں۔

مردہ لوگ

دینی دعوت کا کام کرنے کے دو میدان ہیں۔ ایک ہے بنو اسرائیل جیسے لوگوں میں کام کرنا، جس کا ایک نمونہ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا ہے بنو اسماعیل جیسے لوگوں میں کام کرنا، جس کی روشن مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نظر آتی ہے۔

بنو اسرائیل (یہود) نے حضرت مسیح کی بدترین مخالفت کی۔ انتہائی کھلے ہوئے معجزات اور انتہائی طاقتور دلائل کے باوجود انھوں نے حضرت مسیح کا اقرار نہیں کیا۔ اپنی تمام ممکن تدبیروں سے وہ حضرت مسیح کے مشن کو ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے آخری مرحلہ میں کمینہ پن کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے حضرت مسیح پر جھوٹے الزام لگائے۔ حضرت مسیح کے الفاظ میں وہ "ابن آدم کو رومی عدالت میں لے گئے"۔ وہ خود حضرت مسیح کو قتل نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ آپ پر جھوٹے الزامات لگا کر رومی حکمرانوں کے ذریعہ آپ کو ہلاک کریں۔ اس معاملہ میں ظلم اور کمینہ پن کی جتنی صورتیں ان کے بس میں تھیں وہ سب انھوں نے آخری حد تک کر ڈالیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی تدبیر سے آپ کو بچا لیا۔

بنو اسرائیل (یہود) اس وقت ایک انتہائی بے جان قوم بن چکے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم میں چند افراد سے زیادہ آپ کا ساتھ دینے والے نہ نکل سکے۔ پیغمبرانہ مشن کا ساتھ دینے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کے اندر اعلیٰ انسانیت زندہ ہو۔ وہ برتر مقصد کی خاطر جینے اور مرنے کا حوصلہ کرسکے۔ مگر مردہ قوم اس صلاحیت سے بالکل خالی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسرائیل کی بھیڑ میں سے چند افراد بھی نہیں نکلے جو حضرت مسیح کے پیغمبرانہ مشن کے حامل بن سکیں۔

انجیل بتاتی ہے کہ یہود میں سے جو لوگ حضرت مسیح کا ساتھ دینے والے نکلے ان میں سے خاص لوگوں کی تعداد بارہ تھی۔ یہودیوں کی سازش کے تحت جب رومی سپاہیوں نے آپ کو پکڑنا چاہا تو انجیل کے الفاظ میں "سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے" (متی، باب ۲۶) دوسری جگہ انجیل میں ہے "اس پر سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مگر ایک جوان اپنے ننگے بدن پر مہین چادر اوڑھے ہوئے اس کے پیچھے ہولیا۔ اسے لوگوں نے پکڑا مگر وہ چادر چھوڑ کر ننگا بھاگ گیا" (مرقس، باب ۱۴)

یہ انسان

جدید مغربی تہذیب کی بنیاد بے قید آزادی اور لذتیت پر تھی۔ اس تہذیب کے اثرات ساری دنیا میں پھیلے۔ یہاں تک کہ امیر اور غریب، جاہل اور عالم، کوئی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ یہ صورت حال آج اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے اور اس نے ساری دنیا میں انسان کو غیر انسان بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج کے آدمی کے سامنے صرف اپنی خواہش اور اپنا فائدہ ہے۔ وہ اپنی خواہش اور اپنے فائدہ کو سب سے اعلیٰ چیز سمجھتا ہے۔ وہ اس کے حصول کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔

تہذیب جدید کے ان اثرات کا سب سے بڑا حصہ ان ملکوں کو ملا ہے جن کے مجموعہ کو برصغیر ہند کہا جاتا ہے۔ اس جغرافی خطہ کا حال یہ ہے کہ آج قوم کی قوم بے حس جانوروں کے ایک جنگل میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ان ملکوں میں ایک سنجیدہ اور حساس آدمی کے لیے زندہ رہنا، حدیث کے الفاظ میں، کالقابض علی الجمر کا مصداق بن گیا ہے۔ یعنی ایسا جیسے اپنی مٹھی میں انگارہ لینا۔

آج ہم ایسے لوگوں کے درمیان ہیں جن کا حال یہ ہے کہ شر ان کی غذا ہے۔ بے انصافی کر کے ان کی روح کو لذت ملتی ہے۔ وہ ظالمانہ کارروائی کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہو کر خوشی کے قہقہے لگاتے ہیں۔ لوگ اپنی جائز کمائی کو کھا کر سیر نہیں ہوتے، وہ صرف اس وقت سیری محسوس کرتے ہیں جب کہ انھوں نے دوسروں کے اوپر ڈاکہ ڈال کر ان کے مال اور جائداد پر قبضہ کر لیا ہو۔

آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ کسی کے بارہ میں سچی بات کا اعلان کر کے ان کی زبان تر نہیں ہوتی۔ ان کی زبان کی حلاوت صرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کر رہی ہو۔ دوسروں کی حیثیت کا اعتراف کر کے ان کا سینہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ ان کے سینہ کی ٹھنڈک یہ ہے کہ وہ دوسرے کا اعتراف نہ کریں، وہ عزت والے کو بے عزت کریں اور جس کو خدا نے اونچا کیا ہو اس کو ذلیل کر کے اپنی روح کی تسکین حاصل کریں —— آج کی دنیا جھوٹ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہے، آخرت کی دنیا سچ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہوگی۔ پھر اس دن وہ لوگ کہاں کھڑے ہوں گے جو صرف جھوٹ پر کھڑا ہونے والا پاؤں اپنے پاس رکھتے تھے۔

فرق کا سبب

ستمبر ۱۹۸۶ میں سی ادل (کوریا) میں دسویں ایشیائی کھیل (10th Asian Games) ہوئے۔ اس روزہ مقابلہ میں ساؤتھ کوریا کو مجموعی طور پر سب سے زیادہ میڈل ملے۔ چند ملکوں کی تفصیل یہ ہے :

	(Gold)	(Silver)	(Bronze)	Total
China	94	82	46	222
S Korea	93	55	76	224
Japan	58	76	77	211
Iran	6	6	10	22
India	5	9	23	37
Philippines	4	5	9	18
Thailand	3	10	13	26
Pakistan	2	3	4	9

اس نقشہ کے مطابق تین قوموں (چین، کوریا، جاپان) نے ۲۷۰ سونے کے میڈل میں سے ۲۴ میڈل حاصل کیے۔ ساؤتھ کوریا کے مقابلہ میں ہندستان بہت بڑا ملک ہے، مگر اوپر کے نقشہ سے ظاہر ہے کہ ہندستان اس مقابلہ میں ساؤتھ کوریا سے بہت پیچھے رہا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۶ اکتوبر ۱۹۸۶) نے لکھا ہے کہ کوریا والوں نے اپنے کھلاڑیوں کو چننے کے لیے ایک کمپیوٹر کا استعمال کیا اور ہر کھیل کے لوگوں کی تربیت پر ایک ایک ملین ڈالر خرچ کیے۔ یہ تربیتی عمل دو سال تک جاری رہا۔ ہندستان نے اپنا روایتی طریقہ "کوشش کرو، خواہ رہ جاؤ" اختیار کیا۔ جو اس کی پرانی بیماری، علاقائیت اور اقربا نوازی سے بھی پوری طرح خالی نہ تھا :

> The Koreans used a computer to select their athletes and spent $ a million to train them for each discipline, for two years. India used familiar try-or-miss methods in which the old malady of parochialism and nepotism may not have been at a total discount.

دوسرے لفظوں میں یہ کہ کوریا والوں نے اپنے کھلاڑیوں کا انتخاب ان کے ذاتی جوہر کو دیکھ کر کیا۔ اور ہندستان میں کھلاڑیوں کا انتخاب زیادہ تر تعلقات کی بنیاد پر کیا گیا۔ کوریا نے بہت سے کھلاڑیوں کے بارہ میں ضروری معلومات کمپیوٹر کے اندر بھر دیں اور پھر کمپیوٹر نے مشینی غیر جانبداری کے ساتھ جو فیصلہ دیا اس کو مان لیا۔ اس کے برعکس ہندستان میں انتخاب کی بنیاد یہ تھی کہ یہ میرا رشتہ دار ہے، یہ میرے علاقہ کا آدمی ہے۔ جہاں طریقہ میں اس قسم کا فرق پایا جائے وہاں نتیجہ میں فرق پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

الزام کافی نہیں

الزام لگانے کا نام ملزم ہونا نہیں۔ اگر کسی شخص کے واقعۃً ملزم ہونے کے لیے یہ بات کافی ہو کہ اس کے خلاف الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ہے تو پھر دنیا کا ہر شخص ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا نظر آئے گا، حتیٰ کہ خدا کے معصوم اور بے خطا پیغمبر بھی۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر تھے۔ آپ بلاشبہ پاک اور معصوم تھے۔ مگر آپ کے زمانہ کے لوگوں نے آپ پر بدترین الزامات لگائے۔ یہ الزامات صرف یہودیوں اور منافقوں نے نہیں لگائے۔ بلکہ آپ کے مخلص ساتھیوں تک کو آپ کے کردار کے بارہ میں بے جا شبہات لاحق ہوئے۔ اس قسم کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کا تعلق حاطب بن ابی بلتعہ سے ہے۔ حاطب بن ابی بلتعہ ایک بدری صحابی تھے۔ یعنی وہ بدر کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر لڑے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی دین کے لیے سرفروشی پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ (انصاری) اور زبیر بن العوام (مہاجر) کے درمیان ایک جھگڑا ہوا۔ یہ جھگڑا کھجور کے درختوں کی آبپاشی کے بارہ میں تھا۔ مدینہ میں پانی کا ایک گڑھا تھا جس سے آبپاشی کی جاتی تھی۔ اس کے پاس دونوں صاحبان کا کھجوروں کا باغ تھا۔ ایک بار اس امر پر جھگڑا ہو گیا کہ دونوں میں سے کون پہلے پانی لے۔ اس کا مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ زبیر بن العوام پہلے اپنے باغ میں پانی لے جائیں اور اس کے بعد حاطب بن بلتعہ اپنے باغ کی سینچائی کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا تھا وہ زرعی مصلحت اور جغرافی حالات کی بنا پر کیا تھا۔ یہ محض ایک اتفاقی بات تھی کہ زبیر بن العوام مہاجر تھے اور حاطب بن ابی بلتعہ انصاری۔ اور فیصلہ میں زبیر بن العوام کو اولیت حاصل ہو گئی۔ معاملہ کا انصاری فریق اس بات کو نہ سمجھ سکا کہ آپ نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہ زرعی اور جغرافی بنیاد پر فرمایا ہے۔ اس نے معاملہ کو مہاجر اور انصاری کی اصطلاح میں سوچا اور یہ رائے قائم کر لی کہ آپ نے مہاجر کی جانب داری کرتے ہوئے اس کے حق

میں فیصلہ دے دیا ہے ۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا فیصلہ فرمایا تو اس فیصلہ کو سن کر حاطب بن ابی بلتعہ نے کہا : یارسولَ اللہ اَن کان ابن عمتک (اے خدا کے رسول کیا اسی لیے کہ وہ آپ کی پھوپھی کے لڑکے ہیں) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ انھوں نے کہا : استماقضیٰ لہ لانہ ابن عمتہ (رسول اللہ نے ان کے حق میں اس لیے فیصلہ کیا کہ وہ ان کی پھوپھی کے لڑکے ہیں) (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۱ — ۵۲۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطا تھے۔ آپ سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے یقینی ہے کہ یہ الزام بالکل غلط تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا، وہ اخلاص کے تحت کیا اور عین درست کیا۔ اس کے باوجود ایک صحابی کو آپ کے بارے میں شبہہ لاحق ہو گیا اور اس نے آپ کے اوپر جانب داری کا الزام لگا دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ الزام کے الفاظ بول دینا کسی کے ملزم ثابت ہونے کے لیے کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی بلا ثبوت کسی پر الزام لگائے اور جو لوگ محض الزام کے الفاظ سن کر متعلقہ شخص کو ملزم سمجھ لیں، وہ دونوں سخت گنہ گار ہیں۔ وہ ایسے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کی خدا کے یہاں کوئی معافی نہیں، الا یہ کہ وہ توبہ کریں اور اللہ ان کی توبہ کو قبول کرے۔

یہ واقعہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات بتاتے ہیں کہ کسی کے اوپر الزام لگانے کے معاملہ میں ہم کو آخری حد تک محتاط رہنا چاہیے۔ جب معصوم پیغمبر کے بارے میں غلط فہمی کا امکان ہے تو عام انسان کے بارہ میں بدرجۂ اولیٰ غلط فہمی کا امکان ہے۔ عین ممکن ہے کہ جس چیز کو ہم ایک شخص کی خطا سمجھ رہے ہیں، وہ اس کی خطا نہ ہو بلکہ خود سمجھنے والے کی غلط فہمی ہو۔ وہ اس کی اپنی نظر کا قصور ہو نہ کہ متعلقہ شخص کی نیت یا عمل کا قصور۔

تبلیغی تحریک (انگریزی)

"تبلیغی تحریک" اس سے پہلے اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا انگریزی اڈیشن پریس میں ہے۔ جلد ہی انشاء اللہ چھپ کر آجائے گی۔ منیجر

منافقت

منافقت اور یہودیت دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ مسلم اقوام میں جس بگاڑ کو منافقت کہا گیا ہے، قدیم امتوں کے لیے اسی بگاڑ کا نام یہودیت ہے۔ منافقت یا یہودیت یہ ہے کہ آدمی زبان سے خدا اور رسول کا اقرار کرتا ہو مگر خدا اور رسول کا عقیدہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا نہ ہو۔ وہ آسمانی تعلیمات کو ماننے کا مدعی ہو مگر اس کی زندگی اسلامی تعلیمات کی حقیقی تعمیل سے خالی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں منافق کی جو علامتیں بتائی گئی ہیں وہ سب وہی ہیں جو یہودیوں کی علامتیں بھی بتائی گئی ہیں۔ مثلاً حدیث میں منافق کی ایک علامت یہ ہے کہ جب اس کو کوئی امانت سونپی جائے تو وہ اس امانت میں خیانت کرے (اذا أؤتمن خان) ٹھیک یہی علامت یہودیت کی قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ تم کو ادا نہ کریں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ ہو جاؤ (ومنهم من ان تامنه بدينار لايؤده اليك الاّ ما دمت عليه قائماً، آل عمران ۷۵)

یہودی وہ لوگ تھے جو خدا کی پرستاری کو چھوڑ کر دنیا کے پرستار بن گیے۔ مگر اپنی اس دنیا پرستی کے ساتھ وہ ظاہری طور پر دین کا لبادہ بھی اوڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح منافقت یہ ہے کہ آدمی اندر سے دنیا دار ہو مگر ظاہری طور پر وہ دین دار کی صورت بنائے ہوئے ہو۔ یہودی حقیقۃً دین دار نہیں ہوتا مگر وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو دیندار ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح منافق بھی حقیقۃً دیندار نہیں ہوتا مگر وہ مصنوعی طور پر اپنے آپ کو دین دار ظاہر کرتا ہے۔

ایسے لوگوں کے اندر جو کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں ان میں سے ایک خاص کمزوری یہ ہے کہ وہ دنیوی اہمیت رکھنے والی چیزوں کے معاملہ میں ناقابل اعتبار ہو جاتے ہیں۔ ان سے مالی لین دین کیا جائے، کوئی جائداد ان کے انتظام میں دی جائے، کسی باعزت عہدے پر انھیں

بٹھایا جائے، غرض یہ کہ مادی قیمت رکھنے والی کوئی چیز اگر ان کے حوالے کی جائے تو وہ ان امیدوں پر پورے نہیں اترتے جو ایسی کسی چیز کی حوالگی کے بعد شرعی یا اخلاقی طور پر ان سے کی جاسکتی ہیں۔ وہ بظاہر خوبصورت باتیں کریں گے۔ مگر ان کی باتیں اخلاص کی گہرائی سے خالی ہوں گی۔ وہ نمائشی اخلاق برتیں گے مگر ان کی زندگی میں حقیقی اخلاق کا کہیں پتہ نہ ہوگا۔

مال میں خورد برد کرنا، وعدہ پورا نہ کرنا، جائداد میں ناجائز تصرف کرنا، عہدہ کو شخصی مفاد کے لیے استعمال کرنا، یہ سب امانت میں خیانت ہے۔ اور یہ تمام خیانتیں جس طرح یہودیوں میں پائی جاتی تھیں اسی طرح وہ ان تمام نام نہاد مسلمانوں میں بھی پائی جائیں گی جن کو قرآن وحدیث میں منافق کہا گیا ہے۔ یہودیت جھوٹی دین داری کا نام ہے اور اسی طرح منافقت بھی جھوٹی دین داری کا نام۔

نفاق اور منافقین کے سلسلہ میں چند حدیثیں یہ ہیں:

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اربع من کن فیہ کان منافقا خالصًا ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من نفاق حتی یدعھا۔ اذا أوتمن خان واذا حدث کذب واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر (متفق علیہ) زاد فی روایۃٍ لمسلم: وان صام وصلی وزعم انہ مسلم۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چار خصلتیں ایسی ہیں کہ جن کے اندر وہ ہوں وہ پورا منافق ہے۔ اور جس شخص کے اندر ان میں سے کوئی خصلت ہو تو اس کے اندر اسی کے بقدر نفاق ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ خصلتیں یہ ہیں: جب وہ امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے۔ اور جب بولے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وعدہ کرے تو پھر جائے۔ اور جب بحث کرے تو جھگڑنے لگے۔ ایک روایت میں مزید ہے کہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور سمجھے کہ میں مسلم ہوں۔

عن عمر بن الخطابؓ عن النبی صلی اللّٰہ

حضرت عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ

علیہ وسلم قال : انما اخاف علیٰ ھٰذہ الامۃ کل منافق یتکلم بالحکمۃ ویعمل بالجور (رواہ البیہقی)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں اس امت پر ایسے منافق سے ڈرتا ہوں جو حکمت کی باتیں کرے اور اس کا عمل ظالمانہ ہو۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصلتان لا تجتمعان فی منافق۔ حسنُ سمتٍ ولا فقہ فی الدین۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتیں کبھی منافق کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں۔ خوش خلقی اور دین کا صحیح فہم۔

قرآن میں متعدد مقامات پر نفاق اور منافق کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ منافقین وہ لوگ ہیں جن کے اندر روگ ہے :

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضاً ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون (البقرہ — ۱۰)

ان کے دلوں میں مرض ہے تو اللہ نے ان کے مرض کو بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس بنا پر کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔

حضرت عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم نے کہا کہ اس سے مراد دین کا مرض ہے نہ کہ جسم کا مرض (ھذا مرض فی الدین ولیس مرضاً فی الاجساد) اس سلسلہ میں صحابہ و تابعین سے جو تفسیریں منقول ہیں، ان میں سے ایک تفسیر میں مرض کو شک کہا گیا ہے۔ اور دوسری تفسیر میں مرض کو ریا بتایا گیا ہے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۸)

نفاق کی اصل جڑ یہی شک ہے۔ اسی سے تمام منافقانہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ منافق دکھاوے کی باتیں کرتا ہے، کیوں کہ اس بارہ میں وہ شک میں مبتلا رہتا ہے کہ خدا اس کے دل کے حال تک سے باخبر ہے۔ منافق بغض و حسد میں مبتلا ہوتا ہے، کیوں کہ اس کو یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ کسی کو ملا ہے وہ اللہ کے دیئے سے ملا ہے، منافق برے اعمال کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس یقین سے خالی ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اللہ کے یہاں پکڑا جائے گا۔ منافق جھوٹی کارروائیاں کرتا ہے، کیوں کہ خدا کے بارہ میں بے یقینی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کو ڈر نہیں ہوتا کہ ایک روز اس کے جھوٹ کا پردہ کھلے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے بے عزت ہو کر رہ جائے گا۔

ایک تقاضا

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴-۱۸۵۷) نے جدید اسلامی تعلیم کی تحریک اٹھائی۔ انھوں نے اس زور وشور کے ساتھ اس کی آواز بلند کی کہ ہر طرف اس کا چرچا شروع ہو گیا۔ اس وقت بدعت پسند طبقہ نے یہ اعتراض کیا کہ اسلامی تعلیم مسلم نوجوانوں کو پیچھے لے جائے گی۔ کیوں کہ اسلام علم کا مخالف ہے۔ اس کی مثال یہ دی گئی کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں اسکندریہ (مصر) فتح ہوا۔ اس وقت وہاں ایک بہت بڑا یونانی کتب خانہ تھا جو بطلیموس کے زمانہ سے چلا آرہا تھا۔ مگر یہ مسلمان علم کے اتنے ناقدر شناس تھے کہ انھوں نے اس کتب خانہ کو جلا کر خاک کر دیا۔ دنیا گزشتہ انسانی دماغوں کے ورثہ سے محروم ہو گئی۔

اس وقت مولانا شبلی نے اس مسئلہ کی زبردست تحقیق شروع کی اور پھر اس موضوع پر ایک محققانہ مقالہ شائع کیا۔ اس مقالہ میں انھوں نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ مذکورہ کتب خانہ اسلامی فتح سے بہت پہلے برباد ہو چکا تھا۔ حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مولانا شبلی نے تاریخی حقائق کے ذریعہ ثابت کیا کہ اسکندریہ کا کتب خانہ عیسائیوں نے اپنے زمانہ میں برباد کیا تھا۔ بعد کو چھٹی صدی ہجری کے ایک عیسائی مورخ ابو الفرج ملطی نے یہ کیا کہ عیسائیوں کو اس الزام سے بچانے کے لیے اس واقعہ کو غلط طور پر مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا۔ مولانا شبلی کی یہ بات اتنی مدلل تھی کہ بعد کو خود یورپی محققین نے اس کی تائید کی۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نے جو مہم اٹھائی وہ پوری طرح اس کے اہل (Competent) تھے۔ انھوں نے جس طرح جدید اسلامی تعلیم کا غلغلہ بلند کیا اسی طرح وقت کی طرف سے پیش آنے والے سوالات کا اعلیٰ ترین علمی اور عقلی سطح پر جواب بھی دیا۔ اس کے برعکس مثال ان لوگوں کی ہے جو موجودہ زمانہ میں "تحفظ شریعت" کی تحریک لے کر اٹھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اس عظیم تحریک کا اہل ثابت نہ کر سکے۔ انھوں نے مداخلت فی الدین کا نعرہ تو بہت لگایا مگر اس جدید ذہنی تقاضہ کو پورا نہ کر سکے کہ

اسلامی قانون کو اعلیٰ علمی سطح پر مدلل کر کے پیش کر دیں۔

۸۶ - ۱۹۸۵ ہندستانی مسلمانوں کے لیے اسلامی شریعت کا سال تھا۔ محمد احمد۔ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ محمد احمد اپنی مطلقہ بیوی کو ماہانہ ۱۸۰ روپیہ گذارہ ادا کریں۔ یہ فیصلہ اسلامی شریعت کے خلاف تھا۔ چنانچہ ہندستانی مسلمانوں کا مذہبی طبقہ اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف مداخلت فی الدین کے نعرے لگنے لگے۔ جلسہ اور جلوس کی سیاست نے اتنا ترقی کی کہ لوگوں کے خیال کے مطابق خلافت تحریک کے بعد اس قسم کی مثال نہیں دیکھی گئی۔ بالآخر ہندستانی مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مئی ۱۹۸۶ میں مطلقہ مسلم خواتین کے بارے میں ہندستانی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کر دیا۔

مگر یہ فتح اپنے ساتھ ایک عظیم شکست بھی لے آئی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی پرشور تحریک تمام تر صرف مداخلت فی الدین اور تحفظ شریعت کے نام پر چلائی۔ ان کے اصاغر و اکابر میں سے کوئی بھی شخص یہ کام نہ کر سکا کہ مضبوط دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرتا کہ اسلام کا قانون ہی درست اور مفید قانون ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو عقل پر پرکھتا ہے۔ اب چوں کہ مسلمان اعلیٰ عقلی معیار پر شرعی قانون کو مدلل نہ کر سکے اس لیے ظاہری فتح کے باوجود ایسا نہ ہو سکا کہ لوگوں کے ذہن پر اسلامی قانون کی عظمت قائم ہوتی۔

مسلمانوں کی ہنگامہ خیز تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام کا نکاح و طلاق کا قانون سارے ملک میں زیر بحث آگیا۔ ہر اخبار و رسالہ اس کے بارے میں اظہار خیال کرنے لگا۔ ہر جگہ اس پر بحث ہونے لگی۔ اب ایک طرف ہمارے علماء تھے جو اصرار کر رہے تھے کہ شریعت کے مطابق مطلقہ عورت کو نفقہ نہیں دیا جا سکتا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا جدید طبقہ اور غیر مسلم حضرات تھے جو ہندستان کے کریمنل پروسیجر کوڈ کی دفعہ ۱۲۵ کی حمایت کر رہے تھے جس کے مطابق مطلقہ عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سابقہ شوہر سے ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی حد تک گزارہ وصول کر سکتی ہے۔

اسلام کا قانون بلاشبہ انتہائی معقول اور بہتر قانون ہے۔ مگر ہمارے علماء اس کی معقولیت کو جدید دلائل کے ساتھ ثابت شدہ نہ بنا سکے۔ وہ صرف مداخلت فی الدین کے نام پر

لوگوں کی بھیڑ جمع کرتے رہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بظاہر دیکھنے والوں کو اسلام کا قانون کم تر اور جدید قانون برتر نظر آیا ۔ اسلام کا قانون، علما کی نمائندگی کے مطابق، بس یہ تھا کہ ایک مرد جب چاہے اپنی عورت کو طلاق دے کر اپنے گھر سے رخصت کر دے اور اس کے بعد اس کے اخراجات کی کوئی ذمہ داری مرد کے اوپر نہ رہے ۔ دوسری طرف جدید قانون کی تصویر ان کے سامنے یہ آئی کہ وہ طلاق کے بعد بھی عورت کو سہارا دیتا ہے ۔ وہ شوہر کی زیادتی کی تلافی اس صورت میں کرتا ہے کہ اس کو قانونی طور پر پابند کرتا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کو ماہانہ گزارہ ادا کرے ۔ ہمارے علما نے جو کچھ کیا، اپنی نیت کے اعتبار سے تحفظ شریعت کے لیے کیا، مگر عملاً وہ اسلام کو کم تر (Degrade) کرنے کے ہم معنی بن گیا ۔

اس میں یہ سبق ہے کہ آدمی کو ہمیشہ ایسے کام کو لے کر اٹھنا چاہیے جس کے لیے وہ واقعۃً اہل (Competent) ہو ۔ اگر وہ پیش نظر مہم کو سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا چپ رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اقدام کرے ۔ کیوں کہ وہ اقدام کر کے بات کو اور بگاڑ دے گا، وہ اس کو بنانے کا سبب نہیں ہو سکتا ۔

۷ امئی ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے ۔ اس دن نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک اجتماع (Dialogue) تھا ۔ اس موقع پر راجدھانی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان اور ہندو بلائے گئے ۔ پروگرام کے مطابق ایک مشہور مسلمان قائد نے مفصل تقریر کی ۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ شریعت ہم کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہے ۔ ہم کسی قیمت پر شریعت کے اندر مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ قرآن کے مطابق مطلقہ عورت کے لیے نفقہ نہیں ہے ۔ اس لیے ہم کسی مسلمان عورت کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ ملکی عدالت میں جائے اور وہاں سے ملکی قانون کے مطابق اپنے سابق شوہر سے نفقہ وصول کرنے کا حکم حاصل کرے ۔

قائد موصوف نے اس موضوع پر کافی پرجوش تقریر کی مگر وہ یہ نہ کر سکے کہ شریعت کے اصول کو عقلی طور پر اس طرح مدلل کریں کہ لوگ اس کی برتری ماننے پر مجبور ہو جائیں ۔ چنانچہ جب انھوں نے تقریر ختم کی تو ایک ہندو بزرگ نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی باتیں قبول نہیں کی جا سکتیں ۔ آپ کو اپنے قانون کی معقولیت بتانی ہوگی ۔ صرف ادعا ہرگز کافی نہیں ۔ کل

اگر آپ یہ کہیں کہ ہماری شریعت میں لکھا ہوا ہے کہ بہو پر تیل چھڑک کر اس کو جلا دو تو کیا آپ کو اپنی بہو کو جلانے دیا جائے گا۔ اور ملکی قانون اس میں مداخلت نہیں کرے گا۔

ہندو مقرر نے سب کے سامنے علی الاعلان یہ بات کہی۔ مگر قائد موصوف اس کی تردید میں کوئی مدلل بات پیش نہ کر سکے۔

ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ تعقل کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ کا انسان ہر بات کو عقل پر جانچتا ہے اور اس کو اسی وقت قبول کرتا ہے جب کہ وہ عقلی معیار پر پوری اترے۔ ایسی حالت میں اگر ہم کسی اسلامی اشو کو عوامی سطح پر اٹھائیں اور اس کے عنوان پر ہنگامہ خیز سیاست چلائیں تو ہمیں پیشگی طور پر یہ جاننا چاہیے کہ آج کل کا انسان اس کے حق میں عقلی دلیل مانگے گا۔ وہ اس کو قابل لحاظ ماننے کے لیے یہ مطالبہ کرے گا کہ اس کو معقول اور مدلل بنا کر پیش کرو۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکیں تو ہم جدید انسان کی نظر میں اسلام کو کمتر اور حقیر بنا کر رکھ دیں گے خواہ بطور خود ہم یہی سمجھتے رہیں کہ ہم نے اسلام کا جھنڈا پارلیمنٹ کی دیواروں پر گاڑ دیا ہے۔

پانی پت کے قریب ایک گاؤں میں ۲۸ دن کا ایک بچہ چرا لیا گیا اور اس کو "دیوی جی" کے نام پر قربان کر دیا گیا۔ قربانی کرنے والوں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح ان کی مراد پوری ہو جائے گی۔ (ٹائمس آف انڈیا ۹ ستمبر ۱۹۸۶) اس طرح کے واقعات اخباروں میں برابر آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح افریقہ کے بعض قبائل اپنے توہماتی عقیدہ کے تحت اپنی عورتوں کے چہرے گرم لوہے سے داغتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ساری عمر کے لیے ان کے چہرے بگڑ جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر اپنے رواجوں کو قانون کی صورت دینے کے لیے ہنگامے کریں اور ووٹ پسند حکمراں ان کے حق میں قانون بھی بنا دیں تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج کی دنیا میں ان کو باعزت مقام حاصل ہو جائے۔ اسلام کا قانون بلاشبہ معقول ترین قانون ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کی معقولیت پر پردہ پڑ گیا ہے۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ ان پردوں کو ہٹا کر اسلام کی تعلیمات کی معقولیت کو دوبارہ نمایاں کیا جائے۔ جس دن اسلام کو یہ فکری عظمت حاصل ہو گی، بقیہ تمام عظمتیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی۔

ایک سفر

ایک پروگرام کے تحت بھوپال کا سفر ہوا۔ بھوپال ہندستان کا ایک قدیم شہر ہے جو دہلی سے سات سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ موجودہ سفر کو ملا کر یہاں کے لیے اب تک میرے چار سفر ہو چکے ہیں۔ تفصیل یہ ہے:

پہلا سفر	جنوری	۱۹۸۱
دوسرا سفر	اپریل	۱۹۸۲
تیسرا سفر	نومبر	۱۹۸۳
چوتھا سفر	اپریل	۱۹۸۶

۱۸ اپریل ۱۹۸۶ کی شب کو تامل ناڈو اکسپریس کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دہلی سے بھوپال کے لیے یہ سب سے کم وقت کی ٹرین ہے۔ تاہم مشینی سواریوں سے مجھے اتنی وحشت ہوتی ہے کہ ہوائی جہاز کا سفر بھی مجھ کو دیر طلب معلوم ہوتا ہے۔ اپنے اس مزاج کی وجہ سے ریل مجھ کو لوہے اور لکڑی کا ایک دوڑتا ہوا قید خانہ نظر آتی ہے، ایک ایسا قید خانہ جس میں داخل ہونا اپنے بس میں ہو اور اس سے نکلنا صرف دوسرے کے بس میں۔

ہندستان (بمبئی) میں ریلوے کا آغاز ۱۸۵۳ میں ہوا۔ ہندستان کے ریلوے سسٹم کی مجموعی لمبائی ۴۰ ہزار میل سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ دنیا کا چوتھا سب سے بڑا انتظام ہے۔ بقیہ تین ممالک — امریکہ اور روس اور کناڈا ہیں۔ ہندستانی ریلوے میں چودہ لاکھ سے زیادہ آدمی ملازم ہیں۔ اس کے پاس تقریباً بارہ ہزار انجن اور دس ہزار ٹرینیں ہیں۔ یہ ٹرینیں روزانہ تقریباً ساٹھ لاکھ مسافر اِدھر سے اُدھر لے جاتی ہیں۔ اور روزانہ پانچ لاکھ ٹن سے زیادہ سامان ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچاتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ریلوے کی تاریخ سولھویں صدی عیسوی کے وسط تک جاتی ہے۔ اس وقت جرمنی کی بعض کوئلہ کی کانوں میں ابتدائی ریل چلائی گئی جس کو گھوڑے کھینچتے تھے اور وہ لکڑی کی پٹری پر چلتی تھی۔ اسٹیم سے چلنے والا پہلا انجن ۱۸۰۳ میں انگلینڈ میں بنایا گیا۔ تاہم ریلوے کا دور

حقیقی معنوں میں ۱۵ ستمبر ۱۸۳۰ کو شروع ہوا جب کہ لوگوں نے پہلی بار ایک باقاعدہ ٹرین کا منظر دیکھا جو لیورپول اور مانچسٹر کے درمیان سیٹی بجاتی ہوئی دوڑ رہی تھی اور اس کا انجن سامان اور مسافر کو لیے ہوئے لوہے کی پٹری پر چلا جا رہا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ریلوے میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ جاپان میں گولی ٹرین (Bullet train) ایجاد ہو چکی ہے۔ فرانس میں ایسی ٹرین بنائی گئی ہے جو ۱۷۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ اس کے پہیے ریل کی پٹری پر نہیں چلتے بلکہ ہوا کے گدے (Cushion of air) پر چلتے ہیں۔ یہ ہوائی گدا تقریباً ایک انچ موٹا ہوتا ہے۔ جو ریل کی رفتار کے دوران اس کے پہیے اور ریل کی پٹری کے درمیان بنتا ہے۔

۱۹ اپریل کی صبح کو سو کر اٹھا تو ہماری گاڑی مدھیہ پردیش کے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ جگہ جگہ درخت اور سبزہ کا منظر تھا۔ صبح کا سورج بلند ہو کر پوری فضا کو روشن کر رہا تھا۔ اس قسم کی ایک دنیا کا وجود میں آنا تمام عجائبات میں سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں پانی اور سبزہ ہو۔ جہاں سورج ایک خاص تناسب سے روشنی اور حرارت پہونچائے۔ جہاں وہ بے شمار اسباب جمع ہوں جس نے اس بات کو ممکن بنایا کہ ایک ٹرین بن کر تیار ہو اور وہ اس کی سطح پر تیز رفتاری کے ساتھ دوڑے۔

ایسی دنیا اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کا تعارف ہے۔ وہ اپنے خالق کا اعلان کر رہی ہے۔ بنانے والے نے اس دنیا کو عجیب ڈھنگ سے بنایا ہے۔ یہاں واقعہ دکھائی دیتا ہے مگر صاحب واقعہ نظر نہیں آتا۔ یہاں تخلیق کا منظر ہر طرف پھیلا ہوا ہے مگر ان کے درمیان خالق بظاہر کہیں موجود نہیں۔ اس صورت حال نے بہت سے لوگوں کو خدا کا منکر بنا دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم خدا کو دیکھتے نہیں تو ہم کیسے اسے مانیں۔ مگر خدا کے انکار کے لیے یہ بنیاد کافی نہیں۔

ہم جس ٹرین میں سفر کر رہے ہیں وہ ایک بہت بڑی ٹرین ہے۔ وہ ۱۱۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل دوڑ رہی ہے۔ ہم اس کے اندر بیٹھے ہوئے منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ بظاہر ہم ریل کے ڈرائیور کو نہیں دیکھتے۔ اس کا نام بھی ہم کو نہیں معلوم۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ گاڑی کا ایک ڈرائیور ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔

ہم کو یہ یقین کیوں ہے۔ منکر خدا کہیں گے۔ اس لیے کہ اگرچہ ہم ڈرائیور کو نہیں دیکھتے مگر ہم اس

کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ کسی بھی اسٹیشن پر اتر کر انجن کے پاس جائیں اور وہاں اس کو دیکھیں۔ لیکن یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر ہم اسٹیشن پر اتر کر انجن کے پاس جائیں اور گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھیں تو ہم کیا چیز دیکھیں گے۔ ہم صرف ہاتھ پاؤں والے ایک جسم کو دیکھیں گے۔ مگر کیا یہی دکھائی دینے والا جسم ہے جو گاڑی کو چلا رہا ہے۔ یقیناً نہیں۔ انجن کو چلانے والا دراصل ذہن ہے نہ کہ ظاہری جسم۔ چنانچہ موت کے بعد ڈرائیور کا جسم پوری طرح موجود رہتا ہے مگر وہ گاڑی کو چلا نہیں پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی وہی صورت حال ہے ـــــ ہم گاڑی کا ایک ڈرائیور مان رہے ہیں، بغیر اس کے کہ ہم نے ڈرائیور کو واقعی طور پر دیکھا ہو۔

موجودہ زمانہ کے منکرین خدا کہتے ہیں کہ یہ دنیا محض اتفاق سے بن گئی ہے۔ اس کا کوئی موجد اور خالق نہیں۔ مگر موجودہ کائنات جیسی بامعنی کائنات کا محض اتفاق سے ظہور میں آنا ممکن نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کباڑخانہ میں دھماکہ ہونے سے ایک اکسپریس ٹرین برآمد ہو جائے یا اچانک ایک ہوائی جہاز بن کر ہوا میں اڑنے لگے۔

میرے ساتھ ثانی اثنین خاں بھی بھوپال گیے تھے۔ انھوں نے اپنا ٹکٹ عین روانگی کے دن ۱۸ اپریل کو لیا۔ جب کہ میرا ٹکٹ روانگی سے دو ہفتہ پہلے لیا گیا تھا۔ بظاہر دونوں کو الگ الگ ڈبہ میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر اسٹیشن پہونچ کر رزرویشن چارٹ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کی برتھ ایک ہی بوگی کی ایک ہی کیبن میں ہے۔ بظاہر یہ خلاف امید تھا۔ یہ جو ہوا، ہماری کسی کوشش کے بغیر محض اتفاق سے ہوا۔

اس قسم کے اتفاقی واقعات ہماری دنیا میں پیش آتے رہتے ہیں۔ انھیں جزئی مثالوں کو لے کر موجودہ زمانہ کے منکرین یہ کہتے ہیں کہ یہ پورا عالم محض اتفاق سے بن گیا ہے۔ مگر یہ سراسر بے بنیاد قیاس ہے۔ اتفاق کی بنا پر کبھی ایسا تو ہو سکتا ہے کہ دو مسافر کسی ٹرین کے لیے الگ الگ رزرویشن کرائیں اور دونوں کو اتفاق کی بنا پر ایک ہی ڈبہ میں نیچے اوپر جگہ مل جائے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ ایک پوری بھری ہوئی ٹرین اور اس کا پورا انتظام محض اتفاق کے تحت وجود میں آجائے۔ پہلا واقعہ بلاشبہ ممکن ہے اور دوسرا واقعہ بلاشبہ ناممکن۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۶ کی صبح کو بھوپال پہونچا۔ یہاں میرا قیام جناب حافظ وحیدالدین صاحب کے

مکان پر تھا۔ موصوف نہایت دیندار آدمی ہیں اور قدیم مشرقی وضع کا نمونہ ہیں۔

بھوپال کی ریاست ۱۷۲۳ء میں قائم ہوئی۔ وہ حیدرآباد کے بعد ہندستان کی دوسری سب سے بڑی مسلم ریاست تھی۔ اس کے پہلے فرماں رواں سردار دوست محمد خاں (۱۷۲۰ – ۱۷۵۰ء) تھے۔ اور آخری فرماں روا نواب حمید اللہ خاں (۱۹۲۴ – ۱۹۴۹ء) تھے۔ اس دوران ریاست بھوپال سے جو واقعات وابستہ ہیں ان میں سے ایک خاص واقعہ نواب صدیق حسن خاں صاحب (۱۸۳۲ – ۱۸۹۰ء) کا ہے۔ وہ قنوج میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ معاشی مسئلہ سے مجبور ہو کر وہ نوجوانی کی عمر میں اپنے وطن سے نکلے۔ مختلف نشیب و فراز کے بعد بالآخر وہ بھوپال پہونچے۔ یہاں ۱۸۵۹ء میں تاریخ نگاری کے کام پر ان کا تقرر ہوا اور ۷۵ روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔

صدیق حسن صاحب نہایت ذہین آدمی تھے۔ اسی کے ساتھ وہ جسمانی اعتبار سے ایک پرکشش شخصیت رکھتے تھے، چنانچہ بھوپال کی خاتون نواب شاہ جہاں بیگم کو ان سے دلچسپی ہوئی۔ ابتداءً ان کو ریاست میں ایک بڑے عہدے (میر دبیری) پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ کی اجازت سے ۱۸۷۰ میں ان کا عقد والیہ ریاست کے ساتھ ہو گیا۔ ان کو امیر الملک والاجاہ کا خطاب ملا اور وہ نواب صدیق حسن خاں کہے جانے لگے۔ دھیرے دھیرے بھوپال کے ریاستی اختیارات بھی عملاً ان کے قبضہ میں آگیے۔

نواب صدیق حسن صاحب کے زمانہ میں بھوپال میں بہت سی دینی اصلاحات ہوئیں۔ ان کے لیے یہاں کام کے زبردست مواقع تھے۔ مگر موصوف کے سیاسی ذہن کی وجہ سے یہ موقع بہت زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔ ان کے سیاسی مزاج نے ان کو انگریزوں کی نظر میں معتوب بنا دیا۔ ۱۸۸۵ء میں وہ نوابی سے معزول کر دیئے گیے۔ بقیہ عمر انھوں نے خانہ قید ہو کر گزاری۔

یہاں کے ایک صنعت کار جناب سلیم شمسی صاحب نے ہم کو بھوپال کی سیر کرائی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ دوسرے اکثر بڑے شہروں کی طرح بھوپال بھی دو بھوپال کا نام ہے۔ بھوپال قدیم اور بھوپال جدید۔ قدیم بھوپال تنگ سڑکوں، گھنی آبادیوں اور گندی نالیوں کا نام ہے۔ اس کے برعکس جدید بھوپال میں کشادہ سڑکیں ہیں۔ کھلے ہوئے مکانات ہیں۔ ہر طرف صفائی ستھرائی کا ماحول ہے۔ قدیم بھوپال میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰ فی صد ہے۔ اور جدید بھوپال میں بمشکل ۵ فی صد۔ یہ واقعہ علامتی طور پر مسلمانوں

کی حالت کو بتا رہا ہے ـــــــ مسلمان ماضی کی دنیا میں " زیادہ " تھے مگر حال کی دنیا میں وہ " کم " ہو کر رہ گئے۔

بھوپال آزادی کے بعد کے ہندستان میں گم نامی کی تاریکی میں جا چکا تھا۔ اس کو دوبارہ شہرت صرف ۱۹۸۴ میں ہوئی اور وہ بھی ایک بربادی کے واقعہ کے ذریعہ۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۴ کو یہاں یونین کار بائڈ کمپنی کے پسٹی سائڈ پلانٹ میں حادثہ ہوا۔ ایک ٹینک جس میں ۴۰ ٹن مہلک گیس بھری ہوئی تھی، اس میں شگاف ہوگیا۔ گیس کہر اور دھوئیں کی شکل میں باہر آنے لگی۔ ایک گھنٹہ کے اندر اس کی چالیس ٹن گیس باہر آگئی۔ ۲۰ مربع کیلومیٹر کے رقبہ میں ہر سانس لینے والا اس سے متاثر ہوا۔ تقریباً ڈھائی ہزار (عوامی رائے کے مطابق اس سے بہت زیادہ) آدمی مر گئے۔ تقریباً تین لاکھ آدمی پر اس نے اثر ڈالا۔

اس حادثہ کی تلافی (Compensation) کا کیس امریکہ کی عدالت میں چل رہا تھا۔ ہندستان کی حکومت نے بھوپال کے شہریوں کی طرف سے مطالبہ کیا تھا کہ یونین کار بائڈ کمپنی ایک بلین ڈالر (۱۲۰۰ کروڑ روپیہ) ادا کرے۔ مگر ۱۳ مئی ۱۹۸۶ کے فیصلہ میں امریکی جج نے زرتلافی کی ادائگی سے انکار کر دیا۔

بھوپال کے کچھ لوگوں نے بتایا کہ زیادہ تر واقعات گھبراہٹ میں ہوئے۔ جب مہلک گیس فضا میں پھیلی تو لوگ گھبرا کر باہر بھاگے۔ باہر بھاگنے میں ایک تو وہ پوری طرح گیس کی زد میں آگئے۔ دوسرے دوڑنے بھاگنے کی وجہ سے ان کی سانس تیز ہوگئی اور نتیجۃً گیس زیادہ مقدار میں ان کے اندر جانے لگی۔ اس کے برعکس جو لوگ کسی وجہ سے بھاگ نہ سکے اور دروازے اور کھڑکی بند کر کے گھر کے اندر رکے رہے وہ نسبتاً گیس کے مہلک اثرات سے محفوظ رہے ـــــــ آدمی ہمیشہ " اقدام " کی بات سوچتا ہے۔ حالانکہ اکثر حالات میں اقدام یہ ہوتا ہے کہ سرے سے کوئی اقدام نہ کیا جائے۔

مسٹر جیکسن براوننگ (Jackson Browning) امریکہ کی مذکورہ یونین کار بائڈ کمپنی کے ہیلتھ ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے ایک بیان میں کہا کہ ہماری کمپنی نے اس قسم کے دو پلانٹ لگائے ہیں ایک امریکہ میں اور دوسرا ہندستان میں۔ امریکہ کے پلانٹ میں کمپیوٹر حفاظتی نظام (Computerised safety system) لگا ہوا ہے۔ یہ سسٹم نہایت حساس ہوتا ہے اور اس قسم کی کسی خرابی کو پیشگی طور پر معلوم کر کے اس کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اس قسم کا کمپیوٹر سسٹم ہندستان کے پلانٹ میں بھی لگنا چاہیے تھا۔ مگر وہ لگایا نہ جا سکا، جس کے نتیجہ میں اتنا بڑا حادثہ پیش آیا۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک ہندستان میں اس کی پشت پناہی کرنے والے نظامات کا نہ ہونا اور فالتو پرزے کی ناکافی فراہمی ہے

(ہندستان ٹائمس ۸ دسمبر ۱۹۸۴) :

He said there were insufficient back-up systems and spare parts in India.

گیس کے حادثہ کو اب دو سال بیت چکے ہیں ۔ مگر ڈاکٹروں کی ایک ریسرچ ٹیم نے اندازہ لگایا ہے کہ اب بھی بھوپال میں تقریباً ۳۰ ہزار آدمی ایسے ہیں جو زہر یلی گیس کے مابعد اثرات (After-effects) کا شکار ہیں (انڈین اکسپریس ۶ مئی ۱۹۸۶)

بھوپال میں قدیم دور کی ایک یادگار تاج المساجد ہے جو غالباً ہندستان کی سب سے بڑی مسجد ہے ۔ یہ مسجد خاتون نواب شاہ جہاں بیگم نے ۱۸۹۶ میں بنوانا شروع کیا۔ ۱۹۰۱ میں ان کے انتقال کی وجہ سے کام رک گیا ۔ اس کی بنیادی تعمیر ہو چکی تھی ۔ تاہم اس کی تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کی صاحبزادی سلطان جہاں بیگم ریاست کی تاجدار مقرر ہوئیں ۔ مگر ماں بیٹی میں اتنا زیادہ بگاڑ تھا کہ سلطان جہاں بیگم جب اقتدار میں آئیں تو انھوں نے مسجد کی مزید تعمیر کا کام روک دیا ۔ حتی کہ مجھے معلوم ہوا کہ شاہ جہاں بیگم کے زمانہ میں جو اینٹیں تیار کی گئی تھیں ان پر ان کے نام کی نسبت سے ' ش ' لکھا گیا تھا ۔ سلطان جہاں بیگم کے زمانہ میں اینٹوں پر ش کا نقطہ منصوبہ کے تحت مٹایا گیا تاکہ 'ش' کا حرف 'س' کا حرف بن جائے جو سلطان جہاں بیگم سے مشابہت رکھتا ہے (ماں اور بیٹی کے درمیان اس بگاڑ کی وجہ غالباً صدیق حسن خاں صاحب سے نکاح تھا)

اس نامکمل مسجد کو مکمل کرانے کا کام آزادی کے بعد مولانا محمد عمران خاں صاحب نے اپنی تولیت میں لیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کے مشورہ پر اس میں عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی ۔ نوابی دور میں عربی کا مدرسہ احمدیہ تھا ۔ وہ سرکاری خرچ پر چلتا تھا ۔ مسلم ریاست ختم ہونے کے بعد وہ ختم ہو گیا ۔ اس خلا کو اس مدرسہ نے پُر کیا جسے مولانا عمران خاں صاحب نے قائم کیا تھا ۔ پھر ۱۹۷۱ء میں مولانا محمد عمران خاں صاحب نے شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کے مشورہ پر تاج المساجد کی تکمیل کا آغاز کیا ۔ دار العلوم تاج المساجد کے استاد ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے بتایا کہ شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نے حکمت کی ایک بات مولانا کو یہ بتائی کہ بھوپال کے باہر سے کسی طرح کچھ پیسہ لا کر ایک بار کام شروع کر دیجئے ۔ بھوپال والے جب کام ہوتا ہوا دیکھیں گے تو پیسہ دینا شروع کر دیں گے ۔ اور عملاً ایسا ہی ہوا ۔ تاج المساجد کی تکمیل کی فنی

نگرانی مدھیہ پردیش کے مشہور آرکیٹکٹ جناب سرور قریشی صاحب نے کی اور عملی نگرانی سخت محنت و لگن سے مولانا عمران خاں صاحب کے بھائی مولانا محمد سلمان صاحب نے کی ۔

مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی (۸۵ سال) بھوپال کی خاص شخصیت ہیں ۔ اس سے پہلے وہ ندوہ (لکھنؤ) میں مہتمم تھے ۔ عجیب بات ہے کہ وہ ندوہ میں جس کمرہ میں رہا کرتے تھے ۔ اسی کمرہ میں میں بھی اپنے قیام ندوہ کے زمانہ میں مقیم رہا ۔ مولانا محمد عمران خاں سے اس سفر میں دو بار ملاقات ہوئی ۔ ایک بار موصوف کی رہائش گاہ پر اور دوسری بار اس وقت جب کہ مولانا موصوف بازدید کے لیے میری قیام گاہ پر تشریف لائے ۔ مولانا میری بعض کتابیں مثلاً "پیغمبر انقلاب" پڑھ چکے ہیں اور اس سے اتفاق فرماتے ہیں ۔

موجودہ تاج المساجد مولانا عمران خاں صاحب ہی کا کارنامہ ہے ۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں بھوپال کے تذکرہ کے ذیل میں وہاں کی سب سے نمایاں عمارت کے طور پر جو تصویر شائع کی گئی ہے وہ تاج المساجد کی تصویر ہے ۔ اس کو ہندستان کی سب سے بڑی مسجد (The largest mosque in India) بتایا گیا ہے ۔ مگر یہ تصویر اس کی جدید تکمیل سے پہلے کی ہے ۔ چنانچہ اس میں موجودہ تاج المساجد کے بلند و بالا منارے موجود نہیں ہیں ۔ میں تاج المساجد کے منتظمین سے گزارش کروں گا کہ وہ انسائیکلو پیڈیا کے اڈیٹروں کو اس کی تازہ تصویر روانہ کر دیں تاکہ وہ اگلے اڈیشن میں اس کو شائع کر سکیں ۔

بھوپال کی تاج المساجد اونچائی پر بنائی گئی ہے ۔ نیز اس کے منارے غیر معمولی طور پر بلند ہیں ۔ یہ منارے آزادی کے بعد کے دور میں بنائے گیے ہیں ۔ بھوپال میں آپ کہیں بھی کھڑے ہوں ، آپ کو سب سے زیادہ نمایاں چیز تاج المساجد دکھائی دے گی ۔ تاج المساجد کے اونچے مینار تمام دوسری عمارتوں کے اوپر اس طرح ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے بونے آدمیوں کے درمیان چھ فٹ کا لمبا آدمی نمایاں طور پر کھڑا ہوا ہو ۔

میں نے ایک تقریر میں کہا کہ یہ واقعہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے علامتی سبق ہے ۔ وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے بعض پہلوؤں سے ایسے مواقع پائے جاتے ہیں جو خود مسلم ممالک میں بھی موجود نہیں ۔ آج کسی بھی مسلم ملک میں یہ ممکن نہیں کہ وہاں غیر مذہب کے لوگ اپنا عبادت خانہ اتنا اونچا بنائیں کہ وہ تمام دوسری عمارتوں (بشمول مساجد اور سرکاری دفاتر) سے اوپر اٹھ جائے ۔ جب کہ مسلمانوں کو اس ملک میں یہ موقع پوری طرح حاصل ہے ۔

ہندستان کی آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے ملک کے دینی اور ملی اداروں کے لیے مالی تعاون کا سب سے بڑا ذریعہ دو تھا۔ ریاست حیدرآباد، اور ریاست بھوپال۔ آج دنیا بھر میں دینی اور ملی سرگرمیوں کو تعاون دینے کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب پٹرول کو بنا رکھا ہے۔ مگر اُس وقت عربوں کا یہ حال تھا کہ وہ ایک ایسی قوم تھے جن کو خود باہری امداد کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں ہندستان سے عربوں کی مدد کے لیے رقمیں بھیجی جاتی تھیں۔ ہندستان کے ایک شہر میں ایک وقف "بیت المدینہ" کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ وقف نامہ کے مطابق اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ اس کی آمدنی کو "غربار مدینہ" کی بہبود پر صرف کیا جائے۔ مگر آج کا حیدرآباد اور بھوپال اس سے مختلف ہے۔

بھوپال کے آخری فرماں روا نواب حمید اللہ خاں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو قاضی ریاست کی حیثیت سے بھوپال بلایا تھا۔ سید صاحب زیادہ عرصہ تک بھوپال نہ رہ سکے۔ تاہم ان کے مختصر زمانہ قیام میں بعض ضروری کام ہوئے۔ ان کے مشورہ پر مولانا محمد عمران خاں صاحب نے یہاں ایک عربی مدرسہ قائم کیا جو کہ ندوہ کی شاخ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ بھوپال میں دوسرا عربی مدرسہ جامعہ اسلامیہ (ترجمہ والی مسجد) کے نام سے مشہور ہے جو دارالعلوم دیوبند کے انداز پر چلایا جا رہا ہے۔

آزادی کے بعد جب بھوپال کی ریاست ختم ہوئی تو نواب حمید اللہ خاں صاحب نے نئی سرکار سے جو معاہدہ کیا اس میں ایک اہم بات یہ بھی شامل تھی کہ جن مساجد کے ائمہ و موذنین کی تنخواہ ریاست کے ذمہ تھی اس کی ذمہ داری نئی سرکار لے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اب ریاست بھوپال کی تقریباً تین سو مساجد کے ائمہ و موذنین کی تنخواہ سرکاری گرانٹ سے دی جاتی ہے۔ اس میں دارالقضاء و دارالافتاء کا خرچ شامل ہے۔ ہر امام کی تنخواہ تین سو روپے موذن کی ڈھائی سو اور قاضی کی دس سو روپیے۔ موجودہ قاضی جناب مولانا وجدی الحسینی صاحب ہیں، اور مفتی شہر مولانا عبد العلی صاحب ہیں۔ سرکار ایک کمیٹی تشکیل دیتی ہے جو یہ سارا انتظام کرتی ہے، اسے مساجد کمیٹی کہتے ہیں۔ اس کے موجودہ سکریٹری جناب عبد الکریم صاحب اور چیرمین جناب ملک حبیب صاحب ہیں۔ یہی مساجد کمیٹی ایک اسکول بھی چلاتی ہے۔ عربی بول چال کی ایک کلاس جس میں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی تعلیم دیتے ہیں اس کا خرچ بھی اسی کمیٹی کے تحت ہے۔ اس وقت مساجد کمیٹی کو جو گرانٹ دی جاتی ہے اس کی مقدار چودہ لاکھ روپے ہے، پہلے صرف تین لاکھ تھی۔ یہ اضافہ سابق چیف منسٹر شری ارجن سنگھ کے زمانہ میں ہوا۔ معلوم ہوا کہ گرانٹ میں اضافہ

ہونے کے بعد بعض لوگوں نے صرف اس بات پر جھگڑنا شروع کر دیا کہ اس اضافہ کا سہرا کس کے سر بندھے۔ کئی لوگ اسے اپنی کوششوں کا نتیجہ قرار دینے لگے۔ اس کی وجہ سے یہاں کافی تلخ ماحول پیدا ہوگیا۔ خود چیف منسٹر صاحب بھی بددل ہوگیے۔ وہ چاہتے تھے کہ گرانٹ کی اس رقم میں مزید اضافہ کرائیں مگر جب انھوں نے مذکورہ حالات دیکھے تو اس کے بعد وہ خاموش ہوگیے (اس گرانٹ کا تعلق مرکزی حکومت سے ہے۔ ریاستی چیف منسٹر اس میں درمیانی رول ادا کرتے ہیں)

بھوپال میں تین دن کے دوران ۱۲ تقریریں ہوئیں۔ ہر تقریر میں توقع سے بہت زیادہ لوگ آئے۔ اور غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو صاحبان بھی اکثر اجتماعات میں شریک ہوئے۔

ایک ہندو بھائی سے ایک اجتماع کے بعد میں نے ان کا تاثر پوچھا۔ انھوں نے کہا: لوگ گنگا جل میں نہا کر پوتر ہوتے ہیں، آپ نے ہم کو اپنے شبدوں سے پوتر کر دیا۔ ایک ہندو بھائی نے ایک تقریر سننے کے بعد غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: اب تو ڈکشنری کے الفاظ ختم ہوگیے۔

ایک ہندو بھائی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ وحدت وجود (Monism) کا عقیدہ صحیح نہیں۔ اس عقیدہ کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ انسان خدا کا انش ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم خدا کا حصہ نہیں ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔ اکثر اس عقیدہ کو بتانے کے لیے سمندر اور قطرہ کی مثال دی جاتی ہے۔ سمندر اور قطرہ دونوں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان میں جو فرق ہے وہ کمیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کیفیت کے اعتبار سے۔ مگر یہ ناقابل تصور ہے کہ خدا اور انسان دونوں ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان خود کیفیت کے اعتبار سے فرق ہے نہ کہ محض کمیت کے اعتبار سے۔

ایک اجتماع خاص طور پر شرعی قوانین کے مسئلہ پر ہوا۔ اس کا انتظام جناب خلیل اللہ خاں صاحب ایڈوکیٹ نے کیا تھا۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع ہوئے اور میری مفصل تقریر کو نہایت دل چسپی کے ساتھ آخر تک سنا۔

بھوپال کے تمام پروگرام غیر معمولی طور پر کامیاب رہے۔ ہر پروگرام میں شہر کا انتہائی تعلیم یافتہ طبقہ کثرت سے شریک ہوا جو اب تک کسی دینی اجتماع میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس غیر معمولی کامیابی کا خاص سبب الرسالہ کی اشاعت ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی اور ان کے ساتھیوں نے پچھلے دو سال میں الرسالہ کو شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ میں پہونچانے کی زبردست جدوجہد کی ہے۔ یہی کام ہر مقام پر ہمارے

ساتھیوں کو کرنا چاہیے ۔

بھوپال سے واپسی کے بعد خطوط کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس تین روزہ قیام میں بعض حضرات قریب سے میرا ذاتی مطالعہ کرتے رہے ۔ ایک خط میں کہا گیا ہے "...... صاحب اب مزید آپ سے قریب ہوگیے ہیں ۔ یہاں انھوں نے آپ کی ہر ہر بات ، حتیٰ کہ نشست و برخواست اور کھانے پینے تک کا بغور معائنہ کیا ۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ایک کھنکھناتا ہوا سکہ ہیں " بھوپال کی تقریروں کے کیسٹ موجود ہیں ۔ یہاں کے پروگرام بہت متنوع قسم کے تھے ۔ ذیل میں پروگرام کا خاکہ دیا جاتا ہے ۔

تاریخ	مقام	سامعین	موضوع
۱۹ اپریل ۱۹۸۶	رہائش گاہ پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ	وکیل صاحبان ، اکثریت غیر مسلم	توحید
	صدر منزل	تعلیم یافتہ مسلم و غیر مسلم صاحبان	قرآن ایک عالمی پیغام
	رہائش گاہ ڈاکٹر عارفہ سیمیں	کالج کے اساتذہ اور پرنسپل	نوجوانوں کے مسائل
۲۰ اپریل	مسجد ٹی ٹی نگر	تعلیم یافتہ طبقہ	درس حدیث
	پترکار بھون	پریس کانفرنس	اسلامی مرکز کا تعارف
	مدھیہ پردیش دینی تعلیمی کانفرنس	سنجیدہ اور تعلیم یافتہ اصحاب	تعمیر ملت
	انٹرنیشنل فرینڈس کلب	نوجوان طبقہ	نوجوانوں کے فرائض
	مسجد ندسیہ بیگم	قارئین الرسالہ	الرسالہ کا پیغام
	موتی مسجد	ایجوکیشنل سوسائٹی	تعمیر ملت
	گلشن محی الدین ریت گھاٹ	نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ	شریعت کا دائمی پہلو
۲۱ اپریل	رہائش گاہ سلیم شمسی صاحب	تعلیم یافتہ اصحاب	احیاء اسلام
	مدینہ ہوٹل	مسلم اور غیر مسلم نوجوان	اسلام کا تعارف
	دین دیال وچار پرکاشن	جنتا پارٹی کے کارکن اور ذمہ دار	اسلام کیا ہے
	رہائش گاہ عفران اعظم	اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ، مسلم و غیر مسلم	بھارت کی تعمیر

بھوپال کے اجتماع کی خبر سن کر اطراف کے علاقوں کے بھی کچھ لوگ بھوپال آگیے تھے۔ ایک قریبی شہر سے آنے والے ایک نوجوان نے بتایا کہ وہ اردو الرسالہ کے علاوہ ۲۰ عدد انگریزی الرسالہ ہر ماہ منگاتے ہیں اور اس کو غیر مسلموں میں پھیلاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ " پہلے صرف مسلمان الرسالہ کا انتظار کرتے تھے۔ اب غیر مسلم بھی الرسالہ کا انتظار کرتے ہیں " الرسالہ انگریزی کے ایک غیر مسلم قاری کا تاثر انھوں نے ان الفاظ میں نقل کیا : یہ بہت اچھا پرچہ ہے عقل و فطرت کے خلاف کوئی بات نہیں " ایک صاحب نے کہا کہ مسلمانوں کے دوسرے پرچے ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے صرف ان کے مخصوص حلقہ کو دل چسپی ہو سکتی ہے۔ الرسالہ واحد پرچہ ہے جو ہر ایک کی دل چسپی کا ہوتا ہے۔ الرسالہ کو کسی بھی شخص کے ہاتھ میں اطمینان کے ساتھ دیا جا سکتا ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۸۶ کو پترکار بھون میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات کے نمائندے بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس پریس کانفرنس کو یو این آئی اور پی ٹی آئی دونوں نے کور کیا تھا۔ اس لیے اس کی رپورٹ بھوپال اور بھوپال کے باہر کے اکثر اخبارات میں شائع ہوئی۔ دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اپریل ۱۹۸۶) میں جو رپورٹ شائع ہوئی تھی اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

Bhopal, April 20 (UNI): The Muslim Women (Divorce) Bill introduced in the Lok Sabha does not contravene the Shariat says a well-known Islamic theologian. Maulana Waheeduddin Khan head of New Delhi based Islamic centre told newsmen here today that Islam held women in high esteem and provisions in the Shariat clearly define the status of Muslim women. The protection provided to Muslim women would be further strengthened by the Bill when it becomes law, he added Referring to the Shahbano case, the Maulana said it was more a social than a legal problem. He said that the maintenance provided by the Supreme Court to Shahbano would not be sufficient. If the issue had been decided through arbitration, Shahbano would have had a better deal, he said. The Maulana said former Chief Justice Chandrachud had misquoted from the Hadees in the Supreme Court decision. 'The reference to women as the rib of man has been misquoted by the learned judge.' "The comparison has been done to point out to Muslims that a woman was like a rib which would break if straightened out. Thus a woman should be respected and loved as you love your body.", the Maulana explained claiming that it was not a reference derogatory to the fair sex. The Maulana said it was wrong to say that the Shariat or the Muslim personal law was not codified.

The Times of India, 21 April 1986

۲۱ اپریل ۱۹۸۶ کو ایک عیسائی مسٹر جارج (M.O George) کی رہائش گاہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ موصوف یہاں بنک منیجر ہیں۔ مکان نہایت صاف ستھرا تھا۔ ہر چیز میں صفائی اور قرینہ جھلک رہا تھا ایک دیوار پر ایک چوکھٹے میں فریم کی ہوئی تصویر نظر آئی۔ دیکھا تو وہ حضرت مسیح کی تصویر تھی۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا :

Christ is the head of this house, the unseen guest, at every **meal**, the silent listener to every conversation.

مسیح اس گھر کے سردار ہیں۔ ہر کھانے کے ساتھ نہ دکھائی دینے والے مہمان، ہر گفتگو کو خاموشی کے ساتھ سننے والے ـــــ یہ مسیح کے بارہ میں عیسائی حضرات کا عقیدہ ہے۔ انھوں نے اپنے پیغمبر کے لیے خدائی اوصاف فرض کر رکھے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمان بھی اس معاملہ میں ان سے پیچھے نہیں۔ انھوں نے بھی اپنے پیغمبر کے لیے ایسے عقیدے بنا لیے ہیں جس کے بعد خدا اور بندہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

بھوپال کی ملاقاتوں میں سے ایک خاص ملاقات حضرت پیر سعید میاں صاحب مجددی کی تھی۔ آپ خانقاہ مجددیہ کے سجادہ نشین ہیں۔ یہ خانقاہ حضرت شاہ پیر ابو احمد صاحب (۱۳۴۲ - ۱۲۶۰ھ) کے زمانہ سے قائم ہے اور مسلسل عوام و خواص کا مرجع بنی رہی ہے۔

حضرت پیر سعید میاں صاحب قبلہ نے بہت سی قابل قدر دینی باتیں بتائیں۔ آپ نے بتایا کہ ایک بار حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ لاہور میں مقیم تھے۔ آپ نے پیغام بھیج کر مولانا علی میاں صاحب اور مولانا منظور نعمانی صاحب کو لاہور بلوایا۔ دونوں حضرات گیے اور حضرت رائے پوری کے ساتھ ٹھہرے۔

ایک بار قیام گاہ پر شہر کے کافی لوگ جمع تھے۔ لوگ چاروں طرف منتظر بیٹھے ہوئے تھے مگر حضرت رائے پوری بالکل خاموش تھے۔ مولانا علی میاں نے چاہا کہ کسی طرح سکوت ٹوٹے اور حضرت رائے پوری کچھ فرمائیں جس سے حاضرین مستفید ہوں۔ چنانچہ مولانا علی میاں نے حضرت رائے پوری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ حضرت قرآن میں صبر کا بار بار ذکر ہے اور اس کی بہت تعریف آئی ہے۔ کچھ اس کے بارہ میں ارشاد فرمائیں۔ حضرت رائے پوری دو منٹ خاموش رہے۔ پھر کہا کہ آپ ہی فرما دیجئے۔ مولانا علی میاں نے کہا کہ حضرت ہم کو صبر کا اتنا ہی مطلب معلوم ہے جو لغت کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ اس پر

حضرت رائے پوری دوبارہ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا : ہم کو تو اتنا بھی نہیں معلوم۔

مجھے کھانے پینے کی دھوم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حتی کہ پر تکلف دسترخوان پر جہاں اکثر لوگ معمول سے زیادہ کھاتے ہیں، میں معمول سے کم کھانے کی وجہ سے اکثر بھوکا رہ جاتا ہوں۔ بیرون ملک کی ایک بین اقوامی کانفرنس میں اسی "کم خوری" کی وجہ سے مجھے قبض ہو گیا۔ میں طبی کمرہ میں گیا اور کہا کہ مجھے قبض کی کوئی دوا دیدیجئے۔ بڑے کمرہ میں کافی دوائیں بھری ہوئی تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کافی تلاش کے باوجود قبض کی دوا نہ پاسکے۔ میں نے کہا کہ آپ کے یہاں تو دواؤں کا زبردست اسٹاک ہے۔ پھر آپ کے پاس قبض کی دوا کیوں نہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا " ہمارے پاس تو زیادہ تر دست کے کیس آرہے ہیں "

بھوپال میں مختلف لوگوں نے اپنے مکانات پر کھانے کا انتظام کیا۔ اور اس میں معززین شہر کو مدعو کیا۔ مثلاً سلیم شمسی صاحب، ڈاکٹر عارفہ سیمیں صاحبہ، ڈاکٹر حمید اللہ ندوی وغیرہ۔ ان مواقع پر شہر کا خواص کا طبقہ اکٹھا ہو گیا۔ مثلاً مقامی ایم ایل اے، اخبارات کے ذمہ دار، ڈاکٹر، وکلار اور اساتذہ صاحبان۔ جناب غفران اعظم ایم پی کے والد جناب محمد اعظم صاحب نے بھی اپنے یہاں کھانے کی ایک مجلس رکھی۔ محمد اعظم صاحب شروع سے الرسالہ کو پسند فرماتے رہے ہیں اور مقامی طور پر الرسالہ کی تحریک سے وابستہ ہیں۔

ان مجالس میں اعیان شہر سے ملاقات کے مواقع ملے جو کسی اور صورت میں یکجائی طور پر کم ہی ملتے ہیں۔ جناب نور محمد صاحب (ٹی ٹی نگر) کے یہاں کھانے پر محکمۂ تعلیمات کے ڈپٹی ڈائرکٹر سے ملاقات ہوئی اور تبادلۂ خیال ہوا۔

بھوپال میں ڈاکٹر حمید قریشی (سابق منسٹر) سے ملاقات ہوئی۔ ہندستان کی جدید سیاسی تاریخ سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مہاتما گاندھی کی کیا خصوصیت تھی کہ وہ ملک کی سیاست پر چھا گیے انھوں نے کہا کہ ٹالرینس (برداشت)۔ انھوں نے بتایا کہ شملہ کانفرنس میں ایک بار گاندھی اور جناح دونوں وائسرائے سے بات چیت کر کے باہر نکلے تو گاندھی جی نے جناح صاحب سے کہا کہ آئیے۔ ہم دونوں ایک ساتھ چلیں۔ مگر جناح صاحب نے گاندھی جی کی گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ جناح صاحب، اگر آپ میری گاڑی میں نہیں بیٹھتے تو میں ہی آپ کی گاڑی میں بیٹھتا ہوں

اور پھر وہ جناح صاحب کے ساتھ بیٹھ کر واپس آ گیے۔

میں نے ڈاکٹر حمید قریشی سے کہا کہ گاندھی جی کے بارہ میں دو انتہائی مختلف قسم کی رائیں ہیں۔ کچھ لوگ ان کو نہایت مخلص سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ ان کو سیاسی اداکار کہتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید قریشی نے میرا سوال سن کر ایک لمحہ سوچا اور اس کے بعد کہا: گاندھی جی اگر اداکار تھے تو ان سے بڑھ کر دنیا نے کوئی دوسرا اداکار پیدا نہیں کیا۔

بھوپال کی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات جناب پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ کی تھی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے ایک بڑا عجیب واقعہ بتایا۔

مسٹر گپتا نے کہا کہ اندرا گاندھی کے قتل سے کچھ پہلے بھوپال کے وکیلوں کا ایک وفد ان سے دہلی میں ملا تھا۔ اس وفد میں میں بھی شریک تھا۔ اس وقت اتفاق سے میرے ہاتھ میں قرآن کا ایک نسخہ تھا۔ مسز اندرا گاندھی جب باہر آئیں تو وفد سے ملتے ہوئے وہ میرے پاس کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن۔ اس کے بعد انھوں نے فوراً قرآن پر گفتگو شروع کر دی۔ مقررہ وقت کا تقریباً پورا حصہ انھوں نے میرے ہی پاس کھڑے کھڑے گزارا اور پورے وقت میں وہ صرف قرآن پر گفتگو کرتی رہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں قرآن کو پڑھنا چاہتی ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ میں تقابل بھی کرنا چاہتی ہوں۔ یعنی میں جاننا چاہتی ہوں کہ قرآن میں کیا ہے اور دوسری مذہبی کتابوں میں کیا۔ انھوں نے بار بار مجھ سے کہا کہ کیا اس سلسلہ میں آپ میری مدد کریں گے۔

مسٹر پریم نارائن گپتا سے یہ بات سن کر مجھے زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ مسز اندرا گاندھی کے طویل زمانۂ حکومت میں بے شمار مسلمان قائدین ان سے ملے۔ جن میں باریش قائدین بھی تھے اور بے ریش قائدین بھی۔ مگر یہ سارے مسلم قائدین سابق وزیر اعظم کے سامنے صرف اپنی "قومی کتاب" پیش کرتے رہے۔ انھوں نے ان کے سامنے کبھی خدا کی کتاب پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ان قائدین میں سے ہر شخص مسز اندرا گاندھی سے صرف اس لیے ملا کہ وہ ان کے سامنے مسلمانوں کی شکایات پیش کرے۔ وہ ان کے سامنے مسلمانوں کے معاشی اور سیاسی مطالبات رکھے۔ وہ مسلمانوں کے مادی مفادات کا میمورنڈم ان کے حوالے کرے۔ مسلم قائدین میں سے کوئی ایک بھی قائد نہیں جس نے ایسا

کیا ہو کہ وہ اپنی رات کی تنہائیوں میں نمازیں پڑھ کر مسز اندرا گاندھی کی ہدایت کے لیے دعا کرے۔ صبح کو اٹھ کر وہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجہ پڑھے اور رو رو کر اللہ سے مدد کی درخواست کرے۔ اس کے بعد وہ قرآن کا ترجمہ لے کر مسز اندرا گاندھی کے یہاں جائے اور درد و سوز کے انداز میں ان سے گفتگو کر کے انھیں خدا کی کتاب پیش کرے۔ مسلمان قائدین نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مسز اندرا گاندھی اس دنیا سے چلی گئیں۔

مسلم قائدین کی اس کوتاہی کو صرف کوتاہی یا غلطی کہنا مسئلہ کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور جدید میں ان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جس میں ہمارے تمام اصاغر اور اکابر یکساں طور پر شریک ہیں۔

۲۲ اپریل ۱۹۸۶ کو انڈین ایرلائنز (IC 460) کے ذریعہ بھوپال سے دہلی واپسی ہوئی۔ جہاز کے اندر اعلان کے دوران کہا گیا:

Captain Javed is in command

(کپتان جاوید اس جہاز کے پائلٹ ہیں) دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس جہاز کے ذریعہ میں بھوپال سے دہلی آیا اس کے اڑانے والے ایک مسلمان تھے۔ اس طرح کے واقعات آج ہندستان کے ہر شعبہ میں موجود ہیں اور لوگوں کے علم میں آتے ہیں مگر کوئی نہیں جو ان کو قابل ذکر سمجھتا ہو۔ مسلمانوں کے تمام لکھنے والے اور تمام بولنے والے صرف اس "جاوید" سے واقف ہیں جو کسی وجہ سے سرکاری سروس میں پہونچنے میں ناکام ہو گیا ہو۔ وہ اس "جاوید" سے واقف نہیں جو اعلیٰ سرکاری سروس میں ہے اور اس کو وہی تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی دوسرے ہندستانی شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

اجتماع کے بعد بھوپال سے کچھ خطوط ملے ہیں۔ ان میں سے ایک خط کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

" آپ کے پروگرام میں جو ویشیشتا پائی وہ اسلام بنام پرم پرا، یا دھرم بنام پرم پرا واد نہیں ہے۔ آج کا انسان سائنٹفک دور سے گزر رہا ہے جس میں پرم پرا واد دم توڑ چکا ہے۔ دھرم کے پرانے ٹھیکیدار مُردے گھوڑے کو کوڑے مار مار کر کب تک زندہ رکھ سکیں گے، اس پر نظریں اٹھنے لگیں تھیں۔ ایشور کی کرپا سے دھارمک جگت میں ایک ستارہ نظر آیا ہے اور وہ ستارہ آپ ہیں جس کی وجہ سے جو ویکوم پیدا ہو چلا تھا اس بھونچال کے لاوے میں دب گیا ہے۔ آج کی زندگی کا ہر پہلو پیاسا ہے اور وہ پیاس تب

تک نہیں بھی جب تک اسے حقیقت کے پیالے سے نہ ملایا جائے۔ یہ آپ کی اپروچ کا مشن ہے۔ آپ کے لٹریچر یا بھاشن میں کیول اسلام ہی نہیں سب مذہبوں کی روحیں زندہ رہیں۔ ایسا سندیش ملتا ہے جب روحیں زندہ ہو جائیں گی تب پنڈت واد ختم ہو جائے گا۔ اور جب پنڈت واد ختم ہو جائے گا تب دھرم واد کے کھلے درشن ہو جائیں گے۔

شری برج کشور ایڈوکیٹ ہندو پریشد کے سکریٹری نے فرمایا کہ ہم انگور کھاتے ہیں گریپس کہنے والوں سے لڑ بیٹھتے ہیں۔ حضرت مولانا نے اپنے بھاشن میں ہماری آنکھیں بند کروا کر منہ میں دانا رکھ دیا اور فرمایا منہ بند کیجئے ہم نے منہ بند کیا تو وہی انگور کا رس، مٹھاس ٹھنڈک سب موجود تھے۔ مولانا صاحب نے کہا یہ وہی گریپس ہیں۔ جس کو آپ کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے تھے"

پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ، بھوپال

بھوپال سے واپسی کے بعد "برطانیہ میں اسلام" کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں پہلی بار یہ خبر پڑھی کہ برطانیہ کی سب سے قدیم مسجد جو ووکنگ میں ہے، وہ بھوپال کی خاتون نواب سلطان جہاں بیگم کی طرف سے ۱۸۹۰ میں تعمیر کرائی گئی تھی ——————

بھوپال ہندستان کی نسبتاً ایک چھوٹی ریاست تھی۔ مگر اس کے حکمرانوں کی عالی ہمتی نے ان سے بڑے بڑے کام لے لیے۔ اس دنیا میں بڑے کام اکثر بڑے دل والے لوگ کرتے ہیں نہ کہ بڑے وسائل والے لوگ۔

قیمت میں اضافہ

سابقہ اعلان کے مطابق الرسالہ اردو اور انگریزی کی قیمت میں جنوری ۱۹۸۷ سے اضافہ کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ سے الرسالہ کی قیمتیں حسب ذیل ہوں گی۔

فی شمارہ	چار روپیہ
سالانہ	۴۸ روپیہ

اسی نسبت سے ایجنسی کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

توحید اور شرک

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک خدا کی سطح پر جینے والا۔ دوسرا غیر خدا کی سطح پر جینے والا۔ پہلا انسان مذہب توحید پر ہے اور دوسرا انسان مذہب شرک پر۔ پہلے انسان کا نام موحد ہے اور دوسرے انسان کا نام مشرک۔

یہ فرق اس اعتبار سے پیدا ہوتا ہے کہ کون آدمی کس کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ کون آدمی کس کی عظمتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہے۔ کون آدمی کس چیز کو اپنی زندگی میں آخری درجہ دیے ہوئے ہے۔ اسی نفسیاتی حالت کو مذہب کی اصطلاح میں عقیدہ کہا جاتا ہے۔ یہی عقیدہ کا فرق ایک انسان کو دوسرے انسان سے الگ کر دیتا ہے۔ ایک قسم کے عقیدہ والا خدا پرست بن جاتا ہے اور دوسرے قسم کے عقیدہ والا غیر خدا پرست۔

جو انسان خدا کے عقیدہ پر ہو وہ خدا کی بڑائیوں میں جینے والا انسان ہوتا ہے۔ [illegible] محبتیں اور اس کے اندیشے خدا سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کی یادوں میں خدا [illegible] ہوتا ہے۔ وہ خدا کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ وہ خدا کے کان سے سنتا ہے۔ [illegible] ہے۔ اس کے تمام اقوال اور افعال پر خدا کا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ [illegible] خدا کے لیے چھوڑتا ہے۔ وہ جس چیز کو اختیار کرتا ہے خدا کے لیے [illegible] اعتبار سے [illegible] جینے والا انسان بن جاتا ہے۔

جو انسان شرک کے عقیدہ پر ہو اس کا معاملہ اس کے برعکس [illegible] ذہن میں دوسری چیزوں کی عظمتیں سمائی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ دوسری چیزیں [illegible] اور بے جان ہوں، خواہ وہ [illegible] ہوں، خواہ وہ قوم [illegible] اس کی اپنی ذات یا اس کے بیوی بچے ہوں۔ ایسے انسان کا ذہن ہمیشہ انھیں [illegible] چیزوں پر چلتا ہے۔ وہ انھیں کی یادوں میں تڑپتا ہے۔ اس کے توجہات اور اہم [illegible] چیزوں کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کا غم اور اس کی خوشی سب انھیں چیزوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ یہی چیزیں اس کی زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۲۴

۱۔ الرسالہ کی ڈاک میں خدا کے فضل سے تقریباً روزانہ ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں، یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ میں نے فلاں موقع پر اتفاقاً الرسالہ دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ میرے نام الرسالہ جاری کر دیا جائے۔ اس سے الرسالہ کی فکری تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں اسی قسم کا ایک خط (۵ ستمبر ۱۹۸۶) یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> I happened to go through your esteemed magazine AL-RISALA (English) at Shri Aziz Ahmad Siddiqi Advocate's office. I appreciate the idea being presented through the magazine. The vision presented is multi-dimention and would enlighten the society. Kindly make arrangement to send and English copy of 'Al-Risala' at the below mentioned address.
>
> Robert Anthony, Advocate, 38 Ladies Hospital, Bhopal

۲۔ حیدر آباد سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں چند اجتماعات میں اسلامی مرکز کی مطبوعات کا بک اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے لوگوں نے کافی دلچسپی لی اور کتابیں حاصل کیں۔ ان لوگوں نے ٹیلی فون سروس بھی قائم کی ہے۔ یعنی کتابوں کا طالب ٹیلی فون پر آرڈر دے کر کتابیں منگالے۔ یہ اسکیم بھی کامیاب ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے بڑے شہروں میں بھی اس طریقہ کو اختیار کیا جائے۔

۳۔ ۴ اگست سے ۱۴ اگست تک سری نگر میں کتابوں کی آل انڈیا نمائش تھی۔ اس موقع پر اسلامی مرکز کی کتابوں کا اسٹال بھی رکھا گیا۔ خدا کے فضل سے غیر معمولی کامیابی رہی۔ اسلامی مرکز کے اسٹال پر شروع سے آخر تک سب سے زیادہ مجمع رہا۔ کتابوں کا جو اسٹاک رکھا گیا تھا وہ سب ختم ہو گیا اور مانگ برابر جاری رہی۔

۴۔ حج کمیٹی بمبئی کی طرف سے حج پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی جا رہی ہے جس کا نام ہوگا "آخری جہاز"۔ اس سلسلے میں اس کے ذمہ داران مختلف حلقہ کی نمایاں شخصیتوں سے انٹرویو لے رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۶ کو اس کی پارٹی مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو حج اور قربانی کے موضوع پر ریکارڈ کیا۔

۵۔ افریقہ کی ایک عالمی اسلامی کانفرنس (۱۵ ستمبر — ۲۰ ستمبر ۱۹۸۶) کی دعوت پر صدر

اسلامی مرکز نے کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ اور مفصل روداد سفر آئندہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔ انشاء اللہ

۶۔ پاکستان کے ایک ادارہ نے اسلامی مرکز کی بیس کتابیں شائع کی ہیں۔ انھوں نے اطلاع دی ہے کہ جو شخص ایک کتاب پڑھ لیتا ہے وہ پوراسٹ حاصل کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ادارہ جلد ہی اسلامی مرکز کی تمام کتابیں شائع کرنا چاہتا ہے، اس کا پتہ یہ ہے:

فضلی سنز لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی (پاکستان)

۷۔ یہ الرسالہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ اس نے الرسالہ کو لوگوں کے لیے اکتشافِ حق کا ذریعہ بنایا۔ اس کا اندازہ روزانہ خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک صاحب جو سعودی عرب میں رہتے ہیں، اپنے خط مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۸۶ میں لکھتے ہیں: آپ کی کتاب "حل یہاں ہے" پڑھا اور آپ کے دو کیسٹ سنے۔ جزاکم اللہ میں چالیس برس سے حل کی تلاش میں تھا۔ آپ نے حل کر دیا۔ کیسٹ سن کر آنکھیں بھی کھل گئیں اور دل کے دروازے بھی۔

۸۔ اسلامی مرکز کا پیغام الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کے علاوہ بالواسطہ انداز میں بھی مختلف طریقوں سے پھیل رہا ہے۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر متعدد جرائد برابر الرسالہ کے مضامین شائع کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور کا ماہنامہ "اشراق" اپنی ہر اشاعت میں الرسالہ کے ایک یا ایک سے زیادہ مضامین شائع کر رہا ہے۔ وغیرہ

۹۔ جکارتہ (انڈونیشیا) میں اگست [illegible] میں اسلامی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ اس موقع پر منتظمین کی طرف سے جو [illegible] نمائش کے لیے رکھی گئیں ان میں اسلامی مرکز کی عربی اور انگریزی اور [illegible] مات بھی شامل تھیں۔

۱۰۔ اس وقت اسلامی [illegible] اسکیم کے تحت کئی کتابیں زیر طبع ہیں (۱) تذکیر القرآن جلد دوم، سورہ الکہف تا سورہ الناس (۲) خاتونِ اسلام، خواتین کے مسئلہ پر اسلامی تعلیمات کی مدلل وضاحت۔ (۳) رازحیات، تعمیری مضامین کا مجموعہ۔ (۴) مذہب اور جدید چیلنج کا انگریزی ترجمہ مع اضافہ۔ (۵) انسان اپنے آپ کو پہچان اور حقیقت کی تلاش کا ہندی ترجمہ۔ وغیرہ

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ اردو یا انگریزی کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی [illegible] دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ مثلاً تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک [illegible] تمام پرچوں کی مجموعی قیمت کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ [illegible]

۵۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	۲۰۰ [illegible]

[illegible]

ہوائی ڈاک	[illegible]
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے [illegible] چھپوا کر دفتر الرسالہ [illegible] دہلی سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76

الرسالہ

GIFTING The Word of God

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Please tick box where applicable

- ☐ URDU
- ☐ ENGLISH
- ☐ ONE YEAR
- ☐ TWO YEARS

SUBSCRIPTION RATES:
(Prices include postage)

INLAND	Rs. 36
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

Rs. 2.00

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

انسان کی سب سے اعلیٰ صفت بہادری ہے
اور اس کی سب سے بری صفت کمینہ پن

شمارہ ۱۲۱

دسمبر ۱۹۸۶

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۱ دسمبر ۱۹۸۶

فہرست

ناشکری نہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
(دنیا کے معاملہ میں) اس کو دیکھو جو تمہارے نیچے ہے ، اس کو نہ دیکھو جو تمہارے اوپر ہے ۔ اس طرح تم اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھوگے :

عن أبي هريرة قال : قال رسول الله ﷺ : « أنظروا إلى من هو أسفل منكم و لا تنظروا إلى من هو فوقكم ، فإنه أجدر أن لا تزدروا نعمة الله عليكم » (رواه الترمذي) ۔

دنیا کی چیزوں کی تقسیم میں یکسانیت نہیں ۔ یہاں کسی کو کم ملا ہے اور کسی کو زیادہ ۔ کسی کو ایک چیز دی گئی ہے اور کسی کو دوسری چیز ۔ اس صورت حال نے دنیوی معاملات میں ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان فرق کر دیا ہے ۔ اب اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرے جو بظاہر اس کو اپنے سے کم نظر آتا ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا ۔ اس کے برعکس اگر آدمی اپنا مقابلہ اس شخص سے کرنے لگے جو بظاہر اس کو اپنے سے زیادہ دکھائی دیتا ہے تو اس کے اندر ناشکری کا احساس ابھرے گا ۔

اس نفسیاتی خرابی سے بچنے کا آسان حل یہ بتایا گیا ہے کہ ہر آدمی اس کو دیکھے جو اس کے نیچے ہے ، وہ اس کو نہ دیکھے جو اس کے اوپر ہے ۔

شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے ۔ میں نے کچھ لوگوں کو جوتا پہنے ہوئے دیکھا ۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھو ، خدا نے ان کو جوتا دیا اور مجھے بغیر جوتے کے رکھا ۔ وہ اسی خیال میں تھے کہ ان کی نظر ایک شخص پر پڑی جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا تھا ۔ یہ دیکھ کر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انھیں اس سے بہتر بنایا اور ان کو دو تندرست پاؤں عطا کیے —— اللہ تعالیٰ کو اپنے ہر بندہ سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس کا شکر گزار رہے ۔ مگر موجودہ دنیا میں شکر گزار وہی شخص رہ سکتا ہے جو اس اعتبار سے اپنا نگراں بن گیا ہو ۔

جوشِ عمل

دور اول کے مسلمانوں میں اسلام کے لیے جو جوش عمل تھا، وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کے لیے اسلام ایک دریافت تھا، اسلام کی صورت میں انھوں نے ایک نئی حقیقت پائی تھی۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے اسلام محض ایک تقلیدی عقیدہ ہے۔ وہ انھیں وراثتی طور پر مل گیا ہے، نہ کہ اس کو انھوں نے ایک نئی اور برتر حقیقت کے طور پر دریافت کیا ہے۔

ایک نئی چیز کا پانا آدمی کے لیے سب سے زیادہ اہم واقعہ ہوتا ہے۔ وہ آدمی کی فکر و عمل کی صلاحیتوں کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔ جو آدمی اپنی زندگی میں کوئی نئی چیز نہ پائے، اس کی مثال سوئے ہوئے آدمی کی سی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی زندگی میں کوئی نئی چیز پا جائے وہ گویا وہ آدمی ہے جو نیند سے جاگ اٹھا۔ وہ بے حرکت کی حالت سے حرکت کی حالت میں آگیا۔

موجودہ زمانہ میں نفسیات کے میدان میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان سے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ ان تحقیقات میں سے ایک تحقیق اس موضوع پر تھی کہ وہ کیا چیز ہے جو کسی آدمی کو عام لوگوں سے زیادہ عمل کرنے پر اکساتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں اس موضوع کی تفصیلات دیتے ہوئے بتایا گیا ہے:

psychological experiments in the fields of motivation and learning have disclosed in the power of novelty as an inducement to action.
(III/227)

حرکت اور علم کے میدان میں نفسیاتی تجربات سے ظاہر ہوا ہے کہ نیاپن اپنے اندر عمل پر ابھارنے کی طاقت رکھتا ہے ـــــــ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں زندہ ایمان پیدا کرنے کی ایک ہی تدبیر ہے۔ یہ کہ ان کے ایمان کو دوبارہ ان کے لیے دریافت کے ہم معنی بنا دیا جائے۔

کتنا مشکل کتنا آسان

ایک صاحب ملے۔ ان کے پاس یونیورسٹی کی ایک بڑی ڈگری ہے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے کہا کہ "مولانا صاحب، آپ انگریزی رسالہ نکالتے ہیں۔ مگر آپ کے رسالہ کی انگریزی غلط ہوتی ہے۔" میں نے کہا کہ آپ زبان کی غلطی کی کوئی مثال دیجیے۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت الرسالہ ماہ نومبر ۱۹۸۶ تھا۔ اس شمارہ کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر ایک مضمون انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے۔ (یہ مضمون الرسالہ اردو اور انگریزی دونوں میں موجود ہے) یہ انگریزی مضمون حسب ذیل ہے:

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul. That being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a gift of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

مذکورہ بزرگ نے اس عبارت کی چوتھی سطر میں لفظ sent پر نشان لگاتے ہوئے کہا کہ دیکھیے یہ غلط ہے۔ انھوں نے کہا کہ "یہاں if you send ہونا چاہیے نہ کہ if you sent جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔" مگر جو لوگ انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ اعتراض درست نہیں۔

میں نے جواب دیا کہ معاف کیجیے، آپ نے یہ بات محض جوش اعتراض میں فرمائی ہے نہ کہ برنبائے واقفیت آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اپنے اس اعتراض کی تحقیق کے لیے گرامر کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ آپ ہرگز ایسا نہ فرماتے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پرنسپل کلاز میں چوں کہ لفظ would (سکنڈ فارم) استعمال ہوا ہے، اس بنا پر سب آرڈینیٹ کلاز میں بھی sent (سکنڈ فارم) استعمال کیا جائے گا۔ یہی انگریزی گرامر کا اصول ہے:

The form 'sent' is gramatically necessitated by the use of the word 'would' in the principal clause of the sentence. The other possible alternative would be 'could send' but not 'send.'

میرے اس جواب کے بعد مذکورہ بزرگ چپ ہو گیے۔ تاہم انھوں نے زبان سے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ تم غلطی پر ہو کہنا کتنا زیادہ آسان ہے اور میں غلطی پر ہوں کہنا کتنا زیادہ مشکل۔

خدا، رسالت، آخرت

موجودہ دنیا مادی دنیا ہے۔ مگر یہاں مادی واقعات کی صورت میں معنوی حقیقتوں کی تمثیلات قائم کردی گئی ہیں۔ آدمی اگر سنجیدہ ہو اور وہ چیزوں کو غور وفکر کے ساتھ دیکھے تو وہ یہاں ہر قسم کے اطمینان بخش دلائل پالے گا۔ وہ معتقدات کے حق میں یقینیات کی زمین حاصل کرے گا۔

خدا کی تمثیل

خدا کی تمثیل خود انسان کا اپنا وجود ہے۔ انسان کا وجود خدا کے وجود کی دلیل ہے۔ "خدا" کیا ہے۔ ایک زندہ ہستی جو خود اپنی ذات میں قائم ہو۔ جو سوچے۔ جو دیکھے اور سنے۔ جو اپنے ارادہ کے تحت عمل کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ جو خود اپنے آپ کو جانتا ہو اور دوسروں سے بخوبی طور پر واقف ہو۔ جو تمام موجودات سے الگ اپنی ایک "انا" رکھتا ہو۔

یہ سب کچھ عین وہی ہے جس کو "انسان" کی صورت میں ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے۔ ہر آدمی "میں" سے بخوبی طور پر واقف ہے۔ خدا پر ایمان اسی "میں" کی ایک برتر صورت پر یقین رکھنا ہے۔ انسان جن صفات اور خصوصیات کے ساتھ اپنی ذات کا تجربہ کر رہا ہے، انھیں صفات اور خصوصیات والی ایک اور برتر ذات ہے جس کو ہم خدا یا اللہ کہتے ہیں۔

اگر میرا وجود یقینی ہے تو خدا کا وجود کیوں یقینی نہیں۔ اگر میں ایک مقام پر بیٹھ کر کائنات کو دیکھ رہا ہوں تو اس میں کیا تعجب ہے اگر اسی طرح ایک عظیم تر ہستی کہیں متمکن ہو کر کائنات کا مشاہدہ کر رہی ہو۔ اگر میں ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعہ خلا میں ایک مشین کو چلاتا ہوں تو اس میں کیا تعجب ہے اگر اسی طرح ایک خدا اپنے نظام کے تحت کائنات کو چلا رہا ہو۔ اگر میں اپنے تصور عدل کے مطابق کسی کو سزا یا انعام دیتا ہوں تو اس میں استبعاد کیا ہے اگر اسی طرح ایک طاقتور خدا تمام انسانوں پر اپنے تصور عدل کے مطابق سزا اور جزا کا نفاذ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسان کے وجود کو تسلیم کرنا۔ خدا کو ماننا بلاشبہہ عجیب ہے۔ مگر انسان کو ماننا بھی اتنا ہی عجیب ہے۔ پھر ایک عجیب کو مان لینے کے بعد دوسرے عجیب کو ماننے میں کیا رکاوٹ۔

پیغمبر کی تمثیل

"ہم لندن سے بول رہے ہیں، اب آپ آج کی تازہ خبریں سنیے"۔ یہ الفاظ ایک شخص ہم سے دور لندن میں بیٹھ کر بولتا ہے۔ ہم اس کو براہِ راست نہیں سن پاتے۔ لیکن جب ہم اپنا ریڈیو سٹ چلاتے ہیں تو ہم فوراً اس آواز کو سننے لگتے ہیں۔

دور کا ایک ریڈیو اسٹیشن ہماری قابل فہم زبان میں ہمارے لیے پروگرام نشر کرتا ہے، ہم اس کو براہِ راست اپنے کان سے نہیں سن پاتے۔ لیکن جب ہم ریڈیو سٹ کا سہارا لیتے ہیں تو ہزاروں میل دور سے نشر ہونے والا پروگرام ہم کو اس طرح سنائی دینے لگتا ہے جیسے کہ ہمارے اور نشرگاہ کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو گیا ہو اور ہم براہِ راست اس کو سننے لگے ہوں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ بلاتشبیہ پیغمبر کا بھی ہے۔ پیغمبر گویا ہمارے لیے ایک قسم کا ریڈیو سٹ ہے۔ وہ ہمارے اور خدائی نشرگاہ کے درمیان یقینی واسطہ کا کام کرتا ہے۔ جس طرح عام ریڈیو یا ٹرانسسٹر یہ کرتا ہے کہ نشرگاہ کی خبریں اور پروگرام وصول کر کے دوبارہ ہمیں سناتا ہے۔ اسی طرح خدا پیغمبر کو یہ طاقت دے دیتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آنے والی آوازوں کو اخذ کر سکے۔ پیغمبر خدا کی خصوصی توفیق سے ان کو نہایت صحت کے ساتھ اخذ کرتا ہے اور پھر کسی حذف و اضافہ کے بغیر ان کو ہمیں سنا دیتا ہے۔

پیغمبر انسان اور خدا کے درمیان ایک زندہ ریڈیو سٹ ہے۔ اگر پیغمبر نہ ہو تو ہم خدا کی آوازوں کو نہ سن سکیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے مشینی ریڈیو سٹ کے بغیر کوئی شخص دور کی نشرگاہوں سے نشر ہونے والے پروگرام کو نہیں سن پاتا۔ لوگ دنیوی نشرگاہوں کی نشریات کو سننا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ریڈیو اور ٹرانسسٹر کو بے حد عزیز رکھتے ہیں۔ آج ساری دنیا میں کوئی بھی گھر اس سے خالی نہیں۔ اسی طرح اگر آدمی کو خدائی نشریات کی اہمیت معلوم ہو جائے تو وہ پیغمبر کو دل و جان سے چاہنے لگے۔ وہ ان باتوں کو انتہائی توجہ اور اہتمام کے ساتھ سنے جو پیغمبر نے بتائی ہیں۔

پیغمبر کے معاملہ کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ریڈیو کے معاملہ کو سمجھنا۔ پیغمبر اسی قسم کے ایک کام کو الہامی طور پر کر رہا ہے جس کو عام ریڈیو سٹ مشینی طور پر انجام دیتا ہے۔

عالمِ آخرت کی تمثیل

ایک کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ بول رہے ہیں اور سن رہے ہیں۔ وہ اپنے سامنے

ایک پوری دنیا کو دیکھ رہے ہیں۔ مگر یہ وہی دنیا ہے جو محسوس طور پر نظر آتی ہے۔ بظاہر محسوس دنیا کے سوا کوئی اور دنیا نہیں جو وہاں اپنا وجود رکھتی ہو۔

اتنے میں ایک شخص سامنے رکھے ہوئے ٹیلی وژن سٹ کو چلا دیتا ہے۔ اچانک اس کے شیشہ پر ایک اور دنیا دکھائی دینے لگتی ہے جو ابھی تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چلتے پھرتے انسان ان کی آوازیں، ان کے مکانات، ان کی کارگزاری سب آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

آخرت کا نظریہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیا کے پرے ایک اور دنیا ہے۔ یہ دوسری دنیا اسی طرح ایک مکمل دنیا ہے جس طرح ہماری موجودہ نظر آنے والی دنیا۔ ٹیلی وژن گویا اس نظریہ کی عملی تصدیق ہے۔ ٹیلی وژن کا تجربہ بتاتا ہے کہ کس طرح موجودہ محسوس دنیا کے اندر ایک اور دنیا موجود ہو سکتی ہے۔ ٹیلی وژن کی دنیا ہمارے گردوپیش پوری طرح موجود ہوتی ہے، مگر وہ صرف اس وقت ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے جب کہ ٹیلی وژن سٹ کو چلا جائے۔ اسی طرح آخرت کی دنیا پوری طرح یہاں موجود ہے۔ البتہ وہ ہمارے مشاہدہ میں اس وقت آئے گی جب کہ خدا اس کے ظہور کا حکم دیدے۔

سائنس میں اکثر کسی چیز کو "ماڈل" سے سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ دنیا گویا ایک قسم کا مادی ماڈل ہے جس کے ذریعہ ہم غیر مادی حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہماری دنیا ایک اعتبار سے بالاتر حقیقتوں کا آئینہ ہے، آدمی اگر سنجیدہ طور پر سوچے تو وہ اس کے اندر اپنے تمام سوالات کا جواب پالے گا۔

خدا اور وحی اور آخرت غیب کی چیزیں ہیں۔ انسان اپنی موجودہ نگاہ سے ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ مگر دنیا میں بہت سی چیزیں، بلکہ تمام اعلیٰ حقیقتیں وہ ہیں جو آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں۔ آدمی قرائن کی بنیاد پر ان کو مانتا ہے۔ یہی معاملہ خدا اور وحی اور آخرت کا بھی ہے۔ یہ چیزیں بلاشبہ موجودہ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر ایسے واضح قرائن موجود ہیں جو ہم کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ چیزیں حقیقی ہیں اور یقینی طور پر وہ اپنا وجود رکھتی ہیں۔

آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ سوچے تو وہ ان کو مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دو قسم کے انسان

والتین والزیتون ۔ وطور سینین ۔ وھذا البلد الامین ۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۔ ثم رددناہ اسفل سافلین ۔ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت فلھم اجر غیر ممنون ۔ فما یکذبک بعد بالدین ۔ الیس اللہ باحکم الحاکمین ۔ (التین)

قسم ہے تین اور زیتون کی ۔ اور طور سینا کی ۔ اور اس امن والے شہر کی ۔ یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو سب سے اچھی ساخت پر ۔ پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو سب سے نچلی پستی میں ۔ مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں تو ان کے لیے ثواب ہے بے انتہا ۔ پھر کیا چیز تجھ کو روز جزا کے جھٹلانے پر آمادہ کر رہی ہے ۔ کیا خدا سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ۔

تین اور زیتون سے مراد فلسطین کی دو پہاڑیاں ہیں جن کے قریب بیت المقدس واقع ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش اور بعثت ہوئی ۔ طور ، صحرائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے خطاب فرمایا ۔ بلد امین (مکہ) وہ شہر ہے جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنائے گیے ۔ بائبل میں ہے : خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر چمکا ۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا (استثنا ۳۳ : ۱-۲) یہود کی نظر میں سب سے زیادہ عظمت حضرت موسیٰ کی تھی اور عیسائیوں کی نظر میں حضرت مسیح کی ۔ اس لیے پیغمبر آخرالزماں کے ساتھ ان دونوں مسلّمہ شخصیتوں کی مثال دے کر بتایا کہ خدا کی طرف سے ان داعیوں کا آنا کس طرح ایک عظیم حقیقت کو آشکارا کرنے کا سبب بنا ۔ وہ یہ کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک احسن تقویم کے مقام پر ہے اور دوسرا اسفل سافلین کے مقام پر ۔ اور جب انسانوں میں اس قسم کا فرق پایا جائے تو ان کا انجام ایک کیسے ہو سکتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر دنیا کی زندگی میں خدا کی عدالت ہے ۔ وہ اسی لیے آتا ہے کہ دو قسم کے انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دے ۔ ایک وہ انسان ہے جو حق کے آگے جھک جاتا ہے ۔ دوسرا وہ ہے جو حق کے آگے سرکشی دکھاتا ہے ۔ ایک دوزخ میں جی رہا ہے ، دوسرا جنت میں سانس لے رہا ہے ۔ پیغمبر اس لیے آتا ہے

کہ دونوں قسم کے انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ دودھ بلویا جاتا ہے تو مکھن الگ ہو جاتا ہے اور چھاچھ الگ۔ اسی طرح پیغمبر کی دعوت کا اٹھنا ایک قسم کا بلونے کا عمل ہے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں قسم کے انسان ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔

کسی آبادی میں جب اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارنے کے لیے اٹھتا ہے تو عملاً یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہیں اور کچھ اس کے منکر بن جاتے ہیں۔ یہ گویا انسانیت کی تقسیم ہے جو اللہ کے نمائندے کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ وہ شخص جو اپنی فطرت کو زندہ کیے ہوئے تھا اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ سچائی کی آواز کو اس طرح پہچان لیتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کی آواز کو۔

خدا نے اس کو انسان کی زبان سے پکارا تو اس نے اپنے رب کی آواز کو پہچان لیا اور اس کی طرف دوڑ پڑا۔ حق کی دعوت جب اس کے ذہن سے ٹکرائی تو اس کے اندر اعتراف، تواضع، تقویٰ اور حق شناسی ابھرا۔ اس نے اپنی زندگی کو پوری طرح اللہ کے راستہ پر ڈال دیا۔ دنیوی مفاد، عزت کا سوال، مصلحتوں کے اندیشے، کوئی بھی چیز اس کے لیے اپنے رب کا راستہ اختیار کرنے میں رکاوٹ نہیں بنے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جنھوں نے خدا کی دی ہوئی آنکھ اور کان کو اس طرح بگاڑ رکھا تھا کہ خدا کی آواز انتہائی عیاں ہونے کے باوجود، ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ وقتی مفادات، عوامی دباؤ اور شخصی مصالح کو انھوں نے وہ اہمیت دی جو صرف حق کو دی جانی چاہیے۔ انھوں نے دنیا کے تقاضوں کو ترجیح دی اور آخرت کے تقاضوں کو ٹھکرا دیا۔ وہ اپنی ذات میں گم رہے اور خدا کی طرف نہیں لپکے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اِذَا قَرَأَ اَحَدُکُمْ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ فَاَتٰی عَلٰی آخِرِھَا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ فَلْیَقُلْ بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ۔ جب تم میں سے کوئی شخص سورہ والتین والزیتون پڑھے اور اس کے آخر تک پہونچے تو اس کو چاہیے کہ وہ کہے کہ ہاں، اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا: سُبْحَانَکَ فَبَلٰی۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ ایک شخص جب اس کو پڑھے تو اس کے پڑھنے سے اس کی نفسیات میں ہلچل پیدا ہو۔ وہ قرآن کے مضامین کے مطابق ہر موقع پر مناسب جواب پیش کرتا چلا جائے۔

دلیل یا دھاندلی

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر ہمیشہ بیّنہ (دلیل) پر کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ان کے مخالفین کا سارا سرمایہ اندھی مخالفت اور دھاندلی ہوتا تھا۔ پیغمبر کی بات حقائق کی بنیاد پر ہوتی تھی اور ان کے مخالفین کی بات محض نفسانی سرکشی کی بنیاد پر۔

یہی موجودہ دنیا میں اہل حق اور اہل باطل کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ پیغمبر خدائی سچائی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی ہر بات مبنی برحقیقت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کے اتارے ہوئے علم کی بنیاد پر کہتا ہے۔ اس لیے وہ جو کچھ کہتا ہے، پوری کائنات اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس کے برعکس اس کے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں محض اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت کہتے ہیں، اس لیے ان کی بات کو علم وعقل کی تصدیق حاصل نہیں ہوتی۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہاں کوئی شخص سچ بولے تو اس کو بھی الفاظ مل جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص جھوٹ بولے تو وہ بھی اپنی بات کے لیے الفاظ پالیتا ہے۔ لغت اور گرامر اِس کا بھی ساتھ دیتے ہیں اور اُس کا بھی۔

مگر یہ آزادی صرف موجودہ دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں یہ آزادی آدمی سے چھن جائے گی۔ آخرت میں وہ اس سے عاجز ہوگا کہ وہ جھوٹ بولنے کے لیے الفاظ پا سکے۔ وہ دھاندلی کو بھی ایک صحیح رویہ بتائے اور ظالمانہ کارروائی کو بھی انصاف کہہ سکے۔

آج کی دنیا جھوٹ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہے۔ آخرت کی دنیا سچ پر کھڑے ہونے والوں کی دنیا ہوگی۔

آج کی دنیا میں لوگوں کو جھوٹ کی قیمت مل رہی ہے۔ فریب اور سازش کی بنیاد پر وہ مقام حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب سراسر وقتی ہے۔ موت آتے ہی یہ تمام بنیادیں بالکل باطل ثابت ہوں گی۔ موت کے بعد آدمی جب اگلی دنیا میں داخل ہوگا تو اچانک وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکل چکی ہوگی جس پر وہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ابدی طور پر بے جگہ ہو جائے گا اور اسی کے ساتھ ابدی طور پر برباد بھی۔

اسلام کی آفاقیت

اسلام جب شروع ہوا اس وقت عرب کے شہر یثرب (مدینہ) میں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک اوس اور دوسرے خزرج۔ یہ دونوں قبیلے ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ مگر جب ان پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین توحید کی حقیقت کھل اور وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے تو ان کی آپس کی لڑائیاں ختم ہوگئیں۔ دو دشمن گروہ ایک دوسرے کے دوست گروہ بن گیے۔ اپنے اپنے ذاتی مفاد کے لیے آپس لڑنے والے لوگ متحد ہوکر بلند تر انسانی مفاد کے مجاہد بن گیے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے دونوں قبیلے صرف اپنی اپنی بڑائی کو جانتے تھے۔ اوس کا قبیلہ خزرج پر بڑا بننے کی کوشش کرتا اور خزرج کا قبیلہ اوس کے اوپر بڑا بننا چاہتا۔ اس طرح دو بڑائیاں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی تھیں اور ان میں کبھی موافقت اور ہم آہنگی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ مگر جب انھوں نے اسلام کے ذریعہ ایک خدا کی بڑائی کو دریافت کیا تو ان کی اپنی الگ الگ بڑائیاں ختم ہوگئیں اور صرف ایک سب سے اونچی بڑائی باقی رہی۔ پہلے دونوں قبیلے غیر مشترک بڑائیوں میں جی رہے تھے، اب دونوں ایک ہی مشترک بڑائی میں جینے لگے۔ یعنی خدا کی بڑائی، جس سے بڑا اور کوئی نہیں۔

یہ ہے سب سے بڑی آفاقیت جو اسلام انسان کو عطا کرتا ہے۔ اسلام انسان کو توحید کا عقیدہ دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ خدا ایک ہے۔ وہی سب کا خالق ہے۔ وہی سب کا مالک ہے۔ وہی سارے عالم کا نظام چلا رہا ہے۔ خدا ہی کے دیئے سے آدمی کو ملتا ہے۔ خدا نہ دے تو کوئی شخص کچھ بھی نہیں پا سکتا۔ یہ توحید اسلامی آفاقیت کی بنیاد ہے۔

جب آدمی اس کامل توحید کو اختیار کرتا ہے تو اس کی نظر میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہو جاتی ہے۔ بقیہ تمام چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہو جاتی ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو طرح طرح کے اونچ نیچ ہیں وہ اس کو مصنوعی نظر آنے لگتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو مختلف قسم کی دیواریں اٹھا دی گئی ہیں وہ سب ڈھ جاتی ہیں۔ ذات اور رنگ اور نسل اور جغرافیہ اور اس قسم کی دوسری بنیادوں پر ایک انسان اور دوسرے انسان میں جو فرق کیا گیا ہے وہ سب مٹ جاتا ہے۔ ہر انسان بندہ بن جاتا ہے اور ایک خدا سب کا معبود۔

توحید کا عقیدہ آدمی کے اندر یہی عالمی ذہن پیدا کرتا ہے۔ جس خدا کی طرف ایک انسان

دوڑتا ہے اسی خدا کی طرف تمام انسان دوڑنے لگتے ہیں۔ جس خدا کے سامنے ایک انسان اپنی بڑائی کو چھوڑتا ہے۔ اسی کے سامنے تمام انسان اپنی بڑائی کو چھوڑنے والے بن جاتے ہیں۔ توحید کے بغیر ہر انسان کی توجہ کا مرکز الگ ہوتا ہے۔ توحید کے تحت ہر آدمی کی توجہ کا مرکز ایک ہوجاتا ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی آفاقیت ہے، اس سے بڑی آفاقیت اس دنیا میں نہیں ہوسکتی۔

عرب قوم ہزاروں سال سے عرب کے جغرافیہ میں آباد تھی۔ مگر تاریخ میں اس کا کوئی کارنامہ لکھا نہ جاسکا۔ اسلام سے پہلے عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ شاعری کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑجاتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ان کے درمیان ایک لڑائی چھڑتی تو وہ نسل در نسل سیکڑوں سال تک جاری رہتی۔

مگر یہی عرب تھے کہ جب اسلام کے زیر اثر ان کے اندر فکری انقلاب آیا تو انھوں نے ایک عالمی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے محدود جغرافیہ سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گئے۔ جو لوگ اس سے پہلے ناقابل ذکر سمجھے جاتے تھے انھوں نے تمام قابل ذکر علوم میں اپنے وقت کی سب سے بڑی ترقیاں کیں۔ عربی زبان جو اس سے پہلے صرف ایک مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی وہ ایک بین اقوامی زبان بن گئی۔

اس کی وجہ اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت تھی۔ اسلام نے ان کے بند ذہن کو کھول دیا۔ وہ نیچر کو پوجتے تھے، اسلام نے بتایا کہ نیچر تو مخلوق ہے اور بے بس ہے۔ پوجنے کے قابل تو صرف خدا کی ذات ہے جو تمہارا اور تمام دنیا کا مالک ہے۔ اس سے ان کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ نیچر جھکنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس کی تحقیق اور تسخیر کی جائے۔ وہ انسان کو عرب اور عجم، کالے اور گورے، آزاد اور غلام، اونچی نسل اور نیچی نسل میں بانٹے ہوئے تھے۔ اسلام نے ان پر کھولا کہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں، ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے ان کے اندر وہ عالمی اور آفاقی ذہن پیدا ہوا جس نے پوری دنیا کو اپنا وطن اور ساری انسانیت کو اپنا کنبہ سمجھ لیا۔ اسلام سے پہلے وہ دنیا سے الگ تھلگ ہو رہے تھے۔ اسلام کے بعد وہ ساری دنیا کے شریک اور ساتھی بن گئے۔

اسلام سے پہلے عرب کے لوگ قبائلی دور میں جی رہے تھے، اسلام کی بنیاد پر جب فکری انقلاب آیا تو اس نے ان کو ایک بین اقوامی گروہ بنا دیا۔ اس سے پہلے ان کی نظر چھوٹے چھوٹے مقاصد تک محدود تھی، اسلام کے بعد ان کی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ وہ خشکی اور تری کو

پار کرکے ساری دنیا تک وسیع ہو گئی ۔ اس کے بعد کوئی پہاڑ نہ رہا جو ان کی نظر کو روکے اور کوئی سمندر نہ رہا جو ان کے سفر میں حائل ہو ۔

اسلام نے عربوں کے اندر جب آفاقیت پیدا کی تو ان کا یہ حال ہوا کہ قبیلہ کی سرداری پر فخر کرنے والے لوگ عالم کے امام بن گیے ۔ ان کے اندر ابن سینا اور الرازی جیسے ماہرین طب پیدا ہوئے جن کی طبی کتابوں کے یورپ کی زبان (لاتینی) میں ترجمے ہوئے اور یورپ کے میڈیکل کالجوں میں وہ بطور نصاب داخل کی گئیں ۔ ان میں الادریسی جیسا جغرافیہ داں پیدا ہوا جس نے سسلی کے بادشاہ راجر دوم کے لیے سب سے پہلا دنیا کا نقشہ بنایا ۔ ان میں ایسے ماہرین صنعت پیدا ہوئے کہ انگلینڈ کے بادشاہ اوفا رکس نے اپنے یہاں سونے کا سکہ ڈھلنے کے لیے بغداد سے سکہ گر بلائے ۔

انھوں نے فن جہازرانی میں اتنی ترقی کی کہ ان کے یہاں احمد بن ماجد جیسا شخص پیدا ہوا جس نے واسکوڈی گاما کی بحری رہنمائی کی جو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرنے کے لیے نکلا تھا ۔ ان کے یہاں ابوعبیدہ مسلم البلنسی جیسے زمینی علوم کے ماہر پیدا ہوئے جن کی تحقیقات کو پڑھ کر کولمبس کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ یہاں کچھ اور بھی دنیائیں ہیں جن کو دریافت کرنا چاہیے ۔ چنانچہ اسی شعور اور حوصلہ کے تحت وہ یورپ کے ساحل سے روانہ ہوا اور آخر کار نئی دنیا (امریکہ) کو دریافت کیا ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک کائناتی دین اور ایک آفاقی نظریہ ہے اور اسلام کی بنیاد پر بننے والی تاریخ اس کی تائید کرتی ہے ۔ اسلام کی آفاقیت صرف نظریاتی چیز نہیں ، وہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے ۔

اسلام کے آفاقی اصولوں کا بہت اچھا اظہار اس واقعہ میں ہے جس کا تعلق ربعی بن عامرؓ اور رستم (ایرانی سردار) سے ہے ۔ عرب جب قدیم ایران میں داخل ہوئے اور ایرانیوں کو ہر جگہ ان کے مقابلہ میں شکست کھانی پڑی ، تو رستم نے ربعی بن عامر کو اپنے دربار میں بلایا ۔ رستم اس وقت ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا ۔ رستم اپنے شاندار دربار میں سونے اور جواہرات کا تاج پہنے ہوئے عالی شان تخت پر بیٹھا ہوا تھا ۔ اور ربعی بن عامرؓ بالکل معمولی کپڑے اور معمولی حالت میں تھے ۔ رستم نے پوچھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ۔ ربعی بن عامرؓ نے جواب دیا :

الله ابتعثنا والله جاء بنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة الله ومن ضیق الدنیا الی سعتها ومن جَور الادیان الیٰ عدلِ الاسلام۔

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے اور اللہ ہم کو یہاں لے آیا ہے تاکہ جس کے بارہ میں وہ چاہے اس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کو اس کی وسعت میں پہونچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دے کر اس کو اسلام کے عدل وانصاف میں لے آئیں۔

ربعی بن عامرؓ نے اپنے اس قول میں نہایت مختصر طور پر مگر نہایت فصاحت کے ساتھ اسلام کے آفاقی اصولوں کو بیان کر دیا ہے۔

اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر جب ایک شخص کے اندر فکری انقلاب آتا ہے تو وہ مخلوقات سے گزر کر خالق کو پالیتا ہے۔ وہ کائنات کے مالک کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے جو تمام تنگیوں اور محدودیتوں سے بلند ہے۔ اس سے پہلے وہ بندوں کی سطح پر جی رہا تھا، اب وہ خدا کی سطح پر جینے لگتا ہے جو تمام آفاق سے اوپر ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ ایک خول کے اندر تھا تو اب وہ خول کے باہر کی وسیع دنیا میں اپنے لیے زندگی کے مواقع پالیتا ہے۔

عام حالت میں آدمی بندوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ بس اپنے قدموں کے نیچے کی زمین کو جانتا ہے۔ مگر جب وہ خدا کو پاتا ہے اور خدا کا عبادت گزار بنتا ہے تو وہ انسانوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ انسانی دوستیاں اور دشمنیاں اس کی نظر میں حقیر بن جاتی ہیں۔ وہ انسانی شکایتوں اور انسانی محبتوں سے گزر جاتا ہے۔ اس کی روح لامحدود پنہائیوں میں سفر کرنے لگتی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اُلجھنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

خدا کو پانے سے پہلے آدمی دنیا کی محدودیتوں میں گم رہتا ہے۔ خدا کو پانے کے بعد وہ دنیا کی محدودیتوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں اور اپنے حوصلوں کی تسکین کے لیے بلند تر سطح پالیتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کھونا بھی پانا بن جاتا ہے۔ جہاں ناخوش گواریاں بھی خوش گواریوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ جہاں غم بھی اتنا ہی اہم بن جاتا ہے جتنا خوشی اور مسرت۔

پھر اسلام آدمی کو انسانی موشگافیوں والے دین سے نکالتا ہے۔ وہ آدمی کو جھوٹے رسم ورواج والے مصنوعی دین سے باہر لاتا ہے۔ وہ اس کو اس سچے دین سے آشنا کرتا ہے جہاں ایک طرف انسان ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا۔ جہاں خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہیں، جہاں خدا سے ملنے کے لیے رسم ورواج کے بندھنوں میں اپنے کو باندھنے کی ضرورت نہیں۔

خدا ہر آن اپنے بندوں تک پہونچا ہوا ہے، اسی طرح خدا کے بندے بھی ہر آن خدا تک پہونچ سکتے ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں، اس لیے خدا اور بندے کے ملاپ کے لیے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت بھی نہیں۔ انسان جب اس ابدی دنیا میں پہونچتا ہے تو وہ خدا کو بھی عین اسی مقام پر پا لیتا ہے جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔

اسلام توحید کا دین ہے۔ اسلام میں خدا ایک ہے اور ساری خدائی بھی اسی ایک ذات کو حاصل ہے۔ جو لوگ اس خالص توحید کو پالیں وہ ایسی لامحدود دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں آفاقیت ہی آفاقیت ہے، اور جہاں ابدیت ہی ابدیت۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو (بمبئی) سے ۷ اکتوبر ۱۹۸۶ کو نشر کی گئی

والدین کی ذمہ داری

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من مولود یولد الا علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر پیدا ہونے والا فطرت (صحیح) پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا اس کو نصرانی بنا دیتے ہیں یا اس کو مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اس کا مطلب صرف مذہبی معنوں میں یہودی اور عیسائی اور مجوسی بنانا نہیں ہے۔ یہ تو بنانے کی آخری صورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہر وہ بگاڑ شامل ہے جو والدین کے ذریعہ ان کی اولاد میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں عمومی الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً :

عن جابرؓ بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل مولود یولد علی الفطرۃ حتی یعرب عنہ لسانہ فاذا عبر عنہ لسانہ اما شاکرا و اما کفورا ۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر پیدا ہونے والا فطرت (صحیح) پر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بولنے لگے۔ پھر جب وہ بولنے لگتا ہے تو وہ شکر گزار یا ناشکر بن جاتا ہے ۔

بچے پیدا ہوتے ہی بولنے نہیں لگتے۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد بولتے ہیں۔ بولنے سے پہلے ان کا ربط ان کی پیدائشی فطرت سے ہوتا ہے، بولنے کے بعد ان کا ربط ان کے قریبی ماحول سے ہو جاتا ہے جو کچھ ملے اس پر اللہ کا شکر کرنا ہے یا اس کو کسی اور کا عطیہ سمجھنا ہے، اس کا ابتدائی سبق انھیں اپنے ماں باپ سے ملتا ہے۔ کسی کو چھوٹا دیکھ کر اس کو حقیر سمجھنا یا کسی کو بڑا دیکھ کر جل اٹھنا، یہ بھی پہلی بار ان کو اپنے والدین ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح والدین یا تو اپنے بچوں کو نیک عمل بناتے ہیں یا ان کو بدعمل بنا دیتے ہیں۔ بچہ کا گھر اس کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اور بچہ کے والدین اس کے سب سے پہلے معلم۔

آزمودہ حل

میرے ایک قریبی عزیز ہیں وہ ہندستان کے ایک شہر میں رہتے ہیں۔ وہاں انھوں نے ۲۴ کمروں کا ایک بڑا مکان بنایا۔ اس سے ملا ہوا ایک ہندو ٹھیکہ دار کا بھی کافی بڑا مکان تھا۔ دونوں کے درمیان ایک خالی زمین تھی۔ اس زمین کے بارے میں دونوں کے درمیان نزاع پیدا ہوئی۔ میرے عزیز کہتے تھے کہ یہ ہماری زمین ہے اور ہندو ٹھیکہ دار کا دعوی تھا کہ وہ ہماری زمین ہے۔

یہ نزاع جاری رہی یہاں تک کہ ہندو ٹھیکیدار نے اس معاملہ میں مقامی جن سنگھی عناصر کو ابھارا۔ ٹھیکہ دار نے ان لوگوں کو بتایا کہ میری زمین پر ایک "مسلمان" نے قبضہ کر رکھا ہے۔ جن سنگھی افراد قدرتی طور پر بھڑک اٹھے۔ چنانچہ ایک روز ان کی پوری جماعت جلوس کی شکل میں آئی اور مذکورہ مسلمان کے مکان کو گھیر لیا۔ وہ جذبات میں بھرے ہوئے تھے اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے۔

مذکورہ مسلمان عمارت کے اوپر کے حصہ میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے اور نیچے ان کا کاروباری دفتر تھا۔ وہ شور سن کر دفتر سے باہر آئے اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاملہ یہ ہے کہ تم نے ہمارے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان لوگوں نے اور بہت سی اشتعال دلانے والی باتیں کہیں۔ مگر مذکورہ مسلمان ذرا بھی غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ میں لیڈر کون کون ہیں۔ چند لوگ آگے بڑھے۔ انھوں نے ہجوم سے کہا کہ آپ لوگ یہیں سڑک پر ٹھہریئے۔ ابھی زمین کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لیڈر صاحبان کو اپنے دفتر میں لے آئے۔

یہ گرمی کا موسم تھا۔ پہلے انھوں نے لیڈر صاحبان کی کولڈ ڈرنک سے تواضع کی۔ اس کے بعد ان سے کہا کہ اب بتائیے آپ لوگوں نے کس لیے زحمت فرمائی ہے۔ انھوں نے دوبارہ کہا کہ آپ نے ہمارے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس زمین کو اصل مالک کے حوالہ کیا جائے۔ مذکورہ مسلمان نے نہایت ٹھنڈے انداز میں کہا کہ آپ سب پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ زمین کا غذ پر ہوتی ہے۔ یعنی کاغذ یہ فیصلہ کرتا ہے

کہ زمین کس کی ہے اور کس کی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اصولی طور پر اس سے اتفاق کیا۔ اس طرح جب مذکورہ مسلمان نے جن سنگھی لیڈروں سے یہ اقرار کرالیا کہ زمین کا مسئلہ کاغذ کو دیکھ کر طے ہوتا ہے تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اب میں اس مسئلہ میں خود آپ لوگوں کو جج بناتا ہوں۔ میرے پاس جو کاغذات ہیں وہ میں آپ کو دے رہا ہوں۔ ٹھیکیدار صاحب کے پاس جو کاغذات ہیں وہ آپ ان سے لے لیں۔ اور دونوں کو لے کر اطمینان کے ساتھ گھر جائیں۔ تمام کاغذات کو دیکھ کر آپ خود فیصلہ دیدیں۔ اور میں پیشگی طور پر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ مجھ کو بلا شرط منظور ہوگا۔

اب جن سنگھی لیڈروں کا موڈ بدل گیا۔ ہندو ٹھیکیدار نے مذکورہ مسلمان کی جو تصویر بتائی تھی، عملی تجربہ میں انھوں نے ان کو اس سے بالکل مختلف پایا۔ جن سنگھی لیڈروں کی رہنما اب تک ہندو ٹھیکہ دار کی غلط رپورٹ تھی، اب ان کا رہنما ان کا وہ ضمیر بن گیا جو خدا نے ان کے سینہ کے اندر پیدا کیا تھا۔ چنانچہ وہ کاغذات کو لے کر دفتر سے باہر آئے اور ہجوم سے کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ "میاں صاحب" نے فیصلہ خود ہمارے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ ہم سوچ کر اس معاملہ کا فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ یہ کہ ان لوگوں نے کاغذات دیکھنے کے بعد مکمل طور پر مذکورہ مسلمان کے حق میں اپنا فیصلہ دیدیا۔

یہ واقعہ ۱۹۶۵ کا ہے اور اترپردیش کے ایک شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے تمام اہم کردار آج بھی زندہ موجود ہیں۔ کوئی شخص تصدیق کرنا چاہے تو میں اس کو نام اور پتے دیدوں گا، وہ اصل مقام پر جاکر اس کی مکمل تصدیق حاصل کر سکتا ہے۔

حال میں بابری مسجد (اجودھیا) اور عیدگاہ (متھرا) وغیرہ کے مسائل پیدا ہوئے تو مجھ کو بار بار مذکورہ واقعہ یاد آتا رہا۔ خیال ہوا کہ کاش مسلمانوں کے لیڈر سنجیدہ اور حقیقت پسند ہوتے تو وہ اس طرح کے قومی مسائل میں بھی وہی تدبیر اختیار کرتے جو مذکورہ مسلمان نے اپنے ذاتی مسئلہ میں اختیار کی اور صد فی صد کامیابی حاصل کی۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو یقینی طور پر یہ مسائل نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہوجاتے۔ اور آئندہ کے لیے اس قسم کے نئے مسائل پیدا ہونے کا دروازہ بھی بند ہوجاتا۔

مگر مسلمانوں کے نادان لیڈروں کا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی اس طرح کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کو جوابی ہنگامہ آرائی کا عنوان بنا لیتے ہیں ۔ پر جوش تقریریں کرنا اور سڑکوں پر جلوس اور نعروں کے مظاہرے کرنا، یہی آخری بات ہے جو ان کی عقل انھیں بتاتی ہے ۔ یہ طریق کار ممکن ہے کہ لیڈروں کی اپنی لیڈری کے لیے مفید ہو، مگر اصل مسئلہ کی نسبت سے وہ برعکس نتیجہ پیدا کرنے والا (counter-productive) ہے ۔ ایک مسئلہ جو ابتداءً محض چند مفاد پرست افراد کا مسئلہ تھا، مظاہراتی طریق کار اختیار کرنے کے بعد وہ قومی مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ وہ دونوں گروہوں کے لیے ساکھ (prestige) کا مسئلہ بن جاتا ہے ۔ ملک کے سیاسی حکمراں اگر کچھ کر سکتے تھے تو وہ بھی اب کرنے سے رک جاتے ہیں ۔ کیوں کہ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے کوئی انقلابی قدم اٹھایا تو اس کی انھیں یہ قیمت دینی پڑے گی کہ الکشن کے موقع پر وہ اس فرقہ کے ووٹوں سے محروم ہو جائیں جس کے خلاف انھوں نے اپنا فیصلہ دیا ہے ۔

اس کے برعکس اگر مسلمان لیڈر یہ کرتے کہ وہ سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ اعلیٰ سطح کے لوگوں سے ملاقات کرتے اور ان کے سامنے یہ تجویز رکھتے کہ دونوں فرقوں کے باخبر اور قابل اعتماد افراد پر مشتمل کمیٹی بنائی جائے اور وہ تاریخی حقائق کا بے لاگ جائزہ لے کر فیصلہ کرے نیز جرأت مندانہ طریقہ اختیار کر کے وہ مذکورہ مسلمان کی طرح یہ بھی کہہ دیتے کہ کمیٹی جو فیصلہ کرے گی اس کو ہم بلا شرط مان لیں گے ۔ مسلمان لیڈر اگر یہ طریقہ اختیار کرتے تو یقینی طور پر مسئلہ اب تک ختم ہو چکا ہوتا ۔

اس رائے کا درست ہونا اس واقعہ سے بھی ثابت ہے کہ متعدد ہندو صاحبان نے اس معاملہ میں کھل کر اپنی قوم کے فرقہ پرستوں کی تردید کی ہے ۔ اور اس موضوع پر نہایت منصفانہ مضامین لکھے ہیں ۔ یہ مضامین نئی دنیا (دہلی) تعمیر حیات (لکھنؤ) نقیب (پٹنہ) دعوت (دہلی) وغیرہ میں نقل ہوئے ہیں ۔ ان اخبارات کی ۱۹۸۶ کی فائل میں ان مضامین کو دیکھا جا سکتا ہے ۔ اگر ان مضامین سے سبق لیا جائے تو وہ راقم الحروف کی تجویز کی معنویت ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں ۔

یہاں میں اس نوعیت کی صرف ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ یہ ایک مفصل خط ہے جو نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶) میں چھپا ہے۔ اس خط کے نیچے ۱۲ آدمیوں کے نام درج ہیں۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور ان میں سے ۱۱ افراد ہندو فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خط نہایت منصفانہ ہے۔ وہ اگلے صفحہ پر اصل الفاظ میں پورا نقل کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ ترین سطح کے ان ہندو دانشوروں نے اپنے خط میں سخت تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اخبار ٹائمس آف انڈیا اپنی خبروں اور اپنے ادارتی نوٹ کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہا ہے۔ اس کی ایک مثال متھرا کی عیدگاہ کے بارہ میں اس کی رپورٹ ہے جس کو "اورنگ زیب کے بعد کرشنا کی جائے پیدائش" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ قدیم کیشو مندر کو راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ نے جہاں گیر کے زمانہ میں بنوایا تھا۔ اورنگ زیب نے اس مندر کو گرا کر عیدگاہ تعمیر کرائی۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس نے سیاسی بنیاد پر ایسا کیا۔ کیونکہ متھرا کے علاقہ میں بندیلہ اور جاٹ اس کے باغی ہو گئے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بے شمار دوسرے مندروں کو اورنگ زیب نے بالکل نہیں چھوا، حتیٰ کہ کئی نئے مندر اسی کے زمانہ میں بنوائے گئے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود یہ کیشو مندر بدھ مذہب کے عبادت خانہ کو توڑ کر بنایا گیا تھا۔

ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ یہ تاثر دیتی ہے کہ یہ مقام کرشنا کی جنم بھومی ہے۔ یہ بات اس وقت بہت عجیب معلوم ہوتی ہے جب اس حقیقت کو دھیان میں رکھا جائے کہ خود کرشنا کا وجود تاریخی طور پر مشتبہ ہے۔ یہی معاملہ اجودھیا کی رام جنم بھومی کا ہے۔ یہ بات جائزہ طلب ہے کہ کیا تاریخی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ جگہ رام کی جائے پیدائش تھی۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ۱۹ ویں صدی تک یہاں ہندو اور مسلم کی جو نزاع تھی وہ خود بابری مسجد کے بارہ میں نہ تھی بلکہ مسجد سے الگ ایک اور جگہ کے بارے میں تھی جس کو ہنومان بیٹھک کہا جاتا تھا۔

ہندستان میں غیر رواداری کا مظاہرہ ہر مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے ہوتا رہا ہے

Communal Twist

Sir, — We have noted with growing concern a recent tendency in *The Times of India* to give a communal twist to news items and even to editorial comments. An example of this is a report from Mathura dated 15 September and entitled, "Krishna's Birthplace after Aurangzeb." It evoked considerable correspondence, some of which, as could be expected, was markedly communal in tone.

Your readers should know that historical analysis and interpretations involve more than a mere listing of dates with an eye to pious sentiments. The Dera Keshava Rai temple was built by Raja Bir Singh Deo Bundela during Jahangir's reign. This large temple soon became extremely popular and acquired considerable wealth. Aurangzeb had this temple destroyed, took the wealth as booty and built an Idgah on the site. His actions might have been politically motivated as well, for at the time when the temple was destroyed he faced problems with the Bundelas as well as Jat rebellions in the Mathura region. It should be remembered that many Hindu temples were untouched during Aurangzeb's reign and even some new ones built. Indeed, what is really required is an investigation into the theory that both the Dera Keshava Rai temple and the Idgah were built on the site of a Buddhist monastery which appears to have been destroyed.

Your news report also gives credence to the suggestion that this site was the birthplace of Krishna. This is extraordinary to say the least, when even the historicity of the personality is in question. It creates the kind of confusion such as has been created, probably deliberately, over the question of the birthplace of Rama in the matter of Rama-Janam-bhumi. A Persian text of the mid-nineteenth century states that the Babari mosque was adjacent to the Sita-ka-rasoi-ghar and was known as the Rasoi Sita mosque and adjoined the area associated with the birthplace of Rama. It would be worth enquiring whether there is reliable historical evidence of a period prior to the nineteenth century for this association of a precise location for the birthplace of Rama. Furthermore such disputes as there were between Hindus and Muslims in this area upto the nineteenth century were not over the Babari mosque but the totally different size of Hanuman-baithak.

It cannot be denied that acts of intolerance have been committed in India by followers of all religions. But these acts have to be understood in their context. It is a debasement of history to distort these events for present day communal propaganda.

The statement in your news report that the site at Mathura is to be "liberated" and handed over to the "rightful owners" as the birthplace of Krishna raises the question of the limits to the logic of restoration of religious sites (and this includes the demand for the restoration to worshippers of disused mosques now under the care of the Archaeological Survey of India). How far back do we go? Can we push this to the restoration of Buddhist and Jaina monuments destroyed by Hindus? Or of pre-Hindus animist shrines?

ROMILA THAPAR, MUZAFFAR ALAM, BIPAN CHANDRA, R. CHAMPAKA LAKSHMI, S. BHATTACHARYA, H. MUKIHA, SUVIRA JAISWAL, S. RATNAGAR, M.K. PALAT, SATISH SABERWAL, S. GOPAL, MRIDULA MUKHERJEE.

The Times of India, New Delhi, 21, Oct. 1986

مگر ان جھگڑوں کو ان کے سیاق میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ یہ تاریخ کی تلبیس ہوگی کہ ان چیزوں کو فرقہ وارانہ مقاصد کے لیے بگاڑ کر پیش کیا جائے۔

ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ متھرا کے اس مقام کو دوبارہ حاصل کیا جائے اور اس کو اس کے اصل مالکوں کے حوالہ کیا جائے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منطق کی حد کیا ہے اور اس کو آپ کتنے پیچھے تک لے جائیں گے۔ کیا اس کو ہم یہاں تک لے جائیں گے کہ بدھوں اور جینیوں کے ڈھائے ہوئے مندروں کے مقامات دوبارہ انھیں لوٹائے جائیں اور کیا اسی طرح قدیم ہندستانی باشندوں کے چھینے ہوئے مقدس مقامات بھی (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶)

اوپر جو خط نقل کیا گیا، یہ اول درجہ کے ہندو صاحبان کا خط ہے جو ملک کے اول درجہ کے انگریزی اخبار میں چھپا ہے۔ یہ اعترافِ حق اس وقت ہے جب کہ ہم نے ابھی تک ہندو شخصیتوں کے ضمیر کو حَکَم نہیں بنایا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہندو شخصیتوں کے ضمیر کو حَکَم کے مقام پر بٹھا دیا جائے تو وہ کس قسم کا اور کیسا فیصلہ کریں گے، بشرطیکہ سیاسی طریقہ اختیار کر کے مسئلہ کو قومی ساکھ کا مسئلہ نہ بنا دیا گیا ہو۔

دو قسم کے انسان

مکی دور کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس گیے۔ ان کو اللہ کی طرف بلایا اور ان سے کہا کہ دعوت حق کے اس کام میں میری مدد کرو۔ ان میں سے ایک شخص اٹھا۔ اس کا نام بیحرہ بن فراس تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ہم اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیں پھر اللہ آپ کو آپ کے مخالفین پر غالب کر دے تو کیا آپ کے بعد اقتدار (امر) میں ہمارا حصہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا اقتدار اللہ کا ہے وہ جسے چاہتا ہے اسے دیتا ہے۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فقال لہ افنھدف نحورنا للعرب دونك فاذا اظھرك اللہ کان الامر لغیرنا؟ لاحاجة لنا بامرك فابوا علیہ۔

(سیرت ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۳۳)

اس نے آپ سے کہا کیا ہم آپ کی حمایت میں اپنے سینہ کو سارے عرب کا نشانہ بنائیں پھر جب اللہ آپ کو غلبہ دیدے تو اقتدار ہمارے سوا دوسرے کا ہو جائے۔ ہم کو آپ کے دین کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

یہ ایک قسم کے انسان کی مثال تھی۔ اب دوسرے قسم کے انسان کی مثال لیجیے۔

مکی زندگی کے آخری زمانہ میں مدینہ کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور اسلام قبول کیا۔ لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تو ان میں کا ایک شخص اٹھا۔ یہ عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے قبیلہ خزرج کے لوگو کیا تم جانتے ہو کہ تم اس آدمی سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ کہا کہ تم تمام سرخ و سفید کے خلاف جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اس میں تمہارے اموال برباد ہوں گے اور تمہارے بہترین افراد قتل کیے جائیں گے:

قالوا فانا ناخذہ علی مصیبة الاموال وقتل الاشراف۔ فما لنا بذلك یا رسول اللہ ان نحن وفینا۔ قال الجنة۔ قالوا ابسط یدك فبسط یدہ فبایعوہ۔

(الجزء الثانی، ۵۵)

انھوں نے کہا کہ پھر ہم ان کو اموال کی ہلاکت اور افراد کے قتل کے باوجود قبول کرتے ہیں۔ پھر اے خدا کے رسول ہمارے لیے کیا ہے اگر ہم اس کو پورا کردیں۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے آپ نے ہاتھ بڑھایا اور پھر انھوں نے بیعت کی۔

ہم کو فائدہ ہے

ہندستان کے ایک مسلمان لیڈر سے ملاقات ہوئی۔ وہ اردو کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالتے ہیں۔ ابتداءً ان کا اخبار عرصہ تک خسارہ پر چلتا رہا۔ مگر اب وہ نفع پر چل رہا ہے۔

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جب اپنا اخبار نکالا تو کوشش کے باوجود اس کی اشاعت کسی طرح تین ہزار سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ اسی حالت میں لمبی مدت گزر گئی۔ انھوں نے ہر قسم کی تدبیریں کر ڈالیں مگر اخبار کی اشاعت نہیں بڑھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ میں اجودھیا کی مسجد کا معاملہ پیش آیا جو مسلمانوں کے نزدیک "بابری مسجد" ہے مگر ہندوؤں کا دعوی ہے کہ وہ "رام جنم بھومی" ہے۔ مذکورہ لیڈر نے فوراً اس کو پکڑ لیا۔ انھوں نے اس موضوع پر مسلسل دھواں دھار مضامین شائع کیے، اور ان پر تیز و تند سرخیاں قائم کیں۔ نتیجہ عین اندازے کے مطابق نکلا۔ ان کے اخبار کی اشاعت اچانک تین ہزار سے بڑھ کر تیس ہزار تک پہونچ گئی۔ ان کے پاس ہر طرف سے تحسین اور مبارک باد کے خطوط آنے لگے۔

بابری مسجد جیسے واقعات مسلم ملت کے لیے بری خبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ مسلم قیادت کے لیے اچھی خبر بن جاتے ہیں۔ وہ ایک کے لیے المیہ ہیں اور دوسرے کے لیے طربیہ ——— یہ کہانی محض ایک صحافی لیڈر کی کہانی نہیں، یہی ہماری تمام قیادت اور صحافت کی کہانی ہے۔

مذکورہ روداد سن کر مجھے ایک صاحب کا قصہ یاد آگیا۔ وہ ایک دیہاتی مسلمان تھے۔ وہ اکثر قبروں اور درگاہوں پر جاتے اور وہاں مرادیں مانگتے۔ بستی کے ایک عالم نے ان کو اس سے منع کیا اور کہا کہ قبروں سے مرادیں مانگنا شرک ہے۔ عالم کے نزدیک اس قسم کا فعل شرک تھا۔ مگر مذکورہ دیہاتی مسلمان کا "تجربہ" تھا کہ وہ صاحب قبر سے جو مراد مانگتا ہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس نے لڑکا مانگا تو اس کے یہاں لڑکا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ عالم کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، اس نے چلا کر کہا :

ہم تو جائیں گے، ہم کو فائدہ ہے

راقم الحروف پچھلے بیس سال سے مسلم رہنماؤں کو مشورہ دے رہا ہے کہ وہ جذباتی

سیاست کا طریقہ چھوڑ دیں اور خاموش تعمیر کا طریقہ اختیار کریں۔ اس کے لیے میں نے اکابرِ ملّت ملاقاتیں کیں۔ ان سے خط و کتابت کی۔ تحریروں کے ذریعہ مسلسل انھیں متوجہ کیا۔ اور دلائل اور مثالوں سے اس کو اس حد تک واضح کر دیا کہ کسی کے پاس اس کی تردید میں کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ اس کے باوجود کوئی مسلم رہنما اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں بھی اصل سبب وہی ہے جس کا نمونہ دیہاتی مسلمان کے واقعہ میں نظر آتا ہے۔ ہر رہنما گویا زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے:

ہم جذباتی سیاست چلائیں گے، اس سے ہم کو فائدہ ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی صحافت اور قیادت دونوں فسادات کے اوپر قائم ہیں۔ اس ملک میں اگر فرقہ وارانہ فسادات ختم ہو جائیں تو اسی کے ساتھ اس ملک کی مسلم صحافت اور مسلم قیادت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اردو کے ایک تجربہ کار صحافی جناب ساجد رشید نے اسی بات کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

"اردو کے بیشتر اخبارات کا محبوب موضوع فساد ہے، اور وہ بھی صرف ہندو مسلم فساد۔ اردو اخبارات فساد کی خوفناک خبروں کے بغیر نیا شمارہ چھاپنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ ایک ہفت روزہ اخبار کے نوجوان مدیر نے ایک بار مجھ سے کہا: "بھائی، کہیں پر ایک آدھ فساد ہو جائے تو اخبار کی اشاعت بڑھ جائے"۔ بیشتر اردو صحافی آج اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ کسی بھی اردو ہفت روزہ کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، وہ مسلمانوں کی کچھ ایسی تصویر کشی کرے گا گویا اس سے زیادہ مظلوم قوم کوئی دوسری نہیں۔ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ مسلمان اس دیس کی فرقہ وارانہ آگ کا ایندھن ہیں۔ لیکن اردو کے صحافی اس کو جس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں، اس سے مسلمانوں پر منفی اثرات مترتب ہو رہے ہیں۔ مسلمان خود کو بے حد مظلوم اور غیر محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس قسم کا جذبہ آدمی کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کو اس بری طرح متاثر کرتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس منطق سے غور کریں تو پتہ چلے گا کہ بیشتر اردو اخبارات ایک پوری قوم کو مفلوج کرنے کی خطرناک سازش میں غیر محسوس طریقے سے ملوث ہیں"۔ (روزنامہ اردو ٹائمز، بمبئی، ۱۴ ستمبر ۱۹۸۶)

ایک تقریر

اس وقت میری گفتگو کا موضوع خدا اور خدا کی وحدت کا موضوع ہے۔ یہ موضوع بلاشبہ میرا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع ہے۔ زمین و آسمان گواہ ہیں کہ میں سب سے زیادہ توحید کے موضوع پر سوچتا ہوں۔ میں سب سے زیادہ خدا کی باتوں میں گم رہتا ہوں۔

مگر قرآن میں آیا ہے کہ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں) اور فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی کی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا)

خدا تو وہ ہے جہاں زبانیں بند ہو جاتی ہیں، پھر خدا کے بارے میں بولا جائے تو کیا بولا جائے۔ خدا تو وہ ہے جس کے سامنے آتے ہی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ پھر اس کے مشاہدہ کو بیان کیا جائے تو کس طرح بیان کیا جائے۔ خدا تو وہ ہے کہ جب وہ اترتا ہے تو جہاں وہ اترتا ہے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر کہاں سے وہ دل لایا جائے جو خدا جیسی ہستی کا چرچا کر سکے۔

خدا میرے لیے صرف ایک رسمی عقیدہ نہیں، خدا میری دریافت ہے۔ خدا کو میں نے دیکھا ہے۔ خدا کو میں نے چھوا ہے۔ بخدا میری مثال صحرائے سینا کے اس پہاڑ کی ہے جس پر خدا اترا اور اس نے اس کی ہستی کے ریزے ریزے کر دیئے۔ ایسے ایک انسان کے لیے خدا پر بولنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایسے ایک انسان کے لیے خدا کا بکھان کرنا عام تقریروں کی طرح صرف ایک تقریر کر دینے کی بات نہیں۔

غالباً ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میں اعظم گڈھ (یوپی) میں تھا۔ وہاں ایک صاحب (شاہ نصیر احمد) نے مجھ سے پوچھا: "کیا انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے"، میری زبان سے فوراً یہ الفاظ نکلے: "کیا آپ نے ابھی تک خدا کو نہیں دیکھا"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا سورج اور چاند سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ آنکھ اسی لیے دی گئی ہے کہ وہ خدا کو دیکھے۔ یہ دماغ اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ خدا کا ادراک کرے۔ بخدا وہ آنکھ بے نور ہے جس کو خدا دکھائی

نہیں دیتا۔ وہ انسان بے دماغ ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس نے خدا کو نہیں پایا، یا یہ کہ خدا کو پایا نہیں جا سکتا۔

خدا بلا شبہ اتنا بڑا ہے کہ وہ ہمارے مشاہدہ میں نہیں سماتا۔ مگر بلاشبہ وہ تمام چیزوں سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ موجودہ دنیا میں ہم خدا کو اس کی ذات میں نہیں دیکھ سکتے۔ مگر خدا کو اس کی صفات میں ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں اور ہر وقت دیکھ سکتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں یہی خدا کو دیکھنا ہے، یہی خدا کو پانا ہے۔

کار کو کارخانہ کا انجینیر بناتا ہے۔ انجینیر کار میں ہر وقت بیٹھا ہوا نہیں ہوتا۔ مگر جس شخص نے کار میں صرف کار کو دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ کار کو دیکھنے والا وہ ہے جو کار کو دیکھتے ہی اس کے انجینیر کو بھی دیکھ لے۔ اسی طرح انسان خدا کو دیکھتا ہے۔ اگر آپ نے سورج میں صرف سورج کو دیکھا تو آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ سورج کو دیکھنے والا وہ ہے جس نے سورج میں خدا کے روشن چہرہ کو دیکھ لیا ہو۔ جس نے پہاڑ میں صرف پہاڑ کو دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ پہاڑ کو دیکھنے والا وہ ہے جس نے پہاڑ میں خدا کی عظمتوں کو پا لیا ہو۔ خدا کوئی دور کی چیز نہیں۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ چڑیوں کے چہچے میں بول رہا ہے۔ وہ پھولوں کی لطافت میں مسکرا رہا ہے۔ وہ ہواؤں کے جھونکے میں آپ کو چھو رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا ہر طرف اور ہر جگہ ہے۔ وہ ہم سے بالکل الگ ہے، اسی کے ساتھ وہ ہم سے انتہائی قریب ہے۔ پھر بھی جو انسان خدا کو نہ دیکھے وہ اندھا ہے۔ اس کے باوجود جو انسان خدا کو نہ پائے وہ محرومی کی اس انتہا پر ہے جس کے آگے محرومی کا کوئی درجہ نہیں۔

خدا کو پانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو پانا۔ کون ہے جو اپنے آپ کو پائے ہوئے نہ ہو۔ اس لیے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو خدا کو پانا چاہے پھر بھی وہ اس کو نہ پا سکے۔ جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے وہ سورج کو نہیں دیکھتا۔ ایسے شخص کے چاروں طرف سورج اپنی بے پناہ روشنی کے ساتھ موجود ہوگا مگر وہ سورج کو نہیں دیکھے گا۔ اسی طرح خدا ہر لمحہ آدمی کے چاروں طرف موجود ہے۔ مگر جس شخص نے اپنی بصیرت کو کند کر لیا ہو وہ کبھی خدا کو دیکھنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔

بھوپال، ۱۹ اپریل ۱۹۸۶

اسلام پسندوں کے مسائل

ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۷۲ سے ۱۹۷۷ تک پاکستان کے وزیر اعظم تھے۔ ب
ابوالاعلیٰ مودودی اور پاکستان کے دوسرے اسلام پسند لوگوں نے ان کے خلاف تحریک چلا
اور اس کا نام " نظامِ مصطفیٰ " رکھا۔ اتھارٹی کے خلاف عوام کو ابھارنا سب سے زیادہ آسا
کام ہے۔ چنانچہ ان حضرات کی پرجوش تقریروں سے پاکستانی عوام بھڑک اٹھے۔ یہاں
کہ بھٹو کی حکومت ختم ہوگئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور اسلامی محاذ کے دوسرے لوگوں
اپنی تقریروں اور تحریروں میں یہ تاثر دیا تھا کہ بھٹو کا جانا پاکستان میں اسلام کا آنا ہے۔
بھٹو کے جانے کے بعد جو چیز پاکستان میں آئی وہ اسلامی محاذ کا آپس کا اختلاف تھا نہ کہ
معنوں میں اسلام۔

یہی واقعہ موجودہ زمانہ میں اکثر ملکوں میں بار بار پیش آیا ہے، کہیں ایک صورت
اور کہیں دوسری صورت میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ " انقلاب " سے پہلے صرف ایک د
مشترک طور پر سب کا مرکز توجہ ہوتا ہے۔ مگر مشترک دشمن کے ہٹنے کے بعد جب تعمیر کا وقت
ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر ملک کے بارے میں ہر ایک کے ذہن میں الگ الگ نقشہ ہے۔
یہاں سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ منفی بنیاد پر متحد ہونے والے مثبت بنیاد پر متحد ہونے
ناکام رہتے ہیں۔

یہ اختلافات کس قسم کے مسائل میں پیدا ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال لیجئے۔ پاکستا
کا ایک اردو ہفت روزہ " دید شنید " ہے۔ اس نے پاکستان کی تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر
اسرار احمد صاحب کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کے سوالات میں سے ایک سوال یہ تھا: " اچھا اگر آپ
حکومت ملک میں قائم ہو جائے تو آپ کے پاس تو پورے اختیار ہوں گے۔ قومی زندگی م
خواتین کی شرکت کے بارے میں آپ کا کیا رویہ ہوگا۔ آپ کہاں تک اجازت دیں گے "

اس سوال کے جواب میں تنظیم اسلامی کے امیر نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات
تھی: " ہم پرائمری تعلیم پوری عورتوں کے حوالہ کر دیں گے۔ ہم پابندی لگا دیں گے کہ کوئی مرد پرا

ٹیچر نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ بچوں کی صحیح طور پر عورت ہی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ مادرانہ شفقت صرف عورت ہی دے سکتی ہے۔" ماہنامہ میثاق، لاہور، ستمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۶۶)

اب اسی موضوع پر دوسرے اسلام پسند کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ احمد محمد جمال سعودی عرب کے مشہور اسلامی مفکر ہیں۔ وہ فکری طور پر اخوان کے آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوہ (یکم ستمبر ۱۹۸۶) میں ایک پرجوش مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے: الفتنة نائمة ..... لعن الله من ایقظها۔ (فتنہ سویا ہوا ہے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے) یہ مضمون عین اسی مسئلہ کے بارے میں ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

سعودی عرب میں اس وقت تعلیم کا پورا نظام مردوں کے ہاتھ میں ہے، ابتدائی تعلیم بھی اور اعلیٰ تعلیم بھی۔ اب سعودی عرب کے بعض دانشور وہاں یہ تحریک چلا رہے ہیں کہ ابتدائی درجہ (المرحلة الابتدائية) میں شروع کے تین سال کی تعلیم عورتوں کے حوالہ کر دی جائے۔ اور اس کی دلیل عین وہی دی جاتی ہے جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں ہوا۔ یعنی مادرانہ شفقت۔ وہ کہتے ہیں:

ان الطفل محتاج الى الاحساس بالامن والحب والحنان۔ وهو ما لا يتحقق الا على يد المعلمات بكل ما يحملن من غرائز الامومة الحانية (صفحہ ۲۰)

احمد محمد جمال صاحب نے اپنے مضمون میں اس نقطۂ نظر کے خلاف نہایت شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے جس کا اندازہ ان کے عنوان سے ہوتا ہے۔ وہ بچوں کے لیے خاتون معلّم مقرر کرنے کو "فتنہ" قرار دیتے ہیں، ایک ایسا فتنہ جس کے بیدار کرنے پر آدمی خدا کی لعنت کا مستحق قرار پائے۔ انھوں نے اس نظریہ کو نہ صرف اسلامی اعتبار سے مکمل طور پر رد کیا ہے، بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لیے خاتون معلّم کے مقابلہ میں مرد معلّم زیادہ بہتر ہے:

واعتقد الرجل اصلح من المرأة فى التدريس خلال المرحلة الابتدائية

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ مختلف اسلام پسند ایک دشمن کے خلاف متحد ہوتے ہیں۔ اور جب خارجی دشمن ہٹ جاتا ہے تو خود ایک دوسرے کے دشمن بن کر آپس میں لڑنے لگتے ہیں۔

سرکشی

ایک صاحب کو اپنے ایک مسلمان بھائی سے شکایت ہو گئی۔ اس کے بعد وہ انتقامی جوش سے بھر گیے۔ انھوں نے اس مسلمان کے خلاف ہر ممکن کارروائی کرنا شروع کر دیا ــــــ اس کو دھوکا دینا، اس کو بدنام کرنا، اس کے خلاف جھوٹے مقدمے چلانا، غرض کمینگی کی کوئی قسم نہ تھی جس کو انھوں نے اپنے لیے جائز نہ کر لیا ہو۔

مذکورہ بزرگ سے کہا گیا کہ آپ ایک مسلمان کے خلاف ایسی غلط کارروائیاں کیوں کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ خود حدیث میں آیا ہے کہ الحرب خدعة (جنگ دھوکا ہے)

اس قسم کا قول غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ یہ اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکالنا ہے جو خدا کے غضب کو بھڑکانے والے ہیں۔ کیوں کہ اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ ان لوگوں کے لیے ہے جو ظالموں کے خلاف دفاع پر مجبور کر دیئے گیے ہوں نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو خدا کی زمین میں فساد برپا کریں۔ جو کسی انسان کو ناحق ستانے کا منصوبہ بنائیں جو کسی کا حق غصب کر کے بیٹھ جائیں۔ جو خود ظالم ہوں نہ کہ مظلوم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگ مختلف قسم کی سرکشی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں قرآن میں فرمایا گیا:

سنکتب ما قالوا (آل عمران ۱۸۱) کلّا سنکتب ما یقول (مریم ۷۹) ہرگز نہیں، ہم لکھ لیں گے جو وہ کہتے ہیں۔ اور پھر قیامت کے دن ہم ان کو بتائیں گے۔

جو لوگ سرکشی کی باتیں کرتے ہیں اور جو لوگ ان کی باتوں کو دلچسپی سے سنتے ہیں وہ اسی لیے ایسا کرتے ہیں کہ ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کا ہر لفظ خدائی رجسٹر میں ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ ان کو یقین نہیں کہ وہ اپنی ہر بات کے لیے آخرت کی عدالت میں جواب دہ ہوں گے۔

ایسے تمام لوگ جو حد سے تجاوز کریں اور حق کے مقابلہ میں سرکشی کا طریقہ اختیار کریں ان سے خدا کی کتاب ابدی طور پر یہ کہہ رہی ہے کہ خدا سے ڈرو، کیوں کہ خدا تمہارے ایک ایک لفظ کو لکھ رہا ہے

ایک سفر

پٹنہ ریاست بہار کی راجدھانی ہے۔ اس کا قدیم نام پاٹلی پتر تھا۔ مگدھ کے راجہ نے پانچویں صدی قبل مسیح میں پاٹلی پتر کی بنیاد رکھی۔ مگدھ کے بعد نندا اور موریہ اور سونگلنے یہاں راج کیا۔ چندرگپت موریہ (۲۹۷-۳۲۱ ق م) کے زمانہ میں ایک یونانی سفیر میگاس تھینز (Megasthenes) یہاں آیا اور کئی سال مقیم رہا۔ اس نے اپنی یادداشت میں یہاں کے راجہ کے حالات لکھے ہیں۔ چندرگپت موریہ حضرت مسیح سے پہلے پیدا ہوا، اور اس کا تذکرہ اس کے معاصر مورخین کی کتابوں میں موجود ہے۔ مگر حضرت مسیح کا تذکرہ ان کے معاصر مورخین کی کتابوں میں موجود نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جن شخصیتوں کو آج لوگ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے عظمت و تقدس کا اعلیٰ ترین درجہ دیے ہوئے ہیں ان کے ہم زمانہ لوگوں کی نظر میں وہ سرے سے کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھے۔

افغان حکمراں شیر شاہ نے اس علاقہ کو ۱۵۴۱ میں فتح کیا اور اس کا نام پٹنہ رکھا۔ شیر شاہ کی حکومت صرف پانچ سال تک باقی رہی۔ اس کے بعد پٹنہ اورنگ زیب (۱۷۰۷-۱۶۵۹) کے ماتحت آیا اور اس نے اپنے پوتے شہزادہ عظیم کے نام پر اس کا نام عظیم آباد رکھا۔ انگریزی دور میں دوبارہ وہ پٹنہ بن گیا۔ یہ ۱۸۶۵ کا واقعہ ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۱۷ میں قائم ہوئی۔ یہاں کی قدیم عمارتوں میں سے ایک بنگال کے ہمایوں شاہ کی مسجد بھی ہے جو ۱۴۹۹ میں تعمیر ہوئی تھی۔

ایک پروگرام کے تحت ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ کی صبح کو میں پٹنہ پہونچا۔ اور ۱۳ جولائی کی شام کو پٹنہ سے دہلی واپس آیا۔

۱۲ جولائی کی صبح کو ۱۰ بجے پٹنہ کے تعلیم یافتہ افراد کی ایک نشست ہوئی۔ اس نشست کا انتظام پٹنہ ہائی کورٹ کے سینیر جج آنریبل مسٹر جسٹس ایس کے جھا نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر کیا تھا۔ اس میں ہندو مسلم دونوں طبقہ کے لوگ شریک تھے۔

جسٹس جھا نے اپنی تمہیدی گفتگو میں کہا کہ "مولانا صاحب اسٹائچ مسلم ہیں اور میں

اسمارٹ ہندو ہوں۔ اس لیے میرے اور ان کے درمیان موافقت ہونا بہت مشکل ہے"۔ اس کے بعد میں نے تقریر کی اور تقریباً پون گھنٹہ تک اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں جسٹس جھا دوبارہ بولے۔ انھوں نے کہا کہ اب میں اپنی پہلی والی بات کو واپس لیتا ہوں۔ مولانا صاحب نے جو بات کہی وہ بہت اچھی اور گہری بات ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے مجھے ایک ہفتہ لگے گا۔

حاضرین میں سے ایک معمر آدمی نے کہا کہ میری عمر ۸۰ سال ہو چکی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنی پوری عمر میں کبھی میں نے ایسی باتیں نہیں سنیں جو آج میں نے مولانا صاحب کی زبان سے سنی ہیں۔ ہائی کورٹ کے ایک ہندو رجسٹرار نے کہا کہ یہ بڑی عجیب تقریر تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ مذہب کا یہ مطلب بھی ہے۔

پٹنہ میں میرا قیام مسٹر ایم ٹی خان کے مکان (عدالت گنج) پر تھا۔ یہاں لوگ برابر آتے رہے اور ان سے مختلف اسلامی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ ان آنے والوں میں مسلم بھی تھے اور ہندو صاحبان بھی۔

۱۲ جولائی کی شام کو نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس کا مقام خدابخش لائبریری (پٹنہ) کا ہال تھا۔ لوگ بڑی تعداد میں آئے۔ ہال اس طرح بھرا ہوا تھا کہ لوگوں کے لیے کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ چنانچہ بعد کو آنے والے گیلری میں کھڑے ہو کر سنتے رہے۔ تقریر کا موضوع "اسلام اور عصر حاضر" تھا۔ سخت گرمی تھی۔ بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ مگر ایک ایک شخص آخر تک دم بخود ہو کر سنتا رہا۔

آخر میں سوالات کا اعلان کیا گیا۔ تاہم بیشتر لوگ اپنے تاثر کے تحت چپ رہے۔ البتہ چند افراد نے سوالات کیے۔ میں نے سوالات کی وضاحت کی۔ مگر یہ سوالات زیادہ تر اصل موضوع سے غیر متعلق تھے۔ ایک صاحب جن کا تعارف "پروفیسر" کے لفظ سے کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ الشمسُ تجری لِمُستقرٍ لہا۔ یعنی سورج چل رہا ہے جب کہ علم الافلاک کہتا ہے کہ سورج اسٹیشنری (غیر متحرک) ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ جدید فلکیات واضح طور پر سورج کو متحرک بتاتی ہے۔ بلکہ جدید سائنس کے نزدیک

دنیا کی ہر چیز متحرک ہے۔ وہ خاموش ہوگیے۔

اجتماع کے بعد کچھ نوجوانوں نے آٹوگراف لیا۔ میں نے ایک صاحب کی بک پر یہ جملہ لکھ دیا :

جو بولا وہ نہیں بولا، جو چپ رہا وہی بولا

پٹنہ کے ایک صاحب سے میں نے کہا کہ پٹنہ روایتی طور پر اہل علم کا شہر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ " اہل علم کا نہیں بلکہ اہل شعر کا"۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں بہت سے شعراء پیدا ہوئے۔ اور یہاں مشاعرے ہوتے ہیں تو ان میں سامعین کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ سائنس کا دور ہے اور سائنس کے دور میں شاعری کرنا ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (Anachronism) ہے۔ چنے کی دال پر قُل ہو اللہ لکھنا ایک آرٹ ہو سکتا ہے مگر اس کا عملی فائدہ کیا ہے۔ اسی طرح ردیف وقافیہ کی زبان میں باتیں کہنے سے کچھ لوگ وقتی طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں مگر کیا اس طرح کی شاعری سے یہ ممکن ہے کہ کوئی قوم دور جدید میں اپنی کھوئی ہوئی جگہ پالے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس ملک میں ہمارے ساتھ تعصب کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سب سے بڑا فریب ہے جس میں اس ملک کے مسلمان مبتلا ہیں اور ہمارے تمام اصاغر واکابر مسلسل یہی ذہن مسلمانوں میں پیدا کر رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ جس چیز کو آپ " تعصب" کہتے ہیں وہ دراصل زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ فرض کیجئے کہ آپ کے دو بیٹے ہیں۔ ایک بیٹا عرب میں جاکر دس ہزار روپیہ مہینہ کما رہا ہے، دوسرا بیٹا گھر پر پڑا ہوا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ کیا دونوں بیٹوں کا مقام گھر کے اندر یکساں ہوگا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ گھر میں بے کار پڑا رہنے والا بیٹا اگر کہے کہ میرے ساتھ تعصب کیا جاتا ہے۔ تو کیا آپ اس کو مانیں گے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ یہی معاملہ اس ملک میں مسلمانوں کا ہے۔ آپ کا بے کار بیٹا اپنے نکمے پن کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح اس ملک کے مسلمان بھی اپنی بے شعوری اور اپنے پچھڑے پن کی قیمت ادا کر رہے ہیں، اس کا کوئی

تعلق تعصب یا فرقہ واریت سے نہیں۔

مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے شاعروں اور خطیبوں نے انھیں جھوٹے فخر میں مبتلا کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر ہو کر رہ گیے۔ آپ مسلمانوں کو حقیقت پسند بنا دیجئے اور اس کے بعد اس ملک میں ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔

ایم ٹی خان سے کسی صاحب نے کہا کہ الرسالہ والے تو صرف مرض کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ اس کا حل نہیں بتاتے۔ اس سے کیا فائدہ۔ ایم ٹی خان نے کہا کہ آپ سمجھے نہیں ایک شخص کی صحت خراب ہے۔ وہ ڈاکٹر سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا جائزہ لے کر کہتا ہے کہ تم اینمک ہو۔ یہ صرف مرض بتانا نہیں ہے، یہ علاج بھی ہے۔ کسی شخص سے یہ کہنا کہ تم اینمک ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر ہیموگلوبن کم ہے۔ اس لیے وہ چیزیں استعمال کرو جس سے ہیموگلوبن کی پیداوار بڑھتی ہے۔ مریض اگر اتنا باشعور نہیں ہے تو اس کے لیے ڈاکٹر کا نسخہ بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

انھوں نے کہا کہ ہر کام میں شروع شروع میں مشکل پیش آتی ہے۔ مگر یہ ایک قسم کا دانت نکلنے کا درد (Teething trouble) ہے۔ دانت نکلنے کے وقت ہمیشہ تکلیف ہوتی ہے مگر یہ تکلیف وقتی ہوتی ہے۔ آپ اس کو برداشت کرلیں تو وقت گزرنے کے بعد وہ اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ باتیں تو بہت اچھی کہتے ہیں مگر کوئی عملی پروگرام پیش نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ موجودہ حالت میں "عملی پروگرام" پیش کرنا قوم کے ساتھ غداری کرنا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی قوم کو بیوقوف بنا کر اس کے اوپر لیڈری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں خدا کے فضل سے ایسا کر سکتا ہوں کہ ایک خوش نما پروگرام بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر دوں۔ لیکن موجودہ حالت میں میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے یہ پسند ہے کہ میں قبر میں دفن ہو جاؤں۔ مگر مجھے یہ پسند نہیں کہ ایک ایسی قوم کے سامنے "عملی پروگرام" پیش کروں جس کے پاس بے شعوری کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔

میں نے کہا کہ عملی پروگرام اس وقت پیش کیا جاتا ہے جب کہ نظری پروگرام قابل لحاظ

حد تک کامیابی کے درجہ کو پہونچ چکا ہو۔ جب قوم فکر و شعور کے اعتبار سے ضروری حد تک تیار ہو چکی ہوتی ہے، اسی وقت اس کو عملی پروگرام دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے سارا زور صرف تعمیر شعور پر صرف کیا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہم سب سے زیادہ زور اس پر دیتے ہیں کہ الرسالہ کی اشاعت بڑھائی جائے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ تعمیر شعور کی مہم ہے اور یہی اس وقت ہمارا سب سے بڑا پروگرام ہے۔

میں ایک صاحب کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کی سڑک پر ایک گائے والا گائے لے کر نکلا۔ میں نے کہا کہ اس گائے کو دیکھیے۔ یہ خدا کا ایک زندہ کارخانہ ہے۔ خدا نے اس کو دودھ دینے کے لیے بنایا ہے۔ مگر وہ دودھ کیسے دیتی ہے۔ وہ گھاس کو دودھ میں کنورٹ (تبدیل) کرتی ہے، تبھی وہ دودھ دینے والی بنتی ہے۔ خدا کو ایسی گائے مطلوب نہیں ہے جو دودھ پی کر دودھ دے۔ بلکہ اس کو ایسی گائے مطلوب ہے جو غیر دودھ کھائے اور پھر اس کو تبدیل کر کے دودھ کی شکل میں باہر لائے۔

میں نے کہا کہ گائے کی یہ ساخت خود خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اس طرح "گائے" گویا خدا کی پسند کا ایک مظاہرہ ہے۔ وہ عمل کی زبان میں انسانوں سے کہہ رہی ہے کہ تم بھی ایسے ہی بنو۔ تمہارے کان میں برے الفاظ داخل ہوں مگر وہ تمہاری زبان سے اچھے الفاظ بن کر نکلیں۔ لوگ تمہیں ستائیں مگر تمہارے دل سے ان کے لیے دعائیں نکلیں۔ لوگ تمہارے ساتھ برا سلوک کریں مگر تم سے انھیں اچھے سلوک کا تجربہ ہو۔

پھر اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی تعمیر کے معاملہ میں مسلمانوں کا طریقہ کیا ہونا چاہیے انھیں خدا کی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے یہ ثبوت دینا ہوگا کہ وہ "گھاس" کو "دودھ" میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ مشکل کو اپنے لیے آسان بنا سکتے ہیں۔ وہ کم تر ذرائع سے ایک برتر دنیا کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو تزکیہ (یا اسلامی تربیت) کہا جاتا ہے۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ چنانچہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ

ایک چڑیا بھی فضا میں پر نہیں پھڑپھڑاتی تھی کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو کسی علم کی یاد دہانی کرتے تھے (ما من طائر یقلب جناحیہ فی الھواء الا وھو یذکر لنا منہ علماً)

بعد کے زمانہ میں "سلوک " کے نام سے جو مشقی کورس بنائے گیے وہ سراسر بدعت تھے۔ اس قسم کے مشقی کورسوں سے کبھی وہ افراد تیار نہیں ہو سکتے جو اسلام میں مطلوب ہیں۔

مسلمانوں کا ایک عجیب مزاج یہ ہے کہ جب حقیقت ان سے کھوئی گئی ہو تو وہ الفاظ کے گلدستے بنا لیتے ہیں اور ان کو بول کر خوش رہتے ہیں۔ پٹنہ کے مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے بطور خود پٹنہ کا ایک اور نام اختیار کر رکھا ہے جو ان کی خواہشات کے مطابق ہے۔ یہ نام ہے ــــــ عظیم آباد۔ مسلمان اکثر پٹنہ کو پرفخر طور پر عظیم آباد کہتے ہیں۔ اسی طرح دہلی کے مسلمان دہلی کو شاہ جہاں آباد اور کشمیر کے مسلمان اننت ناگ کو اسلام آباد کا نام دیئے ہوئے ہیں۔ یہ خوش قسمتی کی عجیب وعزیب قسم ہے جو مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہے۔ جو چیز انھیں عملی طور پر حاصل نہ ہو، اس کو وہ ایک دل پسند لفظ بول کر خیالی طور پر حاصل کر لیتے ہیں۔

پٹنہ بہار کی راجدھانی ہے۔ مگر سڑکوں پر جگہ جگہ گندگی اس طرح نظر آئی جیسے یہاں کے منتظمین کو صفائی کا کوئی شعور ہی نہیں۔ مگر جب میں " وی آئی پی ایریا " سے گزرا تو میری غلط فہمی ختم ہوگئی۔ وزیروں اور بڑے بڑے عہدیداروں کے رہائشی علاقہ میں صفائی ستھرائی کا پورا اہتمام نظر آیا۔ گویا یہاں کے منتظمین کے اندر صفائی کا شعور ہے مگر وہ صرف اپنے لیے ہے نہ کہ شہر کے لیے ــــــ آج ملک کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ یہاں ذاتی غرض کو برتر حیثیت حاصل ہے نہ کہ اصول کو۔

یہاں آٹھ ماہ پہلے مسلمانوں کا ایک جلوس نکلا تھا۔ اس میں فائرنگ ہوئی اور کئی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ انھیں میں ایک مسلم نوجوان تھے جن کے پاؤں میں گولی لگی اور وہ پچھلے آٹھ مہینے سے اسپتال میں ہیں۔ اور ابھی غالباً مزید آٹھ ماہ تک انھیں اسپتال میں رہنا ہوگا۔ ان کو دیکھنے کے لیے میں اسپتال گیا۔ ان کے پاؤں میں پلاسٹر بندھا ہوا

تھا اور وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے ۔ ان کو دیکھ کر دل سے دعائیں نکلیں ۔ آخر میں میں نے انھیں ایک جملہ لکھ کر دیا جو یہ تھا :

زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو مقصد اعلیٰ سے کم تر کسی چیز میں استعمال کیا جائے ۔

۱۳ جولائی کو دن میں ۱۱ بجے مدرسہ شمس الہدیٰ (قائم شدہ ۱۹۱۲) کے ہال میں اجتماع ہوا ۔ یہاں بھی ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا ۔ بڑی تعداد میں لوگ کھڑے ہوئے تھے ۔ تقریر کا موضوع تھا : دور جدید میں مسلمانوں کا پچھڑاپن اور اس کا حل ۔ لوگ انتہائی انہماک کے ساتھ آخر تک تقریر سنتے رہے ۔ شہر کے معززین کی بھی بڑی تعداد ڈائس پر موجود تھی ۔

تقریر کے بعد مختلف لوگوں کے تاثرات معلوم ہوئے ۔ لوگ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور تقاضا کیا کہ مزید قیام کریں یا دوبارہ پٹنہ کا پروگرام بنائیں ۔

پچھلے ایک سال کے اندر مجھے ہندستان کے کئی شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے ۔ ان سفروں میں جو اجتماعات ہوئے اور جتنی کثرت سے لوگ "الرسالہ کی آواز" سننے کے لیے جمع ہوئے ، اس کے بعد میری قطعی رائے یہ ہو چکی ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا ذہین طبقہ اب سب سے زیادہ الرسالہ کی تحریک کا مطالعہ کر رہا ہے ۔ ہر شہر میں ذہین اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد جس کثرت سے جمع ہوئی اس کے بارہ میں عام تاثر یہ تھا کہ کسی بھی دوسری آواز کو سننے کے لیے تعلیم یافتہ طبقہ اتنی بڑی تعداد میں جمع نہیں ہوتا ۔ کوئی شخص ایک جذباتی اشو اٹھا کر عوام کی بھیڑ جمع کر سکتا ہے ۔ مگر سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ جتنی بڑی تعداد میں الرسالہ کی آواز سننے کے لیے جمع ہو رہا ہے ملک میں کوئی بھی دوسری آواز نہیں ہے جو سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اتنی بڑی تعداد میں جمع کر سکے ۔

دہلی اور پٹنہ کے درمیان تقریباً ایک ہزار کیلو میٹر کی دوری ہے ۔ ہوائی جہاز سے یہ دوری صرف ڈیڑھ گھنٹہ میں پوری ہو جاتی ہے ۔ میں ۱۲ جولائی کی صبح کو دہلی سے پٹنہ گیا اور وہاں کئی پروگرام میں شرکت کر کے ۱۳ جولائی کی شام کو دوبارہ دہلی

واپس آگیا۔ جب میں دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترا تو میرا دل خدا کے احسان کے جذبہ سے سرشار تھا۔ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کیسی عجیب نعمت ہے کہ اس نے دور دراز سفروں کو اتنا آسان بنا دیا ہے۔

۱۵۷۳ء میں شہنشاہ اکبر فتح پور سے گجرات گیا تھا۔ یہ سفر ایک جنگی مہم کے تحت تھا اور اس کے لیے شاہانہ سطح پر غیر معمولی انتظامات کیے گیے تھے۔ تب بھی شہنشاہ اکبر کو اس سفر کے طے کرنے میں گیارہ دن لگ گیے۔ وہ روزانہ پچاس میل کا سفر طے کرتا تھا۔ قدیم مورخین اس تیز رفتار سفر کا ذکر نہایت حیرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ چار سو سال بعد وہ وقت آنے والا ہے کہ اس سے زیادہ لمبے سفر اس سے زیادہ کم وقت میں انجام دیے جا سکیں گے۔

واپسی میں ہوائی جہاز معمول کے مطابق اڑ رہا تھا کہ اچانک اعلان ہوا:

Please fasten your seat belt.

(آپ اپنی کرسی کی پیٹی باندھ لیں)۔ چند منٹ بعد جہاز تیزی سے نیچے اوپر ہونے لگا۔ معلوم ہوا کہ اپ ڈرافٹ، ڈاون ڈرافٹ (Updraft and downdraft) کا علاقہ آگیا ہے۔ ہوائی جہاز کے تربیت یافتہ عملہ کے لیے اس قسم کا تجربہ زیادہ پریشان کن نہیں ہوتا۔ مگر ایک عام مسافر کے لیے یہ صورت حال سخت گھبرا دینے والی ثابت ہوتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ شاید اب ہوائی جہاز زمین پر گر کر تباہ ہونے والا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے تمام مسافر بھی۔

میں نے سوچا کہ ہوائی جہاز میں نیچے اوپر (اپ ڈرافٹ، ڈاؤن ڈرافٹ) کی کیفیت ہو تو لوگ ڈر جاتے ہیں کہ شاید ان کا آخری وقت آگیا۔ لیکن غور کیجیے تو آدمی کا اپنا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہر لمحہ آدمی کی ایک سانس اندر جاتی ہے اور ایک سانس باہر آتی ہے۔ جب آدمی کی ایک سانس اندر جاتی ہے تو یہ یقینی نہیں ہوتا کہ وہ پھر باہر آئے گی۔ اسی طرح جب اس کی ایک سانس باہر آتی ہے تو یہ یقینی نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اندر جائے گی۔ ایسی حالت میں آدمی ہر آن اسی صورت حال سے دوچار ہے جس سے ہوائی جہاز

کامسافر کبھی کبھی دوچار ہوتا ہے۔ اگر آدمی کا شعور زندہ ہو تو ہر لمحہ اس کو محسوس ہوگا کہ وہ اپ ڈرافٹ، ڈاؤن ڈرافٹ کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو ہوائی جہاز کے نیچے اوپر ہونے کے واقعہ میں خود اپنے نیچے اوپر ہونے کے واقعہ کو دیکھ لیں۔

اس سفر میں بہت سے لوگوں کے سوالات سامنے آئے اور حسب موقع میں نے ان کا جواب دیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آپ کی اور الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ نہ دیکھئے کہ لوگ مخالفت کرتے ہیں، بلکہ یہ دیکھئے کہ جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفت کی بنیاد کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام پیغمبر بلاشبہ حق پر تھے۔ اس کے باوجود ان پیغمبروں کی سب سے زیادہ مخالفت کی گئی۔ حتی کہ ان پر رکیک قسم کے اخلاقی الزام لگائے گیے۔ اس کی تفصیل آج بھی پچھلے انبیاء کے بارے میں بائبل میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مخالفت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے بیّنہ (واضح دلیل) کی بنیاد پر کسی کی مخالفت کرنا۔ اور دوسری چیز ہے کسی کے خلاف عیب جوئی اور الزام تراشی کرنا۔ مثلاً پیغمبر کی دعوت توحید کی دعوت تھی۔ اب پیغمبر کو بینہ کی بنیاد پر رد کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص توحید کے نظریہ کو دلائل کے ذریعہ غلط ثابت کرتا۔ مگر پیغمبر کے مخالفین نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ پیغمبر کی ذات میں جھوٹے عیب نکال کر اس کو بدنام کرتے رہے۔ اول الذکر قسم کی مخالفت یا تنقید کا حق ہر شخص کو ہے۔ مگر ثانی الذکر قسم کی مخالفت یا تنقید کا حق کسی کو نہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھٰذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون (۴۱: ۲۶) اس آیت میں والغوا فیہ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے عَیِّبُوہ کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی اس پر عیب لگاؤ (تفسیر ابن کثیر) اس تشریح کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل کفر نے قرآن کی دعوت کو مغلوب کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ قرآن پر اور صاحب قرآن (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر عیب لگاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیب جوئی کا طریقہ اہل کفر کا طریقہ ہے، یہ مومن کا طریقہ نہیں۔

اب آپ ہمارے مخالفین کو دیکھئے تو سب کے سب بلا استثناء وہی کام کر رہے ہیں جس کو

مذکورہ آیت میں اہل کفر کی روش بتایا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک شخص نہیں جو بیّنہ کی بنیاد پر ہماری تنقید کرے۔ یعنی وہ الرسالہ یا مطبوعات الرسالہ میں چھپے ہوئے افکار کو ہمارے اپنے الفاظ میں لے اور شرعی یا عقلی دلائل سے اس کو رد کرے۔ ہر ایک صرف یہ کر رہا ہے کہ وہ ہمارے خلاف جھوٹی کہانیاں پھیلا رہا ہے۔ وہ غیر ثابت شدہ باتوں کی بنیاد پر ہمارے خلاف الزام تراشی کی مہم چلانے میں مصروف ہے۔ یہ مخالفین بظاہر الرسالہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے کہ وہ الرسالہ کے صفحات سے ہمارے ثابت شدہ افکار کو لیں اور پھر دلائل اور براہین کی بنیاد پر ان افکار کو غلط ثابت کریں۔ اس کے برعکس وہ سنی سنائی اور بلا تحقیق باتوں کو لے کر ان کے ذریعہ ہم کو بدنام کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ یہ تنقید نہیں بلکہ قرآن کے مطابق یہ تعییب ہے۔ اور تعییب کی مہم چلانے والا خود اپنے آپ کو غلط ثابت کرتا ہے نہ کہ کسی دوسرے شخص کو۔

"ہمارے افکار کو ہمارے الفاظ میں لینے" کا لفظ میں نے بالقصد استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ بعض لوگ بظاہر الرسالہ کا حوالہ دیتے ہیں مگر وہ بھی خود اپنے گھڑے ہوئے الفاظ کو ہماری طرف منسوب کرکے ہمیں بدنام کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ کہتے ہیں کہ "الرسالہ مسلمانوں کو بزدلی کا سبق دیتا ہے" یہ کہنے والے کے اپنے الفاظ ہیں، وہ ہمارے الفاظ نہیں۔ ان کو کہنا چاہیے کہ الرسالہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو صبر اور اعراض کا سبق دے رہا ہے، نہ یہ کہ الرسالہ بزدلی کا سبق دے رہا ہے یہ مخالفین کے اپنے جھوٹے الفاظ ہیں جو انھوں نے بطور خود گھڑ لیے ہیں، وہ ہمارے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ نہیں۔ ایسے لوگوں کو جاننا چاہیے کہ خدا نے کسی کو یہ لائسنس نہیں دیا ہے کہ وہ اپنے گھڑے ہوئے الفاظ کو کسی کے اوپر چسپاں کرے اور اس کی بنیاد پر سمجھ لے کہ وہ شخص غلط ثابت ہو گیا۔

پٹنہ کا سفر ادارہ ترقی کامن سنس (Institute for Developing Common Sense) کی دعوت پر ہوا تھا۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک تنظیم ہے جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔

سادہ طور پر کامن سنس سے مراد وہ عام فہم باتیں ہیں جو ہر آدمی جانتا ہے اور بلا اختلاف ان کو مانتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس دنیا میں میں اکیلا نہیں ہوں، یہاں میرے سوا اور

بھی بہت سے انسان ہیں۔ یہ ایک بے حد قدیم تصور ہے۔ تاہم ۱۸ ویں اور ۱۹ ویں صدی میں وہ فلسفیانہ غور و بحث کا موضوع بن گیا۔ بعض مفکرین (مثلاً برٹرینڈرسل) نے کامن سنس کی موجودگی کا انکار کیا۔ کچھ دوسرے علماء مثلاً ٹامس ریڈ، جی ای مور نے اس کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو ایک منظم فلسفہ کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں جی ای مور کی کتاب عقل عام کا دفاع (Defence of Common Sense) نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۵ میں شائع ہوئی۔

تاہم پٹنہ کی مذکورہ تحریک (کامن سنس) کا تعلق اس قسم کی فلسفیانہ تحریکوں سے نہیں ہے۔ وہ سادہ طور پر انسانی فطرت کو جگانے اور عوام کے اندر تعمیری شعور پیدا کرنے کی تحریک ہے۔ اس تحریک کے سکریٹری مسٹر ایم ٹی خان ہیں۔ سفر سے واپسی کے بعد موصوف کا ایک مفصل خط ہمیں موصول ہوا ہے۔ اس خط کے بعض اجزاء یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

U.N.I. helped us a lot. All papers gave the coverage.

Judge Saheb told that "Maulana's beauty lies in objectivity and coherent analysis. He likes comparative approach which is the tide of time."

Shamim Raza Saheb of Amin Manzil, Sabzi Bagh, Patna accomplished the long pending partition of family property after being impressed by your comments on Distributive Justice and acquisition of property. Shamim Saheb adopted tolerant attitude and sacrificial approach to end family feud.

Janab M.A. Manzoor Saheb of Chajjubagh, Patna (Retd Registrar and now advocate) derived three things while listening to your lecture at the residence of Hon'ble Mr Justice S.K. Jha of Patna High Court. (a) Indulgence in petty matters soils the fibres of approach to life. (b) Seeds of victory lie in the ashes of defeat. This mode of thinking will have no room for frustration. (c) Conditioned thinking eats into the potentialities of one's personality.

Mr Parbhat Kumar opined: Maulana's speeches were not only praiseworthy but record-worthy.

To me, *Al-Risala* paves the way for all-round over-hauling of the components of life and accompaniments of inter-human relationship.

To me, through *Al-Risala*, I invent new manures of mind and discover latent virtue of heart, every month.

S.H. Naqui Saheb says: *Al-Risala* helps one much in founding congenial atmosphere in office.

Uma Shankar and Anjani Babu (both of Patna High Court) say: *Al-Risala* is not only for Muslims but for mankind.

اخلاقی قیادت

کچھ مسلم رہنما اپنی تقریروں میں پرجوش طور پر کہتے ہیں : مسلمانوں کو آگے بڑھ کر اس ملک کی اخلاقی قیادت اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے ۔ مگر موجودہ حالت میں یہ لفظی بازیگری کے سوا اور کچھ نہیں۔

" اخلاقی قیادت " کوئی تقریری اجلاس کی صدارت نہیں جو ایک شامیانہ پھیلا کر اس کے نیچے حاصل ہو جاتی ہے ۔ وہ ایک عظیم قربانی کے ذریعہ حاصل ہونے والا عظیم نتیجہ ہے ۔ اخلاقی قیادت سب سے بڑا انسانی شرف ہے جو سب سے بڑی انسانیت کا ثبوت دینے کے بعد ملتا ہے ۔ اخلاقی قیادت کسی کو شاعری اور خطابت کی قیمت پر نہیں ملتی ۔ وہ عمل اور کردار کی اعلیٰ ترین متاع دے کر حاصل ہوتی ہے ۔

اخلاقی قیادت حاصل کرنے کا سب سے بڑا راز یک طرفہ حسن اخلاق ہے ۔جس کو قرآن میں خلق عظیم کہا گیا ہے ۔ یہ عمل کی اس نادر قسم کا ثبوت دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھالے کہ وہ تنقید کے باوجود برہم نہ ہو، وہ نفرت کرنے والوں کے ساتھ محبت کرے ۔ وہ ظلم کرنے والوں کے ساتھ انصاف کرے ۔ وہ چھیننے والوں کو بھی دینے کا حوصلہ رکھتا ہو ۔ وہ اپنے دشمن کو بھی دوست کی طرح سینہ سے لگا سکے ۔ حقوق کی چیخ پکار کرنے والوں کو کبھی اخلاقی قیادت نہیں ملتی ۔ اس دنیا میں اخلاقی قیادت صرف ان بلند انسانوں کو ملتی ہے جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے حقوق کو پامال ہوتے ہوئے دیکھیں پھر بھی اس کے خلاف فریاد و ماتم نہ کریں ۔

اخلاقی قیادت دراصل بلند اخلاقی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتیجہ کا دوسرا نام ہے۔ آدمی جب اس حد تک اوپر اٹھے کہ وہ یک طرفہ طور پر اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائے ۔ اس کی مسلسل قربانیوں سے جب لوگوں کے اوپر کھل جائے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے ۔ لوگ مادی سطح پر جی رہے ہیں اور وہ غیر مادی سطح پر ۔ اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی فریق ثانی کے دل کو جیت سکے جس کا دوسرا نام اخلاقی قیادت ہے ۔ قرآن کے الفاظ میں ، اخلاقی قیادت صبر کی زمین پر ابھرتی ہے نہ کہ چیخ پکار کی زمین پر ۔ (السجدہ ۲۴) ایک طرف احتجاج اور مطالبہ کی بات کرنا اور دوسری طرف اخلاقی قیادت کا نعرہ لگانا صرف ایک فکری تضاد ہے ۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا کی دنیا میں صرف اخلاقی پستی کا مقام مقدر ہے نہ کہ اخلاقی قیادت کا ۔

انسانی صفات

حضرت اسماعیل نے اپنی نسل کو ابراہیمی دین دیا تھا جو عرصہ تک غیر محرف شکل میں اور بعد کو محرف شکل میں ان کے درمیان قائم رہا۔ چند سو سال بعد پڑوسی ممالک عراق اور شام کے اثر سے بت پرستی عرب میں داخل ہوئی۔ عربوں کی آبادی بڑھی تو ان کے افراد تجارت کی غرض سے باہر جانا شروع ہوئے۔ انھیں تجارتی سفروں کے ذریعہ وہ متمدن دنیا کی بت پرستی سے واقف ہوئے۔ مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ عرب کی بت پرستی در اصل شام کی دین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا شخص جس نے عرب میں بت کو درآمد کیا وہ ایک تاجر عمرو بن لُحَیّ الخزاعی تھا۔ اپنے کسی تجارتی سفر سے واپس ہوتے ہوئے وہ ایک بت بھی اپنے ساتھ لایا اور عربوں میں اس کو رواج دینے کی کوشش کی۔ تاہم بت پرستی عرب کی زندگی کا صرف ایک جزئی حصہ تھی۔ وہ عرب زندگی میں کبھی اس طرح سرایت نہ کر سکی جس طرح وہ عراق وشام اور مصر وغیرہ میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ چنانچہ وہاں کثرت سے ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو اپنے آپ کو حنیف کہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بتوں سے بے زار تھے۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے مرگیے کہ ——— خدایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کس طرح کی جانی چاہیے تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا۔

ڈھائی ہزار سال کے توالد وتناسل کے ذریعہ عرب کے جغرافیہ میں جو قوم تیار ہوئی وہ انسانی اوصاف کے اعتبار سے دنیا کی بہترین قوم تھی۔ عرب کا جغرافیہ اور تہذیب وتمدن سے دوری کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ان کی فطرت پوری طرح محفوظ تھی۔ وہ تکلف کے بجائے سادگی کو پسند کرتے تھے۔ وہ انتہائی حقیقت پسند لوگ تھے۔ ان کے یہاں قول وفعل کا تضاد نہ تھا۔ وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہی کہتے تھے۔ وہ چیزوں کو جوہر کی بنیاد پر دیکھتے تھے اور جس چیز کو حق سمجھ لیں اس کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار رہتے۔ وہ ناحق کے آگے کبھی نہیں جھکتے تھے۔ مگر جس چیز کو حق سمجھ لیں اس کو ماننے میں بھی انھیں کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ کسی کے اوپر جھوٹا الزام نہیں لگاتے تھے۔ ان صفات کو قدیم عرب کے لوگ المروۃ (مردانہ پن) کہتے تھے اور یہ المروۃ ان کے اندر کمال درجہ میں موجود تھا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ــــ ۲۵

۱۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے الرسالہ کو اس دینی عمل کا ذریعہ بنا دیا جس کو قرآن میں "تزکیہ" کہا گیا ہے۔ روزانہ خطوط سے اس کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک صاحب کان پور سے اپنے خط (۲ ستمبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: "۱۹۸۵ سے الرسالہ کا مستقل خریدار ہوں۔ ۵ کاپیاں میرے یہاں آتی ہیں۔ رسالہ کیا ہے تازیانہ ہے جس کے پڑھنے کے بعد ذہن فوراً آخرت کے احوال کی طرف منتقل ہو کر قلب میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بیان سے باہر ہے"۔ ایک صاحب اورنگ آباد سے اپنے خط (۲۸ ستمبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: آپ کی مطبوعات نہ صرف دین کی اشاعت کا ذریعہ ہیں، بلکہ ذہنوں اور خیالات کو موڑنے کا ایک بہت ہی موثر ذریعہ ہیں۔ ہم بہت سے نوجوان آپ کی مطبوعات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ الرسالہ کا ہم لوگوں کو بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے اور اس کے آنے پر ایک ایک رسالہ کئی کئی بار پڑھا جاتا ہے، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کے نتیجہ میں نوجوان طبقہ نمازوں سے جڑا ہوا ہے۔

۲۔ انگریزی الرسالہ خدا کے فضل سے دن بدن اپنا نفوذ بڑھاتا جا رہا ہے۔ اس کی مثالیں مختلف شکلوں میں برابر سامنے آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایران کے ایک اسکالر علی امیر بابایات لندن گئے۔ وہاں انھوں نے کسی کے یہاں انگریزی الرسالہ کا ایک شمارہ دیکھا۔ وہ ان کو پسند آگیا۔ انھوں نے لندن سے اس کا سالانہ زرتعاون بھیجتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے تہران کے پتہ پر انگریزی الرسالہ جاری کر دیا جائے۔

۳ ہندستان کے ایک بڑے شہر سے ایک صاحب لکھتے ہیں: الحمد للہ اب الرسالہ کے مشن کو لوگ سنجیدگی سے سمجھ رہے ہیں، اور آپ کی پالیسی جو عین اسلامی پالیسی ہے، اس کے قائل ہونے لگے ہیں۔ اس کی مثال ہمارے شہر میں دیکھنے کو ملی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ کو رات میں یہاں ایک میٹنگ ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے یہاں کے ایک غیر مسلم ہفتہ وار اخبار نے کچھ باتیں اسلام اور قرآن کے بارہ میں

توڑ مروڑ کر لکھ دی تھیں جس پر کچھ نوجوان احتجاجی کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کچھ لوگ میٹنگ میں ایسے بھی تھے جو الرسالہ کے قاری ہیں۔ انھوں نے نوجوانوں کو ایسے اقدام سے روکا۔ میں خود اس مجلس میں حاضر نہ تھا۔ وہ لوگ جو اس مجلس میں حاضر تھے وہ دوسرے دن مجھ سے ملے تو کہنے لگے کہ کل میٹنگ میں تمہاری بہت یاد آئی۔ اگر تم وہاں ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔ کیوں کہ اس میں الرسالہ کی پالیسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۴۔ الرسالہ کی دعوت کے سنجیدہ دعوت ہونے کا اعتراف اب عام طور پر کیا جانے لگا ہے۔ مہاراشٹر کے ایک قاری اپنے خط (۱۳ اکتوبر ۱۹۸۶) میں لکھتے ہیں: بمبئی کا سفر نامہ جو ماہ اکتوبر ۱۹۸۶ کے الرسالہ میں چھپا ہے، اس پر بہت سے لوگوں سے گفتگو ہوئی اور بار بار ہو رہی ہے۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات ہے۔ "کچھ علوم وہ ہیں جو درد کی درسگاہ میں پڑھائے جاتے ہیں" (صفحہ ۴۲) یقیناً مولانا صاحب درد کی درسگاہ کے طالب علم ہیں، ورنہ ان کی زبان سے یہ جملہ کبھی نہ نکلتا۔

۵۔ آج کل کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔ اردو میں: تذکیر القرآن جلد دوم، خاتونِ اسلام، رازِ حیات، تعلیماتِ اسلام، تعبیر کی غلطی۔ ہندی میں: انسان اپنے آپ کو پہچان، حقیقت کی تلاش۔ انگریزی میں: مذہب اور جدید چیلنج، تبلیغی تحریک انسان اپنے آپ کو پہچان۔

۶۔ خواتین کے حلقہ میں بھی خدا کے فضل سے الرسالہ برابر پھیلتا جا رہا ہے۔ علی گڑھ سے ایک خاتون لکھتی ہیں: "میں ایک طالبہ ہوں۔ دو سال سے الرسالہ اور تذکیر القرآن غور سے پڑھتی ہوں۔ اس کے ذریعہ دل و دماغ بدلتے جا رہے ہیں۔ جب ہم کچھ خواتین صبح کو ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھتی ہیں اور الرسالہ اور تذکیر القرآن کو مل کر پڑھتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کے سوز دروں اور باطن کے درد نے ان کی زبان کے الفاظ میں بجلی سا اثر پیدا کر دیا ہے۔ یقین کیجیے کہ ہم الرسالہ کا انتظار اس طرح کرتے ہیں جس طرح بچے بے چینی کے ساتھ صبح عید کا انتظار کرتے ہیں۔

اسلام وہی قدیم اسلام ہے۔ مگر آپ نے اس کو زمانہ حاضر کی ضرورت کے عین مطابق پیش کیا ہے۔ آپ عصری اسلوب میں قرآنی نغمے چھیڑ کر خوابیدہ فطرت کو جگارہے ہیں۔ (۲ اکتوبر ۱۹۸۶)

۷۔ الرسالہ اپنے فطری اور آفاقی انداز کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول ہو رہا ہے۔ ایک انگریزی خط (۵ ستمبر ۱۹۸۶) یہاں بطور مثال نقل کیا جاتا ہے:

For the last 10 months I have been reading *Al-Risala* English and Urdu. I found very much interest in these two magazines. When I start reading, I finish it only in 30 minutes. What the topics are! May God continue to bless you in this work which is very useful for the new as well as for old generation. Your topics on Islam and all other topics in Urdu Al-Risala will help people very much in their motto. Thanking you for the edition of Al-Risala in English. I made it very popular (being a Sikh) among my friends.
J.B. Singh, H. No. 2, Allocha Bagh, Srinagar 190009

۸۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۶ کی شام کو البرٹ اسکوئر (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک مفصل تقریر کی اور بتایا کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل حاضرہ کا حل کیا ہے۔ تقریر کے بعد سوالات و جوابات کی مجلس ہوئی۔

۹۔ جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے، قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ کی بنا پر الرسالہ اردو اور الرسالہ انگریزی کی قیمت میں جنوری ۱۹۸۷ سے ایک روپیہ کا اضافہ کیا جارہا ہے۔ جنوری ۱۹۸۷ سے دونوں الرسالہ کی قیمت فی شمارہ چار روپیہ ہوگی۔ سالانہ زرتعاون ۴۸ روپیہ ہوگا۔ اسی نسبت سے ایجنسی کی قیمتیں بھی بڑھ جائیں گی۔ پانچ پرچہ کی ایجنسی کی ماہانہ قیمت پندرہ روپیہ ہوگی۔ اور اسی نسبت سے زیادہ تعداد کے لیے۔ ڈاک خرچ میں سرکاری اضافہ کے باوجود ملکی ایجنسیوں کے لیے ڈاک خرچ بدستور ادارہ کے ذمہ ہوگا۔ غیر فروخت شدہ پرچے بھی بدستور پوری قیمت پر واپس کیے جا سکیں گے۔ کوئی صاحب ایجنسی آئندہ کسی قسم کی تبدیلی چاہتے ہوں تو فوراً بذریعہ ڈاک مطلع فرمائیں۔ خط میں ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نیو آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

[illegible]

The Word of God



To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that [illegible] the earnest endeavour of this [illegible]ine, how noble-spirited it would be [illegible], dear readers, if you sent it on [illegible] to friends and relatives. Make a [illegible] of it. Think of a whole year's [illegible] as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

(Please use separate sheet for more than one address)

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Please tick box where applicable

☐ URDU
☐ ENGLISH
☐ ONE YEAR
☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND	RS 48
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

GI[illegible] & RELATIVES